علم الانسان ما لم یعلم

کتبخانہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ

دہلی

شعبہ ۰۵۱

شمارہ ۲۹

عدد ماخذ ۱۳۶۲۲

۴۲۔ یادرفتگان:-

۴۳۔ رفتار زمانہ

حصۂ نظم

۷۳۔ لطفِ سخن:-

زمانہ

جلد ۶۶ — جنوری ۱۹۳۶ء — نمبر ۱

اُردو رسم الخط کے متعلق ایک تجویز

از مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے۔ ایل ایل بی (وکیل جودھپور)

موجودہ دور میں اُردو اور ہندی کے قضیہ کے سلسلے میں رسم الخط کا سوال بھی آتا ہے۔ بعض کے نزدیک اُردو ہندی میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو صرف رسم الخط کا۔ دونوں زبانوں کے حامی اپنے اپنے رسم الخط کی تعریف کرتے ہیں جسمیں دونوں فریق تعصب سے کام لیتے ہیں۔ اس ضمن میں جو کچھ میں لکھونگا وہ ذاتی تجربہ کی بنیاد پر لکھونگا۔ اُردو میری مادری زبان ہے مگر تقدیر کی خوبی سے روزی پیدا کرنے کے لئے دن رات ہندی اور وہ بھی مارواڑی لکھنا پڑھنا پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں زبانوں کی سہولتیں اور دشواریاں کس درجہ تک مجھ سے پوشیدہ رہ سکتی ہیں۔

میں ہندوستان کی آبادی کو چار حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔

اوّل وہ لوگ جو صرف عربی رسم الخط سے واقف ہیں، اِن میں عموماً مسلمان ہیں۔

دوسرے وہ لوگ جو صرف ہندی رسم الخط سے واقف ہیں۔

تیسرے وہ لوگ جو اُردو اور ہندی دونوں رسم الخط سے واقف ہیں

چوتھے وہ لوگ جو عربی اور ہندی دونوں رسم الخط سے بے بہرہ ہیں۔

یہاں جاہل لوگوں کا ذکر نہیں جو کسی رسم الخط سے واقف نہیں، بلکہ عموماً عیسائی۔ پارسی۔ اور انگریز وغیرہ سے مراد ہے جن کی تعداد بہت کم ہے۔

یہی وا... میں ۲ کی تعداد سب سے زیادہ ہے ۳ میں بھی زیادہ تر ہندو ہیں۔ جھگڑا صرف ... اور ۲ میں ہے۔ چونکہ ۳ میں ہندو زیادہ ہیں لہذا وقت پر قدرتاً ۲ کا ساتھ دیں گے۔

میں دونوں زبانوں کے بارے میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر عرض کرتا ہوں۔ اُردو کے متعلق پہلے شدہ ہے کہ وہ جلد لکھی جاتی ہے مگر ہم مارواڑی جو ہندی لکھتے ہیں (وہ اس طرح کہ ایک سطر کھینچی اور بائیں طرف سے جو قلم رکھ کر گھسیٹا تو پھر اٹھانے کا کام نہیں لکھ دینے سے مطلب) اس کا پڑھنا محض اللہ کے بھروسہ پر ہوتا ہے، لہذا اس بارہ میں بحث فضول ہے۔

جس طرح اُردو ایک قسم کا شارٹ ہینڈ ہے، اسی اصول پر ہم مارواڑی میں عمل کرتے ہیں، کم و بیش یہی حرکت ناگری والا ناگری کے ساتھ کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے ہندی کا پڑھنا اُردو کے بہ نسبت قدرے دشوار ہو جاتا ہے مگر نہ ایسا کہ جتنا بدنام کر دیا گیا ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ دنیا کے کاروبار میں خلل پڑے یا محض اس وجہ سے اُردو کو ہندی پر فوقیت حاصل ہو۔ درحقیقت یہ نہایت فروعی بات ہے اور اس فرق کو اُردو والوں کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جہاں واقعی جلدی پڑھنے کی ضرورت ہوگی وہاں ہندی والا شکست کھا جائیگا۔ اس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ جن لوگوں کی مادری زبان ہندی ہے اور وہ اُردو بھی جانتے ہیں وہ اپنا ذاتی تحریری کام اُردو میں کرتے ہیں۔ جودھپور میں کئی وکیل اُردو ٹھیک نہیں بول سکتے مگر اپنے دفتر کا کام اور مقدمات کی مسلیں اُردو میں رکھتے ہیں (میں خود جہاں تک ہندی لکھنے کا سوال ہے بہت تیز لکھتا ہوں مگر عموماً اپنا ہی لکھا پڑھنا دشوار ہو جاتا ہے)

لکھنے کے متعلق اصل یہ ہے کہ ہندی صرف چند منٹ میں لکھنا آجاتی ہے مگر اُردو کا صحیح لکھنا بیحد مشکل ہے۔ اُردو داں شخص ہندی لکھنا چند منٹوں میں سیکھ لیگا اور غلطی نہ کرے گا۔ مگر ہندی داں کو اُردو سیکھنے کے لئے ایک مدت درکار چاہیئے۔ ہندی تحریر میں غلطیاں کرنے کی اجازت ہے مگر اُردو میں نہیں۔ ہماری طرف اِس میں اتنی آزادی حاصل ہے کہ صرف حرف لکھتے چلے جائیے زیر و زبر سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ "لالہ جی اجمیر گئے بڑی بہی کو بھیج دو"۔ اور "لالہ جی آج مر گئے بڑی بہو کو بھیجدو" دونوں تحریریں ہو بہو یکساں لکھی جاتی ہیں۔ مگر ہزاروں آدمی اسی طرح اپنا کام چلا رہے ہیں۔ ہزاروں جاہل میرے علم میں ہیں جو سوائے ہندی حروف کے اور کوئی قاعدہ زیر و زبر لگانے کا نہیں جانتے اور دن رات اسی طرح خط و کتابت کرتے ہیں۔ میں خود بھی دن رات ایسی تحریریں پڑھتا لکھتا رہتا ہوں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جائز یا ناجائز لکھنے کی ہندی نے کتنی آزادی دیدی ہے اور ہزاروں جاہل مطلق حرف گھنٹہ بھر میں ہندی حروف یاد کر کے لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ کاش اُردو داں اصحاب یہ اندازہ لگا سکتے کہ

کس قدر جلد ایک جاہل مطلق چشم زدن میں ہندی لکھنا شروع کردیتا ہے۔ لکھا پڑھا آدمی ہندی عبارت کے ہر ہر لفظ کے ٹکڑے توڑ توڑ کر معلوم کر لیتے ہیں کہ اس میں کون کون سے حروف ہیں اور ان کو لکھ دیتے ہیں "کرتا" لکھیں گے تو زبان سے ٹکڑے کرتے ہیں "کا۔ را۔ تا" اور یہ تینوں حروف بغیر زیر وزبر کے لکھ دیتے ہیں۔ اب اس کے مقابلے میں اُردو تحریر کے قواعد دیکھئے۔ کتنے حروف الفاظ میں آکر کیسی کیسی طرح صورتیں بدل لیتے ہیں۔ کسی حرف کا دائرہ غائب کسی کا سر ندارد، کسی کی ہستی ہی صرف ایک شوشہ میں تحلیل ہو کر رہ گئی اور اس کے وجود کا ثبوت صرف اُس کے نقطے میں موجود ہے۔ کسی کی صورت ہی دوسری ہو جاتی ہے۔ مثلاً "غ" لفظوں میں دوسری صورت کا ہو جاتا ہے، اور پھر یہ تمیز کہ "کرنے دو" کو "کرندو" مت لکھو۔ "ملنے کے لئے" کو "ملنیکیلئے" لکھنا درست نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام باتیں کسی جاہل مطلق کو بھلا دو دن میں بتا تو دیجئے۔

بہرحال یہی وجہ ہے کہ ہندی کی اشاعت بڑی سُرعت سے ہو رہی ہے اور ہندی میں لکھنے پڑھنے والے کہلانے والے لوگوں کی تعداد جس غیر معمولی تیزی سے بڑھ رہی ہے اُس کا اندازہ لگانا ایک اُردو کے متعصب حامی کے لئے ممکن نہیں۔ مزید ثبوت کے لئے دیکھئے کہ کس تیزی سے ہر قسم کی کتابیں ہندی میں چھپتی چلی جاتی ہیں۔ اُردو کے حامی ہندی رسالوں کی تعداد اشاعت اور ہندی کتابوں کی کھپت پر تعجب کرتے ہیں۔ اُنھیں یقین نہیں آتا کہ کس طرح ایک اُجڈ لٹھ دو دن میں ہندی لکھنا پڑھنا اور صرف ایک آنہ کا ہندی اخبار لیکر شروع سے آخر تک ختم کرکے خوب پڑھنا جان جاتا ہے۔ وہ تو کہئے کہ ہندی کے ادیب بھی متعصب ہیں اور سنسکرت کے غیر مانوس لفظ جن کی تحریر اور ترکیب ہندی کو اُردو سے بھی مشکل بنا دیتی ہے استعمال کر رہے ہیں۔ ورنہ اگر یہ بدعت نہ ہو تو ہندی کے رسالوں کی تعداد اشاعت دس گُنی زیادہ ہو جائے۔ اب رہیں پریس کی سہولتیں اور فوائد، وہ بارہا زیر بحث آچکے ہیں۔ لیتھو کا لٹریچر اور ٹائپ کے فوائد، ارزانی اور گرانی کی بحث، وغیرہ سوالات کو یہاں قصداً نظر انداز کیا جاتا ہے۔

مسلمان عربی رسم الخط پر کیوں فدا ہیں؟ یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی لٹریچر اسی رسم الخط میں ہے جس پر دنیا کے مسلمان فدا ہیں، اور اسلامی دنیا کی زبانیں گو مختلف ہیں مگر رسم الخط کا تخیل ایک ہے۔ یعنی قرآن پاک کے رسم الخط کا۔ اسی میں اسلام کی شان ہے، اسی رسم الخط پر چینی اور ایرانی اور تورانی مسلمان متفق ہیں۔ اسمیں قبلہ کا تخیل مضمر ہے جس سے مسلمانوں کو جائز محبت ہے۔ اس کی بدولت ہر زبان کو اسلامی شان حاصل ہو جاتی ہے اور واقعی بہت سی ناقابل تردید خوبیوں کا حامل ہے۔ دنیا کا کوئی ملک

نہیں جہاں کا مسلمان اس رسم الخط سے ناواقف ہو۔ مسلمان کس طرح اپنی ایسی بین الاقوامی چیز کو محض ہندوؤں اور ہندی کی خاطر چھوڑ سکتے ہیں؟ اس کا مطالبہ مسلمانوں کے لئے سراسر ظلم ہے خصوصاً جبکہ یہ اس قدر مقبول عام ہے اور ہندوؤں میں بھی ہر دلعزیز ہے۔ ابھی تک ہزاروں لاکھوں ہندو اس پر فدا ہیں، ہماری دنیوی اور مذہبی تاریخ اسی رسم الخط میں ہے، اتنے دنوں کے اقتدار کے بعد اب اس کو تخت سے اُتار دینا بہت تکلیف دہ ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ اگر یہ رسم الخط چھوٹ جائے تو عرب پرستی چھوٹی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اُردو کے بعض کیوں نہ ہم ہندوستان میں اس قسم کی عربی زبان بنالیں جیسی افریقہ کی مختلف قوموں میں رائج ہے، عرب بھی اسکو کچھ کچھ سمجھ لیتا ہے اور وہ اب عربی کی مسخ شدہ صورت کہلانے کی مستحق ہو گئی ہے کیوں نہ اُردو بھی ویسی ہی عربی ہو جائے ہم اس کو ایسا ہی بنا رہے ہیں۔

ہندوؤں کے نقطۂ خیال کو دیکھئے، گو ہم عرب میں نہیں رہتے لیکن ہم عرب پرستی میں اپنے کو حق بجانب سمجھتے ہیں اسی طرح ہندو بھی آخر انسان ہیں، اُن کی مُردہ زبان سنسکرت کی اکلوتی لڑکی یہی ہندی رہ گئی ہے آپ اس کو ان سے چھڑانا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ خود اُن کے ملک میں اُن کا رسم الخط محض چند تحریری فوائد کے خیال سے رائج نہ ہونے پائے۔ خود ہندوستان میں سنسکرت کا رسم الخط ہی فنا ہو جائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ کسی قوم پر اس سے زیادہ اور کیا ظلم ہو سکتا ہے؟

غرض دونوں فریق اپنے اپنے خیالات وجذبات کے لحاظ سے حق بجانب ہیں، لہذا دونوں رسم الخط کی کشمکش یوں ہی جاری رہے گی، اور ان کے جاری رہتے ہوئے ایک میں عربی اور دوسری میں سنسکرت گھستی چلی جائیگی، اور دونوں کے درمیان جو خلیج پیدا ہو گئی ہے وہ وسیع سے وسیع تر ہوتی جائے گی اس کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ دونوں رسم الخط کو پس پشت ڈالکر ایک نیا رسم الخط ایجاد کیا جائے۔ "اُردو" یا ہندوستانی اب ایک نیا رسم الخط مانگتی ہے۔

نیا رسم الخط کیسا ہونا چاہئیے؟ یہ سوال ہے جس کا حل ضروری ہے۔ میری رائے میں اسکی خصوصیات یہ ہونا چاہئیے:۔

(۱) بہت جلد آجائے، اس کے سیکھنے میں دقت نہ ہو ہندی سے بھی زیادہ آسان ہو، اور لکھنے میں بھی کسی طرح کی قباحت نہ ہو۔

(۲) عرب پرستی کا الزام باقی نہ رہے

(۳) اسکی بدولت اُردو پڑھنے والوں کی تعداد دس گنی ہو جائے اور اُردو کے رسالے اور کتابیں وغیرہ سب دس گنی

چھپنے لگیں!

(۴) چھپائی کی سہولتیں ہوں،

(۵) مرہٹہ۔ بنگالی۔ مارواڑی گجراتی غرض ہر صوبہ والا اس کو آسانی سے پڑھ سکے

اُردو کے ہمدردوں کو ٹھنڈے دل سے سوچکر کوئی نیا رسم الخط جلد تر ایجاد کرنا چاہیئے۔

میری تجویز یہ ہے کہ نئے حروف تہجی ایجاد ہوں اور اُردو کے حامی بطور تجربہ اعلیحضرت حضور دکن سے اپنی قلمرو میں اسے جاری کرنے کی درخواست کریں، اور اس کا نام شاہ دکن کے نام نامی پر "عثمانی الف بے" رکھا جائے تاکہ اُردو کی آئندہ تاریخ میں یادگار رہ جائے کہ کس فرمانروا نے اُردو کو نیا رسم الخط عطا فرمایا۔ میں حسب ذیل حروف تہجی پیش کرتا ہوں، یہ حروف انگریزی سے لئے گئے ہیں مگر ان کے نام انگریزی نہیں رکھے گئے، ہمارے وہی حروف ہیں، ہمارا زیر و زبر بھی بدستور قایم ہے صرف ظاہری شکل دوسری ہوگی لیکن بچوں کو ا۔ ب۔ ت کی طرح پڑھایا جائیگا۔

عثمانی حروف تہجّی

a	b	p	t	ṫ	s	j	ĵ
ا	ب	پ	ت	ٹ	ث	ج	چ
h	kh	ḣ	d	ḋ	r	ṙ	z
ح	خ	خ	د	ڈ	ر	ڑ	ز
ż	c	ĉ	e	ė	ß	ß̇	b
ژ	س	ش	ص	ض	ص	ض	ط
ƀ	ε ε	ğ ğ	f	ḟ	k q	k	g
ظ	ع	غ	ف	ق	ق ق	ک	گ
l	m	n	v	o	∞	6	y
ل	م	ن	و	ہ	ھ	ء ی	ی
y—	w	•	—	‿	>		
ے	تشدید	پیش	زیر وزبر	ــــ	جزم		

نوٹ:- ان حروف میں خاطر خواہ ردو بدل کیا جا سکتا ہے مثلاً غ کے بدلے g کر سکتے ہیں حتی الوسع اپنی ایجاد کے بجائے روشن حرف میں ذرا سی ترمیم سے کام چلانا بہتر ہوگا۔ ورنہ غ بصورت g بہتر رہیگا ھ فضول ہے اسکو خارج کیا جا سکتا ہے

اِس الف بے کو سامنے رکھکر اُردو لکھیے :۔

قاسم : Qacm

نوٹ :۔ سین کے نیچے زیر ہے اور میم کے اوپر جزم ہے۔

فہیم : Foym

لحم : Lhm

تجمّل : Tjml

نوٹ : میم کے اوپر پیش مشدد ہے۔

کون سا اُردو داں ہے جو اِن حروف کو سامنے رکھکر اُردو نہیں سیکھ سکتا، اور کون اُردو رسم الخط نہ جاننے والا ہندی داں ہے جو ذرا دیر میں اُردو نہیں پڑھ سکتا۔ انگریزوں کو بھی اُردو لکھنے میں سہولت ہوگی غرض یہ حروف بہت آسان ہیں اور اس کے ذریعے سب لوگ اُردو آسانی سے پڑھنے لگیں گے۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس کا رواج ممکن ہے۔ کیا یہ تجویز قابل عمل ہے؟ اگر اعلیٰحضرت نظام خلد اللہ ملکہ چاہیں تو اپنی قلمرو میں اسے جاری کرا سکتے ہیں۔ سرکاری عرضیاں اور رپورٹیں سب اسی رسم الخط میں طلب کی جائیں اسکولوں میں آٹھویں جماعت سے دو علحدہ پرچے اس کے بھی کر دیئے جائیں۔ ایک پرچہ املا کا اور دوسرا اس رسم الخط کی اُردو پڑھنے کا۔ سرکاری گزٹ اسی رسم الخط میں شائع ہو۔ اس کے ساتھ ہی اُردو کا موجودہ رسم الخط بھی چلنے دیا جائے۔

درسِ تواضع

(۱)

بیمار اگر تو ہے، طبیبوں سے ملے
محبوب جو ہونا ہے، حبیبوں سے ملے
اللہ نے گر تجھکو بنایا ہے امیر
لازم ہے تجھے بڑھکے غریبوں سے ملے

(۲)

کیا تجکو ملے گا جو امیروں سے ملے
بیکار ہے شاہوں سے وزیروں سے ملے
اللہ نے رتبہ جو دیا ہو باسط
مسند سے اُٹھے اُٹھ کے فقیروں سے ملے

(باسط بسوانی)

اُردو زبان اور اُس کا رسم الخط

(از مسٹر ریاض الدین احمد خاں ریاض بی۔ اے۔)

جس ہندوستانی زبان کی داغ بیل خسرو نے ڈالی تھی اور جس کی موجودہ تشکیل شاہجہاں کے اُردوئے معلی میں ہوئی وہ بہت سادہ تھی۔ میر و درد کی زبان میں ناسخ و غالب نے سب سے پہلے تصنع اور فارسیت کا تخم ممنوع نہ صرف خود کھایا بلکہ اُسے آئندہ نسلوں کی مرغوب غذا بنا دیا۔ اُردو نثر کچھ عرصہ تو فارسی کے پیچھے پیچھے چلی مگر آخر ہندی نژاد تھی جلد ہی دیسی مناظر میں محو ہو کر بھٹک کر رہ گئی۔ مقفی و مسجع اقسام نثر خواب و خیال ہو گئیں۔ وہی غالب جس نے اُردو نظم میں فارسی کی بلیغ ترکیبوں کا سنگ بنیاد رکھا نثر عاری کی وساطت سے ملکی زبان کی ترویج کے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہوا۔ ادھر صنف غزل میں حضرت داغ کی زبان تغزل کی جان اور غالبانہ فارسیت کا ردعمل تھی۔ ان کی بدولت اُردو کے دلچسپ محاورات، دلکش طرز ادا اور دلنشین روزمرہ کا ڈنکا ہندوستان کے چپے چپے میں بج گیا۔ لیکن عشق و عاشقی کی معاملہ بندی ہماری تمدنی ترقی کا ساتھ نہ دے سکی۔ ملکی حالات اور تہذیب جدید نے اظہار جذبات کے لئے غالب کی بلاغت و اشارات ہی کو مستحسن ٹھہرایا۔ رفتہ رفتہ روشن خیال شعرا کی نظموں میں فارسی کی بلیغ ترکیبوں نے فصیح روزمرہ کی جگہ لے لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادبی اُردو ہندوستان کی عام فہم زبان نہ رہکر فارسی داں طبقہ سے مخصوص ہو گئی۔

موجودہ زمانہ کے بعض مصنفین مثلاً مولانا نیاز فتحپوری اور حضرت سیماب اکبرآبادی وغیرہ حضرات بھی موجودہ اُردو اور اُس کے رجحانات پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئے ہیں۔ درحقیقت اس سکول نے عروس زبان کو مغربی رنگینیوں کی روشنی میں عربیت کا برقع پہنا کر ایک مخصوص عربی داں طبقہ کے حبالہ نکاح میں دیدیا ہے چنانچہ آج اُردو زبان اپنی تنگ نظری کا عذر یا ابقا کی اپیل یہی کہکر پیش کر سکتی ہے کہ وہ ایک محدود فرقہ کی زبان ہے اور قومی اختلاف معاشرت کے لحاظ سے اُس کا علحدہ وجود نابدی ہے۔ لیکن کیا یہ کہتے ہوئے وہ اپنی سابقہ ہردلعزیزی کی طرف دیکھکر شرم سے سر اُٹھانے کے قابل رہ سکتی ہے؟

غور کیجئے تو اُردو کو مادری زبان سمجھنے کا زعم اور اُس میں علمی ادبی صلاحیت قرار نہ دینے کی بدعت ہی ملکی زبان میں فارسی و عربی کے غیر متناسب دخل کی ذمہ دار ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آجکل کا اُردو اسکالر اُردو زبان سے مطلقاً نابلد ہوتا ہے۔ اُردو کے تدریجی کورس کی تعلیم جتنی اعلیٰ ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اُس میں فارسی و عربی الفاظ کی بھرمار ہوتی جاتی ہے۔ حالانکہ کسی زبان کے روزمرہ اور محاورات پر کامل عبور ہی زباندانی کا اصلی معیار ہونا چاہیئے۔

اُردو زبان اور اُس کے فصیح محاورات پر کما حقہٗ عبور نہ ہونے ہی کا باعث ہے کہ ہم فارسی و عربی الفاظ کا ضرورت سے زیادہ سہارا لینے پر مجبور ہیں۔ کاش اُن کی جگہ بھاشا کے سُندر الفاظ اور انگریزی کے ادیجنل مصطلحات قبول کر کے اُردو کو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانے کی کوشش کیجائے زبانِ اُردو اپنے اندر کچھ ایسی دلکشی رکھتی ہے کہ ایک مناسب حد تک اُس کی فارسیت و عربیت بھی مرغوبِ طبع ہے۔ اُس کی شان۔ سلیقہ اور دلکشی کا ہر شخص قائل اور اُسے حاصل کرنے کی طرف مائل ہے۔ لیکن ملک کے کثیر طبقہ کے لئے اِس میں دو امور مانع ہیں۔ ایکٹ سرکاری مدارس کا موجودہ طریقہ تعلیم جس میں بہ یک وقت دو دیسی زبانوں کی تعلیم کی گنجائش نہیں ہے، دوسرا فارسی کا معرب رسم الخط۔

اول الذکر مشکل کے حل کے متعلق "زمانہ" بابت جون سنہ ۳۵ء میں آفسر صاحب میرٹھی نے جو اہم تجویز پیش کی ہے وہ ہر حیثیت سے حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔ ہندوستان میں خاموشی سے مشترکہ زبان اور لسانی اتحاد پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر عملی تجویز ممکن نہیں ہے۔ محکمہ تعلیم کے ارباب حل و عقد کو چاہیئے کہ از راہ وطن دوستی اس پر جلد سے جلد توجہ دیکر نہ صرف ملکی زبان کے نشو و نما میں مدد دیں بلکہ غیر ضروری مضامین کا بار ہلکا کر کے طلبا کو نامناسب ذہنی بوجھ سے محفوظ رکھیں۔ تاکہ اُن میں صنعت و حرفت کے مفید شعبوں میں ایجاد و اختراع کی دماغی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ ملک کے لئے اس وقت دو ہی باتیں اشد ضروری ہیں، ایکٹ اتحادِ باہمی، دوسرے صنعت و حرفت کی ترقی۔

اُردو کا موجودہ رسم الخط نہ صرف فارسی بلکہ معرب فارسی ہے یعنی بعض خالص عربی حروف اس کے اہم جزو بن گئے ہیں جو سیاسی اثرات کی وجہ سے فارسی و عربی کے شیر و شکر ہو جانے کا نتیجہ ہیں۔ لیکن اگر یہ حقیقت ہے کہ اُردو ایک دیسی زبان اور ہندوستانی پیداوار ہے تو جس طرح گفتگو میں عربی حروف کی حجازی قرأت ملحوظ نہیں رکھی جاتی اُسی طرح اُردو زبان کو عربی رعایت املا کا محتاج رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

عربی کے مختلف المخرج اور متحد الصوت حروف اُردو رسم الخط کو نہ صرف مشکل بلکہ اُن لوگوں کے لئے جو تھوڑی بہت عربی فارسی نہیں جانتے تقریبًا ناممکن الحصول بنا دیتے ہیں۔ اگر امریکہ زوائد حروف سے الفاظ کو پاک کرکے انگریزی زبان کے املا کو آسان بنا سکتا ہے، اگر ٹرکی یورپ سے متحد اللسان ہونے کے لئے عربی رسم الخط کو قطعی ترک کرسکتا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ ہم لوگ اپنی زبان کو آسان اور وسیع بنانے کے لئے رسم الخط میں تبدیلی گوارا نہ کریں؟

اِس میں شک نہیں کہ اس وقت باعتبار مخرج و قرأت ومختصر نویسی ونیز باعتبار اس کے کہ بعض لفظوں کی حرفی ترکیب ہی سے عربی الاصل، فارسی نژاد اور ہندی نژاد کے الفاظ میں امتیاز اور ایضًا الفاظ کا مخرج وماذہ معلوم کیا جا سکتا ہے (اس لحاظ سے ہمارا رسم الخط اس وقت دنیا کا مکمل ترین رسم الخط کہا جا سکتا ہے، اور بحالت موجودہ اُردو عربی جیسی بلیغ اُمّ الالسنہ۔ فارسی جیسی شیریں ومکلّف زبان اور بھاشا جیسی پیاری پراکرت کی علمی وصوتی رعایات سے مرکب ہے) لیکن یہ خوبیاں جو دشواریاں پیدا کررہی ہیں وہ اگر فوائد کی بہ نسبت زیادہ اہم ہیں تو ہمیں ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے کہ ہم کس قیمت پر اپنے رسم الخط کو آسان بنا کر اُسے آیندہ حملوں سے محفوظ بنا سکتے ہیں۔ مثلًا مختصر نویسی نے اُردو کا ٹائپ آج تک مکمل نہیں ہونے دیا، اس کے حرفی وصوتی امتیاز السنہ کے باعث املا کی مشکلات عربی۔ فارسی کی کافی استعداد کے بغیر رفع نہیں ہو سکتیں، اور یہ استعداد نہ زیادہ عام ہے اور نہ کوئی روشِ مستقبل رکھتی ہے۔ انھیں مشکلات کی وجہ سے اُردو کی ترقی اس قدر محدود ہو گئی ہے کہ اُسے حاصل کرنے کا حوصلہ اکثر بھائیوں کے دلوں میں پیدا ہو ہو کر رہ جاتا ہے۔ مختلف قوموں اور فرقوں کی مسموم ذہنیت کی وجہ سے ہماری حالت کیسی یاس انگیز کیوں نہ ہو پھر بھی کوئی وجہ نہیں کہ زبان کی دلکشی کے ساتھ ساتھ رسم الخط کو سہل الحصول بنا کر اُسے قسمت آزمائی کا موقعہ نہ دیا جائے۔ اس کے علاوہ وقت ومحنت کی بچت بھی جو آسان رسم الخط کا لازمی نتیجہ ہوگی کسی طرح نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہے۔ بہرحال ذیل میں اُردو رسم الخط کو سہل الحصول بنانے کی چند تجاویز اہل الرائے اصحاب کے غور وفکر کے لئے پیش کی جاتی ہیں:۔

(۱) رسم الخط کو آسان بنانے کے لئے چند عربی تراکیب قطعی ترک کردی جائیں۔ قواعد جمع کے علاوہ عربی عطف واضافت کے قبول کرنے میں بھی اعتدال برتا جائے۔ مثلًا الف۔ لام کے ساتھ قمری و شمسی حروف کا امتیاز قابل ترک ہے۔ جیسے الشمس۔ کالقمر۔ یا بالفعل۔ بالکل۔ بالمرّہ۔ بالارادہ وغیرہ جن میں الف اور لام دونوں یا صرف الف آواز نہیں دیتا اس لئے املا میں بھی نہیں آنا چاہیئے کیونکہ الفاظ کے قرین الصوت نہ ہونے کی وجہ سے املا میں مشکلات ہوتی ہیں

(۲) خالص عربی حروف جن کے قریب المخرج حروف موجود ہوں اُردو کے حروف تہجی سے خارج کر دیئے جائیں۔ الف و ہمزہ کی موجودگی میں "ع"۔ ت کی موجودگی میں "ط"۔ س کی موجودگی میں "ث" اور "ص" "ہائے ہوز کی موجودگی میں ہائے حطی"۔ ز کی موجودگی میں "ذ" "ض" اور "ظ" بلحاظ سہولت املا قابلِ اخراج ہیں۔ اس کے بعد اُردو کے حروف تہجی ا۔ ب۔ بھ۔ پ۔ پھ۔ ت۔ تھ۔ ٹ۔ ٹھ۔ ج۔ جھ۔ چ۔ چھ۔ خ۔ د۔ دھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ ر۔ ڑ۔ ڑھ۔ ز۔ ژ۔ س۔ ش۔ غ۔ ف۔ ق۔ ک۔ کھ۔ گ۔ گھ۔ ل۔ لھ۔ م۔ مھ۔ ن۔ نھ۔ و۔ ہ۔ ء۔ ی۔ ے۔ رہ جائیں گے۔ جن کا سیکھنا اور ذہن نشین کرنا آسان ہوگا۔ اور اُسی نسبت سے اُردو ٹائپ بھی کامیاب ہو سکے گا۔

(۳) رسم الخط سے مبتدی کو متعارف کرنے کے لئے حروف کی تقسیم قواعد ذیل کے مطابق کیجائے:۔

الف (علحدگی پسند حروف (الف۔ واؤ۔ اور د۔ ر کا خاندان)

اوّل وہ جو کسی لفظ کے شروع یا آخر میں واقع ہونے کی صورت میں آپس میں نہیں ملتے۔

دوسرے وہ جو کسی لفظ کے شروع میں واقع ہونے کی صورت میں دوسرے خاندان والوں (ب) سے نہیں ملتے۔

تیسرے وہ جو کسی لفظ کے آخر میں واقع ہونے کی صورت میں دوسرے خاندان والوں سے مل جاتے ہیں، مگر مختصر و منکسر ہو کر نہیں ملتے۔

چوتھے "ر" اور "د" کے خاندان میں سے "ڑھ"۔ "دھ"۔ "ڈھ" جزواً اشتراک پسند ہیں یعنی ان کا جزو اکثر (ھ) اپنے آگے کے حروف میں مل جاتا ہے۔

ب۔ اشتراک و انکسار پسند حروف (بقیہ تمام حروف باستثناء ہمزہ)

اوّل وہ جو سب سے کھل مل جاتے ہیں۔

دوسرے وہ جو مختصر و منکسر ہو کر ملتے ہیں

تیسرے وہ جو لفظ کے آخر میں آنے کی صورت میں پورے بنائے جاتے ہیں۔

چوتھے ہائے مخلوط والے حروف جو خود ہی مختصر شکل میں ہونے کی وجہ سے ملنے کی صورت میں مختصر تر نہیں ہوتے۔

ج۔ مختصر ہو کر ملنے والے حروف کی تقسیم:۔

(۱) ب۔ پ۔ ت۔ ٹ۔ ن۔ ی اور ہائے ہوز (اگر لفظ کے ابتدا یا آخر میں واقع ہو) کیلئے صرف ایک دندانہ بنایا جاتا ہے۔ اور نقطوں یا شوشوں سے امتیاز قائم رکھا جاتا ہے۔

(۲) بقیہ حروف اپنے نصف بہتر (سر و سینہ) کے ساتھ اشتراک عمل کرتے ہیں۔

(۳) ہائے ہوز جب لفظوں کے درمیان میں آتی ہے تو اُس کی صورت خاص ہوتی ہے یعنی بجائے دندانہ بنانے کے ایک خوشنما سا نیچے کو نکالا جاتا ہے۔

(۴) "غ" جب لفظ کے آخر یا درمیان میں آتا ہے اور اُس کی صورت خاص ہوتی ہے تو بجائے اُس کا سر بنانے کے ایک خوشنما سا اوپر کو نکالا جاتا ہے۔

(۵) "ک" یا "گ" جب الف یا لام کے ساتھ ملتا ہے تو اُس کی صورت خاص ہوتی ہے یعنی بجائے اُس کا سر بنانے کے ایک دائرہ سا بنا کر اوپر مرکز لگا دیتے ہیں۔

د۔ ہمزہ کا استعمال اور اُس کی خصوصیت:۔

ہمزہ کا استعمال صرف درمیان لفظ میں ہوگا۔ وہاں یہ بجائے عین کے کام دیگا اور اپنی ہیئت برقرار رکھے گا۔ یہ حرف کسی دیگر حرف میں نہیں ملایا جاتا جب درمیانی حرف کے پہلے عین یا الف سے متصل آواز پیدا کرنی ہو اُس کے اوپر ہمزہ بنایا جاتا ہے۔

(۴)۔ اعراب۔ جو الفاظ زیادہ عام نہ ہوں یا جن کا تلفظ مشکل ہو اُن پر اعراب (زیر۔ زبر۔ پیش۔ جزم۔ تشدید) ضرور لگا دیے جائیں فتحتین و کسرتین و ضمتین کے بجائے الف ہٹا کر نون لگایا جائے جیسے "فوراً" کے بجائے "فورن" لکھا جائے۔

(۵) استثنا۔ اِن قواعد کا اطلاق ہماری زبان کے مستعملہ عربی الفاظ پر ہوگا۔ جیسے اب مروجہ شکل میں لکھا جایا کرے گا لیکن اگر آیات قرآنی وغیرہ نقل کرنی ہوں یا غیر معروف عربی الفاظ تحریر کرنے کی ضرورت آپڑے تو اُن کا املا علیٰ حالہ لکھا جا سکے گا۔

میں نے ایک خاکہ پیش کر دیا ہے۔ اب بشرط قبول اس کی ترتیب و تکمیل و تنظیم اور مناسب رنگ آمیزی یا کمی بیشی مجھ سے بہتر لوگوں کا کام ہوگا۔

ستارۂ سحری

(از منشی کرشن سہائے نبکاری وحشی)

شبِ فراق کی تاثیر دیکھنے والے جگر کے داغ کی تنویر دیکھنے والے
نیازِ عشق کی تصویر دیکھنے والے ادائے حسن کی شمشیر دیکھنے والے
سحر کو رات کی دلچسپیوں کا خواب نہ دیکھ
ستارۂ سحری منظرِ شباب نہ دیکھ

ابھی نظر میں تری رات کا فسانہ ہے تری نگہ کا ابھی طرز والہانہ ہے
سنبھل سنبھل یہ ترے کوچ کا زمانہ ہے رہینِ ملکِ عدم تیرا آب ودانہ ہے
خمارِ بادۂ شب کی جو سرگرانی ہے
تری حیات کی یہ آخری نشانی ہے

جبینِ صبح پہ یوں ٹمٹما رہا ہے تو چراغِ زیست کا گویا بجھا رہا ہے تو
جھلک جو دور سے اپنی دکھا رہا ہے تو بتا تو کچھ کہ کہاں آہ جا رہا ہے تو
ٹھہر ٹھہر کہ ترا ہمرکاب میں بھی ہوں
شبابِ رفتہ کی تعبیرِ خواب میں بھی ہوں

نہ چھوڑ ساتھ ترا غمگسار ہوں میں بھی تری ہی راہ کا آخر غبار ہوں میں بھی
خزاں رسیدہ چمن کی بہار ہوں میں بھی ٹھہر! کہ دوشِ فنا پر سوار ہوں میں بھی
فریب خوردۂ رنگِ حیات میں بھی ہوں
ہزار میں تیری طرح بے ثبات میں بھی ہوں

سمجھ سکا نہ تو اپنی حیات کا مفہوم جز اس قدر کہ ہے اک نقشِ ہستیِ موہوم
جو تجھ کو غور سے دیکھا تو یہ ہوا معلوم کہ صبح تک تری آنکھوں سے نور تھا معدوم
خبر نہ تھی تری ہستی کو یوں مٹائے گی
شعاعِ مہر تری موت بن کے آئے گی

تمام رات غریبوں کا غمگسار رہا — ستم رسیدۂ ہجراں کا سوگوار رہا
سیاہ خانۂ ظلمت میں جلوہ بار رہا — دلوں کا صبر نگاہوں کا تو قرار رہا
ٹھہر ٹھہر کہ ترا شکریہ ادا کرلوں
ترے خلوص پہ میں جان و دل فدا کرلوں

عروسِ لیلیٔ شب کی تو ہی نگاہ بنا — بشر کے نیک و بد اعمال کا گواہ بنا
بلاکشانِ محبت کا خضرِ راہ بنا — دلوں میں دردِ تمنا لبوں پہ آہ بنا
نہ ایک پل کو بھی دل میں ترے قرار رہا
یونہی تو مرکبِ شبرنگ پر سوار رہا

سما کے حسن کی نظروں میں تو غرور بنا — پلٹ کے میکدۂ عشق میں سرور بنا
توہی تو دیدۂ موسیٰ کا پہلے نور بنا — پھر اور بڑھ کے تجلائے برقِ طور بنا
تو ایک بحر تھا چشمِ حباب میں پنہاں
تو ایک مہر تھا ذرہ کی شکل میں تاباں

نہ شامِ غم ہے نہ وہ چشمِ انتظار ہے اب — نہ حسن و عشق کی دنیا کے کاروبار ہے اب
نہ خاکِ شمع نہ پروانے کا غبار ہے اب — تو ہی بس اک شبِ ہجراں کی یادگار ہے اب
ٹھہر ٹھہر ترا دیدارِ آخری کرلوں
ترے جمال سے ہر گوشۂ نظر بھرلوں

شبِ فراق کے منظر کو روشنی دیکر — جہانِ تیرہ کو لمعاتِ عاشقی دے کر
فسردہ کلیوں کو پیغامِ زندگی دیکر — بقا کے راز سے دنیا کو آگہی دے کر
ہزار شوق سے آغوشِ خور میں آنے کو
چلا ہے قطرہ سمندر میں ڈوب جانے کو

دنیا اور مطلب

آزمالیں طبیعتیں سب کی — ساری دنیا ہے اپنے مطلب کی

(حضرت محشر لکھنوی)

یوُرپ کے سیاسی اُصول

(ایک "سوراجی" کے قلم سے)

اُنیسویں صدی سے پہلے ممالک فرنگ بھی ایشیا کے ملکوں کی طرح خود مختار بادشاہوں کے زیر حکومت تھے۔ یہ بادشاہ کبھی صلح و آشتی کرکے ایک دوسرے کے یہاں شادی بیاہ کرکے اپنے خاندانوں کو تقویت دیتے تھے کبھی جنگ و جدل کرکے خون کی ندیاں بہاتے تھے، مگر دونوں صورتوں میں رعایا کو سیاسی معاملات پر کوئی قدرت حاصل نہ تھی، بادشاہ کو اختیار تھا کہ وہ اپنی سلطنت کا کوئی حصہ اپنی بیٹی کے جہیز میں دیکر اپنی رعایا کے ایک حصہ کو بغیر اُس کی مرضی کے دوسری سلطنت میں منتقل کردے، یا دوسرے بادشاہ کو شکست دیکر اُس کی سلطنت کا کوئی حصہ اپنی حکومت میں شامل کرلے۔ سلطنت بادشاہ کی ملکیت تھی۔ رعایا کو نہ سلطنت کے کاروبار میں کوئی دخل تھا نہ انتقال کے خلاف آواز بلند کرنے کا کوئی حق۔ اٹلی کے کئی صوبوں پر صدیوں تک اسپین اور آسٹریا کے حکمران خاندان حاکم رہے۔ ہالینڈ اور بلجیم کا بھی یہی حال تھا۔ پولینڈ کو روس، آسٹریا اور پرشیا نے فتح کرکے اس کے حصے بخرے کرلئے تھے اور ان درباروں میں پولش قوم کی فریاد کی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ نہ قومیت کے جذبہ کا احساس تھا نہ جمہور کے حقوق کا کوئی خیال تھا۔

دو ملک البتہ اس عام روش سے مستثنیٰ تھے، سوئٹزرلینڈ کے باشندوں نے ازمنۂ وسطیٰ میں اپنے بادشاہوں کے خلاف بلوہ کرکے آزادی حاصل کرلی تھی اور اپنی سلطنت اصول جمہوری پر قائم کرلی تھی۔ اسی طرح جزیرہ ہونے کی وجہ سے انگلستان کو یورپ کے جھگڑوں سے یک گونہ مفر حاصل تھی اور انگریزوں نے سترھویں صدی میں ایک بادشاہ کا سر کاٹ کر اور دوسرے کو تخت سے اتار کے قومی آزادی اور جمہوری سلطنت کی بنا ڈالی تھی اور باوجود ترقی اور تغیر کے انگلستان میں آج بھی یہی سیاسی اصول رائج ہیں۔ انگلستان کا ذکر کرتے ہوئے ایک نکتہ خیال میں آتا ہے جس کا ذکر شاید بے محل نہ ہو۔ انگریزوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جب سوچ بچار کر ایک سیاسی اصول قائم کرلیتے ہیں تو پھر اس سے ہٹتے نہیں، چاہے ان کو کیسی ہی صعوبت برداشت کرنی پڑے اور کتنی بڑی قربانی کیوں نہ کرنی پڑے۔ چار سو برس سے انگلستان کا ایک اصول یہ رہا ہے کہ اُن کے ملک کے سامنے

انگلش چینل (English Channel) کے اُس پار کا ساحل کسی زبردست اور قوی سلطنت کے ہاتھ میں نہ رہے۔ کیونکہ انگلستان خود اس ساحل کی زد میں ہے۔ براعظم فرنگ کے اس حصہ کا نام کبھی فلینڈرس تھا اور اب بلجیم ہے۔ چنانچہ سولھویں صدی سے لیکر آج تک جب کوئی زبردست قوت اس ملک پر قابض ہوئی تو انگلستان نے اٹھ کر اُس کو وہاں سے ضرور ہٹایا۔ سولھویں صدی میں اسپین کا بادشاہ فلپ دوم، سترھویں صدی میں فرانس کا بادشاہ لوئی چہاردہم، اور اٹھارھویں صدی کے آخری حصہ میں نپولین اور بیسویں صدی میں جرمنی کا شہنشاہ قیصر ولیم سب انگلستان کی اس پالیسی کے ارو میں آئے اور ہر ایک کو نیچا دیکھنا پڑا۔ اس ایک مثال سے انگریزوں کی دُور اندیشی اور اُن کی پالیسی کا استقلال بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا کہنا یہ تھا کہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں جب فرانس کا مشہور و معروف انقلاب (جو فرنگی تاریخ میں French Revolution کہلاتا ہے) ظہور پذیر ہوا اس وقت سے فرنگ کی سیاسی کیفیت میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی، اور انیسویں صدی میں دو نئے اصول کام کرنے لگے، ایک کا نام ہے قومیت (یعنی Nationality) کا اصول، اور دوسرے کا نام ہے جمہوریت (Democracy) کا اصول۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں یہ دونوں اصول انگلستان کی سیاست میں پہلے سے موجود تھے انیسویں صدی میں وہ سارے فرنگستان پر چھا گئے۔ پہلے اصول کے ماتحت ان قوموں نے آزادی کی جدوجہد شروع کی جو کسی دوسری قوم کے زیر حکومت تھیں، اٹلی نے آسٹریا والوں کو نکال دیا، ہنگری نے بلوہ کرکے اپنی قومیت الگ قائم کی۔ یونانی اور دوسری عیسائی قوموں نے ٹرکی کی حکومت سے اپنے تئیں آزاد کر لیا۔ جنگ عظیم کے بعد پولینڈ کی سلطنت از سر نو قائم کی گئی، اور آئرلینڈ والوں نے آئرش فری اسٹیٹ قائم کرکے اپنے جذبات قومی کا اظہار کیا دوسری بات یہ ہوئی کہ بادشاہوں کے اختیارات کو محدود کرکے سیاسی معاملات میں رعایا کو قدرت اور قابو حاصل ہونے لگا، اور شخصی حکومت کی جگہ جمہوری یا پارلیمنٹری گورنمنٹ قائم ہونے لگی یعنی رعایا کو یہ حق حاصل ہوا کہ وہ آزادی سے رائے دیکر اپنے نمایندے منتخب کرے۔ اور یہ نمایندے ایک مجلس میں جمع ہو کر بحث مباحثہ کے بعد ملک اور قوم کے لئے قانون بنا دیں، محاصل تجویز کریں اور سیاسی پالیسی کے راستے نکالیں۔ جن وزراء کے ہاتھ میں عنان سلطنت ہو اُن کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس مجلس کی بڑی تعداد ان پر اعتماد اور اعتبار رکھتی ہو۔ اگر کسی وقت یہ اعتبار اُٹھ جائے تو وزراء پر لازم تھا کہ وہ مستعفی ہو کر سلطنت کے کام سے دست بردار ہو جائیں۔ اس آئین سیاست

میں اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ ظاہر ہے کہ جب رعایا کو آزادی سے رائے دیکر اپنے نمایندے چننے کا حق حاصل ہوگا تو زیادہ تر وہ لوگ چنے جائیں گے جو رعایا کے معتمد ہونگے اور جب حکومت پر ان معتمدین کو قدرت حاصل ہوگی تو ملک اور قوم کے نفع کے خلاف مشکل سے کوئی کام ہو سکے گا مگر اس نظام میں ایک صریح برائی یہ ہے کہ بحث مباحثے میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے جن موقعوں پر ملک کی بہبودی کیلئے اور تدبیر کی کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے کہ جلد سے جلد کام کیا جائے وہاں سہل انگاری اور تساہل سے کام بگڑ جاتا ہے۔ جو باتیں چھپانے کی ہیں وہ غیروں پہ ظاہر ہو جاتی ہیں، اور سیاست کی پالیسی میں رخنے پڑ جاتے ہیں، مگر ان سب کے باوجود یورپ کی اور دنیا کی رائے یہی قرار پائی کہ سلطنت کے جتنے نظام عقل انسانی نے اختراع کئے ہیں اُن میں جمہوری نظام ان کمزوریوں کے باوجود جس کا ذکر اوپر کیا گیا سب سے اچھا ہے، اور اسی رائے پر یورپ ایشیا اور امریکہ والے برابر کام کرتے رہے ہیں۔ ایشیا میں جہاں جہاں سیاسی اصلاح ہوئی چاہے وہ جاپان میں ہو یا ایران میں یا ٹرکی میں، کوشش یہی ہوئی کہ بادشاہ کے اختیارات محدود کر کے جمہوری یا پارلیمنٹری آئین قائم کیا جائے۔

لیکن اب جنگ عظیم کے بعد دنیا کی حالت کچھ بدلتی نظر آتی ہے۔ کئی ملکوں میں جمہوری آئین ساقط ہے اور اس کے بجائے ڈکٹیٹر (Dictator) یعنی ایک مطلق العنان ذی اختیار حاکم کا راج ہے، مثلاً ٹرکی میں مصطفے کمال، اٹلی میں مسولینی اور جرمنی میں ہٹلر۔ ان کے اختیارات نہایت وسیع ہیں، جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور کوئی اُن کو روکنے والا نہیں ہے۔ اس واقعہ سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا اور اس واقعہ کی بنا پر اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اب آئین جمہوری کا زمانہ ختم ہوا اور ایک مرتبہ پھر دنیا میں شخصی حکومت کا رواج ہوگا۔ میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں میرا خیال ہے کہ اس وقت جو تماشا نظر آ رہا ہے وہ خاص اور غیر معمولی اسباب کا نتیجہ ہے اور اس کا قیام مستقل نہیں بلکہ چند روزہ ہے۔ ذرا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مصطفے کمال یا مسولینی کی کامیابی کے راز دو ہیں، اول یہ کہ جس وقت ان کا ظہور ہوا اس وقت ان کی قومیں نہایت پریشانی اور کمزوری کی حالت میں تھیں ان کی اصلاح لازمی تھی اور اصلاح کی کامیابی کے واسطے نہایت ضروری تھا کہ اصلاح کی کارروائی تیزی سے کیجائے، زیادہ بحث مباحثہ کی گنجایش نہ تھی۔ جلدی کام جبھی ہو سکتا ہے جب کل اختیار ایک فرد واحد کے ہاتھ میں ہو، کمیٹیاں اور مجلسیں کبھی جلدی کام نہیں کر سکتیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ٹرکی، اٹلی اور جرمنی کو جو ڈکٹیٹر ملے وہ ایسے ہیں کہ اُن کے

دل ان کی قوم کے خیالات کا آئینہ ہیں، جو سیاسی تدابیر وہ عمل میں لا رہے ہیں، جو سیاسی نظام وہ قائم کر رہے ہیں، وہ تدابیر اور وہ نظام قوم کی بھلائی کے لئے اور قوم کی رائے کے مطابق ہیں، جو باتیں قوم چاہتی تھی وہی ان حاکموں کے ہاتھ سے وقوع میں آ رہی ہیں اور تیزی اور کامیابی کے ساتھ وقوع میں آ رہی ہیں۔ لہذا ہر ایک ڈکٹیٹر کی قوم اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ مخالف بھی ہیں مگر معدودے چند جن کا کچھ زور نہیں چلتا۔ مگر یہ کیفیت چند روزہ اور محض معمولی ہے جس طرح ڈاکٹر ملیریا بخار کے واسطے کونین کھلاتے ہیں، کونین دوا ہے اور ملیریا بخار کو دور کرتی ہے مگر روزمرہ کی غذا نہیں بن سکتی۔ اسی طرح ڈکٹیٹر بھی خاص وقت اور خاص موقعہ کے لئے ہیں، جب یہ اپنا کام ختم کر لیں گے تو پھر جمہوری آئین کا اعادہ ہوگا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ انسانوں کا کوئی شائستہ گروہ جس میں قومیت اور آزادی کا احساس پیدا ہو چکا ہے جو جمہوریت کا مزا چکھ چکی ہے وہ ہمیشہ کے لئے اس آئین سے دست بردار ہو جائے اور اپنی قسمت کو مستقل طور پر کسی ایک حاکم یا بادشاہ کے ہاتھ میں دیدے اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ کوئی قوم اپنے یہاں قابل ایماندار اور خیر خواہ قوم ڈکٹیٹروں کا سلسلہ قائم کر سکے۔ شاہی خاندان اسی وجہ سے تباہ ہوئے کہ بانی خاندان کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو دو تین پشت کے بعد اس کے خاندان سے قابلیت مفقود ہو گئی اور کاہل نالائق اور عیش پسند اولاد نے بزرگوں کی میراث کھودی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مسولینی کے بعد ایسا ہی دوسرا ڈکٹیٹر اٹلی کو ملجائیگا یا ہٹلر کے بعد جو جرمنی کا حکمران ہوگا اُسکا دل بھی اسی طرح جرمن قوم کے خیالات اور جذبات کا آئینہ ہوگا۔ اور وہ اپنے اختیارات کو قوم ہی کے نفع کے واسطے استعمال کرے گا۔ آخر ڈکٹیٹر اس سے پہلے بھی تو ہو رہے ہیں، نپولین کے بعد فرانس نے اس اصول کو خیرباد کہہ دیا۔ کرامول کے بعد انگلستان نے چارلس دوم کو مدعو کیا۔ تاریخ بھی اسی بات کی شہادت دیتی ہے کہ کبھی کبھی اقوام دنیا کے لئے ڈکٹیٹر کی حکومت قومی بہبودی اور فلاح کے لئے ضروری معلوم ہوتی ہے مگر یہ نظام عارضی ہوتا ہے اور ایک نسل سے زیادہ قائم نہیں رہتا قیاس یہی چاہتا ہے کہ زمانہ حال میں جن ممالک نے ڈکٹیٹروں کی حکومت کو قبول کیا ہے وہ ان کے بعد پھر کسی نہ کسی شکل میں جمہوری نظام کو اپنے یہاں قائم کریں اور رعایا کو پھر سوراج کا حق حاصل ہو۔

رات کی رانی

(لیڈی آف دی نائٹ)

(از حضرت محشر لکھنوی)

رات کی رانی ہے گلشن میں عروسِ نوبہار — سبز جوڑا پہنے بیٹھی ہے میانِ لالہ زار
نام ہے مشہور انگریزی میں لیڈی آف دی نائٹ — لمبی لمبی پتیوں سے ہے سراپا سبزہ زار
دستِ قدرت کا بنایا عطرداں کہیے جنھیں — چھوٹے چھوٹے پھولوں کے گچھے میانِ شاخسار
پرتوِ مہتاب سے ہنگامِ شب کھلتے ہیں پھول — کوسوں لے جاتی ہے خوشبو کو ہوائے عطر بار
جس قدر گرمی پڑے اتنی ہی خوشبو تیز ہو — باعثِ جمعیتِ خاطر ہے زورِ انتشار
سانس لیتے ہی دماغِ جاں معطر ہو گیا — بے قراروں کے دلوں کو آگیا صبر و قرار
ترک کر کے عشقِ گل کا عندلیبانِ چمن — ہو رہے ہیں "رات کی رانی" پہ سو دل سے نثار
بس گئے اجزا ہوا کے دورِ گلشن بس گیا — شام ہوتے ہی کھلے یوں نافۂ مشکِ تتار
باغبانوں نے لگایا جس جگہ اس کا درخت — اس زمیں کے ذرہ ذرہ سے ابل آئی بہار
رات بھر کیا کیا مہک ہے اور دن بھر کچھ نہیں — اس طلسمِ حیرت افزا پہ شمیمِ گل نثار
چشم بد دور اس قدر ہے حسنِ ذاتی کا عروج — رات کو مہتاب دن کو آفتاب آئینہ دار

محشر آنکھیں کہتی ہیں ہر وقت دیکھا کیجئے
دن کو حد کی سادگی اور رات کو سو سو سنگار

رُباعی

(حضرت رواں اُناؤی مرحوم)

آئینہ صفت ضمیر حیرانی دے — صدقے ہو خرد جس پہ وہ نادانی دے
ہر چیز کی ماہیت بدل دے لیکن — اس قلبِ پریشاں کو پریشانی دے

اُردو شاعری پر ایک نظر

(از مسٹر اختر عرفانی، بی۔ اے (الہ آباد یونیورسٹی)

اس میں شک نہیں کہ موجودہ تمدنی اور اخلاقی نقطہ نظر سے اُردو کی قدیم شاعری میں متعدد نقائص موجود ہیں، جن کی اصلاح جدید ذہنیت کے لوگ خود کر رہے ہیں۔ لیکن اکثر ارباب قلم تنقید کرتے وقت موجودہ اہل سخن کو ان معائب کی اصلاح کی جانب توجہ دلانے کے بجائے قدماء کے کلام پر غیر ضروری اعتراضات کا انبار لگا دیتے ہیں۔ جو اصول تنقید کے منافی اور انصاف کے خلاف ہے۔

کسی دور کے ادب کو اچھی طرح سمجھنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اُس زمانہ کی معاشی زندگی اور اس کی ذہنیت کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ کیونکہ ادب ہی زندگی کا وہ شعبہ ہے جس میں فطرت انسانی کا عکس نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی فطرت ہمیشہ گرد و پیش کے حالات اور واقعات سے متاثر ہوتی رہی ہے انسان کے انداز خیال، طرق معاشرت۔ میلان طبع، اخلاق و عادات اور جذبات و احساسات غرض سبھی پہلوؤں پر ماحول کا اثر پڑتا ہے۔ جذبات و احساسات سرشت انسانی میں کسی محدود رنگ اور مخصوص انداز کے ماتحت نہیں ہوتے، بلکہ ان پر ماحول کا خاموش اور ناگزیر اثر پڑتا رہتا ہے۔ انقلاب و کشمکش قدرت کا ازلی قانون ہے، اس لئے دنیا کا کوئی ذرہ ایک حالت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک سیکڑوں دور گذر چکے ہیں۔ تمدن و سیاست۔ اخلاق۔ علوم و فنون۔ غرض حیات انسانی کا ہر پہلو تغیر پذیر ہے۔ شاعر کے حساس دل پر وہی شے اثر کرتی ہے جس میں زمانی اور مکانی حیثیت سے کوئی نہ کوئی خصوصیت ہو۔ اور وہ قوت جو اس اثر پذیری کو کاٹ چھانٹ کر رنگین دلپسندیدہ صورت میں نظر عام کے سامنے لاکر رکھ دیتی ہے وہی آرٹسٹ کا جذبہ یا اُس کا احساس یا جدت طبع کہلاتی ہے۔ چونکہ ہر زمانہ میں شاعر یا کسی فن لطیف کے آرٹسٹ کی ذہنیت کی تعمیر و تزئین کی ذمہ داری زیادہ تر اس کے ماحول پر ہے اس لئے جس دور کا جیسا مذاق ہوتا ہے اُس کی ادبیات میں بھی اُسی قسم کے جذبات و خیالات نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس بنا پر کسی شاعر کے کلام پر تنقید کرنے والے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اُس نے کس ماحول میں پرورش پائی ہے، اس کے گرد و پیش کے کیا حالات تھے۔ اس کے وقت میں عام طبائع کا رجحان کس طرف تھا سوسائٹی کا مذاق کیا تھا تعلیم و تربیت کا کیا اصول تھا [illegible]

زمانہ کا سطح نظر کس حد تک بلند تھا۔ جو زمانہ اُس نے پایا تھا وہ امن و سکون کا زمانہ تھا یا ہیجان و انتشار کا۔ جس ملک کا وہ باشندہ تھا اُس کی قدرتی خصوصیات کیا تھیں، وہ صحرائے عرب کی طرح ویران تھا یا چمن زار ایران کی طرح جنت نگاہ۔ خود اُس کی ذاتی حالت کیسی تھی، دولتمند تھا یا مفلس اُس کی طبیعت کیسی واقع ہوئی تھی، آسودہ حال تھا یا پریشان خاطر و فکرمند۔ غرض ان تمام نکات کو ملحوظ رکھکر کسی شاعر کے متعلق یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے زمانہ کے ادبی معیار کی رو سے بارگاہ شاعری میں کیا پایہ رکھتا ہے۔

اس سے بڑھکر ناانصافی اور کیا ہوگی کہ گذشتہ دور کے کسی شاعر کے کلام پر موجودہ مذاق کے نقطۂ نگاہ سے نقد و تبصرہ کیا جائے۔ کیونکہ کسی شاعر کا کلام صحیفۂ ربانی نہیں کہ وہ آئندہ تمام ضروریات پر حاوی ہو، اور ہر مذاق اُس سے ہمیشہ لطف اندوز ہوتا رہے۔ یہ کسی مخصوص شاعر کی وسیع النظری پر منحصر ہے کہ اُس کے کلام میں عالمگیر دلچسپی ہو۔ لیکن ہمیشہ اور ہر ایک کے ساتھ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ جامعیت کسی عام اصول پر قائم نہیں کی جا سکتی، اور نہ کسی انسان کو میسر ہو سکتی ہے۔ دنیا روز بروز ترقی کر رہی ہے اور ہر ایک نفس میں انسانی دماغ میں تغیرات و تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، صحیفۂ عالم کا ہر ورق نقشہائے گوناگوں کا مرقع ہے۔ اس اختلاف و تغیر کے ساتھ ساتھ شاعر کا انداز خیال اور نقطۂ نظر بھی بدلتا رہتا ہے اگر اُس نے باجبروت قوموں کو چشم زدن میں مٹتے دیکھا ہے تو اُس کے دل میں دنیا کی بے ثباتی کا خیال پیدا ہونا ضروری ہے۔ اگر اُس نے گہوارۂ راحت میں پرورش پائی ہے تو اُس کی گویائی مسرت و دلآویزی کے جذبات لئے ہوئے ہوگی۔ اسی اصول کی بنا پر ہر دور کا شاعرانہ مذاق جداگانہ ہوتا ہے، اور ایک ہی زمانے کے مختلف شعراء کے مذاق میں بھی اکثر باہمی تنوع اور اختلاف پایا جاتا ہے۔

اگر کسی قوم و ملک کی ادبیات کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے وہاں کی تاریخ کی ورق گردانی ضروری ہے تو اردو کی قدیم شاعری کو دیکھیے کہ اُس نے کس فضا میں پرورش پائی۔ سلطنت تباہ ہو رہی تھی۔ سیاسی اقتدار کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ افق حیات پر تاریک گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ قومی روح مردہ ہو چکی تھی، دل جوش سے خالی اور آنکھیں سرور سے محروم ہو گئی تھیں۔ دماغ سے نشۂ حکومت اتر رہا تھا۔ اطمینان قلب مفقود تھا۔ دنیا کی بے ثباتی پیش نظر تھی۔ علم کی توسیع و ترقی کا کوئی سامان میسر نہ تھا، معاشرت میں بھی ابتذال ہو گیا تھا۔ سوسائٹی کا مذاق پستی کی طرف مائل تھا۔ قوائے عمل نہ صرف مضمحل بلکہ معطل ہو چکے تھے۔ زندگی کی کشاکش سے طبیعتیں اکتا چکی تھیں اور ایک ایسے کنج عافیت کی تلاش تھی جو مادی ہنگاموں کے دار و گیر سے آزاد ہو۔ ہر بشر کی زبان سے غیر ارادی طور پر یہی صدا بلند تھی۔

"اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلاب گریہ در پئے دیوار و در ہے آج" (غالب)

اِن حالات میں کیا تعجب ہے اگر ہمارے شعرا کی زبان سے زیادہ تر یاس وغم کے جذبات ادا ہوئے اور اُنھوں نے عالم مادّی کے دلفریب مناظر میں کوئی دلآویزی محسوس نہ کی۔ اور صحیفۂ فطرت کے حقائق و نکات کو منکشف نہ کر سکے۔ یہ حقیقت کا صرف ایک پہلو ہے، اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ قدیم اُردو شاعری کے خط وخال کی اور بھی کیا خصوصیتیں ہیں۔

قدیم شاعر ادب اور سخن کی طرف اس لئے مائل نہیں ہوتا تھا کہ اُس کا حساس دل فطری طور پر جذبات کی ترجمانی پر مجبور تھا بلکہ اکثر وہ ضرورتاً شاعر ہوتا تھا۔ شاعری تہذیب وتمدن اور سوسائٹی کے اعتبار سے ایک مستحسن چیز سمجھی جاتی تھی۔ غزل گوئی کا مذاق عوام میں پھیلا ہوا تھا جس کے بغیر قبول عام کا شرف حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔ اس لئے جو شاعر کہلانا چاہتا تھا اُس کے لئے پسند عام کے لحاظ سے ایک فرضی محبوب کی تلاش ضروری تھی اس کے بغیر اس کی طرف کوئی توجہ نہ ہوتی تھی۔ خودنمائی اور خودستائی انسانیت کا ایک تعمیری عنصر ہے۔ اُردو شعرا کا غزل گوئی کی طرف متوجہ ہونے کا بھی یہی سبب ہوا۔

عیش ومسرت کی حالت میں لطیف حزن وملال مزہ دیتا ہے، اس سے روح کو بالیدگی ہوتی ہے چنانچہ شعرا نے عیش وسکون پسند ماحول میں حزن ویاس کے نغمے سنانا شروع کئے، اور شراب وکباب کی محفلوں میں زورِ کلام اور تاثیر کے عجیب ورنگین پہلو لانے کی کوشش شاعری کی کامیابی کا ذریعہ بن گئی اور اسی اصول کی بنا پر قدیم اُردو شاعری بھی شاہراہ زندگی پر گامزن رہی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر ہٹے کٹے لوگ آپ کے سامنے کچھ کھیل تماشے دکھلاتے ہیں جیسے اپنے بازو میں چھری بھونک لینا یا زبان سے لوہے کی سلاخ کو پار کر لینا وغیرہ، اس سے ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کے احساسات پر اثر ڈال کر اپنی معاش کی صورت نکالیں۔ یہی حالت قدیم شاعر کی ہے کہ وہ ظلم وستم، بیکسی وحرماں نصیبی کی موثر تصویر کھینچتا ہے، عیش وطرب کے ماحول میں خراج تحسین حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ اُسکی معاشی زندگی کا انحصار اُس کی اسی کامیابی پر مبنی تھا۔ کامیابی کا اثر اس کی شاعری پر بھی کافی پڑتا تھا۔ بقول غالب:۔

"بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے!"

بہ حال قدیم شاعر کی ذہنیت نے زمان ومکان کے اثرات کے ماتحت ایک مخصوص شکل اختیار

کرلی تھی، اس کا عروج وزوال کا معیار بھی اسی دائرے میں محدود تھا، کیونکہ مروجہ معیار کی تراش وخراش اور اُس کی بوقلمونی شاعری کی مرادف سمجھی جاتی تھی۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ قدما میں صاحبِ دماغ اور جدت آفریں شعرا موجود نہ تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُن حدود کے اندر اندر رہ کر انھوں نے ایسے ایسے بلند مراتب حاصل کیے کہ باید وشاید۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر غالب اس زمانے میں زندہ ہوتا تو وہ بھی سیاسی اور قومی میدانوں میں کسی سے پیچھے نہ رہتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ ماننا پڑے گا کہ آج ملک میں جو قومی اور سیاسی احساس پیدا کرنا مقصود ہے اُسے میرؔ اور غالبؔ کے عاشقانہ ترانے مشتعل نہیں کرسکتے۔ لیکن کیا صرف اسی بنا پر کہ اُن کے رشحاتِ قلم موجودہ ذوق کی تشنگی کو سیراب نہیں کرسکتے، اُن کی شاعرانہ لطافت آفرینیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا قرینِ انصاف ہوگا؟ کیا ہمارے قدیم شاعر اپنے وقت کی دلفریبیوں میں رہ کر ہندوستان کے موجودہ دَور کا کوئی اندازہ کرسکتے تھے؟ کیا انھیں اس کا شائبہ بھی ہوسکتا تھا کہ ملک کا مذاق اس درجہ بدل جائے گا کہ کوئی شخص اُن کا نغمہ سننے کے لیے آمادہ نہ ہوگا۔ قدما نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی وقتی ضروریات کے بموجب لکھا ہم اُس پر کوئی ملامتی ووٹ نہیں پاس کرسکتے۔ البتہ موجودہ حالات وضروریات اور زمانی ومکانی تشکل وصورت کے اعتبار سے جو نقائص قدیم وپامال شاہراہ پر چلنے سے ظہور میں آرہے ہیں اُن کی اصلاح ہم پر اخلاقاً فرض ہے۔ ملک کا ماحول بالکل بدل چکا ہے، غلو اور تصنع کے بجائے سادگی اور حقیقت کی تلاش ہے۔ قومی عزت کا احساس مشتعل ہوچکا ہے۔ ولولۂ عمل جوش پر ہے۔ علمی ترقی نے مطمحِ نظر کو بلند اور وسیع کردیا ہے آجکل زندگی کا معشوق اپنے اندر مختلف النوع خصوصیات رکھتا ہے، اس کے اندر زلف کی درازی، کمر کی عدم موجودگی وغیرہ کے بجائے لطیف خیالات، پاکیزہ جذبات، سائنس وفلسفہ، منطق وحکمت ملک وملت، اخلاق وادب وغیرہ پائی جاتی ہیں۔

کیا آجکل بھی عشق کا دائرۂ اثر صرف "حسن لبِ بام" کی اداشناسی تک محدود رہ سکتا ہے جبکہ ہمارے سامنے سوسائٹی کی آزاد خیالیوں نے حسنِ رہگذر کو کافی بے نقاب کردیا ہو۔ یا شاعر کی گریہ وزاری شمع کی ہمسری ہے۔ جب ہمارے مکانوں میں بجلی کے قمقمے جگمگا رہے ہیں۔ یہ عام خیال پیدا ہوگیا ہے کہ بغیر غزل کے اُردو شاعر شاعر ہی نہیں ہوسکتا، دنیا کا رخ جدھر بھی ہو۔ نظامِ عالم کتنا ہی برہم ہوجائے۔ حیاتِ انسانی کا نقشہ اُلٹ ہی کیوں نہ جائے، ہمارے دل کے حقیقی اور فطری جذبات کا رجحان خواہ کسی جانب کیوں نہ مجبور کررہا ہو لیکن ہمارے شاعر ہیں کہ معشوق کی کمر کی تلاش میں ہی سرگرداں ہیں۔ اس حسنِ تجسس اور وسعتِ نظر پر ہزار آفریں! میرے خیال میں شاعری کی اس سے زیادہ اور کیا توہین ہوسکتی ہے۔

شاعر سوسائٹی کا کوئی عضو معطل نہیں ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ انسانیت اُس سے کیا مانگتی ہے اُس کی قوم اُس سے کس چیز کی طلبگار ہے، خود اُس کی ہستی اُس سے کیا چاہتی ہے۔ وہ اپنے ماحول کے تغیر و تبدل کو اچھی طرح محسوس کرتا ہے۔ پیکار زندگی میں اس کے ہم قوموں کی نبرد آزمائیاں اسکی رجز خوانی کی محتاج ہیں۔ وہ ایک ایسا مطرب ہے جو محفل میں بیگانۂ محفل کے لئے گاتا ہے تو وہ اہل محفل کی تحسین و ستایش سے بے پروا ہوتا ہے، اور اُس کا نغمہ گو اُس کے دل سے نکلتا ہے مگر شورش محفل سے ہم آہنگ ہو کر تمکین و ہوش کا غارت کرنے والا ثابت ہوتا ہے۔

ہر شاعر کے کلام میں ایک خاص رنگ اور ایک مخصوص پیغام نمایاں ہوتا ہے جو اُس کے کل کلام پر حاوی و ساری نظر آتا ہے۔ لیکن یہ تمام اجزا زمان و مکان کی ہم آہنگی، ترتیب و تشکیل کے داخلی اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انسان کی ذہنیت جو جذبات کی ترجمانی کا ایک وسیلہ ہے کلیتاً وہبی نہیں بلکہ اکتسابی ہوتی ہے۔ اکتسابی ان معنوں میں کہ اس ذہنیت کی اجتماعی ہئیت اور اُس کی ساخت ماحول کا نتیجہ ہوتی ہے شاعر کا کلام، اُس کی ذہنیت کا نمونہ ہوتا ہے، اس کی ذہنیت میں اس کے ماحول کا عکس آرا ہونا ضروری ہے، چنانچہ کسی سچے شاعر کا پیغام زمانہ کے نقطۂ نظر سے بے معنی اور بے محل نہیں ہو سکتا ہے درحقیقت شاعر کی ہستی ہمہ گیر ہوتی ہے۔ وہ انسانیت کا مرکز ہے جس کو کائنات کے ہر ذرہ سے تعلق ہے۔ اگر قوم کے انحطاط اور زوال کا زمانہ ہو، قومی زندگی پر سکتہ کی حالت یا جمود کی کیفیت طاری ہو، زندگی کی کشاکش سے عشق و عاشقی کی گنجایش باقی نہ ہو، اور زمانے کے فلسفے اور منطق نے فطرت انسانی سے معشوقیت کے اُن پہلوؤں کو جن کا تعلق جذبۂ "حیوانیت" سے ہے کمزور اور بے ربط کر دیا ہو۔ اور اُس میں مجازی معشوق کی اداکاری سے حقیقی معشوق کے حُسن و لطف کے سمجھنے کی صلاحیت جاتی رہی ہو۔ مگر ایسے وقت میں بھی جو شاعر ایک مخصوص ماحول کو خلق کرنے کی کوشش نہیں کرتا ہے۔ تو ہم اُس کو سچا شاعر نہیں مان سکتے کیونکہ ایسے شخص کے پہلو میں قدرت نے دردمند دل ودیعت نہیں کیا ہے بلکہ اُس نے اپنی ذہنیت کے دھارے کو ایک مخصوص رستے پر کر لیا ہے، جو قلزم حیات سے ہم آغوش ہونے سے پہلے ہی فنا ہو جاتا ہے۔ اُس کی شاعری انسانیت کے لئے سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھ سکتی۔ شاعر صحیفۂ فطرت کا رقم نگار ہے وہ اسرار حیات کا سب سے بڑا محرم ہے، اور اخلاق کا سب سے بڑا معلم، اور واقعات کا سب سے بڑا مبصر ہے۔ اُس کے نزدیک زندگی کا نام ہی اضطراب پیہم ہے۔ شاعری محض تفریح طبع کا سامان نہیں ہوتی بلکہ اپنے اندر ایک خاص مقصد، ایک مستقل کیفیت ایک مخصوص اثر رکھتی ہے۔ اُس کا وجود عالم فطرت کا ایک آئینہ ہے جس میں ماحول کے ہر مؤثر منظر کا عکس پڑنا ضروری ہے۔

ادب کا تعلق زندگی سے بہت مستحکم اور قریب ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے پر اپنا اپنا رنگ چڑھاتی رہتی ہیں۔ ذہنِ انسانی اپنے مذاق و طبع کی تسکین کے لئے ایک نہ ایک جگہ ایسی تلاش کر لیتی ہے جہاں اُس کو سکون اور اطمینان نصیب ہو سکے، اور یہ جبھی ممکن ہے کہ عام ذہنیت کی تشنگی کو طبعی اور فطری طور پر سیراب کیا جائے۔

بہرنوع میرا خیال یہ ہے کہ اس وقت شاعری کے قدیم رنگ سے قطع نظر کر کے واقعیت اور تسلسل خیال کی جانب مائل ہونا چاہیئے۔ قدیم طرز کی تقلید میں بلحاظ فن ایک حد تک موسیقیت اور ندرت کی وقتی دلآویزی موجود ہے۔ لیکن اُن کی تہ میں جو خیالات ہوتے ہیں وہ زمان و مکان کے اعتبار سے اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اس لئے ساری کاوشیں بے نتیجہ اور بے اثر ہوتی ہیں۔ قیس و فرہاد کے افسانے اس قدر دہرائے جا چکے ہیں کہ ان میں اب کوئی دلآویزی باقی نہیں رہی۔ ایک موضوع کے مسلسل بار بار اعادہ سے خیالات کی دنیا بہت تنگ ہو جاتی ہے جس سے رفتہ رفتہ دماغ سے لطافت، بذلہ سنجی اور جدت طرازی کی صلاحیت زائل ہو جاتی ہے۔ اس لئے اب ہمارے شعراء کو اپنے عشق و محبت کی دنیا کو وسیع کرنا چاہیئے اُن کو یہ نکتہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ شاعر کا کام صرف گرمیٔ محفل کا سامان بہم پہونچانا نہیں ہے، بلکہ قدرت نے اس کے فرائض بہت رفیع اور اعلیٰ بنائے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ شاعر قوموں کو زیر و زبر کر سکتا ہے، سلطنتوں کا نقشہ بدل سکتا ہے، غلاموں کو آزاد کر سکتا ہے، رذیل کو شریف، بزدل کو شجاع، مردہ کو زندہ بنا سکتا ہے اور اگر شاعر کے پیشِ نظر کوئی مخصوص مقصدِ حیات نہیں تو اُس کی تمام شاعری ایک سعیٔ لاحاصل ہے۔

ذوقِ تمنّا

(از مسٹر ویسراج سروش لائلپوری)

متاعِ صبر و قرار کھو کر، شبیہہ صد اضطراب کر دے
نگاہِ جاناں اگر کرم ہے تو دل کی دنیا خراب کر دے

خرد کے پُرخار جنگلوں میں عجب نگوں سر بھٹک رہا ہوں
جنوں کے فیضانِ رہبری سے مجھے بھی کچھ بہرہ یاب کر دے

عذابِ دوراں کی جانگزا تلخیوں نے بیزار کر دیا ہے
پلا کے صہبائے بیخودی ہر ملال کا سدِ باب کر دے

سلاسلِ رسمِ عام افراطِ شوق کو تنگ ہو گئے ہیں
مری نگاہوں میں ایک سا رتبۂ گناہ و ثواب کر دے

فریبِ بتخانہ و حرم نے خدا سے کافر بنا دیا ہے
کمالِ وحدت دکھا کے ساری حقیقتیں بے نقاب کر دے

بساطِ ہستی کے ذرّے ذرّے پہ جیسے مرگ آفریں ہے
ترانہ بار سرورِ جاوید زندگی کا رباب کر دے

حضیضِ ذلت میں رشتہ بر پا سروشِ بیکس پڑا ہوا ہے
تو اپنے بندے کو اقتدار و وقار میں لاجواب کر دے

ہندوستان

(از حضرت شاہد صدیقی اکبرآبادی (حیدرآباد دکن)

مرے ہندوستاں وطن پر ایک ایسا دور گذرا ہے	جو اب تک صفحۂ عالم پہ عنوانِ تماشا ہے
کبھی اس انجمن میں رقص ہوتے تھے مسرت کے	نظر آتے تھے ہر جانب نمونے آدمیت کے
کبھی اس باغ کے پھولوں میں خوشبو تھی محبت کی	فضاؤں پر مسلط تھیں بہاریں آدمیت کی
کبھی اس بزم میں جامِ طرب کا دور چلتا تھا	سنبھل کر کوئی گرتا تھا، کوئی گر کر سنبھلتا تھا
کبھی اس بتکدے میں یہ اچھوتا شغل جاری تھا	کہ جو انسان تھا انسانیت ہی کا پجاری تھا

یکایک جانبِ مغرب سے طوفانِ بلا آیا
لباسِ ہوش میں، دیوانگی کا دیوتا آیا

سکھائے ہند والوں کو طریقے خود نمائی کے	بتائے آڑے کہ علم کی گر بے حیائی کے
بدل ڈالا نظامِ کہنہ کو آئینِ جدت سے	دلوں کو رفتہ رفتہ کر دیا خالی محبت سے
بہاریں لوٹ لیں فردوس زارِ آدمیت کی	ملا دیں خاک میں رنگینیاں عہدِ محبت کی
دلوں میں دشمنی کے چند شعلے سے بھڑک اٹھے	نگاہوں سے غضب کے آتشیں جذبے جھلک اٹھے
دماغوں تک محبت کا پیامِ آخریں آیا	کہ چشمِ شاعرِ غمگیں میں اشکِ اولیں آیا

وطن کی شانِ رفتہ خون کے آنسو رلاتی ہے
اسے ہندوستاں کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے

رباعی

(از حضرت رواں مرحوم)

جانداروں میں جو شِ خودکشی کیا معنی	ذروں میں یہ جنگِ باہمی کیا معنی
جب رزم گہِ عام ہے بزمِ ہستی	ہر گام پہ یہ شگفتگی کیا معنی

ہندوؤں میں طلاق کا مسئلہ

(از منشی جگدیشور ناتھ صاحب بیتاب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

کہا جاتا ہے کہ ہندو شاستروں نے رسمِ طلاق کو متروک و مذموم قرار دیا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہاں اس میں شبہ نہیں کہ بالاستثنائے چند تمام سمرتیوں کے مصنفین نے رسم طلاق کی پرزور مخالفت کی ہے، یا کم از کم اس معاملہ میں خاموشی اختیار کرلی ہے جن بزرگوں نے مخالفانہ رویہ اختیار کیا ہے اُن کا لب و لہجہ درشت اور اُن کی اخلاقی کمزوری مضحکہ انگیز ہے۔ عورتوں کو تو اس حق سے بیانگِ دہل محروم کردیا گیا ہے لیکن مردوں پر کسی قسم کی ازدواجی پابندی عائد نہ کرکے کھلے بندوں جنسی تعصب و عدم رواداری کا ثبوت دیا گیا ہے۔

ہندو شاستروں کے مطابق مرد پر کوئی قید نہیں۔ ایک ہی وقت میں چاہے جتنی بیویوں کا شوہر بن سکتا ہے، اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ حسن و شباب کے کسی نئے سرسبز و شاداب چمن پر قابض و دخیل ہونے سے پہلے اپنے پہلے شکار کو اپنے آہنی چنگل سے آزاد کردے۔ مرد کو اس معاملہ میں چونکہ آزادی حاصل ہے اس لئے اُسے حربۂ طلاق کے استعمال کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اور عورت کی لونڈی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں ہے۔ غالباً اپنی مجبوری و معذوری سے وہ پہلے سے خبیث مرد کو خدا سے بھی زیادہ بلند مرتبہ دے چکی ہے

یہ کہنا اخلاقی گناہ ہے کہ چونکہ ہندو مذہب کی نگاہ میں رشتۂ ازدواج ناقابل شکست ہے اور زن و شوہر کے تعلقات دھرم کی چھاپ لگ جانے کے بعد عالمگیر قانونِ موت کے توڑے بھی نہیں ٹوٹ سکتے اس لئے طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ شاستروں میں ایسی کتنی ہی ناگزیر حالتوں کا ذکر موجود ہے جن کے زیر اثر میاں بیوی کے تعلقات مذہباً برقرار نہیں رہ سکتے۔ خود منو (मनु) نے لکھا ہے:۔

कामममामरराात्तिष्टे दगृहे कन्यातु मत्यपि

न चैनां मयच्छेजु गुराा हीनाय कहिचित ।

उन्मत्तं पतितं क्लीबमबीजं पापरोगिराामु

न त्यागोड स्ति द्विषन्त्याश्च न च दायापर्वतनमु ।

ظاہر ہے کہ قانون کی مدد سے صرف انھیں رسوم قبیحہ کی بیخکنی کیجاتی ہے جو کسی عہد اور کسی ملک میں خاص حالات کے تحت بُری اور معیوب بھی پائیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاستر لکھنے والوں نے طلاق کی ممانعت کرکے کم سے کم یہ ضرور ثابت کردیا ہے کہ اُن کے عہد میں یہ رسم کسی نہ کسی رنگ سے ہند میں موجود ضرور تھی، اور یہ بزرگ اُسے حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کے لئے بیقرار تھے "نیچ" ذاتوں میں تو طلاق کا رواج قدیم سے ہے اس سے بھی اس دعوے کی تائید ہوتی ہے

اپنے زمانہ کی پسندیدہ رسموں کی تائید وتلقین اور معیوب رواجوں کی تردید و ممانعت کرنا ہی سمرتی لکھنے والوں کا وطیرہ تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں تک طلاق کا واسطہ ہے ایک خاص وقت میں علمائے دین نے شد و مد کے ساتھ اس کی مخالفت پر کمر کس لی تھی۔ رفتہ رفتہ ان مخالفین کی تعداد میں بہت ترقی ہوگئی حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آگیا کہ لوگ اس سے بالکل برگشتہ و بدظن اور منحرف و متنفر ہوگئے۔ چنانچہ اسی کیفیت کی جھلک سمرتیوں پر بھی پڑی۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ ہند قدیم میں طلاق کا رواج تھا مگر بعد میں خیالات میں تبدیلی ہوئی ہے اسطرح مستقل طور پر آج تک یہ رسم متروک و مسدود نہ ہوسکی۔

نیچ ذاتیں اس زمانہ میں بھی اس پر عامل رہیں۔ شاستروں کی سرتوڑ مخالفت کے باوجود نیچ ذاتوں میں یہ رواج نیست و نابود نہ ہوسکا۔

درحقیقت طلاق کو ہندو قانون و فلسفۂ ازدواج کے خلاف سمجھنا حماقت ہے۔ شاستروں میں ابھی تک ایسے ثبوت و دلائل ملتے ہیں جن سے اس رسم کی قدامت ثابت ہوتی ہے۔ سمرتیوں کے مصنفین میں چانکیہ کا درجہ بہت اونچا اور اُس کا ارتھ شاستر منوسمرتی کے بہت پہلے کی تصنیف ہے، بلکہ منوسمرتی کے ایک اہم جز میں ارتھ شاستر ہی کا عکس نظر آتا ہے۔ لیکن دیگر ابواب میں ان دونوں بزرگوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا ہے۔ مشہور نقاد مسٹر کین کی رائے ہے کہ: "موجودہ منوسمرتی کا محولہ جز ممکن ہے کہ چانکیہ ہی کے زمانہ میں یا اس سے پیشتر تصنیف ہوا ہو۔ لیکن اس کے دیگر حصے بعد کی تصنیف ہیں، اور وہ مزید قطع و برید اور تصرف بیجا کی دست بُرد سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک منوسمرتی میں بے شمار رنگ آمیزی ہوچکی ہے۔

مسٹر کین کی رائے کے مطابق چانکیہ کے ارتھ شاستر کا زمانۂ تصنیف تین سو ق۔م سے لیکر سنہ ۲۰۰ عیسوی تک کا درمیانی وقت ہے۔ اس قدیم تصنیف میں طلاق کی جن لفظوں میں تائید ہوئی ہے وہ یہ ہیں:

" नीचत्वं परदेशं वा प्रस्थिते राज बिल्बिषी ।
प्राणाभिहन्ता पतितस्त्याज्यः किल्बिषोपि वा पतिः ।

آگے چلکر چانکیہ پھر رقمطراز ہے کہ

अमोक्ष्या भर्तुर कामस्य द्विषती भार्या भार्यायाश्च भर्ता।
परस्परं द्वेषान्मोक्षः। अमोक्षो धर्म विवाहानामित ॥"

پہلے اشلوک میں چانکیہ نے عورتوں کو مکمل آزادی دی ہے کہ وہ اپنے شوہر سے قطع تعلق کر سکتی ہیں اگر اُن کا شوہر بدچلن ہو، آوارہ ہو پردیسی ہو گیا ہو۔ باغی ہو۔ نامرد ہو۔ انہیں قتل کر ڈالنے کی دھمکی دیتا ہو یا ذات برادری سے خارج کر دیا گیا ہو۔

چانکیہ شادی کو راحتِ زندگی کا لوازمہ تسلیم کرتا ہے جیسا کہ اُس نے مذکورہ اشلوک میں واضح کر دیا ہے "اگر توسیع نسل انسانی کے فریضہ کی تکمیل میں کوئی امر مانع نہ ہو تو طلاق دینے کی اُس وقت تک اجازت نہیں دی جا سکتی جب تک کہ زن و شو ایک دوسرے سے متنفر نہ ہوں ظاہر ہے کہ خانگی زندگی اُس وقت مرد اور عورت دونوں کے لئے تلخ ہو جاتی ہے جبکہ اُن میں محبت و یگانگت نہ ہو، اور آپس میں ہر وقت کشیدگی رہتی ہو۔ اس سے میاں بیوی کے ساتھ ساتھ اولاد کے اطوار و خصائل بھی بگڑ جاتے ہیں اور اُن کی قدرتی ترقی کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں جس سے نہ صرف سماج۔ سوسائٹی۔ فرقہ یا ملک ہی کا نقصان ہوتا ہے بلکہ بنی نوع انسان کو بھی مجموعی حیثیت سے گزند عظیم پہنچتا ہے جس کی ہرگز اجازت نہ ہونا چاہیئے۔

چانکیہ کے نظریے کے مطابق اگر مرد یا عورت میں سے کوئی ایک دوسرے سے بددل ہو تو طلاق کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہاں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہندو شاستروں نے طلاق کے بارے میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے اور صرف خاص خاص صورتوں ہی میں اس کی اجازت دی ہے۔ اور مردوں کو شرع محمدی کی طرح اس معاملہ میں بالکل آزاد و خود مختار نہیں بنا دیا ہے بلکہ اہم اور دُور اندیشانہ قیود عائد کر کے طلاق کی شہرۂ آفاق تباہ کاریوں کا موقعہ باقی نہیں رکھا ہے۔

بعض مخالفین چانکیہ کے فرمان پر استدلال کرتے ہیں، کہ اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ جو شادیاں شاستر کے مطابق ہوئی ہیں اُن کو دنیا و ما فیہا کی کوئی طاقت توڑنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ جیسا کہ چانکیہ نے دوسرے اشلوک کے آخری ٹکڑے میں کہا ہے۔

ہم معترف ہیں کہ چانکیہ کے یہی الفاظ ہیں جن سے اُس نے زن و شو کو فریقین کا احترام کرنے اور اس پاک رشتہ کی اہمیت کو سمجھنے کی تاکید کی ہے لیکن اگر اس کے یہی معنی لگائے جائیں جو مخالفین کی رائے۔ تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ چانکیہ نے جہاں طلاق کی اجازت دیتے ہوئے ان شرائط کا ذکر کیا ہے جن کی تکمیل

طلاق کو جائز بنانے کے لئے ضروری ہے وہاں شاستر کے مطابق جو شادیاں ہوئی ہیں انھیں اس قانون سے مستثنیٰ کر دیا ہے مگر اس کے معنی یہ ہونگے کہ شاستروں کے عہد میں بھی دو طرح کی شادیاں ہوا کرتی تھیں۔ ایک شاستروں کے مطابق اور دوسری شاستروں کے مخالف۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ شادیاں رچانے میں شاستروں کے احکام کو ٹھکرا دینے کی جسارت کریں گے اُن کے لئے شاستروں کا طلاق کی مختلف صورتوں کا ذکر کرنا اور قانون بنانا سراسر مضحکہ خیز ہے۔

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اشلوک ۲ کے آخری ٹکڑے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ مذکورہ شرائط کے علاوہ طلاق قطعاً ناجائز اور خلاف قانون قرار دیا جائے۔

ارتھ شاستر کے علاوہ ایک اور مقدس کتاب طلاق کی مؤید ہے۔ یہ تصنیف پاراشر سمرتی ہے، جو کلجگ کے رسوم و رواج کے تعین کے لئے تحریر کی گئی ہے۔ اس سمرتی کی اشاعت کیتھ کی رائے میں سنہ ۱۰۰ء سے سنہ ۵۰۰ء تک کسی زمانہ میں ہوئی تھی۔ یاگیہ ولکیہ نے (جو عیسیٰ سے دو سو سے تین سو سال کے بعد کے زمانہ میں ہوئے) اپنی کتاب میں پاراشر سمرتی کا حوالہ دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اصل تصنیف بہت پرانی ہے۔

پاراشر سمرتی میں عورتوں کے عقد ثانی اور طلاق کے بارے میں یہ لکھا ہوا ہے:۔

नष्ट मृत प्रब्रजिते क्लीबे च पतिते पतौ ।
पंचस्वापत्सु नारीणाम् पतिरन्यो विधीयते ॥

نارد اسمرتی میں بھی لکھا ہے کہ "اگر شوہر نامرد ہو تو بیوی طلاق حاصل کر لینے کی مستحق ہے۔"

" त्रीनु ऋतून समीतक्रम्य कन्यायद्वरयेत् वरम् ।

یعنی لڑکی تین مہینے تک انتظار کرے اس کے بعد دوسری شادی کرلے۔ یہاں لڑکی (نارد) سے اگر نا کتخدا مراد ہے تو دوسری شادی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ قیاس کیا جاتا ہے کہ بعد کی کاٹ چھانٹ نے "لڑکی" کے استعمال کو مشکوک کر دیا ہے۔

گوتم بھی متذکرہ مصنفین سے متفق ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہند قدیم میں طلاق کی رسم خلاف مذہب نہیں سمجھی جاتی تھی مگر مخالفین نے اپنے دعوے باطل کی تائید میں ان تمام اشلوکوں کو جو طلاق کی موافقت میں تھے یا تو قطعاً خارج کر دیا یا ان میں حسب دلخواہ ترمیم و تنسیخ کر کے بیٹھ رہے۔ ردو بدل اور تصرف بیجا کی مثال منو کے یہاں ان لفظوں میں نظر آتی ہے:۔

प्रोषितो धर्मकार्याय प्रतीक्ष्याडष्टौ नरः समाः
विद्यार्थं षट् यशोर्थं वा कामार्थं त्रींस्तु वत्सरान् ॥

گوتم اور دوسرے بزرگوں کی بھی یہی رائے ہے کہ وہ عورت جس کا شوہر کسی مذہبی فرض کی ادائیگی کے لئے پردیس گیا ہو آٹھ برس تک اُس کی منتظر رہے۔ اور وہ خاتون جس کا خاوند تحصیل علم کے لئے گھربار چھوڑ گیا ہو چھ سال تک اُس کی واپسی کی راہ دیکھے اور وہ منکوحہ جس کا مالک شہرت و کارگذاری کی طلب میں غریب الوطن ہو تین برس تک اُس کی واپسی کی متمنی رہے۔۔۔۔۔"

تعجب کی بات ہے کہ منو اور اُن کے معتقدین اس کے آگے خاموش ہیں اور یہ نہیں بتاتے کہ مقررہ وقت فراق و انتظار کی کلفتوں میں گذار دینے کے بعد بھی اگر شوہر واپس نہ آئے تو حرماں نصیب عورت کو کیا کرنا چاہیئے۔ ایک دوسری جگہ منو نے مردوں کے لئے بھی انتظار کی ایسی مدت معین کی ہے۔ اور اُن کے اختتام کے بعد اُنھیں دوسری شادی کرنے کی اجازت دیدی ہے۔ ان دونوں تحریروں کا موازنہ کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کو بھی منو نے یہی حق دیدیا تھا۔ مگر منو کے بعد لوگوں نے اس حق کو غصب کرلیا اور اس کے متعلق اشلوک مذکور کا حصہ سمرتی میں سے نکال دیا۔ بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ اشلوک کی جو عبارت باقی رہ گئی ہے وہ مہمل و بے معنی ہے۔ عقل کچھ کام نہیں کرتی کہ انتظار کا زمانہ گذر جانے کے بعد اگر عورت خود کو مطلقہ سمجھکر دوسری جگہ نسبت نہیں کرسکتی تو پھر انتظار کی مدت معین کرنے کے کیا معنی ہوسکتے ہیں۔

منو کے طلاق کے مویدہونے کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ اگر کوئی عورت کسی ایسے شخص کے پالے پڑجائے جو نامرد۔ فاترالعقل، جذام یا کسی دوسرے مہلک و لاعلاج مرض میں مبتلا ہو اور وہ اس سے منحرف ہوکر دوسری شادی کرلے تو وہ قابلِ معافی قرار دی جاسکتی۔ مخالفین بتائیں کہ یہ طلاق کا جواز نہیں تو اور کیا ہے؟

ہندو مذہب کے مطابق اولاد پیدا کرنا ہر فرد واحد کا فرض منصبی ہے۔ شاستروں کے نزدیک اولاد کی اس درجہ اہمیت ہے کہ گود کی رسم کے علاوہ اُنھوں نے نیوگ کی بھی اجازت دی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مذہب اتنا بالغ نظر ہو وہ طلاق جیسی ضروری رسم کو کس طرح مکروہ و متروک سمجھ لے گا؟

کیتن کی رائے کے لحاظ سے منوسمرتی دو سو برس ق م سے لیکر دو سو عیسوی تک کے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ دیگر کتب مقدسہ کا بھی یہی حال ہے۔ ایک تاریخی واقعہ سے قدیم ادب میں جو بیجا تصرفات روا رکھے گئے ہیں اُن کی قلعی کھل جاتی ہے بنگال کے ایک نند نامی برہمن نے اپنے دعوے کی تائید کے لئے دتک چندریکا (दत्तक चन्द्रिका) نامی ایک جعلی کتاب لکھ کر مستند قدیم

نسخہ کی حیثیت سے پیش کی تھی تو تاریخ میں جانے ایسے کتنے واقعات ہوئے ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ سمرتیوں کے مؤلفین نے انھیں دوبارہ لکھ لکھ کر تباہ کیا ہو اور اپنی ادنیٰ ذہنیت کا تحریری ثبوت چھوڑ گئے ہوں بہرنوع یہ باور کرنے میں ہم کو کوئی مشکل نہیں معلوم ہوتی کہ ضرورت وقت کے مطابق ہمارے رسم ورواج میں ہمیشہ سے تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ رام ناد کے مشہور مقدمہ میں پریوی کونسل نے بھی اسے تسلیم کیا ہے اس لئے اگر کسی وجہ سے ہندو شاستروں نے طلاق کے رواج کو معیوب خارج کر دیا ہو تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ ایک بات جو موقع ومحل کے لحاظ سے کسی وقت نا قابل قبول ہو وہ ہمیشہ کے لئے بری قرار دیدی جائے۔ بیمار کو غذا دینے کی ممانعت ہوتی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ غذا کو قطعی ترک ہی کر دیا جائے اگر وہی چیز جو کبھی ہمارے سامنے بری تھی اب مفید ثابت ہو تو اُسے ٹھکرا دینا دانشمندی سے بعید ہے۔ علاوہ بریں اگر ہمیں پہلے کبھی شاستروں میں ترمیم و تنسیخ کرنیکا حق حاصل تھا تو اب بھی ہمکو اس کا اختیار باقی رہتا ہے۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ورود سے پہلے ہندوؤں میں طلاق کی رسم عام تھی اُن کے ہندوستان میں سکونت پذیر ہونے سے جہاں پردہ وصغیر سنی کی شادی وغیرہ رسمیں رائج ہوگئیں وہاں طلاق کا رواج بھی مسدود کر دیا گیا۔ لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ ہندو قوم کا شیرازہ اتنا منتشر نہیں ہے، ملک میں سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ خواتین کے حقوق کی حفاظت کی ضرورت ومناسبت جلد جلد بھی شروع ہوگئی ہے۔ برادران وطن مستورات کے حقوق کا جائز احترام کرنا سیکھ رہے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی خواتین کو حق خلع عطا کرنے کا رجحان ہے۔ ایسی حالت میں ہندوؤں کو بھی عورتوں اور بعض صورتوں میں مردوں کے حق طلاق کو جائز تسلیم کرنا چاہیے۔

دیوان غالب

مرزا غالب کا یہ اُردو دیوان جیبی تقطیع پر جرمنی کے مشہور ومعروف پریس مطبع آفتاب برلن میں ٹائپ کے حروف سے خاص اہتمام کے ساتھ بہت خوبصورت چھاپا گیا ہے جلد محبوبیہ کارخانہ جلد سازی حیدرآباد دکن کی بندھی ہوئی ہے جو نہایت مضبوط دلکش اور بالکل ولایتی معلوم ہوتی ہے۔ جہاں تک ظاہری آرائش وزیبائش کا تعلق ہے یہ چھوٹا سا دیوان غالب دیدہ زیب اور قابل قدر ہے۔ شروع میں مرزا غالب کے بڑھاپے کی ایک رنگین تصویر اور اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا فارسی دیباچہ بھی شامل ہیں۔

قیمت دو روپیہ عا، ملنے کا پتہ: منیجر محبوبیہ کارخانہ جلد سازی، بندقاہ شاہی روڈ۔ حیدرآباد دکن

دُنیا

تضمین بر غزل جناب محرومؔ

(از جناب اندرجیت شرما ماچھرہ ضلع میرٹھ)

کہنے کو انتخاب ہے دُنیا مرکزِ آفتاب ہے دُنیا
پھر بھی بالکل حباب ہے دُنیا نقش بر سطحِ آب ہے دُنیا
بلکہ موجِ سراب ہے دُنیا

رازِ الفت سے آشنا نہ ہوئی رنگِ وحدت میں بھی رنگی نہ گئی
ساتھ ہیں اس کے گردشیں اسکی ایک حالت پہ رہ نہیں سکتی
پیکرِ انقلاب ہے دُنیا

مٹنے والی یہ اک نشانی ہے کون کہتا ہے جاودانی ہے
بہتی گنگا ہے بہتا پانی ہے چند روزہ ہے اور فانی ہے
پھر بھی کیا لاجواب ہے دُنیا

رو میں اس کی کہاں وہ بہتے ہیں ہو کے خاموش سُنتے رہتے ہیں
غم اُٹھاتے ہیں رنج سہتے ہیں ہوشیار اس سے بچ کے رہتے ہیں
کہ نہایت خراب ہے دُنیا

کوئی سمجھے نہ دل لگی اس میں پھنس کے رہتا ہے آدمی اسمیں
خیر دیکھی نہ جان کی اس میں تا جوانی ہے دل کشی اسمیں
ہیچ بعد شباب ہے دنیا

اپنی قسمت ہے اپنا ہے مقسوم کیوں ہیں ہر لحظہ ہر گھڑی مغموم
یہی آشفتگی کا ہے مفہوم ہم سمجھتے ہیں خوب اے محرومؔ
جائے صد پیچ وتاب ہے دنیا

نواب امیر الدولہ بہادر

(از خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

اگرچہ عیش و راحت کا دار و مدار تقدیر پر ہے، مگر زمانہ کی روش دیکھکر ماننا پڑتا ہے کہ کوشش اور تدبیر کو بھی اس میں بہت کچھ دخل ہے۔ بہت سے لوگوں نے کوشش اور محنت اور تدبیر سے ہمیشہ کامیابی کا منہ دیکھا ہے اور دولتمند ہوکر ساری زندگی عیش و راحت میں بسر کی ہے۔

اس مثال میں ہم ایک تاریخی واقعہ سُناتے ہیں۔ نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کے والد کابلی مغل تھے، اور ولایت سے آکر فتح آباد کابل میں سکونت اختیار کی۔ جب باپ کا انتقال ہوگیا تو نواب صفدر جنگ کے عہد میں صوبہ اودھ میں بتلاش معاش فیض آباد مارے مارے پھرے۔ رفتہ رفتہ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں نواب کے نائب مہاراجہ بینی بہادر کی سرکار میں کسی فوجی افسر کی سفارش پر داخل ہوئے۔ ایک مدت کے بعد مہاراجہ نے حسن خدمت دیکھکر مقرب خاص بنالیا اور مرزا نور بیگ اور حیدر بیگ مہاراجہ کی خدمت میں زندگی بھر ملازم رہے۔ دونوں کو تین تین سو روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ پھر مہاراجہ کی سفارش سے دونوں بھائیوں کو علاقہ اکبر پور دوست پور غضنفر نگر کا ٹھیکہ ملا اور خیر خواہی کے سبب سے بہت نیک نام رہے۔

جب بکسر کی لڑائی شروع ہوئی تو حیدر بیگ خاں عامل گورکھپور تھے۔ اسی زمانے میں اپنے چھوٹے بھائی امیر بیگ اور ایک چوتھے چھوٹے بھائی اور دو بہنیں تھیں ان کو بھی فیض آباد بلوالیا اور نہایت عیش و آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔

نواب شجاع الدولہ کو معلوم ہوا کہ مہاراجہ بینی بہادر بکسر کی لڑائی میں انگریزوں سے مل گیا تھا جسی سے ہم کو شکست فاش ہوئی، اس نمک حرامی پر اُن کو بہت غصہ آیا۔ بینی بہادر کی آنکھیں نکلوالیں اور اُن کا مال واسباب داخل سرکار ہوگیا۔ بعد اس واقعہ کے نواب شجاع الدولہ بہادر نے بسبب کارگزاری کے خطاب "خانی" عطا فرمایا۔ اس عرصہ میں چھوٹے بھائی اور ایک بہن نے انتقال فرمایا۔

پھر نواب نے اُن کی چھوٹی بہن کی خواستگاری کی، اُنھوں نے اس وجہ سے کہ نواب ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے اس شادی سے انکار کردیا۔ نواب کو بہت غصہ آیا اور باقیات مالگذاری کا حیلہ کرکے

دونوں بھائیوں کو قید کر دیا۔ اور قید میں برابر کا نمک ملنے لگا۔ اس سختی سے مرزا انور بیگ نے جیل خانہ میں انتقال کیا۔ مرزا حیدر بیگ کے حال پر نواب بہو بیگم نے رحم فرماکر انھیں قید سے رہا کرادیا بعد چندے جب محمد ایلچ نائب ہوئے وہ ان سے دیرینہ خصومت رکھتے تھے۔ انھوں نے باقی زر مالگذاری کے بہانہ سے بعد قید کیا۔ مدت کے بعد جب قید سے چھوٹے تو زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا۔ یہ بیچارے تلاش معاش میں سرگردان تھے۔ ایک ترکیب سمجھ میں آئی کہ اگر جان رسٹو صاحب رزیڈنٹ کی خوشامد کی جائے شاید کوئی صورت بہبودی کی نکل آئے۔ اس لحاظ سے میانہ میں سوار ہوکر احاطہ کوٹھی کے باہر پیپل کے درخت کے نیچے میانہ رکھوا کر متوقع رہتے تھے کہ صاحب کی سواری نکلے تو سلام کرلیں، کیونکہ کوئی ایسا ذریعہ اُن کے پاس نہ تھا جو صاحب کی کوٹھی میں جاسکیں۔ بہت دنوں تک اسی طرح سلام کرتے رہتے تو ایک دن صاحب نے پوچھا کہ تم کون ہو اور ہمارے پاس کس غرض سے آتے ہو۔ انھوں نے اپنا تعارف خود ہی کرایا اور حالات بتائے۔ جب اُن کو معلوم ہوا کہ پڑھا لکھا شریف آدمی ہے اور سرکاری ملازمت کرچکا ہے اور منتظم ہے اور کام کی لیاقت رکھتا ہے۔ فکر معاش آجکل تنگ ہے تو کوٹھی میں آکر سلام کرنے کی اجازت دی۔ ان کو یہی غنیمت معلوم ہوا کہ پیپل کے سایہ سے صاحب کی کوٹھی کا سایہ تو نصیب ہوا۔ اور اسی کو اپنے لئے نیک فال سمجھے اب روزانہ حسب عادت پوشاک پہنکر میانہ میں سوار ہوکر صاحب کی کوٹھی کے سامنے احاطہ میں ٹھہرتے اور جب صاحب ہوا کھا کر واپس آتے تو یہ کھڑے ہوکر سرو قد سلام کرتے۔ اس طرز ملاقات سے صاحب کو ان کا بہت خیال ہوگیا اور ایک روز کوٹھی میں بلا کر کہا "تم روز کیوں تکلیف کرتے ہو، ہم کو تمھارا خیال ہے جب کبھی موقع ہاتھ آئے گا اور کوئی جگہ تمھارے مرتبہ کے لائق ہوگی تمھاری سفارش کی جائے گی۔ انھوں نے کہا اس نوازش اور عنایت کے صلہ میں میرا فرض ہے کہ حضور کے سلام کو روزانہ حاضری دیا کروں۔ یہی نوازش کیا کم ہے کہ آپ کو کمترین کا اس قدر خیال ہے۔ انشاءاللہ وہ وقت بھی قریب آئے گا کہ آپ کو میری سفارش کا موقع ملے۔

اتفاق وقت سے نواب آصف الدولہ کو ایک سخت مرحلہ درپیش ہوا، نواب محمد ایلچ خاں نائب نے انتقال فرمایا تھا اور سخت فکر تھی کہ دوسرا نائب متدین اور کارگزار مقرر کیا جائے، اور کوئی شخص سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ نواب مرتضیٰ الدولہ مرزا حسن رضا خاں سب طرح اچھے اور خیرخواہ و معتمد تھے مگر جاہل محض اس لئے بیکار تھے۔ اور بھی تین شخص متدین و کارگزار خیال میں آئے۔ مرزا ابوطالب لندنی۔ مرزا اسمٰعیل بیگ صاحب تاجر تورہ۔ مرزا جعفر سخ۔ اور گمان غالب تھا کہ انھیں میں سے کوئی ضرور نائب سلطنت ہوگا سب کے یہاں کھچڑیاں پک رہی تھیں اور عملہ پر ہزاروں روپیہ صرف ہورہا تھا۔ ہر شخص نیابت کا خواب

دیکھ رہا تھا۔ مگر جب اہل عملہ اپنی رائے متعلق نیابت دے چکے تو رزیڈنٹ بہادر سے مشورہ کیا گیا انھوں نے تائید کے ساتھ میرزا سید رضا بیگ خاں کا نام پیش کیا، اور کہا کہ آدمی محنتی جفاکش اور آزمودہ کار معلوم ہوتا ہے۔ نواب آصف الدولہ کو رزیڈنٹ بہادر کی یہ رائے پسند آئی اور ۱۷۷۵ء میں نواب امیرالدولہ حیدر بیگ خاں انتظام نیابت خلعت نیابت اور خطاب سے سرفراز ہوئے۔ مہاراجہ ٹکیت رائے ان کے دیوان ہوئے اور نواب سرفراز الدولہ مقیم ہوئے۔ باقی سب حقدار امیدوار محروم رہ گئے۔ کئی برس تک نیابت کا کام بہت حسن و خوبی سے کیا، نواب بھی خوش رہے اور رزیڈنٹ بہادر بھی۔

آخر نواب وزیر اور اہل دربار یہ بات قرار پائی کہ مملکت کے بعض اہم امور کے واسطے نواب امیرالدولہ کو کلکتہ جانا چاہیئے، کیونکہ یہاں برسٹو صاحب بسبب عدم رسی اقساط سرکاری ان پر بہت سختی کرتے تھے اور اسی طرح بعض امور سخت گیری روا رکھتے تھے اور دھونس جھپٹ تے تھے اور اپنا آزردہ سمجھکر دھمکاتے تھے۔

امیرالدولہ نے خیال کیا کہ یہ صحیح ہے کہ میں صاحب کا آزردہ ہوں اور انھیں کی ذات سے اس مرتبہ پر پہنچا ہوں، لیکن اب ان کی سختی حد سے گزرتی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ میں ان کی ضد سے اپنے عہدہ سے موقوف کیا جاؤں لہٰذا اس کی فکر کرنا چاہیئے تاکہ مجھے آزار نہ پہنچا سکیں۔

ان کے ایک دوست جنرل مارٹن صاحب تھے جو اپنی سرکار سے پنشن پاتے تھے اور تجارت ولایت کے مال کی کرتے تھے اور خاصکر نواب آصف الدولہ کے ہاتھ کئی لاکھ سالانہ کا مال فروخت کرتے تھے، جس کی دہانید نواب امیرالدولہ کے ہاتھوں ہوتی تھی۔ اس سبب سے جنرل صاحب اور امیرالدولہ میں بہت دوستی تھی۔ دونوں ایک روح دو قالب ہو رہے تھے۔ جنرل صاحب کے تمام حکام انگریزی اور خاصکر نواب گورنر بہادر سے ملاقات کاٹی روٹی تھی۔ نواب امیرالدولہ نے ایک عرضداشت رزیڈنٹ کے معزول کرنے اور ان کی بیجا سختی کی جنرل مارٹن کی معرفت گورنر جنرل کلکتہ کو روانہ کی۔ جنرل مارٹن صاحب نے لکھا ایسا ویسا نہ تھا۔ گورنر نے نواب آصف الدولہ بہادر کی ناراضگی اور مدارالمہام کی برخلافی اچھی نہ سمجھی۔ اس لئے رزیڈنٹ صاحب کو اپنا سکرٹری بناکر کلکتہ بلوالیا۔ اور نواب آصف الدولہ کو خط بھی لکھ دیا۔ اتفاق سے جس وقت گورنر بہادر کی چٹھی آئی اس وقت شدت سے بارش ہو رہی تھی، مگر نواب نے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور حکم دیا کہ رزیڈنسی کی کوٹھی ابھی وقت خالی کردو۔ رزیڈنٹ نے معذرت کی کہ اس وقت پانی برستا ہے

شب بھر یہاں رہنے کی اجازت مل جائے، مگر نواب نے قبول نہ کیا۔ آخر اسی بارش میں رزیڈنٹ بہادر جنرل مارٹن صاحب کی کوٹھی میں اُٹھ گئے اور صبح کو کلکتہ روانہ ہو گئے۔

اس سختی اور بے مروتی کو رزیڈنٹ بہادر عمر بھر نہ بھولے اگرچہ یہ کلکتہ پہنچکر جنرل صاحب کے سکریٹری ہوئے اور مدارج علیا پر پہنچے لیکن اودھ کی سی حکومت کہاں میسر تھی بادشاہت کا مزا ملتا تھا آصف الدولہ کے اتالیق بنے ہوئے تھے۔ بیچارے امیر الدولہ پر یہ مصیبت تھی کہ اگر چھپن لاکھ ستتر ہزار بابت قسط مشروط کے گورنمنٹ میعاد معینہ پر نہ پہنچاویں تو رزیڈنٹ بہادر پھاڑے کھاتے ہیں، اور ساٹھ لاکھ نواب آصف الدولہ کو خرچ ذاتی نہ جائے تو اُن کے غصے کی پناہ نہیں۔ ملازمت سے برطرف ہو جانے کا اندیشہ، اس کے علاوہ عزیزانِ قریب کی تنخواہیں اور امرائے فوج کا درماہہ اور اہلکارانِ سلطنت کا خرچ شمار سے باہر۔ تاجرانِ ولایت کا روپیہ فوراً ادا نہ ہو تو رزیڈنٹ صاحب خفا ہوئے جاتے ہیں۔ یہ سب اسباب ایسے جمع ہو گئے جس کے سبب سے امیر الدولہ بہادر مجبور ہوئے کہ گورنر جنرل سے خود ملکر فیصلہ کرلیں، کیونکہ جو رزیڈنٹ آئیگا سابق رزیڈنٹ کے مطابق کام کریگا اور مدار المہام کی کچھ نہ سُنے گا۔ اس زمانہ میں گورنر جنرل ہند مارکوئیس آف کارن وال تھے۔ اور کلکتہ میں اُن کا قیام تھا۔ نواب امیر الدولہ سنہ ۱۷۸۶ء میں بڑے جاہ وتجمل سے کلکتہ روانہ ہوئے۔ اٹھارہ [۱۸] لاکھ سرکار سے سفر خرچ عنایت ہوا۔ اور ایک کروڑ تک کے خرچ کی اجازت ملی۔

جب کلکتہ پہونچے تو سکریٹری صاحب یعنی سابق ریزیڈنٹ اودھ ان سے خار کھائے ہوئے تھے۔ ان کی دشمنی سے گورنر جنرل کی ملاقات میں حیلہ حوالہ ہوتا رہا۔ امیر الدولہ بھی زمانہ دیدہ تھے جب بہت تنگ آ گئے تو گورنر جنرل کی آج کل کو خاطر میں نہ لائے۔ اور حاجی کربلائی کو حکم دیا کہ ہمارے واسطے لندن جانے والا جہاز کرایہ کرلو، ہم وہیں جاکر بذات خاص گورنمنٹ سے صوبہ اودھ کا فیصلہ کرلیں گے۔ گورنر جنرل کے حیلہ حوالہ کی برداشت ہم سے نہیں ہوگی۔ جب گورنر جنرل کو اچھی طرح یہ خبر معلوم ہوئی تو پردہ غفلت ان کے گوش ہوش سے اُٹھ گیا۔ اور مہمان باوقار سمجھ کر ملاقات میں سبقت کی اور خود ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ نواب امیر الدولہ نے علالتِ مزاج کا عذر کیا کہ سفر کی تکلیف سے بیمار ہوگیا ہوں، انشاء اللہ بعد صحت حاضر ہونگا۔ لیکن گورنر جنرل اس بہانہ کو سمجھ گئے اور کہا کہ میں تو آپ کی عیادت کے واسطے آیا ہوں، اور نہایت اخلاق سے دیکھنے کے مشتاق ہوئے نواب نے بُلوالیا، دو خواصوں نے بغلوں میں ہاتھ دیکر پلنگ سے تعظیم کے واسطے اُٹھایا۔ گورنر جنرل نے بہت اصرار سے منع کیا کہ مریض کو تعظیم معاف ہے۔ بعد اس کے کیفیت مزاج پوچھی، کلمات شوقِ ملاقات

فرما کے تشریف لے گئے۔ کئی روز کے بعد نواب امیر الدولہ بڑے تزک و احتشام کی سواری سے گورنر جنرل کی ملاقات کو گئے۔ نذر پیش کی۔

گورنر نے استفسار فرمایا کہ نواب آصف الدولہ کو کیا خاص ضرورت پیش آئی جو آپ کو ہمارے پاس بھیجا، کیا پریشانی ہے۔ امیر الدولہ نے کہا، بہت سی پریشانیاں جمع ہو گئی ہیں، آمدنی کم اور خرچ بہت زائد۔ تیسرے سالانہ قسط کی رقم کثیر کا بارگراں کہ ہدف چھپن لاکھ ستتر ہزار گورنمنٹ کو دیا جاتا ہے حالانکہ بنارس وغیرہ بائیس لاکھ کا ملک ہدیہ دوستانہ میں سرکار کمپنی کو دیدیا گیا ہے۔ اور دوسرے لاکھوں روپیہ کے مصارف روشنی اور ضیافت میں ان صاحبان عالی شان کے لئے ہوتے ہیں، جو نوروز و ہولی و بسنت وغیرہ کا تماشا دیکھنے لکھنؤ میں آتے ہیں۔ پھر تجار انگریز جو اسباب تجارت ولایت سے لاتے ہیں ان پر کوئی محصول نہیں لگایا جاتا، اور یہ انگریز تاجر جو ضرورت بے ضرورت کا مال لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اسباب صرف حضور کے واسطے لائے ہیں اسے لینا پڑتا ہے اور اس کی دہا نید زبردستی تم پر ہوتی ہے اور جس قدر وہ روپیہ مانگتے ہیں ہم کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ حکم حاکم سمجھکر قرض لیکر انھیں دینا پڑتا ہے اور قرضے کا سود بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔

نواب گورنر بہادر اس گفتگو کو سنکر معقول ہوئے، کہا تم سچ کہتے ہو۔ اتنا بار ملک پر بہت ہے۔ چھپن لاکھ ستتر ہزار کی قسط بالکل مسترد کی جاتی ہے۔ ملک بنارس بھی نواب آصف الدولہ کو واپس دیا جاتا ہے۔ اور حکم دیا جاتا ہے آیندہ کوئی تاجر بے اجازت صاحب رزیڈنٹ جناب عالی کے پاس حاضر نہ ہوگا۔ کوئی زوار یا سیاح بھی آصف الدولہ کے حضور میں حاضر نہ ہوگا اور تاجران ولایت پر پانچ روپیہ فی صدی محصول بھی عائد کیا جائے گا، اور تمسک بکسر کی لڑائی کا جو روپیہ اہلکاروں کی غفلت سے اب تک نواب کو واپس نہیں کیا گیا ہے وہ بھی واپس کیا جائے گا۔ یہ خوشخبری کا پیام سنکر نواب امیر الدولہ بہت شکر گزار ہوئے۔

اس کے بعد آصف الدولہ کی طرف سے جواہرات بیش بہا کا صندوقچہ جس کی قیمت بازار میں ایک کروڑ سے کم نہ تھی، ایک کشتی میں لگا کر بطور دوستانہ ہدیہ پیش کیا۔

نواب گورنر جنرل نے تمام جواہرات ملاحظہ کرکے فرمایا کہ اس گراں بہا ہدیہ کے معاوضہ میں ہم صوبہ دار اودھ کو کون سا ہدیہ دوستانہ دے سکتے ہیں اب تم ہماری طرف سے نواب آصف الدولہ کو دینا۔ نواب امیر الدولہ نے بہت اصرار سے پیش کیا۔ لوگ کہتے ہیں ایسا منصف رحم دل گورنر ہندوستان میں آج تک دوسرا نہیں آیا۔ بہرحال نواب امیر الدولہ اپنے تمام مطالب پورے کرکے صاحب گورنر جنرل سے رخصت

ہو کر نہایت شان و شوکت سے عازم لکھنؤ ہوئے، اور کلکتہ میں اس قدر سخاوت کی کہ مدت تک غربا کے چھپّر اور کھپریلوں سے اشرفی اور روپیہ نکلتے رہے۔ جب لکھنؤ میں آئے تو نواب آصف الدولہ بہادر کمال مسرت سے شہر کے باہر فتح گنج تک امیرالدولہ کے استقبال کو تشریف لائے اور حکم دیا کہ امیرالدولہ ہاتھی بٹھا کر مجھے سلام نہ کریں بلکہ اپنا ہاتھی میرے ہاتھی کے برابر رکھیں، لیکن امیرالدولہ نے آقا کے اس حکم کو قبول نہ کیا۔ نذر پیش کرنے کے بعد ہاتھی پر بیٹھ کر گُل افشانی کرتے ہوئے اور فقیروں و مساکین کو روپیہ لٹاتے ہوئے داخلِ دولت خانہ ہوئے۔

نواب نے صاحب گورنر جنرل کا ذکر حرف بحرف سنا، خلعت مرحمت فرمایا، سب احکام منظور ہوئے لیکن وا پسی بنارس منظور نہ کی، اور کہا مجھے شرم آتی ہے کہ دی ہوئی چیز کو واپس لوں۔ دوسری بات امیرالدولہ نے یہ کی کہ اگرچہ ساٹھ لاکھ سفر خرچ مرحمت ہوا تھا مگر اس سفر میں صرف سولہ لاکھ صرف کیا اور بقیہ داخل خزانہ سرکار کر دیا۔ اسی زمانۂ قیام کلکتہ میں ماذارکری جو چندن نگر فرانس کے جھنڈے اور شیورام پور کے درمیان کئی کوس کی زمین ہے اپنی ناموری کے واسطے تیس ہزار روپیہ کو خریدا۔

نواب آصف الدولہ نے چاہا کہ نواب سرفراز الدولہ کا عہدہ نواب امیرالدولہ کو عنایت کریں مگر نواب امیرالدولہ نے اسے اپنی نیک مزاجی سے منظور نہ کیا، کہ سرفراز الدولہ کو قلق ہوگا۔

مشہور ہے کہ امیرالدولہ بیمار ہوئے تو نواب آصف الدولہ اُن کی عیادت کو تشریف لائے، اس وقت اُن کا دم واپسیں تھا۔ امیرالدولہ نے عرض کی کہ غلام ایک وصیت کرتا ہے۔ آصف الدولہ سمجھے کہ کچھ اپنی اولاد کے واسطے کہنے کو ہیں۔ فرمایا کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ کہنے لگے حضور جو کچھ میرے گھر میں ہے سب حضور کا ہے میری آل اولاد سب آپ کے لونڈی غلام ہیں، لیکن وصیت یہ ہے کہ حضور آیندہ کسی نائب کو اتنا اختیار کامل نہ دیجئے گا، ورنہ اس ملک کی بربادی اور حضور کی بدنامی ہوگی، غلام نے بطور خیر خواہی عرض کر دیا۔ ۱۷۹۱ء میں انتقال فرمایا، کشمیری محلہ میں ان کا باغ تھا اُسی میں دفن ہوئے۔ آصف الدولہ نے اُن کا گھر ضبط نہیں کیا ہر چند جلنے والوں نے بہت آگ لگائی مگر نواب سرفراز الدولہ ان کے حامی تھے کسی کی دال نہ گلی۔ ان کے بعد نواب سرفراز الدولہ نے مثل اپنی اولاد کے پسماندوں کو پرورش کیا۔

امیرالدولہ دیانت دار تھے اور امین تھے اور خیر خواہ ریاست تھے، ان کی نیک نفسی کا نقش نواب آصف الدولہ کے دل پر تھا۔ اب ایسے نمک خوار ریاست کہاں ہوتے ہیں، نہ ایسے قدرداں زندہ ہیں۔

رموز و نکات

(از ابوالفاضل راز چاندپوری)

دلداریِ دوست کا فسانہ کہیئے یا قصۂ شوخیِ زمانہ کہیئے
جو کچھ کہیئے اس انجمن میں اے راز با طرزِ جدید و شاعرانہ کہیئے

دیوانۂ حسنِ یار کر دے مجھکو بیگانۂ روزگار کر دے مجھکو
بیکار ہے بحثِ کفر و ایماں ساقی! کونین میں باوقار کر دے مجھکو

مخمورِ مے بہار ہو جاتا ہوں خوش وقت و کامگار ہو جاتا ہوں
واللہ بیک نگاہِ مستِ ساقی فطرت سے ہمکنار ہو جاتا ہوں

اربابِ جہاں کی دلنوازی، توبہ وہ حسنِ فریبِ چارہ سازی، توبہ
اب کوئی نہیں حریفِ دورِ آخر توبہ، توبہ، یہ پاکبازی، توبہ

غزل

ہنوز بادۂ دوشیں کا ہے خمار مجھے نویدِ کیف نہ دے ساقیِ بہار مجھے
خموش ہمدم خوش کار و خوش نوا خاموش ترے خلوص کا اب تک ہے اعتبار مجھے
کرشمہ سازیِ چشمِ کرم کو کیا کہیئے نہ پوچھ، کس نے بنایا ہے میگسار مجھے
حریفِ جبر کہوں اس کو یا شریکِ قدر بلطفِ خاص دیا ہے جو اختیار مجھے
ہنوز روئے حقیقت پہ ہے نقابِ لطیف ہنوز چشمِ کرم کا ہے انتظار مجھے
بہارِ وادیِ غربت، بہارِ خلد سہی فریب سیر نہ دے حسنِ رہگزار مجھے
مقیمِ دشتِ جبل پور ہوں مگر اے راز
پیامِ اہلِ وطن کا ہے انتظار مجھے

ایک خواب

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم۔ اے)

یہ کس کی رحمت کا ابر ہے میکشوں کے سر پر جو چھا رہا ہے
یہ کون ساقی ہے ایسا مشفق جو جامِ اُلفت پلا رہا ہے
یہ بزمِ عیش و نشاط ہے کیا یہ کیسے ہیں خُرّمی کے نغمے
یہ کون ہے تارِ سازِ عشرت جو دھیمے دھیمے بجا رہا ہے
یہ خم دھرا سامنے ہے کس کے یہ کس کے ہاتھوں میں ہے صُراحی
اُنڈیلتا ہے یہ کون ساغر' یہ کون بھر بھر پلا رہا ہے
یہ حُسن کس کا ہے کس کے جلوے سے ایک وارفتگی ہے پیدا
دکھا کے چشمِ سیاہ اپنی یہ کون بیخود بنا رہا ہے
یہ کون ہے پیار کی نگاہوں سے دیکھتا ہے جو میری جانب
یہ کون ہے چشمِ نیم وا سے جو عشق اپنا جتا رہا ہے
یہ کون ہے غمگسار میرا' جو یوں سنبھالے ہوئے ہے مجھکو
یہ فرشِ مخمل یہ کون مجھکو سنبھل سنبھل کر لٹا رہا ہے
یہ کس کے بازو کا ہے سہارا' یہ کس کے زانو پہ سر ہے میرا
یہ دستِ نازک سے کون مجھکو تھپک تھپک کر سُلا رہا ہے
عجب مزے سے وہ سو رہا ہے عجب پریشاں ہے خواب اُسکا
سرہانے ناشاد کے :: لو لو' وہ لُطفِ غفلت اُٹھا رہا ہے

قطعہ

(از حضرت جاذب دہلوی بی۔ اے۔ (آنرز))

وہی یہ دل ہے کہ رہتے تھے جس میں ہنگامے — وہی یہ آنکھ ہے جو تھی کبھی خمار فروش
یہ خشک لب کبھی لیتے تھے جام کے بوسے — وہی یہ کان ہیں سنتے تھے جو نوائے سروش
مجھے عزیز تھی جو زندگی، یہی ہے وہ — وہی یہ میں ہوں کہ رہتا تھا غرق نائے و نوش
ربابِ دہر سے اب تک برستے ہیں نغمے — مگر کہاں ہے اب ان میں وہ جوش اور خروش
وہ تار جس سے نکلتا تھا نغمۂ امید — شکستہ ہو کے وفورِ الم سے ہے خاموش

"گیاسٹک"

(از مسٹر سلیم جعفر)

مجھے ناظرینِ "زمانہ" کی نسبت یہ حسنِ ظن ہے کہ وہ لفظی تحقیقات کی الجھن میں نہیں پڑتے اور صرف اس سے غرض رکھتے ہیں کہ مضمون نگار جو لفظ لکھ رہا ہے اس سے اس کا مفہوم و مدعا ادا ہو رہا ہے یا نہیں۔ لیکن کلیات و مستثنیات لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے کاوش پسند طبیعتوں کی خدمت میں اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ نفسِ زیرِ عنوان کی حقیقت تو کوئی آئندہ "زمانہ کا جدید لغات نویس" لکھے گا لیکن یہ اس دورِ جدید کا (جو وسعتِ زبان کے خیال سے ہر ملک سے لفظ اور طریقِ اشتقاقِ الفاظ چھین چھین کر اپنا گھر بھر رہا ہے) نیا لفظ ہے۔ یہ سکہ جب ویدوں کی ٹکسال میں گھڑا گیا تھا بالکل سیدھا سادہ تھا۔ اب اس پر یورپی آرٹ کی مدد سے نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ کیوں؟ کہ تماشا ہو، فارسی اس وقت تک یہ صرف صدورِ فعل ظاہر کرتا تھا۔ اس اضافہ سے اس میں یہ وسعت پیدا ہو گیا کہ ایک علم پر دلالت کرنے لگا۔ یہ انگریزی لفظ "اکاوسٹکس" اور "نیومزمیٹکس" وغیرہ کا چھوٹا بھائی ہے۔ٹ

اصل میں اس کے معنی ہیں "وہ علم جس میں بے پر کی اڑانے سے بحث کی جائے۔" لیکن جس طرح اور بہت سے لفظوں کی دلالت لغوی فہرستِ متروکات میں درج ہے اور وہ صرف اپنے مجازی معنی ہی میں مستعمل ہیں یہی حال اس کا ہے۔ اب اس سے صرف "کہانیوں کا تانا بانا" کے معنی سمجھے جاتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد گزارش ہے کہ ایک دن لنچ کے وقت چند دوست جمع تھے۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ ایک صاحب نے کہنا شروع کیا:

"بڑے دن کی چھٹیاں شروع ہوئیں تو بیٹھے بیٹھے دل بے چین ہوا کہ گھر چلو۔ ہمیں یہ دورہ ایسے وقت اٹھا کہ ہمارے اور اسٹیشن کے درمیان جو سترہ اٹھارہ میل کا فاصلہ ہے اس کے طے کرنے کا انتظام ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ گھبراہٹ میں ہم نے اپنے ایک با اثر مہربان کا دامن پکڑا جن کی نسبت معلوم ہوا تھا کہ تنہا یکے میں جا رہے ہیں۔ ہم دونوں اپنے ہیڈ کوارٹر سے ایسے تنگ وقت پر چلے کہ ہمیں ٹرین کے نہ ملنے کا اندیشہ ہو گیا۔ ہمارے مہربان ایک گھاگ تھے یکہ والے کو ابھارنے کے لئے سوار ہوتے ہوتے بولے:۔

ٹ *Acoustics; Numismatics*

"میاں صبح تک تو پہونچ ہی جائیں گے۔"

یکہ والا: "اِس گھوڑے کی مریل صورت پر نہ جائیے، بجلی ہے، بجلی۔ اور سواریاں اب تک کوئی تین میل نکل گئی ہونگی، لیکن یہ بات کی بات میں اُنھیں جالے گا۔"

مہربان: "نہیں تو کیا کرے گا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ میل دو میل دوڑنے کے بعد یمراج[۱] سے جا ملے اور ہم اَدھ بیچ ہی میں لٹکتے رہ جائیں"

یکہ والا: "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ بیٹھئے تو سہی پھر دیکھئے گا کیسا جیوٹ دار جانور ہے۔"

مہربان: "اچھا۔ لو۔ تو سوار ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ تم سچے ہو یا ہم۔"

ہم دونوں یکے میں بیٹھ گئے۔ یکہ والے نے راسیں سنبھالیں۔ سٹاک سے چابک یکے کے بم پر مارا اور بولا "ہاں۔ بیٹا۔ ہو جا بجلی" گھوڑا اچھل پڑا۔ اور چونکہ رہ رہ کر بم سے سٹاک سٹاک کی آوازیں نکل نکل کر اس پر تیزی کا تقاضا کر رہی تھیں، تھوڑی سی دیر میں ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

کوئی چار میل گئے ہونگے کہ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور گھٹنوں کے بل آرہا۔ خیر ہوئی کہ ہم دونوں یکے کے دونوں پہلوؤں پر باہر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ یکہ والا بھی اپنی جگہ کے کونے پر بیٹھا بم کے اوپر سے پاؤں لٹکائے ہوئے تھا۔ دھکا لگتے ہی ہم تینوں اس طرح زمین پر جا کھڑے ہوئے جیسے جان بوجھکر کود پڑے ہوں۔ میرے مہربان کو غصہ تو بہت آیا مگر خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے، کیونکہ اس حادثہ سے پہلے یکہ والے کو بہت کچھ بڑھاوے دے چکے تھے۔ بیچارے گھوڑے کے گھٹنے لہولہان ہو گئے اور ہم سمجھے کہ اب یہیں ڈھیر ہے۔ لیکن یکہ والے نے جھٹ سے گھوڑے کو باگ پکڑ کر کھڑا کر دیا اور بولا "جلد بیٹھئے، ابھی چوٹ تازی ہے منزل پر پہنچا دے گا۔ دیر لگ گئی اور ٹھنڈی ہو گئی تو رات اسی جنگل میں کاٹنی پڑے گی، یا آپ کو پیدل واپس جانا پڑے گا۔"

ہم جھٹ سے بیٹھ گئے اور دو تین گھنٹے میں اسٹیشن پر جا پہونچے۔ راستے میں کسی مصیبت کا سامنا نہیں ہوا۔ یکہ والے کی بیدردی پر بہت کچھ جی کڑھا لیکن گھڑی لگن بھی لگی ہوئی تھی۔

ٹرین کے آتے ہی مسافروں کی عادت کے بموجب جو گاڑی سامنے تھی اُسی میں گھس پڑے۔ اس گاڑی میں ایک درجہ کے سوا سب کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ میں نے صلاح دی کہ دوسری گاڑی میں جاؤ مگر میرے مہربان نے کہا "ابھی جگہ کئے لیتے ہیں۔" ایک آدھ مسافر نے دو چار سنائیں بھی مگر ہم سُنی اَن سُنی کر گئے میرے مہربان نے اسباب سنبھال کر گاڑی بھر پر ایک نگاہ ڈالی۔ آخری درجہ کو خالی دیکھکر وہاں پہونچے۔ کیا

[۱] यमराज

دیکھتے میں کہ ایک سیٹری پر اُس کی تمام لمبائی چوڑائی گھیرے ایک پچ ہتھا نوجوان بوٹ سوٹ ڈالے پڑا خراٹے لے رہا ہے۔ انھوں نے اسے جھنجھوڑے دے کر کہا "اُٹھ بیٹھو"

نوجوان: (لیٹے ہی لیٹے) بائی (بھائی) ہم بہت دُور سے آتا ہے۔ تین دن سے نئیں (نہیں) سویا۔ تم کئیں (کہیں) اور جائے۔"

مہربان: (ذرا جھڑک کر) "میاں! اُٹھتے بھی ہو یا نہیں"

نوجوان: (لیٹے ہی لیٹے) "بائی۔ تم کئیں اور جائے"

میرے مہربان اس نوجوان پٹھان کے ڈیل ڈول کو دیکھ کر یہ ہمت تو کر نہ سکے کہ ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا جھٹ سے اُترے اور ہیڈ ٹکٹ کلکٹر کو جو ان کا دوست تھا پکڑ لائے۔ اُنھوں نے آتے ہی پہلے تو گاری کا تختہ بیچ سے کھٹکھٹایا اور ذرا کڑی آواز سے بولے "سونے والا کون ہے۔ اُٹھ بیٹھو، اور مسافروں کو جگہ دو۔"

نوجوان: (لیٹے ہی لیٹے) "بائی! اور درجہ میں جائے"

ٹکٹ کلکٹر: "اُٹھو اُٹھو اور مسافروں کو جگہ دو۔"

نوجوان لیٹا رہا اور کچھ جواب ہی نہ دیا۔ اس پر میرے مہربان کو غصہ آگیا اور انگریزی میں بولے "آپ جا کر اسٹیشن ماسٹر کو بلا لائیے۔" اس کا سننا تھا کہ نوجوان تاؤ میں آکر اُٹھ بیٹھا، معلوم ہوتا تھا کہ ایک دیو ہے جس کا سر گاڑی کی چھت سے ٹکرا جائے گا۔ گرج کر فراٹے سے انگریزی میں بولا "ہاں ہاں، تم اپنے مردود اسٹیشن ماسٹر کو بلا لاؤ، میں اُس کے دو چار لاتیں رسید کر دوں میں آسٹریلیا سے آرہا ہوں اور پشاور سے پرے جانا ہے۔ مجھے آرام کی سخت ضرورت ہے۔"

اس شیر کی دہاڑ کا جواب کون دے سکتا تھا۔ ٹکٹ کلکٹر صاحب کی ہٹی گم ہو گئی۔ میرے مہربان نے اس جھگڑے کو یوں حل کیا "پنڈت جی، آپ اس راکشس سے منہ نہ لگیں، ہم دوسری گاڑی میں بیٹھ جائیں گے۔"

ہم تینوں اُتر پڑے۔ چشم زدن میں قلیوں نے برابر کی گاڑی میں سامان رکھ دیا۔ ادھر ٹکٹ کلکٹر نے سبحے رام جی کی کہی اُدھر انجن نے سیٹی دی اور ہم روانہ ہو گئے۔

ایک اور دوست بولے "آپ تو مردوں کا ذکر کرتے ہیں، میں ایک عورت کا قصہ سناتا ہوں

ایک دفعہ ایک عجیب تماشا دیکھنے میں آیا، ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔
صاحب کے ساتھ دورہ کر رہے تھے۔ رات کے وقت اسٹیشن پر ٹرین کا انتظار تھا۔ صاحب کے ساتھ جو لوگ دورہ کرتے ہیں وہ ریلوے ملازموں کی نظروں میں ہوّا ہوتے ہیں، ہم لوگ بھی دھونس جمانے میں کسر نہیں رکھتے۔ بڑے بابو جی نے اسٹیشن ماسٹر سے کہہ رکھا تھا کہ ہمیں پوری کی پوری گاڑی چاہئے
ٹرین آکر ٹھہری تو اسٹیشن ماسٹر نے ایک گاڑی کے پاس کھڑے ہو کر کہا "یہ گاڑی یہیں کٹے گی۔
جلدی خالی کرو" اور مسافروں نے جلدی جلدی اسباب اُٹھایا اور بیچارے گھبرائے ہوئے دوسری گاڑیوں میں جا بیٹھے لیکن ایک ادھیڑ عمر کی عورت جس کے ساتھ دس گیارہ برس کا ایک لڑکا تھا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب ڈانٹ کر بولے "جلدی کر جلدی۔ اترتی کیوں نہیں"
عورت: "کیوں اتروں۔ ٹکٹ لیا ہے"
اسٹیشن ماسٹر: "اتر۔ اتر۔ گاڑی کٹتی ہے، یہیں رہ جائے گی"
عورت: "مجھے اتارنے والا تو کون رہ جاؤں گی تو تجھے کیا"
اسٹیشن ماسٹر: "اری سیدھی طرح اترتی ہے کہ نہیں"
عورت: "جا۔ جا۔ اپنا کام کر آیا ہے بڑا اتارنے والا"
اسٹیشن ماسٹر: "کھٹ پٹ سنگھ!" "کھٹ پٹ سنگھ!"
کھٹ پٹ: "حضور، حضور!"
اسٹیشن ماسٹر: اس کا سامان نکال کر پھینک دو۔ اور ہاتھ پکڑ کر اتار لو۔
عورت: "بھڑوے! بلا لے اپنے یاروں کو۔ دیکھوں تو کس کی ہمت ہے جو پاس آئے۔ مارے تھپڑوں کے منہ نہ لال کر دیا ہو تو میں بھی اپنی ماں کی جائی نہیں"
یہ تماشا دیکھ کر ایک چپراسی جو وردی ڈانٹے تھا آگے بڑھا اور اسٹیشن ماسٹر صاحب چھو ہو گئے۔
چپراسی: "ڈپٹ کر" اترتی کیوں نہیں"
عورت: "جوتی دکھا کر" ارے بھڑوے، دہ گیا تو تو آیا۔ آگے آ تو مزہ چکھاؤں۔ آ۔ آگے آ۔"
چپراسی: "ڈپٹ کر" کیوں بڑ بڑ لگا رکھی ہے، اترتی کیوں نہیں"
عورت: "کھڑی ہو کر" آگے آ۔ آگے تو تجھے بتاؤں"
چپراسی ساری ہیکڑی بھول گیا اور کرکری ہونے کے ڈر سے بڑے بابو کے پاس گیا جو مونچھوں پر بہت تاؤ دیا کرتے تھے اور بولا "بابو جی، بڑی ڈائن سے پالا پڑا ہے، گالیاں بکے جاتی ہے اور اترتی نہیں"

بابوجی: (غصہ کے لہجہ میں) "ہم چلتے ہیں، حرامزادی کو بھی اُتارتے ہیں۔ تم سب نامردے ہو"

بڑے بابوجی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے جلدی جلدی چلے۔ جیسے ہی گاڑی کے پاس پہنچے عورت صورت دیکھتے ہی بولی "اب یہ ڈڑھیل (بابوجی خشخشی داڑھی رکھتے تھے) بڈھا مجھے اُتارنے آیا ہے۔ اپنی خیر چاہتا ہے تو چلا جا، نہیں تو داڑھی پکڑ کر اتنی جوتیاں لگاؤں گی کہ جورو بھی صورت نہ پہچانے گی"

بابوجی: (چپراسی سے مخاطب ہو کر) "اس حرامزادی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لو۔ اور اس کا اسباب پھینک دو"

عورت: "بھڑوے! حرامزادی ہوگی تیری ماں بہنیا۔ اپنے خصموں کو کیوں بلاتا ہے تو آ نا۔ تو۔ تو مزہ چکھاؤں۔ چلا ہے وہاں سے مجھے اُتارنے۔"

بابوجی سے جھوٹ ہو رہی تھی کہ ایک ریاست کے ایک معتمد صاحب جو بابوجی کے گہرے دوست تھے آگے بڑھے۔ بابوجی سے ان کا تن و توش بھی زیادہ تھا اور داڑھی بھی بڑی تھی۔ چونکہ دھونس کا تجربہ تین بار کیا جا چکا تھا اور نتیجہ کچھ نہ نکلا تھا۔ انھوں نے مناسب سمجھا کہ پینترا بدلیں۔ چنانچہ بہت ہی نرمی سے بولے "نیک بخت! اس گاڑی میں کیا رکھا ہے۔ ہم تمھیں دوسری گاڑی میں بٹھائے دیتے ہیں۔ اپنے آدمیوں سے اسباب اُتروا کر رکھوا دیں گے، آرام سے بیٹھی چلی جانا۔"

عورت: "یہ مُوا مولوی کہاں سے آگیا۔ جا۔ جا۔ اپنا کام کر آیا ہے بڑا وہ بن کے۔"

معتمد: "بڑی بی۔ تمھارا حرج کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں نا کہ ابھی تمھیں دوسری گاڑی میں آرام کی جگہ بٹھا دیں گے لڑتی کیوں ہو۔ اُتر آؤ نا۔"

عورت: "چل چل آیا ہے باتیں بنانے۔ اپنے یاروں ہی کو کہیں اور بٹھا دے نا۔ کیا یہاں ان کا مال گڑا ہوا ہے؟"

جب نہ سختی سے کام چلا نہ نرمی سے تو ہار کر یہ صلاح ٹھہری کہ اسی گاڑی میں بیٹھ جائیں، سامان بھر دیا گیا۔ ہم سب بیٹھ گئے۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ لیکن چپراسیوں میں ایک ذرا زندہ دل بھی تھا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

"یار، آج تو ایک دیونی سے پالا پڑا۔ کیکیا کو جھڑتے ہے۔"

عورت: "بھڑوو، ابھی تک پیٹ نہیں بھرا۔ میں تو دیونی ہوں۔ ہمت ہو تو آؤ۔ ابھی ایک ایک کا منہ لال کئے دیتی ہوں۔"

دوسرا چپراسی: "بولو خان۔ ہمت ہے، لڑتے ہو۔"

رت : " یہ بھڑوا ۔ یہ ۔ میں اس سے کیا لڑوں گی ، یہ میرے نیچے سے تو لڑلے "

اس اثنا میں اُس عورت کے سامنے کے اُس درجہ میں سے جو بند ہوتا ہے اور جس کے آدھے حصے
تار لگے ہوتے ہیں ، ایک صاحب تے جو بڑے موٹے تازے اور ہمارے شہر کے رہنے والے تھے سر بلند
ا ، ایک تیسرا جیپراسی بولا " ہماری طرف سے یہ لڑیں گے "

ابھی ان حضرت کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا تھا کہ عورت نے کہنا شروع کیا " یہ بھڑوا ۔ یہ ۔ جو
نت کی کھا کھا کے ڈبل روٹی بن رہا ہے ، یہ مجھ سے کیا لڑے گا ۔"

بیچارے کی سٹی گُم ہوگئی اور بولے " ارے یارو مجھے کیوں گالیاں کھلواتے ہو (ہاتھ جوڑ کر عورت سے)
بھاگوان ۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے ۔ معاف کر "

عورت چُپ ہوگئی اور ہم لوگ بھی اپنے اپنے بستروں میں ہنستے ہوئے منہ لپیٹ کر کچھ دیر
میں خرّاٹے لینے لگے ۔ صبح ہوئی اور آنکھ کُھلی تو وہ کہیں اُتر چکی تھی ، ہم نے خدا کا شکر کیا کہ ڈائن کے
پنجے سے چھوٹے ۔

ایک تیسرے صاحب آپ بیتی سُنانے کو تیار ہی ہو رہے تھے کہ ہم میں سے ایک صاحب نے
سمجھیں اور کچھ نہیں تو اہل دل ضرور کہنا چاہیئے ، ایک آدھ سرد بھر کر نعرہ لگایا " ہائے قوت ارادی بقول غالب

اُس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیئے ۔

اس پر سب ہنس پڑے اور " گپا شک " کا ایک اور باب تشنۂ اظہار رہ گیا ۔

" بھوگول " کے خاص نمبر

ایٹلس نمبر ۔ رسالہ بھوگول الہ آباد کے اولوالعزم کارپردازوں نے اپنے مشہور رسالہ کا ایک اٹلیس نمبر شائع کیا ہے جو ہر حیثیت سے مفید اور بازار میں فروخت ہونیوالے اٹلیسوں سے کہیں اچھا ہے ۔ اسمیں کچھ نقشے ایسے بھی دیئے گئے ہیں جو عموماً دوسرے اٹلیسوں میں نہیں ملتے غرض ہر حیثیت سے یہ اٹلیس اسکول کے طالبعلموں کے لئے بہت مفید اور کارآمد ہے ۔ قیمت ۱۲/

ابی سینیا نمبر اسی رسالہ نے اپنے اکتوبر و نومبر ۱۹۳۵ء کو ابی سینیا نمبر کی حیثیت سے شائع کیا ہے ۔ یہ نمبر درحقیقت حبش کی مختصر مگر نہایت دلچسپ تاریخ ہے اسمیں باشندگان ابی سینیا کی گھریلو زندگی ، فوجی دعوت دنیا کا سب سے پرانا راج ، وغیرہ جیسے دلچسپ اور قابل قدر مضامین شائع ہوئے ہیں ۔ حبش کے باشندوں ، خاص خاص حصوں ، بازاروں ، جانوروں وغیرہ کی متعدد تصویریں بھی دیگئی ہیں ۔ اٹلی اور حبش کے باہمی تعلقات بھی واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں ۔ جنگ اٹلی و حبش سے دلچسپی لینے والوں کو یہ نمبر ضرور پڑھنا چاہئے قیمت صرف ۸/ ۔ شائقین دونوں کتابیں مینیجر " بھوگول " الہ آباد سے طلب فرمائیں ۔

"بیچتا ہوں"

تضمین بر غزلِ حضرت جوش ملیح آبادی

(از مسٹر فیاض الدین احمد خاں فیاض گوالیاری بی اے)

میں آنکھوں میں رکھ کر گہر بیچتا ہوں — نگاہوں میں ذوقِ نظر بیچتا ہوں
مرا دل تو دیکھو کہ سر بیچتا ہوں — حسینو! میں داغِ جگر بیچتا ہوں
بہ نرخِ خزف تاجِ زر بیچتا ہوں

مرا دل ہی واقف ہے جیسے ہیں گاہک — کسی کے نہوں جیسے میرے ہیں گاہک
عجب کیا جو دیوانہ سمجھے ہیں گاہک — جہاں سنگریزوں پہ گرتے ہیں گاہک
وہاں جنسِ لعل و گہر بیچتا ہوں

جہاں دور ہیں ترش رو ساقیوں کے — جہاں منہ بنے رہتے ہیں بواؤں کے
گوارا جہاں گھونٹ ہیں آنسوؤں کے — جہاں قدرداں جمع ہیں تلخیوں کے
وہاں قند و شہد و شکر بیچتا ہوں

جہاں رنگ و خوشبو سے بیزاریاں ہیں — جہاں خشکیوں کی پرستاریاں ہیں
خزاں کی جہاں گرم بازاریاں ہیں — جہاں خار و خس کی خریداریاں ہیں
وہاں موجِ گلہائے تر بیچتا ہوں

جہاں چل رہی ہے ہوا نفرتوں کی — جگہ دل میں باقی نہیں الفتوں کی
وہاں دعوتیں متحد برکتوں کی — پرستاریاں ہیں جہاں ظلمتوں کی
وہاں نورِ شمس و قمر بیچتا ہوں

بنانے سے بگڑے جہاں زلفِ برہم — جہاں بے نیازی ہو نا واقفِ غم
وہاں سر بسجدہ ہوں با دیدۂ نم — جہاں دردِ دل کا مخالف ہے عالم
وہاں دردِ دل کا اثر بیچتا ہوں

جہاں دینا انسان کی اس کا گھر ہے — غریب اپنی ہستی سے بھی بے خبر ہے

جہاں پستی و مستی شام و سحر ہے　　جہاں جستجوئے سکونِ حضر ہے
وہاں آرزوئے سفر بیچتا ہوں

جہاں خفتہ ہے جذبۂ ننگ و غیرت　　جہاں گم ہیں ایثار و جوشِ حمیت
جہاں عظمتِ بے نقاب شرافت　　جہاں سات پردوں میں ہے ذوقِ جرأت
وہاں جذبۂ پردہ در بیچتا ہوں

غلامی کی بو ہے جہاں ہر نفس میں　　جہاں شہد لپٹا ہے پائے مگس میں
جہاں [illegible]　　جہاں ہر نیوتر ہے قانع قفس میں
وہاں دولتِ بال و پر بیچتا ہوں

جہاں یاس سے دل [illegible]　　گھرے جا رہے ہیں جہاں کھائیوں میں
جہاں [illegible]　　جہاں دست و پا شل ہیں پسپائیوں میں
وہاں تیغِ فتح و ظفر بیچتا ہوں

جہاں [illegible]　　جہاں رات ہی رات ہے دن نہیں ہے
جہاں جوش و ایثار [illegible]　　جہاں ترکِ یاس کوئی ممکن نہیں ہے
وہاں [illegible] بیچتا ہوں

جہاں دل [illegible]　　نگاہوں کو فرصت نہیں حیرتوں سے
جہاں [illegible]　　جہاں الفت ہے تنگ دامانیوں سے
وہاں وسعتِ [illegible] بیچتا ہوں

[illegible]　　بڑا حسن ہے حسنِ لفظی کے اندر
[illegible]　　چھپا کر ردیف و قوافی کے اندر
میں دل [illegible] بیچتا ہوں

تمنا و جوشِ دل و جہدِ کامل　　یہ چیزیں ہیں کونین کا مجھ کو حاصل
مری شان و عظمت سمجھنا ہے مشکل　　گدا ہوں مگر وہ گدا لئے غنیِ دل
نہ تاج و کلاہ و کمر بیچتا ہوں

خزانہ تپش کا ہے میرے جگر میں　　ملی ہے یہ دولت مجھے عمر بھر میں
لئے ہوں پیامِ عمل ہر نظر میں　　صدا دو کہ بازارِ نوعِ بشر میں

تمنائے روحِ بشر بیچتا ہوں

نظر آئے کس طرح گاہک کی صورت جہاں لوگ ہیں مائلِ خوابِ غفلت
وہاں ہوش کی دے رہا ہوں میں دعوت نہ ہوگا کوئی مجھ سا بھی تیرہ قسمت
کہ بازارِ شب میں سحر بیچتا ہوں

یہ وہ چیز ہے جس کو کوئی نہ پوچھے کوئی مفت بھی دے تو کوئی نہیں لے
مجھے شرم آتی ہے اب تو یہ کہتے کوئی مشتری ہو تو آواز دے دے
میں کمبخت جنسِ ہنر بیچتا ہوں

زمانہ میں یوں تو بہت سے ہیں شاعر مرا ہمنوا ہے تو فیاض ہے پھر
وہ ہے میرے رنگِ طبیعت کا ماہر سخن کے ہیں یوں تو بہت جوش تاجر
مگر میں برنگِ دگر بیچتا ہوں

جذباتِ بسمل

(از حضرت بسمل الہ آبادی)

عشق و وفا میں کام کے قابل بنا دیا ناکامیوں نے دل کو مرے دل بنا دیا
اک اک قدم پہ رہتی ہیں آنکھیں کھلی ہوئی افتادگیِ عشق نے کامل بنا دیا
رہ رہ کے دم قدم سے بڑھی قدر و منزلت منزل کو پائے شوق نے منزل بنا دیا
بڑھ بڑھ کے لے لیا مجھے موجوں نے گود میں تھا ڈوبنا جہاں وہاں ساحل بنا دیا
اک اک میں رنگِ حسن ہے اک اک میں بوئے حسن پھولوں نے کھل کے باغ کو محفل بنا دیا
خلوت کو دیکھتا ہوں تو جلوت سے کم نہیں اُن کے تصورات نے محفل بنا دیا
بولی یہ بڑھ کے موت کہ اے زندگی سلام جب زندگی نے موت سے غافل بنا دیا
مطلب یہ تھا کہ آئے ابد تک نہ مجھکو ہوش اُس نے ازل کے دن سے جو غافل بنا دیا
مجنوں نے کھینچ تان کے دامن کو بار بار دیوانگی میں صورتِ محمل بنا دیا

پڑھ دی غزل تڑپ کے تو دنیا تڑپ اُٹھی
بسمل نے ایک ایک کو بسمل بنا دیا

داؤد بھائی فاضل بھائی ایجوکیشنل ٹرسٹ

(از مسٹر ضیاء الدین احمد برنی۔ بی۔ اے۔)

ہندوستانی مسلمانوں میں اتنے مالدار کہاں کہ امریکہ کے اینڈریو کارنیگی کی طرح تن تنہا نوے کروڑ روپیہ خیراتی کاموں کے لئے وقف کردیں، یا پارسیوں کے واڈیا خاندان کی طرح کروڑوں روپیہ رفاہ عام کے لئے دیدیں۔ مسلمان مقابلتًا غریب ہیں لیکن اس غربت کے باوجود اُن میں بھی ایسے مخیّر اشخاص ہوگزرے ہیں جن کے دل اپنی قوم کی تعلیمی پستی اور زبوں حالی کو دیکھکر تڑپے اور جو انھوں نے اپنی حیثیت کے مطابق اُس کے ازالہ کی کوشش کی۔ کلکتہ کا محسن فنڈ بھی پاک جذبہ کا نتیجہ تھا۔ بمبئی کے مسافرخانوں کے نیک دل بانی کے دل میں یہی تڑپ تھی۔ سرفاضل بھائی کے خاندان نے بھی اسی نیک خیال سے متاثر ہوکر دس لاکھ روپیہ کی گراں قدر رقم بمبئی یونیورسٹی کے حوالہ کردی۔ مگر ان سب میں داؤد بھائی فاضل بھائی مرحوم کے تعلیمی ٹرسٹ کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ کئی اعتبار سے آپ ہی اپنی مثال ہے۔

مسٹر داؤد بھائی مرحوم خوجہ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدا میں اُن کے بزرگ آغا خانی تھے لیکن بعد میں انھوں نے اثنا عشری مذہب اختیار کرلیا۔ بمبئی میں یہ لوگ کچھ سے آئے تھے اور چونکہ وہ تجارت پیشہ تھے اس لئے مسٹر داؤد بھائی بھی اپنے اور رشتہ داروں کی طرح کاروبار میں لگ گئے۔ وہ مختلف قسم کا بیوپار کرتے تھے۔ لیکن اُن کی نیک نیتی دیکھئے کہ انھوں نے زندگی میں لاکھوں روپیہ پیدا کیا جو آج بھی سکونتی جائداد اور سرکاری کفالتوں کی شکل میں جوں کا توں موجود ہے۔ اُن کا انتقال ادھیڑ عمر میں ۱۲ جون ۱۹۱۹ء کو ہوا۔ مگر اپنی وفات سے پہلے وہ اپنی تقریبًا ساری دولت قوم کے لئے وقف کرچکے تھے۔ اُن کا ایک لڑکا تھا جس نے بدقسمتی سے عین عالم شباب میں وفات پائی۔ اب اُن کی یادگار اُن کی بیوہ کے علاوہ فقط دو لڑکیاں ہیں۔ لڑکیوں کی شادی ہوچکی ہے مگر پھر بھی اُن سب کو جائداد کے ایک مقررہ حصہ سے ماہوار امداد ملتی ہے۔ لیکن اُن کے بعد وہ رقوم بھی جو انھیں ماہوار دیجاتی ہیں اُسی تعلیمی فنڈ میں شامل ہوجائیں گی جو "داؤد بھائی فاضل بھائی ایجوکیشنل فنڈ" کے نام سے مشہور ہے اور جس کی مالیت اس وقت تیس لاکھ سے زیادہ ہے۔

یہ عظیم الشان تعلیمی فنڈ دو آنریری ٹرسٹیوں کے زیر انتظام ہے جن کے اسمائے گرامی مسٹر شریف دیوجی کانجی اور مسٹر داؤد بھائی فیضی ہیں۔ یہ واقعہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس ایجوکیشنل ٹرسٹ کا قیام ایک وسیع حد تک مسٹر شریف دیوجی ہی کی کوششوں کا رہین منت ہے اس لئے کہ انہی کی بار بار تحریک کا اثر تھا کہ مسٹر داؤد بھائی نے بالآخر اپنی وسیع جائداد مسلمانوں کی تعلیمی پستی دور کرنے کے لئے وقف کردی۔ اس ایک واقعہ سے دونوں حضرات کی قومی بہی خواہی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ ٹرسٹ اگرچہ ابتدائی قانونی مرحلوں کے بعد ۱۹۲۶ء سے باقاعدہ طور پر ٹرسٹیوں کی تحویل میں آیا ہے لیکن انھوں نے ۱۹۲۲ء ہی سے مسلمانوں کو وظائف دینے شروع کردئیے تھے۔ چند سال قبل انھوں نے پونا کے قریب ایک رہائشی ہائی اسکول قائم کرنے کی بھی کوشش کی تھی یہاں تک کہ اس کے لئے زمین وغیرہ بھی خریدی جاچکی تھی مگر عین وقت پر بعض مشکلات پیدا ہوگئیں جن کی وجہ سے یہ ساری اسکیم نامکمل رہ گئی۔

اس ٹرسٹ کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس بات کے باوجود کہ واقف سے لیکر ٹرسٹیوں اور سکریٹری تک سب کے سب اثنا عشری فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان حضرات نے ابتک شیعہ سنی کی بے معنی تفریق کا کوئی لحاظ نہیں کیا ہے۔ اولوالعزم واقف نے بھی یہ وقف جمہور مسلمانوں کی فائدہ رسانی کے لئے قائم کیا تھا نہ کہ کسی خاص فرقہ کے لئے۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو اُسے اثنا عشری فرقہ کے لئے یا خوجہ جماعت کے لئے محدود کرسکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

ٹرسٹ کی جانب سے دو قسم کے وظائف دیئے جاتے ہیں، اول وہ جو ہندوستان سے باہر تعلیم حاصل کرنے والوں کو دئے جاتے ہیں، دوم وہ جو ہندوستان کے کالجوں میں پڑھنے والوں کو عطا کئے جاتے ہیں۔ اول الذکر صورت میں ٹرسٹ کو ہزاروں روپیہ کے مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں، اور آخر الذکر صورت میں مقابلتاً کم روپیہ صرف ہوتا ہے۔ پھر بھی ۱۹۳۳ء تک پہلی مد میں دو سو چھ ۲۰۶ اور دوسری مد میں ایک ہزار سات سو پینتالیس طلبا مستفید ہوچکے ہیں۔ تعلیمی وظائف پر ۳۱ مارچ ۱۹۳۳ء تک ٹرسٹ گیارہ لاکھ کے قریب رقم صرف کرچکا ہے۔ ہندوستان کے باہر تعلیم کے لئے جو وظیفے دیئے جاتے ہیں اُن کے لئے طالب علموں کو ٹرسٹ سے باقاعدہ معاہدہ کرنا پڑتا ہے اور طلبا پابند ہوتے ہیں کہ غیر ممالک کی روانگی سے پہلے اپنی زندگی کا بیمہ کرائیں اور واپسی پر بصورت ملازمت وغیرہ انھیں اس وظیفہ کو (جو درحقیقت قرض حسنہ کی حیثیت رکھتا ہے

باقساط واپس کرنا پڑتا ہے تاکہ وہی روپیہ دوسرے مستحق طلبا کے کام آسکے۔ اور اس طور پر امداد کا سلسلہ برابر جاری رہ سکے۔ ہندوستان کے اندر رہ کر تعلیم پانیوالوں کو جو تھوڑی بہت امداد دی جاتی ہے وہ بھی قرض حسنہ کی شکل میں ہوتی ہے۔

جن مضامین کے لئے یہ وظائف دیئے جاتے ہیں وہ زیادہ تر ایسے ہیں جن کی ہندوستان کو فی الحال سخت ضرورت ہے۔ مثلاً ڈاکٹری، انجنیری، فن تعمیرات، اقتصادیات و معاشیات، زراعت سائینس، فن تعلیم وغیرہ وغیرہ مزید براں وظیفے عطا کرتے وقت خواتین کی بھی ہر طریقہ سے حوصلہ افزائی کیجاتی ہے مجھے پونا کی ایک خاتون کا حال معلوم ہے جنھوں نے ٹرسٹ کے دس بارہ ہزار روپے سے انگلستان سے تعلیمی ڈگری حاصل کی اور ٹرسٹیان نے صرف تعلیم نسواں کو ترقی دینے کی خاطر وہ رقم واپس نہیں لی

آنریری ٹرسٹیان جن کے شریک حال اُن کے قابل اور انتھک سکریٹری مسٹر فاضل مواج بھی ہیں ہمیشہ اس بات کے ساعی رہتے ہیں کہ جب طلبا فارغ التحصیل ہوکر ہندوستان واپس آئیں تو وہ مناسب ملازمت کی تلاش میں حتی المقدور اُن کے معین و معاون ہوں۔ چنانچہ میری نظروں کے سامنے متعدد مثالیں ایسی ہیں جن میں انھوں نے خلوص و ہمدردی کے ساتھ اپنے فارغ التحصیل طلبا کے لئے کوششیں کیں اور اُس وقت تک دم نہ لیا جب تک کہ اُن کے لئے موزوں ملازمتیں تلاش نہ کریں۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ ٹرسٹیوں کو لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کا بھی بیحد خیال ہے چنانچہ اب تک تین خواتین اس ٹرسٹ کی امداد سے یورپ بھیجی جا چکی ہیں اور ہندوستان کے مختلف مقامات سے ایک سو نو لڑکیاں مختلف شعبوں میں کامیابی حاصل کر چکی ہیں۔ اس کے علاوہ مستورات کے لئے بمبئی میں صنعت و حرفت کا ایک اسکول بھی جاری ہے جہاں مسلم عورتیں صنعت و حرفت کا کام سیکھتی ہیں تاکہ وہ اپنی روزی خود حاصل کرنے کے قابل ہوسکیں۔ ان پڑھنے والیوں میں سے چھیاسٹھ نے "فرسٹ ایڈ" کا امتحان پاس کر لیا ہے، اور تینتیس نے تیمارداری (نرسنگ) کا، اور آٹھ نے حفظان صحت کا۔ یہ سب امتحانات "سینٹ جونز ایمبولینس ایسوسی ایشن" بمبئی نے لئے تھے۔ دایاں اور نرسیں بنانے کی طرف بھی ٹرسٹیان توجہ کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ سن یافتہ مسلم دائیاں یا نرسیں مغربی ہند میں باقی سارے ہندوستان کی طرح بمنزلہ صفر کے ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ کمی جلد پوری ہو جائیگی

ٹرسٹیوں نے ایک اور مفید کام کی طرف اپنی توجہ مبذول کی ہے جس کا نتیجہ نہایت خاطر خواہ نکلا ہے۔ بمبئی کے مضافات میں ایک نیم سرکاری اصلاحی درسگاہ ہے جس کا نام "ڈیوڈ سیسون ریفارمیٹری اسکول" ہے۔ جہاں نوعمر مجرم ایک وقت معینہ تک عدالتی احکام کے ماتحت بغرض تربیت رکھے جاتے ہیں

بدقسمتی سے ایسے اصلاحی اسکولوں میں مسلم مجرمین کی تعداد تناسب آبادی سے کہیں زیادہ ہوتی ہے لیکن باوجود اس کے اُن کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام موجود نہیں ہے، حالانکہ عیسائی اور ہندو حضرات وہاں جاکر اپنے اپنے مذہب کی رضاکارانہ خدمت انجام دیا کرتے ہیں۔ اب داؤد بھائی فاضل بھائی ٹرسٹ کے ٹرسٹیوں نے اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ایک تنخواہ دار مولوی مقرر کیا ہے۔

ٹرسٹ کے روپیہ سے جو طلبا فارغ التحصیل ہوکر نکلے ہیں اُن میں سے بہت سے خدا کے فضل سے اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہیں، اور ان میں سے اکثر باقاعدگی کے ساتھ اپنے قرض کا روپیہ ادا کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ ٹرسٹ اُن کو امداد نہ دیتا تو اُن کے لئے ان عہدوں پر فائز ہونا درکنار اعلیٰ تعلیم پانا بھی ناممکن تھا اس لئے ان طلبا کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں تاکہ حقیقی معنوں میں یہ صدقہ جاریہ قائم رہ سکے۔

بہرحال اس ٹرسٹ کی بدولت بہت سے مسلمان بی۔ اے، ایل ایل بی، بی ٹی، ڈاکٹر، انجینیر، سائنس داں، پروفیسر وغیرہ بن چکے ہیں۔ اور مسلمانوں میں آج اعلیٰ مغربی تعلیم یافتہ اشخاص کی جو چند صورتیں نظر آتی ہیں اُن میں اس ٹرسٹ کی امداد کو بہت بڑا دخل ہے۔

شعرِ جدید

(از مُلّا رموزی)

ابھی فرزانے بن جائیں جنھیں کہتے ہیں دیوانے　　تری رنگیں جوانی کے اگر سن لیں یہ افسانے
پری سے بھی سوا کہئیے جوانی جس کی ہو ایسی　　نگاہوں میں ہوں میخانے اداؤں میں ہوں بتخانے
اگر تو ہو کبھی ساقی، صبا تک لے کے آئیگی　　پرستانوں سے میخانے، گلستانوں سے پیمانے
تری قربت سے اتنی تازگی محسوس کرتا ہوں　　گلستاں سے نظر آتے ہیں مجھکو سات ویرانے
ذرا رنگیں جوانی کو سنورتا دیکھ لینے دے　　تجھے پھولوں کی نذریں دینے آئیں گے چمن والے

رموزی میں نے یوں دیکھا ہے شمعِ حسن کو جلتے
کہ جلتے تو نہیں ہاں وجد میں رہتے ہیں پروانے

تنقیدِ کتب

فنِ انشاپردازی[1]

اس کتاب میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر اردو لٹریچر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے بڑی محنت اور کاوش سے اُردو انشاپردازی اور تصنیف و تالیف میں کامیابی حاصل کرنے کے ابتدائی اصول اور عملی طریقے درج کئے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں بچوں اور بڑوں، عورتوں اور مردوں سبھی کے لئے لکھنے کے طریقے بیان کر دئیے ہیں۔ کتاب کے تین باب ہیں (۱) کیوں لکھیں؟ (۲) کیا لکھیں؟ اور (۳) کس طرح لکھیں؟ بخصوصیت سے سبق آموز ہیں۔ انھیں تینوں باتوں کا علم گویا انشاپردازی اور تصنیف و تالیف کی ابجد ہیں۔ ان تینوں سوالوں کا جواب فاضل مصنف نے جو کچھ دیا ہے اس کا مختصر خلاصہ یہ ہے:۔ (۱) تفریح اور پیشہ، (۲) جو کچھ مشاہدہ یا خیال میں آئے۔ (۳) خیالات کو دلکش اور سلیس الفاظ کا لباس پہنائیے معمولی سی بات کو طول نہ دیجئے، شاعرانہ انداز میں لمبی چوڑی تمہید نہ لکھئے۔ روزمرہ اور آسان لفظوں کے بجائے موٹے موٹے غیر مانوس اور ٹھوس یا غیر زبانوں کے بے ضرورت الفاظ استعمال نہ کیجئے۔ طلسم ہوش رُبا یا فسانۂ عجائب کی سی شاعرانہ ترکیبوں کو اب کہیں بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ الفاظ آسان، فقرے مربوط اور تمام مضمون مسلسل اور مدلل ہونا چاہیئے۔ اختصار سے کام لیا جائے مگر اتنا کہ مطلب ہی خبط ہو جائے اور نہ اتنی طوالت ہو کہ ناظرین پڑھنے سے گھبرا جائیں۔ فاضل مصنف نے نو آموز انشاپردازوں کی مدد کے لئے کتاب کے آخر میں تقریبًا چارسو مضمونوں اور فسانوں کے عنوانات بھی دیدیئے ہیں۔ کتاب بہت اچھی، سبق آموز اور دلچسپ ہے، اور اسکول کے مدرس اور طلبا اس کی ہدایتوں سے بہت فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ سب عمدہ، تقطیع ۲۲×۱۷ انچ ۱۱۶ صفحات۔ قیمت غالبًا ایک روپیہ ہوگی۔

نغمۂ خداوندی[2]

یہ کتاب بھگوت گیتا کا نفیس اور سلیس اُردو ترجمہ ہے، جسے محمد اجمل خاں ایم۔ اے نے نہایت خوش اسلوبی سے انشوک داکیا ہے۔ فلسفۂ حیات کے متعلق گیتا دنیا کی بہترین کتابوں میں ہے۔ ہندوستان کیا مشرق

[1] مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔
[2] لکھائی چھپائی کاغذ معمولی۔ ضخامت ۷۶ صفحات۔ تقطیع چھوٹی۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ ادارۂ نوامیس آلہیہ (دائرہ) الہ آباد

کو اس پر فخر ہے۔ دنیا کی اکثر زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو میں بھی نثر و نظم کے بہت سے اچھے ترجمے موجود ہیں۔ لیکن نثر میں جو فاضلانہ اور سلیس ترجمہ اجمل خاں صاحب الہ آبادی نے کیا ہے وہ بہت قابل قدر ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ گیتا کے اشلوکوں میں بھگوان کرشن نے جو نکات بیان فرمائے ہیں اُن کے مقابل میں دوسرے کالم میں اسی مفہوم کے مشہور فارسی یا اُردو شعر بھی فاضل مترجم نے درج کر دیے ہیں، جس سے ترجمہ کی خوبی دوبالا ہو گئی ہے، مثلاً دوسرے ادھیائے کا بارھواں اشلوک:-

(۱۲) "میں کبھی عدم میں موجود نہ تھا، نہ تو، نہ	گاہے بفلک مہر درخشاں بودم	گاہے بہ ہوا ذرۂ پریشاں بودم
یہ راجے غیر موجود تھے۔ اور نہ ہم میں کوئی اس	گاہے [illegible] گاہے تن و گہ جاں بودم	[illegible] شوم کہ ہم آں بودم
کے بعد فنا ہوگا ہم سب غیر فانی ہیں		
(۱۶) جو شے غیر حقیقی ہے (لاوجود) اس کا	آئینۂ عدم ہی میں ہستی سے جلوہ گر	ہے موج نام پہ دریا سا [illegible]
وجود ہی نہیں، اور جو شے حقیقی ہے (باوجود)	ہر جزو کو کل کے ساتھ بھی ہے اتصال	دریا سے [illegible] ہے یہ سے موج آپ [illegible]
وہ کبھی فنا نہیں ہوتی جو لوگ عارف ہیں		
وہی دونوں کے اندازہ سے واقف ہیں		

الغرض جہاں کہیں مضمون واسطہ مل گیا ہے بالمقابل درج کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں اصل میں کوئی لفظ تشریح یا تلمیح طلب آ گیا ہے اس کی وضاحت فٹ نوٹ میں کر دی گئی ہے۔ اس کا مقدمہ بھی بہت قابل قدر ہے جس میں مختصراً حسب ذیل امور پر بحث کی ہے (۱) تاریخ قدیم (۲) ویدوں کا خدا (۳) پرانوں کا زمانہ (۴) برہمنوں کا علم الٰہی (۵) وشنو کے مختلف اوتار (۶) شری کرشن جی (۷) اسلام اور کرشن جی (۸) جنگ مہا بھارت (۹) بھگوت گیتا (۱۰) تاریخ تصنیف (۱۱) طرز انشا (۱۲) گیتا اور ذاتیں (۱۳) گیتا اور وید (۱۴) گیتا اور نجات (۱۵) گیتا کی تعلیم وغیرہ وغیرہ۔ ان عنوانوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فاضل مترجم نے کس قدر تلاش و محنت سے کام لیا ہے۔ غرض یہ ترجمہ ہر حیثیت سے قابل قدر ہے۔

"ساقی" کا چغتائی نمبر[1]

دہلی کا ادبی و علمی رسالہ "ساقی" کئی خاص نمبر قابل داد حسن انتظام سے شائع کر چکا ہے۔ اکتوبر کو اُس نے بالکل ایک نئے قسم کا خاص نمبر مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے، ایل ایل۔ بی کے نام نامی پر شائع کیا ہے۔ اس میں انیس[19] مضامین مرزا صاحب کے لکھے ہوئے شائع کئے گئے ہیں اور آخر میں ایک

---

[1] حجم دو سو صفحات قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: ساقی بک ڈپو۔ دہلی۔

مضمون مولوی فضل حق قریشی دہلوی کا لکھا ہوا ہے جس میں مرزا صاحب موصوف کی ادبی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ مرزا عظیم بیگ کے نام نامی سے ناظرین "زمانہ" بخوبی واقف ہیں۔ آپ نے چند ہی سال کے اندر بہت دلچسپ قصہ کہانیاں اور مزاحیہ مضامین لکھ کر اردو مصنفین کی صفِ اول میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی ہے۔ مرزا صاحب ایک زود نویس اور بے تکلف مصنف ہیں، اور قلم برداشتہ صفحات کے صفحات لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس خاص نمبر کے لئے اُنھوں نے جو مضامین لکھے ہیں وہ سب ایک سے ایک بڑھکر ہیں، مگر "سوانہ کی روحیں" اور "وقار احمد" "شہزوری" "قانونی تشوہ" اور "نوجوان ڈاکٹر" خاص طور پر قابل داد ہیں۔ ان مضامین کو دیکھکر ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے۔ مرزا صاحب نے زبان کی صحت اور عبارت کی عمدگی کے لحاظ سے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ یہ نمبر واقعی مطالعہ کے قابل اور بہت سے ناولوں سے اچھا ہے۔ شروع میں "چغتائی اینڈ سنز" کے نام سے مرزا صاحب اور اُن کے تین لڑکوں موہن، سوہن اور لکھن کی تصویر اور اُس کی پشت پر مرزا صاحب کی تحریر کا عکس ہے۔

پیام تعلیم دہلی (تاسیس نمبر)

یہ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ماہوار رسالہ "پیام تعلیم" کا سالگرہ نمبر ہے جو نومبر و دسمبر ۳۵ء کے پرچوں کی جگہ یکجائی شائع کیا گیا ہے، اور جس میں ملک کے مشہور اور مسلّمہ ادیبوں مثلاً پروفیسر رشید احمد صدیقی، منشی پریم چند، ڈاکٹر سید عابد حسین پی ایچ۔ ڈی، مولوی احمد اللہ قادری، پروفیسر محمد مجیب، خواجہ غلام السیدین پرنسپل ٹریننگ کالج علیگڈھ وغیرہ نے بچوں کے لئے خاص طور پر مضامین لکھے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ نمبر بچوں کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کی درسی کتاب ہے۔ اس میں ہر قسم کے دلچسپ مضامین، کہانیاں، عام فہم اور سلیس زبان میں درج کی گئی ہیں۔ رسالہ فوٹو بلاک اور ہاتھ کی متعدد تصویروں سے مزیّن ہے۔ قیمت آٹھ آنے۔ شائقین مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی سے طلب کریں۔

رسالہ "چاند" کا ودشی نمبر

ہندی کے مشہور رسالہ "چاند" الہ آباد کا نومبر گذشتہ میں تعلیم یافتہ خاتونان کا ایک خاص نمبر غیر معمولی اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ اس کی ترتیب کا کام شریمتی مہادیوی ورما ایم۔ اے کے ذمّہ تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ دیوی جی نے اپنے اس نمبر کو نہایت قابلیت سے ایڈٹ کیا ہے۔ اس نمبر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام مضامین عورتوں ہی نے لکھے ہیں جس سے ملک میں تعلیم نسواں کی ترقی اور عورتوں میں علمی بیداری کا ثبوت ملتا ہے۔ سبھی مضامین قابل قدر اور سبق آموز ہیں۔ اسکا حجم ۱۵۰ صفحات ہے، چار رنگی اور چار دیگر رنگین تصویروں کے علاوہ ستاون معمولی تصویریں ہیں۔ قیمت ۱؍ مینجر "چاند" الہ آباد سے طلب فرمائیے۔

ملک معظم جارج پنجم مرحوم

ملک الشعرائے انگلستان مسٹر جان میسفیلڈ نے شہنشاہ مرحوم کی وفات حسرت آیات پر ایک اردو نظم لکھی ہے۔
جس کا برجستہ ترجمہ ہمارے رفیق کار مولانا محمد یعقوب خاں کلام بی۔ اے نے کیا ہے جو ذیل میں درج ہے۔

جب سیہ جنگوں سے تھا روز سفید جب مصائب کی نہ تھی کچھ انتہا
جب نظر آتی نہ تھی شکلِ اُمید شاہِ انگلستاں تھا یہ مردِ خدا

اس کی ہمت لے گیا بر پا عَلَم جس کا سایہ بن گیا عالم پناہ
اس کی پامردی نے سب پیش و کم کر دیا ثابت کہ ہے شاہوں کا شاہ

مٹ گئی جب جنگ کی مکروہ شکل سامنے آیا خیالِ انقلاب
راویانِ صدق گو کرتے ہیں نقل اس نئی بدعت کے بانی شیخ و شاب

(ق)

مرد و زن، پیر و جواں چھوٹے بڑے جو مچانا چاہتے تھے شور و شر
اس کی ہمت اور کرم کے سامنے گرد تھے، مسحور تھے، یا منتشر

بادشاہ یوں تو بہت اپنے ہوئے لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا
جس نے ایسے نامساعد عہد سے سخت دشمن ہے جو تخت و تاج کا

(ق)

ہر طرح بچ کر بڑھائی آبرو اور دنیا بھر کے جھگڑوں سے نبٹ
آپ ہو کر فتحمند و سرخرو دیں زمانے بھر کی تقدیریں پلٹ

کل نشاناتِ شہی کی شان سے بیشتر رکھتا تھا وہ شاہانہ شان
درد اتنا تھا رعایا کا اُسے لوٹ جاتا تھا جو سنتا تھا فغان

الغرض تھا جارج پنجم نیک ذات
خوش خصائل۔ خوش شمائل خوش صفات

ملک معظم جارج پنجم مرحوم

۳ جون ۱۸۶۵ء — ۲۰ جنوری ۱۹۳۶ء

ابھی چند ہی ماہ ہوئے کہ تمام سلطنت برطانیہ میں ملک معظم جارج پنجم کے عہد حکومت کی سلور جوبلی بڑی دھوم دھام کے ساتھ منائی گئی تھی۔ کس کو معلوم تھا کہ ایک سال بھی پورا نہ ہونے پائیگا کہ ہمارے عزیز شہنشاہ معظم ہمیشہ کے لئے اپنی وسیع سلطنت کو داغ مفارقت دے جائیں گے۔ ۱۹۲۸ء میں آپ نے ایک شدید علالت کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا، مگر سات سال کے بعد ایک مختصر علالت سے جانبر نہ ہو سکے۔ چار پانچ روز کے اندر ہی اندر معمولی سی علالت نے خطرناک صورت اختیار کر لی اور آخر ۲۰ و ۲۱۔ جنوری ۱۹۳۶ء کی درمیانی رات کو گیارہ بجکر ۵۵ منٹ پر رنگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔ ۲۱ جنوری کی صبح کو اس دہشت انگیز سانحہ کی افسوسناک خبر تمام ملک میں بجلی کی طرح پھیل گئی اور گھر گھر ماتم برپا ہوگیا۔

ملک معظم جارج پنجم پہلے انگریز بادشاہ تھے جن کی تاجپوشی کی رسم ہندوستان میں بھی ادا ہوئی۔ آپ نے اس مبارک موقع پر اپنے اختیارات شاہانہ سے فائدہ اٹھا کر اپنی رعایا کی ایک وسیع جماعت کی ایک دیرینہ شکایت کو فقط ایک جنبش لب سے رفع کر دیا۔ دہلی دربار میں لارڈ کرزن کی تقسیم بنگال کو رد کرکے دہلی کو ہندوستان کا پایۂ تخت قرار دیا اور صوبہ متوسط آسام بہار میں نئے صوبے قائم کرکے اپنے مراحم خسروانہ کا جو زبردست ثبوت دیا اُس کی مثال انگریزی راج کی تاریخ میں شائد ہی کبھی دیکھنے میں آئی ہو۔ لارڈ کرزن کی گورنمنٹ کو تقسیم بنگال کے متعلق ایک ضد سی ہوگئی تھی۔ اہل بنگال بھی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے اور مصالحت کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ مگر جب خود ملک معظم جارج پنجم نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور رعایا کے جذبات کے ساتھ علانیہ ہمدردی کا اظہار کرنا طے فرمایا تو ساری مشکلیں آسان ہوگئیں۔ یہ اعلان بادشاہ مرحوم کی رعایا پروری کا ایک ادنیٰ ثبوت تھا۔ اس کے ساتھ ہی جس حسن تدبیر کے ساتھ اعلیٰحضرت نے اس کو ہندو مسلمانوں دونوں کے لئے مقبول بنایا اُس سے آپ کی دُور اندیشی اور معاملہ فہمی بھی بخوبی روشن ہوگئی۔ ہندوستان میں دربار تاجپوشی کے لئے تشریف آوری کا خیال بھی سب سے پہلے شاہ جارج پنجم ہی کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ وزرائے سلطنت شروع میں اس کے طرفدار نہ تھے۔ مگر تمام اہل ملک نے جس جوش و خروش سے ملک معظم اور ملکہ معظمہ کا استقبال کیا اُس کو دیکھکر بڑے بڑے مدبرین کو شاہ مرحوم کے اخلاق و دانشمندی کا قائل ہونا پڑا۔ ولیعہدی کے زمانہ میں بھی جب شاہ مرحوم و ملکہ معظمہ سیر و سفر کے لئے ہندوستان تشریف لائے تھے

تو لوگوں کو ہر موقع پر آپ کے حسن اخلاق اور رعایا پروری کے ثبوت ملے تھے۔ واپسی پر آپ نے لندن میں جو تقریر کی اس میں آپ نے اس بات پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا کہ حکمران طبقے کو ہندوستان کے روزمرہ نظم و نسق میں مزید ہمدردی سے کام لینا چاہیئے۔

واقعی شاہ جارج پنجم نے اپنے چھبیس سال کی حکومت میں ہر وقت اور ہر موقعہ پر رعایا کے جذبات کا پورا احترام کیا۔ تخت نشینی کے وقت شاہان انگلستان کو اپنے فرائض منصبی کے متعلق جو حلف لینا پڑتا ہے اس کے بعض فقرے رومن کیتھولک رعایا کے لئے دلشکن تھے۔ یہ فقرے زمانہ قدیم کی مخاصمتوں کی یادگار چلے آتے تھے لیکن شاہ جارج پنجم نے وزرائے سلطنت کو رضامند کر کے ان فقروں کو حلف کی عبارت سے خارج کرا دیا۔ چنانچہ آپ نے تخت نشینی اور تاجپوشی دونوں موقعوں پر جو حلف لیا اور اعلان فرمایا اس میں کوئی لفظ ایسا نہ تھا جو آپ کی رعایا کے کسی طبقہ کے لئے دلشکنی کا باعث ہوتا۔

اسی طرح جنگ عظیم کے زمانہ میں جب انگلستان کو ہر جرمن شئے سے منافرت و مخالفت ہو گئی تھی آپ نے اپنے خاندان کا جرمن نام تبدیل کر کے ہاؤس آف ونڈسر کا لقب اختیار کر لیا۔ چنانچہ آپ ہاؤس آف ونڈسر کے پہلے حکمران ہوئے۔ اور آپ کے بعد اب شاہ ایڈورڈ ہشتم اس خاندان کے دوسرے فرمانروا ہیں۔

اکثر بادشاہوں کو بدنام کرنے کے لئے لوگ جھوٹی سچی خبریں مشہور کر دیا کرتے ہیں۔ شاہ جارج پنجم کے متعلق بھی بعض منچلے لوگوں نے ایک خفیہ شادی کا فرضی قصہ گھڑ رکھا تھا اور تاجپوشی کے قبل ایک انگریزی اخبار اس جھوٹے قصے کو شائع کرنے کی جرأت بھی کر بیٹھا۔ بہت سے لوگ ان گستاخیوں کو نظرانداز کر جاتے مگر شاہ جارج پنجم کی خودداری نے خاموش رہنا گوارا نہ کیا اور تاجپوشی سے پہلے آپ نے اس معاملے کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا کر صاف کر لیا۔ عدالت نے مکمل و مفصل تحقیقات کے بعد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا جس کے بعد یہ جھوٹا قصہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو گیا۔

اس ادنیٰ سے واقعہ سے ملک معظم مرحوم کی خودداری اور غیرت نفس کا پتہ چلتا ہے۔ آئین و عدالت کے احترام میں بھی آپ نے حدیں کھینچ دیں۔ درحقیقت جس خوبی و کامیابی کے ساتھ آپ نے اپنے آئینی فرائض انجام دیئے اس کی وجہ سے تخت و تاج برطانیہ کی عزت میں آپ کی ذات شاہانہ کی بدولت غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔

پچھلے پچیس سال تمام دنیا کے لئے نہایت نازک گزرے۔ آپ کا عہد حکومت بھی سلطنت برطانیہ کے لئے خاص طور پر صبر آزما ثابت ہوا۔ اس اثنا میں قریب ق۔۔۔۔۔ اور ہر سلطنت میں انقلابات عظیم

رونما ہوئے۔ اور جنگ عظیم کی وجہ سے سیاسی اصولوں میں زمین وآسمان کا فرق ہوگیا۔ عوام کے خیالات اور طرز عمل دونوں میں حیرت انگیز تبدیلیاں ہوگئیں۔ بڑے بڑے شاہی خاندان کو تہ وبالا ہوگئے۔ عظیم القدر حکومتیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ لیکن انگلستان کے شاہی خاندان نے ملک معظم جارج پنجم کی رہنمائی میں خدمت خلق، ایثار نفس اور حسن اخلاق کی بدولت تاج وتخت کی بنیاد کو پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط کر لیا۔ لڑائی کے زمانہ میں آپ بارہا خود بہ نفس نفیس محاذ جنگ پر تشریف لے گئے شاہزادہ ولیعہد کو تعلیم ختم کرا کے شریک جنگ ہونے کے لئے میدان کارزار میں روانہ کردیا۔ ملکہ معظمہ نے بیماروں کی نگہداشت اور ہسپتالوں کے انتظامات کی نگرانی اپنے ذمہ لے لی۔ شاہزادی میری اور دیگر شاہزادگان نے بھی ہر ممکن ملکی خدمت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ اور مدبران سلطنت نے جو جو قواعد اور پابندیاں عوام کے لئے تجویز کیں اُن کی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تعمیل خود شاہ جارج پنجم اپنے محل شاہی میں بیٹھے ہوئے کرتے تھے۔

غرض شاہ مرحوم نے جمہوریت کے روز افزوں مطالبات کو اپنے ذات شاہانہ میں کچھ اس طرح جذب کر لیا کہ برطانیہ عظمیٰ کی رعایا کو واقعی دنیا کی بڑی سے بڑی جمہوریت سے بھی زیادہ حقوق واختیارات حاصل ہیں پھر لطف یہ کہ کامل آزادی ومساوات حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ جمہوری طرز حکومت کے نقائص سے وہ بالکل محفوظ ہیں۔ شاہ جارج پنجم کے عہد حکومت میں اس خصوصیت میں مزید ترقی ہوئی۔ جس سے آپ کی ذات شاہانہ سلطنت برطانیہ کے لئے ایک سرچشمۂ رحمت ثابت ہوئی۔

آپ نے تمام زندگی میں خدمت خلق اور رفاہ عام کو مد نظر رکھا۔ اس کے لئے آپ کی خاص طور پر تربیت بھی ہوئی تھی۔ شاہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کے دوسرے بیٹے ہونے کی وجہ سے آپ کی ابتدائی تعلیم وتربیت بحری کمانڈر کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ جس کی بدولت آپ کو سیر وسفر اور معلومات حاصل کرنے کے خاص موقعے ملے اور آپ سلطنت کے مختلف حصوں کے اصلی حالات سے واقف ہوگئے۔ یہ تجربہ آگے چلکر بہت مفید ثابت ہوا۔

مگر آپ کی کامیابی کا اصلی راز آپکی مردم شناسی، معاملہ فہمی اور انسانی ہمدردی تھی۔ آپ کی حق پسندی اور خوش اخلاقی نے آپ کو بہت جلد ہردلعزیز بنا دیا، اور یہ ہردلعزیزی آخر وقت تک بڑھتی ہی گئی۔ کیونکہ آپ ہمیشہ ملک اور سلطنت کے لئے ہر قسم کے ایثار کے لئے تیار رہتے تھے۔ جنگ کے موقع پر آپ نے لاکھ پاؤنڈ کی رقم اپنی جیب خاص سے سلطنت کے نذر کی تھی۔ لڑائی کے خاتمے پر جب مالی زیرباری کا زمانہ آیا تو آپ بخوشی خاطر اپنے شاہی محلات کی تعداد اور بعض دیگر مصارف شاہانہ میں تخفیف کرنے پر آمادہ ہوگئے مگر پارلیمنٹ

نے شاہی اخراجات میں کسی قسم کی کمی گوارا نہ کی۔

آپ کے عہد کے اہم مسائل میں آئرلینڈ کا قضیہ بھی سخت صبر آزما مسئلہ تھا جس کا حل بہت کچھ ملک معظم جارج پنجم کی ہمدردی، فراست اور مستقل مزاجی کی بدولت ہوا۔ مختلف پارٹی لیڈروں کو یکجا کر کے اس کا تصفیہ کرنا آپ ہی کا کام تھا۔ آئرش فری اسٹیٹ قائم ہونے کے بعد آپ خود بلفاسٹ تشریف لے گئے اور شمالی آئرلینڈ کی پہلی پارلیمنٹ کی افتتاحی رسم ادا کر کے آئرلینڈ کے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ صبر و رواداری سے کام لیکر درگذر کریں اور پچھلی باتوں کو بھلا دیں اور اپنے وطن عزیز کے لئے امن و اماں خوشحالی اور نیک نیتی کا نیا دور شروع کر دیں۔ غرض آپ نے آئرلینڈ کی دلجوئی میں اپنے طرف سے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

ہندوستان کے ساتھ بھی آپ نے ہمیشہ ہمدردانہ برتاؤ کی کوشش کی۔ پنجاب میں مارشل لا کے بعد آپ نے ہز رائل ہائینس ڈیوک آف کناٹ کو اسی لئے بھیجا تھا کہ وہ ہندوستانیوں کے دلوں کا ملال دور کر کے اس بات کا اطمینان دلائیں کہ سلطنت برطانیہ کے زیر سایہ رہتے ہوئے ہندوستان کو سوراج کی دولت نصیب ہو سکتی ہے۔

آپ کو اپنے عہد حکومت میں جنگ اور مسائل بعد از جنگ کے وجہ سے غیر معمولی تردّدات سے سابقہ رہا۔ چنانچہ بقول وزیر اعظم مسٹر بالڈون ملک معظم جارج پنجم کو اپنی شاہانہ زندگی کے دوران میں ایک لمحہ بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ مگر آپ نے اپنے فرائض منصبی کی ادائگی میں اپنے آرام و آسائش کا بھی خیال نہیں رکھا۔

آپ نے سلور جوبلی کے موقعہ پر جو پیغام رعایا کے نام بھیجا تھا اس میں بھی اس کے متعلق اشارہ تھا آپ کا یہ کہنا کہ "میری رعایا بڑی بڑی مشکلات اور آزمایش کے زمانہ میں میرے ساتھ رہی ہے" نہایت پُر معنی تھا بات یہ ہے کہ آئینی بادشاہ کی پوزیشن بہت مشکل اور نازک ہوتی ہے۔ انگلستان میں یہ سیاسی خیال انتہائے کمال تک پہونچ چکا ہے، چنانچہ بادشاہ کی ذات مجسم خیر و برکت ہوتی ہے اس کو ہر معاملہ میں اپنے وزرا کو مشورہ دینے کا حق حاصل ہے۔ جب وہ راہ راست پر ہوں اُن کی حوصلہ افزائی کرنا، غلطی پر ہوں تو انھیں نتائج سے آگاہ کرنا اُس کا فرض خاص ہے مگر جبر و قہر سے کام لینے کا اُسے اختیار نہیں ہے امور سلطنت سے نہ وہ اپنی ذات کو علٰحدہ کر سکتا ہے اور نہ کسی معاملہ میں ضد سے کام لے سکتا ہے۔ مختلف طبقوں میں مصالحت اور متضاد اُصولوں میں یگانگت پیدا کرنا اُس کا فرض منصبی ہے۔ شاہ جارج مرحوم نے اس اہم فرض کو تمام زندگی جس خوبی سے ادا کیا اُسی کی بدولت آج نہ صرف برطانیہ بلکہ تمام دنیا میں اُن کا ماتم برپا ہے۔

شاہ مرحوم نے اپنے آغاز حکومت میں اپنی زندگی رعایا کی خدمت میں صرف کرنے کا جو تہیہ کیا تھا اُسے آخر دم تک نبھا دیا۔ کہتے ہیں کہ آخری وقت میں جب آپ کو ذرا دیر کیلئے ہوش آیا تو آپ نے یہی پوچھا کہ سلطنت کا کیا حال ہے اور جب وزیر حاضرالوقت نے کہا کہ "سب خیریت ہے" تو آپ مطمئن ہو گئے۔

سر جان سائمن کا بیان ہے کہ موت سے پہلے جب کونسل آف اسٹیٹ قائم ہوئی تو آپ ضعف و نقاہت کے باعث بمشکل تمام اپنے دستخط کا نشان بنا سکے، وزرا کو اس کے لئے کئی منٹ کھڑے رہنا پڑا جس کے لئے آپ ان سے عذر خواہ ہوئے اور فرمایا کہ "مجھے اس طرح آپ کو منتظر رکھنے کا دلی افسوس ہے۔"

بیشک ملک معظم مرحوم بیحد خلیق اور منکسر مزاج واقع ہوئے تھے۔ آپ کی طبیعت نیک اور سادگی پسند تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے آپ کا برتاؤ ہمیشہ دل خوش کن رہتا تھا۔ روزمرہ زندگی میں وہ انتہائی رواداری کے عادی تھے جس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر آپ نے مہاتما گاندھی کو نہایت کشادہ دلی سے درباری لباس کی پابندیوں سے آزاد کر دیا جس سے مہاتما جی آپ سے لنگی اوڑھے ہوئے مل سکے۔

ذاتی حیثیت سے آپ کو بادبانی کشتیاں چلانے کا بڑا شوق تھا، آپ بہت اچھے نشانہ باز تھے اور ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا خاص شوق تھا۔ بچوں سے بہت محبت سے پیش آیا کرتے تھے۔ آپ کی شاہانہ زندگی کی کامیابی میں ملکہ محترمہ کوئن میری کو بھی بہت بڑا دخل تھا۔ جولائی ۱۸۹۳ء سے جب آپکی شادی ہوئی اسوقت ملکہ معظمہ میری نے جس حسن و خوبی سے اپنے منصب عالی کے تمام فرائض ادا کئے۔ ہر موقع پر شہنشاہ معظم کی رفاقت و ہمنوائی کا جو حق ادا کیا اُس کی تعریف حد بیان سے باہر ہے۔ اس سانحۂ عظیم میں بھی آپ نے جس صبر و استقلال سے کام لیا ہے اُس کا تمام رعایا کے دلوں میں ایک خاص اثر ہوا ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ اس صدمۂ جانکاہ میں ہر فرد بشر کی ہمدردی آپ کے شامل حال ہے۔

ملک معظم آنجہانی کی عمر اس وقت ستّر سال کی تھی، اسی عمر میں آپ کے والد گرامی شاہ ایڈورڈ ہفتم کا بھی انتقال ہوا تھا۔ سات سال ہوئے جس شدید علالت سے آپ بمشکل جانبر ہوئے تھے اُس کی وجہ سے آپکی معمولی صحت میں فرق آگیا تھا۔ اور اسطرف کچھ عرصے سے آپکی تندرستی خاطر خواہ نہ تھی۔ چنانچہ صرف پانچ روز کی علالت پیام مرگ ثابت ہوئی

آپ موجودہ عہد کے بہترین بادشاہ تھے، یہی وجہ ہے کہ آج جب آپ دنیا میں موجود نہیں ہیں تمام دنیا

آپ کے ماتم میں سوگوار ہے۔ آپ کی تجہیز و تکفین میں دنیا کے سبھی ممالک کے حکمران اور قائم مقام شریک تھے۔ ساڑھے نو لاکھ آدمیوں نے آپ کے تابوت کی زیارت کی۔ آپ کے جنازے کا جلوس ایک میل لانبا تھا۔ خداوند تعالیٰ آپ کی روح پُر فتوح کو اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور خاندان شاہی کو خصوصاً شاہ معظم اڈورڈ ہشتم کو اس حادثۂ عظیم کے برداشت کی قوت عطا فرمائے۔

شہنشاہ اڈورڈ ہشتم

اب جواں بخت و جواں سال شاہزادہ ویلز اڈورڈ ہشتم کے لقب سے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ ابھی آپ کی عمر صرف اکتالیس سال کی ہے۔ مگر آپ دنیا کا کونا کونا دیکھ چکے ہیں۔ اور موجودہ زمانہ کے مسائل اور تحریکات سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ ۲۳ جون ۱۸۹۴ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اپنے چار بھائیوں میں آپ ہی سب سے بڑے ہیں۔ آپ نے بھی شروع میں بحری کالج میں تعلیم و تربیت پائی ہے اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل ہو کر آپ نے معمولی طالب علم کی حیثیت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آکسفورڈ میں آپ دوسرے انڈر گریجویٹوں کی طرح بالکل معمولی طور پر زندگی بسر کرتے تھے، اور یونیورسٹی کے روزمرہ مشاغل اور کھیلوں میں بالکل اُسی طرح حصہ لیتے تھے جیسے اور طالب علم جنگ یورپ کی وجہ سے آپ کو یونیورسٹی تعلیم چھوڑ کر فوج میں داخل ہونا پڑا۔ اگست ۱۹۱۴ء کو آپ بری فوج کے سکنڈ لفٹنٹ مقرر کئے گئے، اور تین ماہ بعد فرانس تشریف لے گئے جہاں آپ نے برٹش کمانڈر انچیف کے اے ڈی کانگ کے فرائض انجام دیئے۔ اس طرح اٹھارہ ماہ تک آپ نے فرانس اور بلجیم کے محاذ پر کام کیا۔ اس دوران میں آپ کو ہر قسم کے خطرات سے سامنا رہا، اور ہر طرح کی تکلیفیں بھی اُٹھانا پڑیں۔ کئی موقعوں پر آپ کی جان جوکھوں میں رہی۔ مگر آپ نے ادائے فرائض کے سامنے کسی خطرے کی پرواہ نہ کی۔

۱۹۱۶ء میں آپ مصر کی فوج میں شامل ہوئے، اور اس محاذ پر بھی مختلف مقامات میں کام کیا۔ یہاں کے بعد ۱۹۱۷ء میں آپ اطالوی محاذ پر تعینات ہوئے اور آئندہ سال یعنی ۱۹۱۸ء میں پھر فرانس بلائے گئے۔ جہاں لڑائی کے خاتمے تک آپ نے کنیڈا کی فوج کے ساتھ کام کیا۔ چند دنوں کے لئے آپ آسٹریلیا کی فوج کے ساتھ رائن کے علاقے میں بھی رہے۔ اور صلح ہونے پر انگلستان واپس آکر اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مشغول ہو گئے۔ اس سلسلے میں ۱۹۲۰ء میں آپ نے آسٹریلیا کا سفر کیا ۱۹۲۱-۲۲ء میں ہندوستان اور جاپان کی سیاحت کی ۱۹۲۳ء میں کنیڈا اور ۱۹۲۴ء میں امریکہ

تشریف لے گئے۔ ۱۹۲۶ء میں افریقہ اور ۱۹۳۱ء میں جنوبی امریکہ کی سیر کی۔ اس کے علاوہ کئی دفعہ یورپین ممالک جا چکے ہیں۔ اس طرح پچھلے پندرہ سال کے اندر آپ دنیا کے چالیس ملکوں کی سیر اور دو لاکھ میل سے زائد سفر کر چکے ہیں۔ اور مختلف زبانوں سے واقف ہیں۔

آپ نے اپنے حسن اخلاق خندہ روئی اور کشادہ دلی سے لکھو کھا آدمیوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ آپ کو ہر طبقہ اور ہر جماعت سے سچی ہمدردی ہے، اور غربا سے تو آپ کی طبیعت کو ایک خاص محبت ہے۔ انگلستان کے مزدور پیشہ لوگوں کی اصلی حالت آپ خود بہ نفس نفیس ان کے گھروں میں جا کر چشم ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے دورے کے موقع پر بھی ایک دفعہ آپ اپنے مصاحبوں سے الگ ہو کر اچھوتوں کے محلے میں پیدل چلے گئے تھے۔ اور کئی اچھوتوں سے ہاتھ ملا کر ان سے بے تکلفی سے بات چیت کی۔

آپ کو اپنے بھائیوں سے بڑی محبت ہے۔ آپ نے ہر موقع پر اپنے والد گرامی اور والدہ معظمہ کا انتہائی احترام کیا ہے۔ یہ بات شاید کم لوگوں کو معلوم ہو گی کہ آپ اپنے جاگیر کی آمدنی کا ایک معقول حصہ شاہ معظم کو نذر کر دیا کرتے تھے۔

آپ کی شجاعت و مردانگی، قادر اندازی اور شہسواری کی شہرت بھی تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ آپ کی مستعدی اور رعایا پروری کا کئی اہم موقعوں پر ثبوت مل چکا ہے۔ غرض آپ تعلیم و تربیت اور اوصاف ذاتی کے لحاظ سے دولت مشترکہ برطانیہ کے آئینی بادشاہ ہونے کے ہر طرح سے اہل ہیں۔ آپ کی بے نفسی اور بلند نظری کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنے اعلان شاہی میں "سلطنت برطانیہ" کو "مشترکہ دولت برطانیہ" کے دلخوش کن لقب سے یاد کیا ہے۔ اور پارلیمنٹ کے نام جو پیغام بھیجا ہے اس میں پرانے دستور کے مطابق "اینجانب یا ما بدولت" کے رسمی الفاظ کے بجائے اپنی ذات شاہانہ کے لئے کلمۂ واحد یعنی صرف "میں" استعمال کر کے اپنی اولوالعزمی و روشن خیالی کا ثبوت دیا ہے۔ آپ نے بھی اپنی مقصد زندگی سلطنت کی خدمت کیلئے وقف کر دی ہے اور اپنے والد نامدار کے نقش قدم پر چلنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔

خداوند تعالیٰ آپ کی عمر دراز اور اقبال بلند کرے، اور آپ کے عہد حکومت میں "دولت مشترکہ برطانیہ" صحیح معنوں میں آزاد قوموں اور خود مختار ملکوں کا ایک متفقہ و متحدہ مجموعہ بن جائے۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد



ملک معظم ایدورد هشتم



ملک معظم ایڈورڈ ہشتم بہ حیثیت ولیعہد
ڈرہم کے ایک مزدور کے گھر میں

زمانہ

جلد ۶۶   فروری ۱۹۳۶ء   نمبر ۱

وسطی ایشیا میں قدیم ہندوستان کے آثار

(از مولوی محمد یعقوب خاں صاحب ظلام بی۔اے)

اگرچہ یہ نظریہ ابھی تصفیہ طلب ہے کہ مصری، عراقی اور ہندوستانی تہذیبوں میں کون قدیم ترین ہے[1] اور کس کا اثر ایک دوسرے پر زیادہ پڑا ہے، لیکن یہ ایک مسلمہ واقعہ ہے کہ وسطی ایشیا، تبت، چین، کوریا، جاپان، جزائر شرق الہند مثلاً بورنیو، فلیپائن، بالی، سماترا، جاوا اور ممالک ہند چینی کمبوجیہ، انام اور سیام، سب کی تہذیبوں پر قدیم ہندوستان کے عظیم احسانات ہیں۔

بعض حضرات کا یہ قول ہے کہ "ہندو غیر ملکوں کو اس وجہ سے نہیں جاتے تھے کہ وہ اغیار کو زیر کرکے مالا مال ہوں، بلکہ انھیں شایستہ بنانے کی کوشش کرتے تھے ... صرف دنیا میں ایک ہی قوم ایسی تھی جو ملک گیری کے عام اور مسلمہ مقصود سے بہت کچھ الگ تھی اور وہ پرانے زمانے کی ہندو قوم تھی۔[2]" لیکن اس قول کی پراچین ہندو پشتکوں اور قدیم ہندو روایات سے تردید ہوتی ہے۔ کیونکہ ہندو راجاؤں نے گرد و نواح کے فرمانرواؤں کو زیر کرکے اور غیر ممالک میں اپنی فوجی مہمیں بھیجکر فتوحات حاصل کی تھیں۔ فتح کے بعد ایک عظیم الشان "اسومیدھ یگیہ" منایا جاتا تھا جس کے بعد فاتح مہاراجہ "چکرورتی" راجہ کے خطاب کا مستحق ہوجاتا تھا۔ مہابھارت میں اس قسم کے یگیہ اور فوجی مہموں کا ذکر موجود ہے۔ بہرحال خواہ

---

[1] شاہان بابل و نینوا میں دسرتھ اور آشور بنی پال نام کے راجہ گذرے ہیں جو ہندو نام ہیں۔
[2] رسالہ "زمانہ" اگست ۱۹۲۶ء صفحہ ۵۹

بذریعہ فتوحات، خواہ بذریعہ تجارت و نوآبادکاری قدیم ہندوستان غیر ملکوں پر اپنی تہذیب و معاشرت کا اثر ڈالتا تھا جس کا ثبوت غیر ملکوں میں آثار قدیمہ کی صورت میں آج تک موجود ہے۔

سماترا، جاوا، بالی، کمبوجیہ اور سیام کے ہندوستانی آثار پر انگریزی اور ہندوستانی رسالوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے اس مضمون میں ہم صرف ان قدیم ہندوستانی آثار کا ذکر کرینگے جو حال میں وسطی ایشیا سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان آثار قدیمہ تک دسترس کیونکر ہوئی، اس کا ذکر ذیل میں آتا ہے۔

۱۸۸۹ء میں لفٹننٹ باور (Bower) نامی ایک نوجوان انگریز فوجی افسر ریاست کشمیر میں گلگت کی شمالی سرحد پر تعینات تھا، جو سیر و سیاحت یا دریافت حالات کے شوق میں مشرقی ترکستان کے چینی علاقہ میں جا گھسا اور پھرتا پھراتا کوچہ نامی ایک چھوٹے سے ترکی قصبہ میں پہونچ گیا جو صحرائے تکلا مکان کی شمالی حد پر واقع ہے۔ یہاں اس نے دو کباڑیوں سے بھوج پتر پر لکھی ہوئی قدیم تحریروں کا ایک بنڈل خریدا۔ کباڑیوں کو وہ تحریریں قصبہ کوچہ سے کچھ فاصلہ پر موضع قم تورہ کے قریب ایک پرانی عمارت کے کھنڈروں سے دستیاب ہوئی تھیں۔

شدہ شدہ یہ تحریریں کلکتہ پہونچیں، اور جب بعض ماہرین مشرقیات نے انھیں دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تحریریں سنسکرت زبان کی ہیں جو ایک قسم کے شکستہ ہندی خط میں لکھی ہوئی ہیں جس کا چوتھی صدی عیسوی کے آخری نصف تک شمالی ہندوستان میں عام رواج تھا۔ ان تحریروں کے مضامین کا تعلق مبادیات سائینس، ایوروید، رمل جوتش، جنتر منتر وغیرہ سے تھا۔ اور گو ان تحریروں کے لکھنے والے کا نام کہیں درج نہ تھا لیکن قرائن سے پتہ چلتا تھا کہ وہ شمال مغربی ہندوستان کا رہنے والا کوئی بودھ بزرگ تھا۔

چونکہ اس سے پہلے بھوج پتر یا کتاں پر لکھی ہوئی ہندوستان سے متعلق اتنی پرانی کوئی تحریر دستیاب نہیں ہوئی تھی، اس لئے ان تحریروں کی ماہرین مشرقیات کی نظروں میں بیحد قدر و منزلت ہوئی۔

اس واقعہ سے تین سال بعد یعنی ۱۸۹۲ء میں موسیو دوترِیل (Duteruil de Rhins) نامی ایک فرانسیسی سیاح ملک ختن میں صحرائے تکلا مکان کی جنوبی سرحد کے برابر برابر سفر کرتا ہوا ایک بستی میں وارد ہوا جہاں حسنِ اتفاق سے اس کو کسی مقامی کباڑی سے بھوج پتر پر لکھی ہوئی ایک تحریر کے چند ورق مل گئے۔ پیرس سے جا کر یہ اوراق جب بعض ماہرین مشرقیات کو دکھائے گئے تو معلوم ہوا کہ یہ بدھ مت کی مشہور مذہبی کتاب "دھرم پد" کے اوراق پریشاں ہیں جن کی زبان یا پراکرت "پشاچی"

اور رسم الخط "خروشتی" ہے جو دوسری صدی عیسوی میں شمال مغربی ہندوستان کا رائج الوقت رسم الخط تھا۔ اس طرح گویا ہندوستان سے تعلق رکھنے والی دو تحریریں صحرائے تکلا مکان کی شمالی اور جنوبی سرحدوں پر دستیاب ہوگئیں۔ جن سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ چوتھی صدی شمال مغربی ہندوستان میں "براہمی" اور دوسری صدی میں "خروشتی" رسم الخط رائج تھے۔ ان تحریروں کو دیکھکر ممالک مغرب اور ہندوستان کے ماہرین مشرقیات کے دلوں میں قدرتی طور پر چینی ترکستان میں پہونچکر علمی تحقیقات کرنے کا شوق پیدا ہوگیا۔

لیکن اس زمانہ میں چینی ترکستان کی سیاسی و طبعی حالتیں کچھ اس قدر ناقابل اطمینان تھیں کہ مصارف سفر کی زحمت برداشت کرکے وہاں کوئی باقاعدہ تحقیقاتی مہم بھیجنا دشوار تھا اور کامیابی کی بھی کوئی توقع نہ تھی۔ اس لئے حکومت ہند نے حصول مقصد کی یہ سبیل نکالی کہ اپنے تجارتی ایجنٹوں کو جو ختن اور یارقند میں تعینات تھے ہدایت کردی کہ مقامی کباڑیوں یا اس علاقہ کے کھنڈرات کھودنے والوں سے جو پرانی چیزیں دستیاب ہوں وہ خرید کر بحفاظت تمام کلکتہ بھیجدی جائیں۔

اس ہدایت کے بعد ۱۸۹۵ء اور ۱۸۹۸ء کے درمیان چینی ترکستان سے انگریزی ٹریڈ ایجنٹوں کی معرفت بہت سا پرانا سامان ہندوستان آیا جس میں مختلف قسم کی بیشمار چیزیں تھیں۔ مثلاً سنسکرت اور چینی زبان کی قدیم تحریریں جو کاغذ اور بھوج پتر پر لکھی ہوئی ہیں۔ بعض تحریریں ایسی زبان اور خط میں لکھی ہوئی ہیں جن کا پڑھنے اور سمجھنے والا چینی ترکستان سے باہر کوئی نہیں ہے۔ تعمیری مسالہ کی ابھری ہوئی مورتیاں، بدھمت کے بزرگوں کے بت جیسے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر برآمد ہوچکے ہیں، مٹی کے کھلونے، برتن، مہریں، سکے، اور پتھر، دھات یا لکڑی کی بنی ہوئی مختلف چیزیں وغیرہ جن کا زیادہ تر تعلق بدھ مذہب سے تھا، اور جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستان کے بودھوں نے چینی ترکستان پر زبردست مذہبی اور سماجی اثر ڈالا تھا۔

قدیم ہندوستان کے یہ آثار وسطی ایشیا میں دستیاب تو ضرور ہوچکے تھے لیکن اُن کی تاریخی قدر وقیمت خاک میں مل گئی تھی کیونکہ یہ نہیں معلوم ہوسکا تھا کہ کونسی چیز کب اور کہاں سے ملی تھی، یا سطح زمین سے کس قدر نیچے ملی تھی۔ مگر اس امر کا اطمینان ضرور ہوا کہ اگر وسطی ایشیا میں آثار قدیمہ کی برآمد و تحقیقات کے لئے کوئی علمی مہم بھیجی جائے تو قدیم سامان بہت کافی مقدار میں دستیاب ہوگا۔ اسی کے ساتھ ایک خرابی یہ بھی ہوئی کہ بعض لوگوں نے مالی منفعت کی لالچ سے بہت سے پرانے کھنڈر کھودنے شروع کردیے جس سے موقع پر پہونچکر تحقیقات کرنا اور بھی مشکل ہوگیا۔

بہر حال گورنمنٹ ہند نے وسطی ایشیا کو ایک علمی مہم روانہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ خوش نصیبی سے اُس زمانہ میں ایک یورپین ماہر مشرقیات اور محقق آثار قدیمہ ہندوستان میں موجود تھا، یہ اسٹین صاحب تھے جو بعد میں سر آریل اسٹین کے بی سی آئی ای کے نام سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے وسطی ایشیا کے سفر کی زحمتیں برداشت کرنے اور اس مہم کی رہنمائی کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور حکومت نے ان کی خدمات منظور کر لیں۔

سر آریل اسٹین سنہ ۱۹۰۰ء اور سنہ ۱۹۱۵ء کے درمیان ہندوستانی آثار قدیمہ کی تلاش میں تین مرتبہ وسطی ایشیا میں گئے اور چین خاص کی مغربی سرحد سے لیکر ماوراء النہر اور مشرقی ایران کی سرحد تک آثار قدیمہ کی تلاش اور علاقوں کی جغرافیائی مساحت کی، جو میدان تحقیق کی وسعت اور ملک کی دشوار گذار طبعی حالت کو دیکھتے ہوئے واقعی ہفتخوان رستم سے کم کارنامہ نہیں ہے۔ ڈیڑھ ہزار فٹ اونچے پہاڑوں کو عبور کرنا اور بے آب و گیاہ ریگستانوں کی خاک چھانکر آثار قدیمہ کی علمی اور تاریخی تحقیقات کرنا خصوصاً اس وقت جب نقل و حرکت اور بار برداری کے موجودہ ذرائع میسر نہ تھے، واقعی ایک قابل یادگار علمی خدمت ہے۔

چینی ترکستان کا وسیع علاقہ چاروں طرف اس قدر بلند اور دشوار گذار پہاڑی سلسلوں سے گھرا ہوا ہے جن کا ضروری اسباب کے ساتھ عبور کرنا بہت مشکل ہے۔ شمال میں تین شان کے سر بفلک پہاڑوں کا سلسلہ اُسے زنگاریہ اور منگولیا سے جدا کرتا ہے۔ مغرب میں پامیر کا رفیع الشان حدب جسے بلندی کی وجہ سے "بام دنیا" کہتے ہیں، اسے افغانستان، روسی ترکستان اور ایران سے علیحدہ کرتا ہے، جنوب میں سلسلہ قراقرم، ہندوستان، کوہستان کوئن لین، تبت اور نان شان کا سلسلہ چین سے الگ کرتا ہے۔ یہ تمام پہاڑی سلسلے اس قدر بلند اور دشوار گذار ہیں کہ تنگ دروں اور خطرناک گھاٹیوں کے سوائے انھیں عبور کرنے کا اور کوئی موقعہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس علاقہ میں نہ جنوب کی مانسونی ہوائیں پہونچ سکتی ہیں نہ شمال کی بارانی گھٹائیں آسکتی ہیں جس کی وجہ سے یہ علاقہ ایک خشک اور لق و دق ریگستان ہے جس کا طے کرنا اونٹوں کے ذریعہ سے بھی مشکل ہے۔ دور دراز فاصلوں پر جہاں کوئی چشمہ نکل آیا ہے مختصر سی آبادی نظر آتی ہے، ورنہ تمام ریگستان جسے تکلہ مکان کہتے ہیں ایک غیر آباد اور بنجر بیابان ہے۔ ریگ رواں کے باعث قافلوں کے راستے معدوم ہوجاتے ہیں اور مردہ اونٹوں کے ڈھانچوں کے سوا اور کوئی چیز ان گم شدہ راستوں کا نشان نہیں دیتی۔ ریگستان کے اس بیابان میں صرف دو کاروانی راستے ہیں، ایک تکلہ مکان کے شمالی اور دوسرا جنوبی کنارہ کے متوازی شرقاً و غرباً گذرتا ہے، اور یہ دونوں راستے مشرقی کنارہ پر مقام آلتسی میں مل جاتے ہیں جو دریائے

کی وادی میں واقع ہے۔ انہی دقتوں کے باعث اس ملک کا حال بیرونی دنیا کو بہت کم معلوم ہے۔

سر آسٹین کی پہلی تحقیقاتی مہم ریاست کشمیر کے پایۂ تخت سری نگر سے ۲۰ مئی سنہ ۱۹۰۰ء کو روانہ ہوئی اور امپیریل ٹرانسپورٹ روڈ پر سفر کرتی ہوئی ہونزا اور ناگر کی وادیوں کو عبور کر کے پامیر کے علاقہ تاغدمباش میں درۂ کلیک سے گذر کر تاشقرغان پہونچی جو چینی ترکستان کے مغربی علاقہ ساریکول کا صدر مقام ہے۔ یہاں کچھ دنوں دم لے کر یہ مہم پہاڑوں میں سفر کرتی ہوئی ۲۹ جولائی سنہ ۱۹۰۰ء کو کاشغر پہونچی، اور کچھ دنوں گرد و نواح کے پرانے کھنڈروں میں کھدائی اور تحقیقات کر کے تکلا مکان کے جنوب مغربی اور جنوبی کنارہ کے برابر برابر دیکھ بھال اور تحقیقات کرتی ہوئی نخلستان آندرہ تک گئی۔ یہ کاشغر سے بخط مستقیم تین سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور درمیان میں ختن، دموکو، کیریہ، اور نایہ کے علاقے پڑتے ہیں۔ ان تمام مقامات میں ریت کے نیچے دبی ہوئی پرانی عمارتوں اور معبدوں و مقبروں میں ہندوستانی وضع کے قدیم بدھی آثار ملے بعض تحریریں اور سکے ایسے بھی دستیاب ہوئے جو سن عیسوی کی پہلی دس صدیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ کام اس مہم نے سال بھر میں انجام دیا۔ سب سے زیادہ وقت دھمی و براہا و ندان یولکین میں صرف ہوا جو ریگستان کے قلب میں واقع ہے۔ کچھ چیزیں ملک ختن کے پرانے دارالحکومت یتقان سے بھی برآمد ہوئیں جس جگہ دریائے نایہ پہلے بہتا تھا مگر اب خشک پڑا ہوا ہے وہاں ایک پرانی بستی کی عمارتیں اور نیچے بھی ریت میں دبے ہوئے برآمد ہوئے۔

مندرجہ بالا اور دیگر مقامات سے آثار قدیمہ کا جو یہ عظیم الشان مجموعہ برآمد ہوا اس میں قدیم فنون کے کارنامے، صنعت و حرفت کے نادر نمونے، کاغذ، چمڑے اور لکڑی پر کتبے اور عام و خاص کے استعمال کی بیشمار چیزیں تھیں جن کے مطالعہ سے نہ صرف قدیم ہندوستانی تمدن کا پتہ چلتا تھا بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ دو ڈیڑھ ہزار برس پیشتر جو تہذیب و تمدن چینی ترکستان میں نظر آتا تھا وہ یونانی، ایرانی، تورانی، ہندوستانی تبتی اور چینی تمدنوں کا ایک مجموعہ تھا جس کے حالات باوجود چند در چند موجودہ دنیا کو معلوم نہیں ہیں۔ غرض سر آرل اسٹین کے انکشافات سے یورپ کے علمی مرکزوں میں وہ رجحان پیدا ہو گیا کہ برلن، لینن گراڈ اور پیرس سے ماہرین آثار قدیمہ کی باقاعدہ مہمیں چینی ترکستان میں پہونچ گئیں اور خاص طور پر مشرقی اور شمال مشرقی علاقوں میں چھان بین شروع کر دی۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں حکومت ہند اور برٹش میوزیم کے مشترکہ اہتمام اور صرفہ سے سر آرل اسٹین کی سرکردگی میں ایک دوسری مہم تیار کی گئی جو اپریل کے مہینہ میں سرحد افغانستان کے برابر برابر سفر کرتی ہوئی ایک نئے راستہ سے جس پر ابھی تک کسی یوروپین کا گذر نہیں ہوا تھا، روانہ ہوئی اور دیر و سوات کی سرحدی ریاستوں

ے گذرتی ہوئی درۂ لوواری کو عبور کرکے چترال میں جا پہونچی۔ چند روز یہاں دم لیکر دۂ مستوج اور درکوٹ
ی دروں سے گذر کر افغانستان کے صوبۂ بدخشاں میں جا پہونچی، اور پھر وہاں سے پامیر کا افغانی علاقہ
ور کرکے چینی ترکستان کے شہر سارکیول میں جا کر دم لیا۔ یہاں سے پوری طرح انتظامات کرکے اس مہم
ے پچھ دلوں تو انھیں مقامات میں کھدائی کی جہاں سے پہلے کچھ سامان برآمد ہو چکا تھا۔ لیکن اس
بعد تکلا مکان کی جنوبی حد کے متوازی سفر کرتی ہوئی چرچان۔ واش شہری۔ چارلیق اور میراں پہونچی
یگستان لاپ کے مشرقی سرے پر واقع ہے۔ ان مقامات میں کھدائی اور تحقیقات کرکے یہ مہم اور
ے بڑھی اور نخلستان تون ہوانگ اور چین کے صوبہ کانسو تک تحقیقات کرتی چلی گئی۔ یہاں سے مہم
نے اپنا رخ شمال مغرب کی طرف پھیرا اور کوہستان پی شان کو عبور کرکے صحرائے تکلا مکان کے شمالی
رہ پر حامی اور طورفان کے نخلستانوں میں وارد ہوئی۔ طورفان کے بعد اس مہم نے قراشہر کے علاقہ میں
اعا۔ توں کے کھنڈروں میں آثار قدیمہ کی تلاش کی اور خاص طور پر منگوئی کے قدیم بودھی دیرا ہے اور
مد میں کھدائی کرکے آثار کی تحقیقات کی۔ منگوئی سے روانگی کے وقت یہ مہم جانب مغرب سفر کرتی ہوئی
کے کاروانی راستے سے قصبۂ کوچہ میں پہونچی جہاں سے لفٹننٹ باور کو ہندوستان کے آثار قدیمہ کی
ے پہلی قسط دستیاب ہوئی تھی۔ یہاں کھدائی کرنے کے بعد سر آریل اسٹین مزید حوصلہ سے کام لیکر
کی طرف چل کر ریگستان تکلا مکان کے قلب میں گھس گئے، اور قرادانگ کے کھنڈروں میں پہونچکر بودھی
ماہوں اور مندروں کے کھنڈروں سے بہت سے بیش قیمت تاریخی ہندوستانی آثار قدیمہ برآمد کئے۔
طرح جانب جنوب چلتے چلتے یہ مہم ملک ختن کے شہر دامو کو میں پہونچی اور طرح صحرائے تکلا مکان کے
وقی اور بے آب و گیاہ ریگستان کو شمالاً جنوباً عبور کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

اس کامیابی کے بعد سر آریل اسٹین کے حوصلے اس قدر بڑھے کہ اُنھوں نے ریگستان کو جنوباً شمالاً
رنے کا عزم کیا، اور سفر کرتے کرتے آکسو پہونچے۔ اس خطرناک اور دشوار سفر میں سر آریل اسٹین نے
مزار تاغ میں آٹھویں صدی کے ایک قدیم تبتی قلعہ کے کھنڈروں کو دریافت کیا جس کے بعد وہ اس
کو براہ یار قند دوبارہ ختن واپس لے آئے اور یہاں سے کوہستان قراقرم کو عبور کرکے ۱۲۔ اکتوبر سنہ ۱۹ء
داخ کے صدر مقام لیہہ میں پہونچے۔

اس سفر میں سر آریل اسٹین نے مقامات میراں۔ تون ہانگ۔ حامی۔ طورفان۔ قراشہر اور کوچہ
بہت سی قدیم بودھ بستیوں، عبادتگاہوں اور خانقاہوں کے آثار برآمد کئے جن سے یہ ثابت ہو
ہندوستان کے قدیم علوم و فنون حتی کہ رسم الخط نے بھی یہاں کی شائستگی پر زبردست اثر ڈالا تھا

اس سفر میں سر آریل اسٹین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے لولان اور تون ہوانگ کے نخلستانوں کے درمیان ایک قدیم مدافعتی دیوار کے کھنڈر دریافت کئے جو چین کی قدیم تاریخ سے خاص تعلق رکھتی ہے۔ اس دیوار کا سلسلہ چین کی مشہور دیوار اعظم کی طرح کوسوں تک چلا گیا تھا۔ اور جگہ جگہ مناسب موقعوں پر برج اور دیدبان بنے ہوئے تھے۔ یہ دیوار جو ہمدمند شہنشاہ چین فغفور چن فیہہ نے تیسری صدی قبل مسیح میں تعمیر کرائی تھی اور اس کے ذریعہ سے دریائے تاریم کی وادی کے میدانوں میں چین کا اثر قائم کرنا مقصود تھا۔

اس دیوار کے ساتھ ساتھ سر آریل اسٹین نے تقریباً دو سو میل سفر کرکے بہت سے آثار قدیمہ برآمد کئے جن میں ننانوے برس قبل مسیح کی تحریریں بھی تھیں جن کے مطالعہ سے قدیم زمانہ کی معاشرت اور طریقۂ تجارت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

اسی سفر میں سر آریل اسٹین کا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے تون ہوانگ کے قریب قدیم زمانہ کی ایک بیش قیمت گم شدہ لائبریری اور مجموعہ فنون لطیفہ کا کچھ حصہ برآمد کیا جو شاہان چین نے بیسیوں زمانہ کی کتابیں فراہم کرکے بڑی محنت سے دسویں گیارھویں اور بارھویں صدی میں قائم کی تھی۔ یہ کتابیں اور تصویریں تون ہوانگ کے قریب چین فوتنگ یا "سہستر بدھ" (ایک ہزار بدھ) کی خانقاہ کے منتظم اعلیٰ کے قبضہ میں تھیں۔ بدھوں کا یہ ویراہہ پہاڑیوں میں حجرے کاٹکر غارہائے ایلورا کی وضع پر تعمیر کیا گیا تھا۔ دسویں صدی عیسوی تک بدھ مت والوں کا سب سے بڑا تیرتھ مانا جاتا تھا۔ گردونواح کے علاقوں سے ہزاروں آدمی تعلیم و جاترا کے لئے یہاں آتے تھے۔ لیکن تاآخر وحشی قبائل کے متواتر حملوں سے تنگ آکر یہاں کے بدھ مہاتماؤں اور بھکشوؤں نے یہ متبرک مقام خالی کردیا۔ لیکن جانے سے پہلے یہ تمام ادبی اور فنی خزانہ عبادت گاہ کے ایک حجرہ میں بند کرکے ایک پختہ دیوار کھینچکر بند کردیا تھا جس کی وجہ سے یہ بیش بہا علمی خزانہ لٹیروں کے ناپاک ہاتھوں سے تقریباً ساڑھے آٹھ سو برس تک محفوظ رہا۔ ۱۸۹۹ء میں طاؤ مذہب کا ایک بھکشو جب ویراہہ کے حجروں کی مرمت کرانے لگا تو اسے ایک چھوٹی سی کوٹھری کی دیوار میں ایک شگاف نظر آیا۔ دیوار ہٹاکر دیکھا تو کاغذوں کے پلندوں، بنڈلوں اور کتابوں کا ایک عظیم الشان انبار لگا ہوا ملا۔ جس پر کئی کئی انچ گردوغبار کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ گردوغبار صاف کرنے کے بعد اس انبار سے ہزاروں کتابیں، بیاضیں، قلمی مسودے، کتبے، تحریریں، تصویریں، نقش و نگار، نقشے، خاکے وغیرہ برآمد ہوئے جو کاغذ، بھوج پتر، کتان، ریشم اور تعمیری مسالہ کی لوحوں پر بنے ہوئے تھے۔ جب اس عظیم الشان کتب خانہ اور فنون لطیفہ کے نادر مجموعہ کا سر آریل اسٹین نے بغور معائنہ کیا تو یہ کتابیں سنسکرت، چینی، تبتی، ختنی، کوچی، صغدی

یوگوری، ترکی اور بعض ایسی زبانوں کی نکلیں جن سے سر آریل اسٹین ناواقف تھے۔ تصویروں میں چین کے تانگی زمانہ کے بہت سے نمونے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ کپڑے بھی برآمد ہوئے جو زردوزی کشیدہ کاری چکن، مشجر، جامدانی اور ململ کے بیش بہا نمونے تھے۔ غرض بہت ردو کد کے بعد سر آریل اسٹین اس خزانہ کا کچھ حصہ حاصل کرکے بحفاظت تمام ہندوستان واپس آئے۔

اس کے بعد ۳۱ جولائی ۱۹۱۳ء کو سر آریل اسٹین ایک تیسری مہم کے ساتھ سری نگر ریاست کشمیر کے راستے سے چینی ترکستان کو روانہ ہوئے۔ اور دریائے داریل، تانگیر اور یسین کی وادیوں کو طے کرتے ہوئے درہ درکوٹ کو عبور کرکے سارکول کے علاقہ میں پہونچے۔ اس مرتبہ یہ مہم حوصلہ کرکے آلتین غول دریا کے دہانہ کی نشیبی سرزمین تک پہونچ گئی جہاں سے جنوبی منگولیا کی سرحد بہت قریب رہ جاتی ہے۔ وہاں سے لوٹ کو ہستان تین شان کے شمالی کنارہ کے برابر برابر چلتے ہوئے چینی صوبہ تنگایہ کی مشرقی سرحد تک پہونچے پھر وہاں سے چلکر روسی پامیر کا سفر کرتے ہوئے ماوراء النہر کے اس قدیم کاروانی راستہ پر نکلے جو چینی ریشم لیجانے والے قافلے استعمال کیا کرتے تھے۔ اور سمرقند پہونچکر کچھ دنوں قیام کیا۔

لیکن سر آریل اسٹین کے بڑھتے ہوئے حوصلوں نے یہاں بھی زیادہ دنوں تک دم لینے نہ دیا۔ اور وہ جنوب مغرب کی جانب مسلسل تین ہفتے سفر کرکے ایران و افغانستان کی درمیانی سرحد کو پار کرتے ہوئے ملک سیستان میں دریائے ہلمند کے دہانہ تک پہونچے۔ جہاں وہ کچھ عرصہ تک قدیم زمانہ کے خرابوں میں تحقیقات کرتے رہے۔ اور فروری ۱۹۱۶ء میں براہ نوشکی ہندوستان واپس آئے۔

اس سفر میں انھوں نے چینی علاقہ میں ڈھائی سو میل فرسنگ تک آثار قدیمہ کی تحقیقات کی اور طور فان کے علاقہ میں بمقام آستانہ مٹی میں دبا ہوا ایک قدیم قبرستان دریافت کیا جس کی قبریں اور مقبرے پتھر کے تھے یہ قبرستان تاریخی لحاظ سے چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کا تھا۔ اور اگرچہ اس زمانہ تک وسطی ایشیا میں بدھ مت رائج ہوچکا تھا۔ لیکن جو چیزیں ان قبروں سے برآمد ہوئیں اُن سے اس عہد کی رسوم تجہیز و تکفین پر کافی روشنی پڑتی ہے جو بدھ مذہب اختیار کرنے کے بعد بھی جاری رہیں۔

اس طرح اس تیسری مہم میں بھی وسطی ایشیا سے آثار قدیمہ کا ایک بیشمار خزانہ ملا جو اختلاف نوعیت و ماہیت کے لحاظ سے ماہرین آثار قدیمہ کے لئے بہت اہم تھا۔ ان چیزوں کی تاریخی۔ علمی۔ فنی۔ مذہبی و معاشرتی وغیرہ نوعیت پر سر آریل اسٹین نے جو فاضلانہ رپورٹیں لکھی ہیں وہ بھی ایک علمی کارنامہ ہیں۔

آثار قدیمہ کے جو نمونے سر آریل اسٹین کی مہمیں وسطی ایشیا سے لائیں ان کی تقسیم مندرجہ ذیل قسموں میں کی جاسکتی ہے۔ :-

(۱) کاغذ، کتاں، چمڑے اور لکڑی کی تختیوں پر دستی تحریریں اور مسودات۔
(۲) ریشم، کاغذ، کتاں، لکڑی اور تعمیری مسالہ پر تصویریں، نقش ونگار، نقشے اور خاکے۔
(۳) مٹی کے کھلونے اور پلاسٹر پر ابھری ہوئی مورتیاں اور نقش ونگار۔
(۴) مصوّر و مشجّر ریشمی و سوتی کپڑے، جامہ وار، چکن، زردوزی، زربفت، جامدانی، ململ، جالی کے کپڑے، کمبل اور نمدے
(۵) مٹی کے برتن۔
(۶) دھاتوں اور قیمتی پتھروں پر کھدی ہوئی مہریں۔
(۷) چینی اور پتھر کی بنی ہوئی چیزیں۔
(۸) لکڑی کی چوکھٹیں، کواڑ، دیوارگیریاں اور دیگر آرائشی و استعمالی سامان۔
(۹) شیشہ، ہڈی، ہاتھی دانت، دھات یا ریشوں کی بنی ہوئی مختلف چیزیں۔
(۱۰) کتابیں اور دستی تحریریں، کاغذ، ریشم، کتاں، بھوج پتر اور لکڑی پر۔

اس علمی خزانہ میں سترہ مختلف زبانوں اور تیئیس قسم کے حروف کی تحریریں ہیں جن میں سے اکثر ایسے ہیں جن سے اس زمانہ کے لوگ واقف نہیں ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے یہ تحریریں اور کتابیں بدھ دھرم، فن جہانبانی، تجارت اور دسویں صدی عیسوی تک چینی ترکستان کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں اور چونکہ اس زمانہ میں بدھ مت نے چینی ترکستان کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس لئے وسطی علاقہ کے مذہبی اور ادبی معاملات میں سنسکرت زبان اور برہمی خط سب پر حاوی تھے اور یہ دونوں چیزیں سرزمین ہند کی مذہبی زبان اور رسم الخط تھیں۔ لیکن جن تحریروں یا کتابوں کا تعلق حکومت یا نظم ونسق سے ہے، وہ عموماً چینی یا تبتی زبانوں میں ہیں۔ البتہ کاروباری، تجارتی یا پرائیویٹ تحریروں کا بڑا حصہ خروسطی خط اور پراکرت زبان میں ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں ہندوستان کی ہیں۔ جو شمال مغربی ہند میں چوتھی صدی عیسوی تک رائج رہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وسطی ایشیا میں بدھ مت اور ہندوستانی تہذیب کے پھیلانے والے شمال مغربی ہندوستان ہی کے باشندے تھے۔

برآمد شدہ قدیم تصویریں بھی خواہ وہ ریشم پر ہوں یا کاغذ پر یا کسی اور چیز پر بدھ مت کی شاخ "مہاینہ" سے تعلق رکھتی ہیں۔ یا مہاتما بدھ کی سوانحعمری کے مختلف مناظر پیش کرتی ہیں اور عموماً اسی قسم کی ہیں جو قدیم ہندوستان کے "گندھار دبستان" یعنی شمال مغربی ہندوستان میں پائی جاتی ہیں، اور ان میں قدیم ہندوستانی، چینی، ایرانی و یونانی فن مصوری کی طرح عکس؎ کے بجائے خطوط؎ سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔

Lines ؎ Shade ؎

کپڑوں، سکوں اور مہروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں وسطی ایشیا کا تمدن ایک مخلوط تمدن تھا جس میں یونانی، ایرانی، تورانی، ہندوستانی، تبتی اور چینی عناصر سموئے ہوئے تھے۔ دھاتوں اور قیمتی پتھروں کی اکثر مہروں اور سکوں پر یونانی دیوی Athene اور یونانی دیوتا Hercules کی تصویریں کندہ ہیں۔ لکڑی کے سامان پر جو آرائشی نقش و نگار ہیں یا کپڑوں پر جو کام بنائے گئے ہیں اُن میں اگرچہ چینی اور ایرانی فنون کا عنصر شامل ہے لیکن یہ چیزیں زیادہ تر ہندوستانی فن کی رہینِ منت ہیں۔

اسی سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ یونان، ایران یا ہندوستان کا اس علاقہ پر براہ راست اثر نہیں پڑتا تھا، بلکہ ہمسایہ ملک باختر اور پارتھیا میں جو سکندرِ اعظم نے فتح کر لئے تھے اور یہاں یونانیوں کی صدیوں سلطنت رہی تھی، یونانی نسل کے لوگ آباد ہو گئے تھے۔ انھیں کا اثر وسطی ایشیا پر پڑا۔ اسی طرح چینی ترکستان کے جنوب مغرب میں ایران کا صوبہ صغد، جنوب میں ہندوستان، مشرق میں چین تھا۔ اور ان ہمسایہ ملکوں کے تمدن کا اثر پڑنا ایک قدرتی امر تھا۔

وسطی ایشیا کے تجارتی تعلقات تو ہندوستان کے ساتھ نامعلوم زمانہ سے تھے، مگر ابھی تک وہاں ہندوستانیوں کی کوئی مستقل نوآبادی قائم نہ ہوئی تھی۔ مستقل نوآبادیاں اس وقت سے شروع ہوئیں جب شہنشاہ اشوک اعظم نے ٹکشاشلا (Taxila) کی چند بدھی جماعتوں کو بعض وجوہ سے وسطی ایشیا کی طرف جلاوطن کر دیا۔ ان لوگوں نے چینی ترکستان میں مستقل سکونت اختیار کی اور اپنی تہذیب، شائستگی اور مذہب سے اہلِ ملک کو بہرہ اندوز کیا۔

ادھر جب تولان اور تون ہوانگ کے درمیان شہنشاہ چین چن شیہہ نے ملک کو تاتاریوں اور ہونوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک عظیم الشان دیوار تعمیر کرا دی تو چین سے جانب مغرب سفر کرنے والے تمام قافلوں کا راستہ چینی ترکستان میں قائم ہو گیا جس کی حفاظت کے لئے مناسب مقامات میں فوجیں تعینات کرنی پڑیں۔ اور اس طرح چینی ترکستان پر چین کا فوجی تسلط قائم ہو گیا جس کا تمدن پر اثر پڑنا لازمی تھا۔

جن آثارِ قدیمہ کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، وہ اس وقت نئی دہلی کے وسطی ایشیا میوزیم میں محفوظ ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ کوئی ماہرِ مشرقیات جسے ہندوستانی آثارِ قدیمہ سے خاص دلچسپی ہو، ان بیش قیمت آثار کا بغور مطالعہ کر کے ہندِ قدیم کے ان ٹوٹے ہوئے تاروں کو جوڑ کر ایک مسلسل تاریخ مرتب کر کے دنیا پر ثابت کر دے کہ

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

Museum of Central Asian Antiquities Delhi

خواب راحت

(ایک بچّہ کو محوِ خواب دیکھکر)

(از ابوالفاضل راز چاند پوری)

اِک شاہکارِ فطرت معصوم و خوبصورت
باصد ادائے دلکش ہے محوِ خوابِ راحت

چہرہ کہ آئینہ ہے حسنِ سکون دل کا
روشن کچھ اس طرح ہے گویا ہے ماہ پارا

واقف نہیں وہ مطلق ہنگامۂ جہاں سے
ناآشنا ہے یکسر افکارِ این و آں سے

کیا دیکھتا ہے اس کو اے صاحبِ نظر تو
رازِ سکونِ دل سے شاید ہے بے خبر تو

کچھ یاد بھی ہے تجھکو اے بندۂ تمنّا
تونے بھی تو جہاں میں دیکھا تھا خواب ایسا

وہ خواب، خوابِ راحت جو اصل زندگی تھا
دنیائے آرزو میں گُم ہوگیا ہے گویا

ملنا ہے اس کا مشکل اب دورِ زندگی میں
ہاں کچھ سکونِ خاطر پنہاں ہے بندگی میں

مولانا احسن سمبھی مرحوم

(از مولوی سید ابو محمد ثاقب کانپوری)

انسان کا یہ فطری خاصہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے واقعات کو اہمیت نہیں دیتا، حالانکہ سیکڑوں واقعات ایسے پیش آتے رہتے ہیں جنھیں اگر قلمبند کیا جائے تو آنے والی نسلیں بہت کچھ مستفید ہو سکتی ہیں۔ اور ایک مدت گزرنے کے بعد وہ تاریخی حقائق بن سکتے ہیں۔ صرف زمانہ سلف کے شعراء کو دیکھیے اور موجودہ تذکروں کی ورق گردانی کیجئے تو اُن کے حالات اس قدر مجمل اور مختصر ملتے ہیں کہ اُن کی زندگی کا صحیح نقشہ ذہن میں نہیں آ سکتا۔ اور بہت سے تو ایسے شعراء ملیں گے جن کے دو چار شعر تو تذکروں میں محفوظ ہیں مگر حالات درکنار اُن کے صحیح نام کی بھی خبر نہیں ہے اگر اُن کے حالات اُن کی زندگی ہی میں قلمبند ہو جاتے تو آج تذکروں میں اُن کے سوانح اس قدر بے ربط اور مشکوک نظر نہ آتے اور ہم اُن کے عادات و اخلاق سے اُسی طرح واقف ہوتے جس طرح اپنے معاصرین کے حالات و اطوار سے واقف ہیں۔ اسی ضرورت کا احساس اور اسی خیال کی اہمیت ایک عرصے سے میرے دماغ کو اس طرف مائل کر رہی ہے کہ اپنے معاصرین شعراء کے حالات ضبط تحریر میں لاؤں۔ چنانچہ ذیل میں مولانا احسن سمبھی کے حالات اور نمونۂ کلام ہدیۂ ناظرین "زمانہ" ہے۔

مولانا احسن سمبھی مرحوم کا پورا نام محمد احسن اللہ تھا اور نام ہی کا ایک جزو احسن تخلص تھا۔ سمبھی ضلع اعظم گڑھ وطن مالوف تھا۔ کسی زمانہ میں آپ کے آباو اجداد وہاں کے بڑے زمیندار تھے لیکن امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں آپ کی زمینداری بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں احسن صاحب مالی مشکلات سے پریشان ہو کر بتلاشِ معاش کانپور تشریف لائے۔ اور مولانا آزاد سبحانی کے دولتخانے پر قیام کیا۔ جو اس وقت کانپور میں قیام پذیر تھے اور غالباً احسن صاحب کے عزیز بھی تھے۔

احسن مرحوم کے ابتدائی کلام میں قدیم رنگِ سخن نمایاں تھا اور کچھ زندہ دلی کی جھلک بھی پائی جاتی تھی۔ آپ بعض ظریف اخبارات میں اکثر مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد ظریفانہ

شعر گوئی و مضمون نویسی ترک ہوگئی۔ اور آپ نے زمانہ کی روش کو دیکھکر اپنی سلیم المذاقی و قادر الکلامی کی بنا پر قدیم رنگ سخن کو بھی چھوڑ دیا۔ اور حقائق و معارف، فلسفہ و تصوّف کے مضامین لکھنے لگے۔ اور بہت جلد اس رنگ میں ایک خاص امتیاز حاصل کر لیا۔

کانپور آنے کے بعد احسن صاحب محلہ امین گنج میں مقیم تھے اور وہاں کے بعض علم دوست احباب کی مدد سے آپ نے ایک انجمن "حلقۂ ادبیہ" کے نام سے قائم کی تھی جس میں رفتہ رفتہ شہر کے دوسرے حصوں سے بھی لوگ آکر شریک ہونے لگے۔ احسن مرحوم چونکہ حسن غزل گوئی کو زبان کی ترقی کا ذریعہ اور شاعری کا حاصل نہ سمجھتے تھے اس لئے وہ اپنے شاگردوں کی ترقی و رانھیں ادب کی صحیح شاہراہ پر لگانے کے لئے ہر جلسہ سے پہلے مصرعۂ طرح کے ساتھ ساتھ مضامین اور نظموں کے چند عنوانات بھی دیدیتے تھے تاکہ وہ انہیں مقررہ عنوانات پر طبع آزمائی کریں۔

جس دن انجمن کا جلسہ ہوتا تھا مولانا آزاد سبحانی بھی اس میں شرکت فرماتے۔ بلکہ اکثر ان جلسوں کی صدارت کے لئے وہی منتخب ہوتے تھے۔ اس زمانے میں میں بہت کم عمر تھا لیکن مولانا آزاد سبحانی کی تاکید و ہدایت سے مجبور ہوکر مقررہ عنوانات میں سے نثر کے کسی عنوان پر میں بھی کچھ نہ کچھ لکھتا تھا جس پر مولانا احسن نہایت غور و فکر سے اصلاح فرمادیا کرتے تھے اور وہ مضمون جلسے کے دن پڑھ دیا جایا کرتا تھا۔ شیخ عبدالعزیز صاحب اوورسیر ان تمام مضامین نظم و نثر کو جمع کرکے انھیں دوبارہ خوشخط لکھکر اور خوبصورت سرورق لگاکر رسالہ کی صورت میں احسن صاحب کو دیدیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ جب اس قسم کے کئی رسالے جمع ہوگئے تو مرحوم کو ان کی باقاعدہ اشاعت کا خیال ہوا۔ اور مولانا محوی اور نورخان صاحب کی اعانت سے "الادب" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جس کے چھ سات نمبر شائع ہوئے، مگر بعد میں مالی مشکلات کی وجہ سے یہ پرچہ بند ہوگیا۔ اس رسالے کو مولانا آزاد سبحانی کی سرپرستی حاصل تھی۔ چنانچہ موصوف ہر مہینے ایک مضمون اس میں لکھا کرتے تھے

رسالہ بند ہوجانے کے بعد بابو عبدالغفور صاحب بی۔ اے کے توسط سے آپ کانپور کے مشہور و معروف تاجر خان بہادر حافظ محمد حلیم صاحب کے بچّوں کے اتالیق مقرر ہوگئے۔ مگر بعض وجوہ سے آپ کو جلد ہی اس ملازمت سے کنارہ کش ہونا پڑا۔ چنانچہ اس کے بعد حلیم مسلم لائبریری میں لائبریرین کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ کچھ مدّت کے بعد یہ لائبریری بھی بند ہوگئی اور ہمارے مکرم منشی دیانرائن صاحب نگم کی جوہر شناس نظریں ان کی طرف پڑیں اور انھوں نے اسسٹنٹ ایڈیٹر

کی حیثیت سے اُن کو اپنے رسالہ "زمانہ" کے دفتر میں جگہ دیدی۔ چونکہ مرحوم کا مذاق خالص ادبی تھا اور اس کے سوا وہ دنیا میں کوئی کام کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ اس لئے اُنھوں نے اس ملازمت کو اپنے لئے بے انتہا پسند کیا اور تقریباً چھ سات برس تک یہاں سکون و قناعت کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے یہاں کی ملازمت سے پہلے احسن مرحوم کے جذبات خود داری کو دیکھتے ہوئے آپ کے احباب کا یہ خیال تھا کہ شاید آپ یہاں بھی عرصے تک نہ رہ سکیں گے۔ لیکن نگم صاحب کے دل میں اُن کی خودداری کے لئے کافی وسعت موجود تھی۔ چنانچہ موصوف ان کا برادرانہ احترام کرتے تھے اور اُن کے لائق بیٹے بھی انھیں اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ کام کے اوقات کے متعلق بھی کوئی خاص پابندی نہ تھی؛ احسن مرحوم جب چاہتے دفتر جاتے اور جب چاہتے دفتر سے چلے آتے۔ انھیں وجوہ سے احسن صاحب یہاں سے علحدہ ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ حالانکہ لاہور اور لکھنؤ سے متعدد بار اُن کے احباب نے اُنھیں بُلانا چاہا لیکن وہ اس گوشۂ عافیت کو چھوڑ کر کہیں نہ گئے۔ اور آخر کار ۸ ستمبر ۱۹۲۸ء کو کانپور ہی میں تقریباً پنتالیس سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

احسن صاحب ایک بلند پایہ اور خوش فکر شاعر تھے۔ اُردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ آپ نے الہ آباد یونیورسٹی سے فارسی کا امتحان بھی پاس کیا تھا اور عربی بھی جانتے تھے۔ اور شعر گوئی میں بھی کافی ملکہ رکھتے تھے۔ درحقیقت مرحوم نے جس انداز کی نظمیں لکھی ہیں اُن کا جواب مشکل سے مل سکتا ہے۔ آپ کی نظموں میں "تلاشِ یار" کے عنوان سے جو نظم ہے وہ آپ کا بہترین شاہکار ہے۔

یہ امر تحقیق نہیں کہ وہ کانپور آنے سے پہلے کسی سے مشورۂ سخن کرتے تھے یا نہیں۔ البتہ یہاں آنے کے بعد غالباً حضرت محوی صدیقی کی تحریک پر اُنھوں نے دو ایک مرتبہ اپنا کلام مولانا شوق قدوائی کو اصلاح کی غرض سے بھیجا تھا لیکن یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور درحقیقت احسن مرحوم کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کانپور میں اُنھوں نے خود اپنے شاگردوں کا ایک حلقہ قائم کرلیا تھا اور ضرورتمند اصحاب کو مشورۂ سخن بھی دیا کرتے تھے۔

احسن صاحب کا مزاج اور عادتیں اس قدر سادہ تھیں جن کا بیان الفاظ میں مشکل سے ہو سکتا ہے وہ ہر شخص سے نہایت خلوص و محبت سے ملتے تھے۔ دوسروں کے اعترافِ کمال میں اُنھیں کبھی کوئی تامل نہ ہوتا تھا، اور جب کبھی مخالف حضرات آپ سے ملنے آتے تو آپ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اُن کی طرف سبقت کرتے تھے۔ اکثر موقعوں پر آپ اپنی صاف باطنی کی بدولت زحمتوں میں بھی مبتلا ہوئے مگر اپنے

وطیرہ میں تبدیلی کرنا پسند کی

جسمانی حیثیت سے آپ کشیدہ قامت اور میانہ اندام تھے فرنچ کٹ داڑھی رکھتے تھے عموماً شیروانی، ڈھیلا پائجامہ، ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے اور ہمیشہ نگاہ نیچی کئے ہوئے رستہ طے کرتے تھے کانپور میں آپ کے متعدد تلامذہ بھی ہو گئے تھے جن میں راقم مضمون کے علاوہ ہادی دہلوری، ابوالفضل راز چاندپوری، ماسٹر عبدالصمد تڑمی، مسٹر فرحت کانپوری، حضرت عابد بلہوری قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ اور بھی متعدد حضرات حلقۂ ادبیہ کے رکن کی حیثیت سے حسب ضرورت آپ کے مخلصانہ مشورہ سے مستفید ہوتے تھے، اور بعض لوگ ایسے بھی تھے جنھیں اس وقت شعر و شاعری سے دلچسپی تھی لیکن اب وہ اس سے قطعاً ترک کر چکے ہیں۔

ذیل میں آپ کے دلکش کلام مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔

اپنی شاعری کے متعلق آپ نے ایک نظم کے دو بند میں بالکل صحیح لکھا تھا:

غرض میں شاعری میں اپنے دل کا حال لکھتا ہوں	کہیں جو جا بجا ہیں ارباب عافیت انسانے میں مجھکو
یہ آنسو ہیں جو مضموں بنکے نکلے ہیں مرے دل سے	یہ نالے ہیں جو کرتے رہتے ہیں اندوہگیں مجھکو
مجھے خود وہ مجھیں اہل دانش فکر رنگیں سے	دیا ہے سوز غم نے ذوق آہ آتشیں مجھکو
سنبھالو اپنا اپنا دل کہ اب میں نالہ کرتا ہوں	بلاغت ضبط کی یارا نہیں قلب حزیں مجھکو

ستاتا ہے فلک مجھکو مٹاتی ہے زمیں مجھکو
مگر پھر بھی نہیں ہے اپنے مٹنے کا یقیں مجھکو

انتخاب غزلیات

غم سے نجات دیگئی ہستی ناگوار کو	موت اب اختیار کر مدت انتظار کو
جلوہ گہ حیات ہے اصل میں منظر فنا	مرگ ہے جان زندگی دیدۂ اعتبار کو
شام سے مضطرب ہے دل رات بہار ہو گئی	آج قرار آ گیا گردش روزگار کو
ایک تمہارے واسطے سب سے وہ ہاتھ اٹھا چکا	تم نہ اٹھاؤ بزم سے احسنؔ خاکسار کو

اسی کا نام ہے جینا تو میں جینے سے باز آیا	کہ ہر ہر سانس سے موت کا پیغام آتا ہے
شب غم کچھ انھیں مایوسیوں سے دل بہلتا ہے	مصیبت میں یہی ٹوٹا ہوا دل کام آتا ہے
کلیجہ منہ کو آتا ہے نہ پوچھو اے ہمنفس مجھ سے	کہ میری داستان غم میں ان کا نام آتا ہے

ابھی ٹوٹی ہوئی امید میں کچھ جان باقی ہے — ابھی سامانِ ماتم اے دلِ ناشاد رہنے دے
وہی افسانۂ غم تو نے احسن آج پھر چھیڑا — ارے خاموش یہ حسرت بھری روداد رہنے دے

حسن والوں کو بنا دیتا ہے قاتل میرا — یہ مری جان کا دشمن ہے کہ ہے دل میرا
بیخودی میں مجھے احساسِ الم تک نہ رہا — اب خدا جانے کہ یہ درد ہے یا دل میرا
دل سمجھ لیجئے افسانۂ طور و موسیٰ — آپ کی جلوہ گہِ ناز تھی اور دل میرا
سیرِ ہستی میں غمِ دوست ہے حاصل میرا — غم سے خوش جان ہے مری درد سے خوش دل میرا

دنیا سمجھ رہی ہے کہ تابِ فغاں نہیں — کیا جانے کیا سمجھ کے میں خاموش ہو گیا
احسن نہ پوچھ قصۂ شبہائے آرزو — اک خواب تھا سو وہ بھی فراموش ہو گیا

تصور کھینچتا ہے جب کبھی تصویر آزادی — تو اک حسرت سے پابندِ سلاسل دیکھ لیتے ہیں
بھری ہے یاس کی اک گردشیں ہیں آرزوؤں کی — ہم اپنے دل میں سیرِ رقصِ بسمل دیکھ لیتے ہیں

جب نشیمن تھا تو صیاد بھی تھا برق بھی تھی — کون اب آتا ہے مجھ سوختہ ساماں کی طرف
ہو چکا نذرِ قفس ذوقِ تماشائے بہار — اب میں چھوٹوں بھی تو جاؤں نہ گلستاں کی طرف
زندہ درگور ہوا ہیں ترے ہاتھوں اے زیست — کون لایا تھا مجھے عالمِ امکاں کی طرف

کبھی ہنگامہ آرا تھی بیاں تھی داستاں میری — مگر اب سانس بن کر لب تک آتی ہے فغاں میری
بہار آئی ہے میری خانہ بربادی کے ساماں ہیں — بجلی پڑتی ہے بارِ گل سے شاخِ آشیاں میری
انھیں آنسو نہ سمجھو نالۂ خاموش ہیں احسن — ہوئی ہے آشنائے رازِ خاموشی فغاں میری

دل تھا تو یہ فطرت کے مناظر تھے نظر میں — اب شام میں کچھ لطف ہے باقی نہ سحر میں
کیا جانے کوئی اشکِ ندامت کی حقیقت — بخشش کے یہ موتی ہیں مرے دامنِ تر میں
جائیں گے کہاں دل سے نکل کر مرے نالے — ناکامیِ جاوید ہے آغوشِ اثر میں

مرتا ہوں کہ معلوم ہو مرنے کی حقیقت   یارب ہے کس انداز کا سودا مرے سر میں
بے وجہ تو احسن پہ یہ غفلت نہیں طاری   شاید کوئی تسکین کی صورت ہے نظر میں

کیا بتاؤں تجھ سے گلشن میں جب آتی ہے بہار   آتش گل سے ہمیں کیا کیا رلاتی ہے بہار
اپنا دامن دامنِ گل کی طرح رہتا ہے تر   خون کے آنسو ہمیں آ کر رلاتی ہے بہار

اچھا ہوا کہ زندگی مختصر ملی   ورنہ امید و یاس کا قصہ دراز تھا
ناکامیوں میں آ کے کسی نے خبر نہ لی   کس دن کے واسطے مرا کارساز تھا
نالے کے ساتھ سینے سے نکلی تھی کوئی چیز   اب یہ خبر نہیں کہ وہ دل تھا کہ راز تھا

مجھ سے نہ پوچھ اپنی نگاہِ کرم سے پوچھ   کیا جانے کس امید پہ تقصیر ہو گئی

نفس نفس مرا دشمن ہے مجھ میں دم کیا ہے   کرم کی شان دکھا دے ترا کرم کیا ہے
تعینات سے آزاد ہے جبینِ نیاز   نظر میں تو ہو تو پھر دیر کیا حرم کیا ہے
ڈریں اجل سے جو مرتے ہیں زندگی کے لئے   جو مٹ چکا اُسے اندیشۂ عدم کیا ہے
وہ ملتفت تو ہیں احسن یہی غنیمت جان   ستم سے تنگ اُٹھا شکوۂ ستم کیا ہے

(پانی)

اس عنوان سے زمانہ ستمبر ۱۹۱۹ء میں احسن مرحوم کی پہلی نظم شائع ہوئی تھی۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

ہے سارے جہان کی جان پانی   ہے آبِ بقا کی شان پانی
ہر ذرّے میں آب بن کے ظاہر   صحرا میں سراب بن کے ظاہر
تلوار کی آب میں ہے پنہاں   نیزے کی انی سے ہے نمایاں
پانی ہی کے روپ ہیں سراسر   قطرہ ہو کہ ہو صدف میں گوہر
موتی کی آبرو اسی سے   ہے رونقِ آبِ جو اسی سے
ہے قطرۂ خون بن کے دل میں   آنسو آنکھوں میں آب تل میں
یہ مثلِ عرق گلاب میں ہے   یا بن کے چمک حباب میں ہے

ہے حسن میں آب تاب اس کی　　دانتوں کی چمک میں آب اس کی
پانی ہے محیط ربع مسکوں　　ہے اس سے فرات و نیل و جیحوں
پھولوں میں بھی رنگ ہے اسی سے　　کلیوں کی اُمنگ ہے اسی سے
شرکت اس کی ہے آبرو میں　　اک جوش اسی سے ہے لہو میں
پانی کیسا ترا چمن ہے　　کوثر میں بھی تو ہی موج زن ہے
فردوس میں بھی رواں ہیں نہریں　　نہروں میں رواں ہیں تیری لہریں
سچ ہے کہ عجیب شے ہے پانی　　انگور میں مثل مے ہے پانی
برسات کا جوش تو ہے پانی　　تجھ سے بادل میں ہے روانی
بجلی کی چمک میں آب تجھ سے　　دریا دل ہیں سحاب تجھ سے

گو میرے حالِ زار نے رسوا کیا مجھے　　اتنا ہوا کہ رحم کے قابل بنادیا
اب اس سے بڑھ کے اے غمِ جاناں میں کیا کروں　　میں نے تو دل میں رکھ کے تجھے دل بنادیا
احسن یہ محویت یہ خموشی یہ بے خودی　　ایسا کسی کی یاد نے غافل بنادیا

صبح محشر ہی سہی صبح تمنا نہ سہی　　اُٹھ تو جائے کہیں پردہ شبِ تنہائی کا
ناتوانی دلِ محرومِ تمنا کی نہ پوچھ　　خواب دیکھا تھا کبھی اُس نے توانائی کا
اب یہ معلوم ہوا غم ہے فریبِ احساس　　آج سے نام نہ لیں گے کبھی دانائی کا
جان لینا کہ غمِ عشق کی دنیا ہے وہی　　موت کرتی ہو جہاں کام مسیحائی کا

کیسی مٹی ہے تربت بادِ صبا کے چلتے　　کچھ خاک ہے ہوا پر کچھ خاک ہے زمیں پر
آنکھوں کے رہنے والے مٹی میں مل رہے ہیں　　برباد ہو رہے ہیں آنسو مرے زمیں پر

——(پروانہ کا گیت)——

اس نظم کا یہاں پر صرف ایک بند ہدیۂ ناظرین ہے۔

خوب ہے اے شمعِ سوزاں شکلِ نورانی تری　　دل کو روشن کر رہی ہے نور افشانی تری
کیا ہے گر تو صرف میری جان و تن کو پھونک دے　　پھونک دے اے شمع ساری انجمن کو پھونک دے

اور صورت کون ہے جس سے علاجِ غم کروں
شمع میں تجھ سے لپٹ کر سوزشِ دل کم کروں

ہمتِ مردانہ شعلے کی گریباں گیر ہو
سوزشِ دل جوش کر تجھ میں اگر تاثیر ہو

وقت آیا کام کا اے میرے چھپکے پرو
لے چلو مجھکو اُڑا کر تم ذرا جنبش کرو

حسرتیں دل میں تڑپتی ہیں نکلنے کیلئے
سوزِ غم رخصت کہ میں جاتا ہوں جلنے کیلئے

شمع کے شعلے پہ گرتا تھا لپک کر چاہ سے
جب تھا وہ آتش بجاں نا آشنا تھا آہ سے

آرزوئے وصل سے آخر ہوا بے چین وہ
شمع کی جانب نظر کی تاکہ کچھ لے چین وہ

گرمیِ سوزِ نہاں سے اُس کو بیہوشی ہوئی
بڑھ گیا جوش اور شعلے سے ہم آغوشی ہوئی

یوں میسر اُس کو وصلِ جلوۂ جانانہ تھا
یعنی اک شعلہ ہی شعلہ تھا کہاں پروانہ تھا

خاک ہو کر جان کے ساتھ اسکا سوزِ دل گیا
جل بجھا وہ، سوزِ الفت کا نتیجہ مل گیا

جل بجھا پروانہ پھر اُس کا نشاں کچھ بھی نہ تھا
ایک چٹکی خاک تھی باقی وہاں کچھ بھی نہ تھا

(حسرتِ آزادی)

اسی امید میں رہتے ہیں اسیرانِ قفس
کبھی کھل جائے اگر درِ زندانِ قفس

رہ گئی حسرتِ پرواز کی حسرت دل میں
بے پر و بال بنے بیٹھے ہیں مرغانِ قفس

کیا ہوئی ہائے اسیروں کے جنوں کی تاثیر
فصلِ گل میں نہ ہوا چاک گریبانِ قفس

ہے اسیروں میں یہ خونناب فشانی کا رواج
سرخ پھولوں سے بھرا رہتا ہے دامانِ قفس

گیت گاتے ہیں اسیری میں بھی آزادی کا
سوئے گلشن ہو دلِ نغمہ سرایانِ قفس

بھول کیسے کہ ہوا تک بھی نہیں گلشن کی
اب ترستے ہیں ہر اک چیز کو مہمانِ قفس

یاد آتا ہے زمانہ انھیں آزادی کا
اُن کو ہر سانس اک افسانہ ہے بربادی کا

بے خطا کر دیا صیاد نے محبوسِ قفس
جرم کہتے ہیں کسے اور گواہی کیسی

سچ تو یہ ہے کہ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے
جیتے جی یہ قفسِ تنگ ہے مدفن اپنا

کاش اجل آ کے اسیری سے چھڑاتی ہمکو
ذبح کر ڈالتا صیاد تو احساں ہوتا

ہے حُسن میں آب و تاب اس کی — دانتوں کی چمک میں آب اس کی
پانی ہے محیطِ ربع مسکوں — ہے اس سے فرات و نیل و جیحوں
پھولوں میں بھی رنگ ہے اسی سے — کلیوں کی اُمنگ ہے اسی سے
شرکت اس کی ہے آبرو میں — اِک جوش اسی سے ہے لہو میں
پانی کیسا ترا چلن ہے — کوثر میں بھی تو ہی موج زن ہے
فردوس میں بھی رواں ہیں نہریں — نہروں میں رواں ہیں تیری لہریں
سچ ہے کہ عجیب شے ہے پانی — انگور میں مثلِ مے ہے پانی
برسات کا جوش تو ہے پانی — تجھ سے بادل میں ہے روانی
بجلی کی چمک میں آب تجھ سے — دریا دل ہیں سحاب تجھ سے

گو میرے حالِ زار نے رسوا کیا مجھے — اتنا ہوا کہ جسم کے قابل بنا دیا
اب اس سے بڑھکے اے غمِ جاناں میں کیا کروں — میں نے تو دل میں رکھ کے تجھے دل بنا دیا
احسن یہ محویت یہ خموشی یہ بے خودی — ایسا کسی کی یاد نے غافل بنا دیا

صبحِ محشر ہی سہی صبحِ تمنا نہ سہی — اُٹھ تو جائے کہیں پردہ شبِ تنہائی کا
ناتوانی دلِ محرومِ تمنا کی نہ پوچھ — خواب دیکھا تھا کبھی اُس نے توانائی کا
اب یہ معلوم ہوا غم ہے فریبِ احساس — آج سے نام نہ لیں گے کبھی دانائی کا
جان لینا کہ غمِ عشق کی دنیا ہے وہی — موت کرتی ہو جہاں کام مسیحائی کا

کیسی مٹی ہے تربت بادِ صبا کے چلتے — کچھ خاک ہے ہوا پر کچھ خاک ہے زمیں پر
آنکھوں کے رہنے والے مٹی میں مل رہے ہیں — برباد ہو رہے ہیں آنسو مرے زمیں پر

(پروانہ کا گیت)

اس نظم کا یہاں پر صرف ایک بند ہدیۂ ناظرین ہے۔

خوب ہے لے شمعِ سوزاں شکلِ نورانی تری — دل کو روشن کر رہی ہے نور افشانی تری
کیا ہے گر تو صرف میری جان و تن کو پھونک دے — پھونک دے لے شمع ساری انجمن کو پھونک دے

اور صورت کون ہے جس سے علاجِ غم کروں　　شمع میں تجھ سے لپٹ کر سوزشِ دل کم کروں
ہمتِ مردانہ شعلے کی گریباں گیر ہو　　سوزشِ دل جوش کر تجھ میں اگر تاثیر ہو
وقت آیا کام کا اے میرے جھکیلے پرو　　اے حیو مجھکو اُڑا کر تم ذرا جنبش کرو
حسرتیں دل میں تڑپتی ہیں نکلنے کیلئے　　سوزِ غم رخصت کہ میں جاتا ہوں جلنے کیلئے

شمع کے شعلے پہ گرتا تھا لپک کر جا مسے　　چپ تھا وہ آتش بجاں تا آشنا تھا آہ سے
آرزوئے وصل سے آخر ہوا بے چین وہ　　شمع کی جانب نظر کی تاکہ کچھ لے چین وہ
گرمیٔ سوزِ نہاں سے اُس کو بیہوشی ہوئی　　بڑھ گیا جوش اور شعلے سے ہم آغوشی ہوئی
یوں میسر اُس کو وصلِ جلوۂ جانانہ تھا　　یعنی اک شعلہ ہی شعلہ تھا کہاں پروانہ تھا
خاک ہوکر جان کے ساتھ اسکا سوزِ دل گیا　　جل بجھا وہ۔ سوزِ الفت کا نتیجہ مل گیا
جل بجھا پروانہ پھر اُس کا نشاں کچھ بھی نہ تھا　　ایک چٹکی خاک تھی۔ باقی وہاں کچھ بھی نہ تھا

(حسرتِ آزادی)

اسی امید میں رہتے ہیں اسیرانِ قفس　　کبھی کھل جائے اگر کبھی در زندانِ قفس
رہ گئی حسرتِ پرواز کی حسرت دل میں　　بے پر و بال بنے بیٹھے ہیں مرغانِ قفس
کیا ہوئی ہائے اسیروں کے جنوں کی تاثیر　　فصلِ گل میں نہ ہوا چاک گریبانِ قفس
ہے اسیروں میں یہ خوں نابہ فشانی کا رواج　　سرخ پھولوں سے بھرا رہتا ہے دامانِ قفس
گیت گاتے ہیں اسیری میں بھی آزادی کا　　سوئے گلشن ہو دلِ نغمہ سرایانِ قفس
پھول کیسے کہ ہوا تک بھی نہیں گلشن کی　　اب ترستے ہیں ہر اک چیز کو مہمانِ قفس
یاد آتا ہے زمانہ انھیں آزادی کا　　اُن کو ہر سانس اک افسانہ ہے بربادی کا
بے خطا کر دیا صیاد نے محبوسِ قفس　　جرم کہتے ہیں کسے اور گواہی کیسی

سچ تو یہ ہے کہ یہ جینا بھی کوئی جینا ہو　　جیتے جی یہ قفسِ تنگ ہے مدفن اپنا

کاش اجل آ کے اسیری سے چھڑاتی ہمکو　　ذبح کر ڈالتا صیاد تو احساں ہوتا

ہنسی آتی ہے جب مجھکو تو رو کے سے نہیں رکتی — رُلا سکتی نہیں کوئی تمنائے حزیں مجھکو
غرض میں شاعری میں اپنے دل کا حال کہتا ہوں — کہیں جو چاہیں ارباب معانی آفریں مجھکو

(تلاشِ دل)

بہاریہ تمہید:۔

آہ یہ برسات کی رُت آہ یہ ٹھنڈی ہوا — آہ یہ بوندوں کی رم جھم آہ یہ کالی گھٹا
اُف یہ بادل کا گرجنا، اُف یہ بجلی کی چمک — اُف یہ پتوں کا نکھرنا اُف یہ پھولوں کی مہک
ہائے مستانہ ہوائیں ہائے گلشن کی بہار — ہائے بیلے کی ادائیں ہائے سوسن کی بہار
بچھ گئی ہیں سبز قالینیں زمین فرش پر — ہے زمرد سبزۂ خوابیدہ گویا عرش پر
یہ کسی کا جلوہ ہے یا چاندنی نکھری ہوئی — بدلیاں ہیں یا کسی کی زلف ہے بکھری ہوئی
پھرتی ہے بادِ صبا اٹکھیلیاں کرتی ہوئی — کس خوشی سے نوعروسِ گل کا دم بھرتی ہوئی

دل مرا سنبل نے زلفوں میں چھپایا تو نہیں — آنکھوں کی آنکھوں میں نرگس نے چرایا تو نہیں
محفلِ گلشن کے ان روشن چراغوں میں نہ ہو — ڈھونڈھ لیں چلکر کہیں لالے کے داغوں میں نہ ہو
پہلوئے بلبل میں کیا ہے چلکے دیکھیں تو سہی — کچھ اُسی کی سی صدا ہے چلکے دیکھیں تو سہی
دیکھو تم ہنستے ہو پھولو، یہ ہنسی اچھی نہیں — لاؤ دل دیدو میرا یہ دل لگی اچھی نہیں
مسکرانے والے غنچو اپنی مٹھی کھول دو — میرے دل کی بھی خبر ہے کچھ پتہ کچھ بول دو
تو نے دیکھا ہے کہیں؟ میرا دلِ مضطر صبا! — تو تو تڑکے ہی سے پھرتی رہتی ہے گھر گھر صبا
دامنِ گل میں نہیں پہلوئے جنبل میں نہیں — چشمِ نرگس میں نہیں گیسوئے سنبل میں نہیں
ہائے اب میرا دلِ دردآشنا ملتا نہیں، — چپّہ چپّہ ڈھونڈھ ڈالا کچھ پتا ملتا نہیں
ہائے وہ میرا دلِ غمخوار بے سر کیا ہو گیا — ہائے کیونکر میرے پہلو سے ستم کش کھو گیا

اے ہوا میں پھرنے والے کالے کالے بادلو! — اے فضائے آسماں کے رہنے والے بادلو!
اپنا دامن دیکھ لو اپنا گریباں دیکھ لو — ان میں پوشیدہ کہیں میرا دلِ مضطر نہ ہو
کیا یہ بجلی ہے کہ یہ میرا دلِ بیتاب ہے — ہے تڑپنے والے دل ہی کی طرح سے کوئی شے
رعد کچھ تو ہی بتا کھوئے دل کا پتا — برقِ مضطر تو ہی کچھ دے میرے بسمل کا پتا

سچ بتا اے ماہِ کامل چاند تجھ میں تو نہیں — میرا زخمی میرا بسمل چاند تجھ میں تو نہیں
آؤ کر آئیں کچھ ان دونوں گھروں کی سیر بھی — اپنے دل کی کھوج میں ڈھونڈیں گے ہم تب دیر بھی
وہ نہ کرتا ہو پرستش دیر میں اصنام کی — پھیرنے بیٹھا نہ ہو مالا بتوں کے نام کی
داغ بن کر بت کدے والوں کی حسرت میں نہ ہو — نارِ کشتہ بنکر وہ ناقوسِ برہمن میں نہ ہو

خون ہو کر دل مرا آنکھوں سے شاید بہہ گیا — داغ ہی داغ اب فقط سینے میں باقی رہ گیا
اب کہاں جوشِ تمنا اور ارمانوں کی دھوم — شمع ہی تنہا تھی مری محفل میں پروانوں کی دھوم
اب کہاں وہ دل رہا کہاں وہ دل میں قطرے خون کے — رہ گئے پہلو میں باقی چند دھبے خون کے
دل کے دم تک تھی تمنا ہستیِ موہوم کی — یاد آتی ہے ہمیں ہے ہے دلِ مرحوم کی

سچ ہے احسن اس طرح جینے کا حاصل کچھ نہیں
دل جو ہو سب کچھ ہے لیکن جب نہ ہو دل کچھ نہیں

اقوالِ زرّیں

اگر تم حق پر ہو تو تمھیں غصہ نہ کرنا چاہیئے اور اگر حق پر نہیں ہو تو غصہ آنے کا کوئی سبب نہیں۔

ملازم پر ہمیشہ اعتبار کرو اور اگر اس پر اعتبار نہیں ہے تو اُسے ملازم نہ رکھو۔

انتقام لینے والے کو ایک دن مسرت ہوتی ہے لیکن معاف کرنیوالا ہمیشہ خوش رہتا ہے

مستقل ارادہ ہر چیز پر غالب آسکتا ہے یہاں تک کہ زمانہ کی روش کو بھی بدل سکتا ہے۔

سب سے بڑا گناہ وہ ہے جس کو آدمی معمولی سمجھتا ہے۔

عقل کے بھروسہ پر کوشش چھوڑ کر بیٹھ رہنا سب سے بڑی غلطی ہے

یاد رکھو بغیر محنت کے پوری کامیابی نہیں حاصل ہوتی۔

غلطی کی سزا میں اپنے کو جسمانی تکلیف نہ پہنچاؤ بلکہ اس سے متنبہ ہو کر عبرت حاصل کرو۔

روپیہ محنت کا پھل ہے اور بڑائی خدمت کا ثمر ہے۔

حسنِ ارکان الفاظ

(از مسٹر سلیم جعفر)

کشمکش حیات کی بوقلمونی ضروریات پر اپنا اثر ڈالتی اور ان کی نوعیت بدلتی رہتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زبان کو بھی شاہراہ تعاون و عدم تعاون پر مجبوراً گامزن ہونا پڑتا ہے۔ زندگی میں جن چیزوں کی ضرورت باقی رہتی ہے زبان ان کے مظہر الفاظ کے ساتھ عدم تعاون کرکے انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیتی ہے لیکن جب کوئی نئی ضرورت پیش آتی ہے تو اس کے مظہر لفظ کو عرصۂ وجود میں لانے کو زبان ہی تعاون کرنے کیلئے سبقت کرتی ہے اور اپنے خزانہ میں اضافہ کو فوراً مستعد ہو جاتی ہے۔ الفاظ کے ترک و رواج کا یہی بہت بڑا محرک و باعث ہے۔

عدم تعاون کی صورت میں تو زبان کو کوئی دقت پیش نہیں آتی کیونکہ دنیا میں متاع کاسد کا کوئی خریدار نہیں۔ زبان کے اس فعل پر کسی نے کسی کو ماتم کرتے نہ سنا ہوگا لیکن جب وہ شاہراہ تعاون پر جادہ پیما ہوتی ہے تو اس کی حالت دل دادگان حسن سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ناصح۔ چارہ گر۔ خار مغیلاں سب سے سابقہ پڑتا ہے اور سب کے سب و شتم سہنے پڑتے ہیں۔ مگر اس کا جگر دیکھئے کہ خندہ پیشانی سے سب کچھ برداشت کرتی اور وفا کیشی کا ثبوت دیتی ہے۔

دورِ حاضرہ کی کشمکش نے سرعتِ برق کے ساتھ ضروریات لامتناہی پیدا کردیں اور اردو زبان کا اُن کے دوش بدوش رہنا دشوار تھا۔ لیکن اس کی خوش قسمتی دیکھئے کہ اسے مولوی وحیدالدین سلیم مرحوم سا خضر راہ مل گیا اور ان الجھنوں اور پریشانیوں سے جو سوہانِ روح تھیں بہت کچھ نجات ملگئی۔ اس خضر طریقت نے جو راہیں بتائیں اس میں شک نہیں کہ وہ منزل مقصود تک رہبری کرتی ہیں۔ لیکن وہ ایسی راہیں ہیں جو کسیقدر ناہموار ضرور ہیں۔ وہ صاف و شفاف ڈامر کی سڑکوں کی سی ہموار نہیں ہیں۔ اس سے میرا مقصد نکتہ چینی و عیب جوئی نہیں۔ بلکہ اظہار حقیقت ہے۔ مرحوم نے ان تمام اصولوں کو جو ایشیائی زبانوں میں مشترک ہیں احاطہ کرنے کی سعی فرمائی ہے لیکن ایک پہلو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز ہوگیا ہے یعنی حسن ارکان الفاظ جس کا منبع ان آوازوں کا تناسب و توازن اور ترنم ہے جو رکن الفاظ ہیں۔ اگرچہ یہ قطعی طور پر دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ طریق الفاظ سازی مرحوم نے بتایا ہے اس سے یہ پہلو بالکل خارج ہے کیونکہ

انھوں نے موجودہ مواد و مصالح سے کام لینے کی ہدایت فرمائی ہے اور اس وقت وہ برسوں کے استعمال سے گھس گھسا کر سڈول ہو گیا ہے مگر الفاظ سازی میں مرحوم کی نظر زیادہ تر مرکبات تک محصور رہی اور حسن الفاظ کی طرف اگر کہیں توجہ بھی کی ہے تو اس کی حیثیت ضمنی ہے اور اس کو ایک اصول کا ممتاز درجہ دے کر اس سے بحث نہیں کی۔

سنسکرت نے حسن الفاظ و سہولت تلفظ کو مدنظر رکھ کر اپنی گرامر میں ایک مستقل باب سندھی[عه] کا قایم کیا ہے۔ لیکن اس میں حرفوں کی تبدیلی سے اس حالت میں بحث کی ہے جبکہ مرکب ناقص بنانے کے لئے دو لفظ پاس پاس رکھے جائیں خواہ وہ پورے دو لفظ ہوں خواہ ان میں سابقے یا[عه٢] لاحقے لگا لئے جائیں۔ سنسکرت کو اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ نئے لفظ بنا کر زبان میں اضافہ کی خواستگار نہ تھی۔ بلکہ موجودہ لفظوں سے کام لیکر نئے معانی پیدا کرنا مقصود تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مرکبات امتزاجی کے ذریعے سے ایجاد و اختصار کی طالب تھی۔ اس لئے اس کے دائرۂ عمل سے حسن الفاظ یا سہولت تلفظ اس اعتبار سے خارج تھی جس سے یہاں بحث کرنا مدنظر ہے۔

لیکن اس سوال کا کوئی قطعی جواب نہیں کہ حسن الفاظ یا سہولت تلفظ کہتے کسے ہیں؟ تمام منطق آرائی اور فلسفہ گستری کے بعد نتیجہ نکلتا ہے کہ عادت کو کہتے ہیں۔ بچوں کی گفتگو پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں وہ لفظوں کا من مانا تلفظ کرتے ہیں۔ مثلاً کؔ کی جگہ تؔ بولتے اور کاؔ کو تاؔ کہتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے بڑے ہوتے جاتے ہیں اور عقل اور قوت ناقلہ یا یہ کہئے کہ اپنے اعضائے تلفظ سے اپنی مرضی کے موافق کام لینے کی قدرت ان میں ترقی کرتی جاتی ہے وہ اس حرف کو صحیح صحیح ادا کرنے لگتے ہیں۔ یعنی جب تک انھیں اتنا شعور نہ تھا کہ اوروں کی پیروی کریں اور کسی حرف کے اوروں کی طرح ادا کرنے میں دقت ہوتی تھی، وہ اس حرف کی جگہ وہ حرف بولتے تھے جس کا بولنا انھیں کسی وجہ سے آ گیا تھا اور جس کی عادت پڑ گئی تھی۔ بڑے ہوئے تو اس بارہ میں انھوں نے اپنی عادت بدل دی اور اس طرح رفتہ رفتہ ٹھیک ٹھیک بولنے لگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سہولت کا کل دار و مدار عادت پر ہے۔ پڑھے لکھے اور جاہلوں کی گفتگو کا مابہ الامتیاز بھی بلحاظ تلفظ یہی ہے۔ ان پڑھ کیوں مشکل کو مُشکل کہتا ہے۔ اس کی وجہ غور کرنے سے اس کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ اُس نے شَین کے تلفظ کی عادت نہیں ڈالی۔

اس لئے سہولت تلفظ درحقیقت ایک ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا ہے۔ اصلیت کچھ بھی نہیں۔ لیکن اس کا معیار مقرر کئے بغیر چارہ بھی نہیں۔ جس شئے کی ہستی کی دنیا بھر قائل ہے اسکے وجود سے

انکار کرنا نکو بنتا ہے۔ معیار کی تلاش بھی ایسی ہی حوصلہ شکن ہے جیسی کہ سہولت تلفظ۔ جسے میں حُسن ارکانِ الفاظ سے تعبیر کرتا چلا آیا ہوں۔ اگر فصحا و بلغا کی گفتگو کو معیار قرار دیں تو جو لفظ وہ آج بول رہے ہیں اگر ان کی تحقیق کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان پڑھ جہلا کی گفتگو کے نقش و نگار موجود ہیں یہ دعویٰ بظاہر ہرزہ سرائی ہے مگر بعید از حقیقت نہیں۔ عالم و فاضل تو کسی لفظ کی صورت مسخ ہی کیوں کرنے لگے۔ وہ تو ہر وقت نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے ایک ایک لفظ کا تلفظ کرتے ہیں۔ نستعلیق گوئی ان کا فخر ہے۔ یہ تو بے پروا۔ اَن گھڑ ہی ہیں کہ انھیں اس سے غرض نہیں کہ کس لفظ کی آوازوں میں سے وہ کس آواز کو صحیح صحیح اور کس کو غلط ادا کرتے ہیں۔ کون کون سی آوازوں میں تقدیم و تاخیر کے مرتکب ہیں۔ کونسی آواز چھوڑ گئے اور کونسی آواز خواہ مخواہ لفظ میں داخل کر دی۔ بروئے قواعد کونسا لفظ صحیح اور کونسا غلط۔ لیکن جب انھیں جاہلوں کے گھڑے لفظ رواج پا جاتے ہیں تو خالصیت پسندوں کی ایک آدھ پشت ماتم کر کے چل بستی ہے۔ اور ان کی اولاد انھیں بگڑے ہوئے لفظوں کو ٹکسال داخل سمجھتی اور بے تکلف برتتی ہے۔ اگر کوئی لفظ کسی وجہ سے کھٹکا اور توجیہ و تاویل ناممکن ہوئی تو مجبوراً اُسے محاورہ کا خطاب دے کر اعتراض کا منہ بند کر دیا۔ آپ ہی فرمایئے میگھ (بارش) کو سنسکرت کو جاننے والا تو کبھی غلط بولے گا ہی نہیں۔ یہ تو جاہلوں کی سیکڑوں پشتوں ہی کی حرکت ہو سکتی ہے کہ پہلے انھوں نے اسے میھو بنایا پھر اس میں نون غنہ بڑھایا اور دم کتر کے مینھ کر دیا۔ اسیطرح انھوں نے جلُو دَر کی مٹی پلید کر کے جلندھر بنا دیا۔ ڈھلل لیقین پر مولوی صاحب لعنت ہی بھیجتے رہے لیکن اسے اقلیم اُردو سے جلا وطن نہ کر سکے۔ تر ٓضل بھی اس محفل میں جمی ہوئی ہے اور نفاست پسند بھی اسے نکالنا نہیں چاہتے۔ فتیلہ پہ آفت آئی اور پلیتہ ہو گیا۔ اور تفلی آٹھ آٹھ آنسو روتی اور کہتی ہے میری درگت کیوں بناتے اور مجھے قلفی کیوں کہتے ہو۔ ان باتوں کو دیکھتے ہوئے ہی سمجھ میں آتا ہے کہ اگر کوئی بات نکل سکتی ہے تو وہ جاہلوں ہی کی حرکتوں سے نکل سکتی ہے۔ کیونکہ زبان کے بارہ میں وہ فطرت کے معصوم کھلونوں کا رتبہ رکھتے ہیں۔ جس طرح بچوں پر خارجی اسباب کا اثر سعی تقلید سے زیادہ نہیں ہوتا اسیطرح اَن پڑھ بھی معاملات زبان میں تقلید سے آگے نہیں بڑھتا۔ اور شعور کی زنجیروں میں جکڑا ہوا نہیں ہوتا کہ اس کی تقلید ناقص ہے یا کامل۔ وہ اپنی تقلید سے صرف اتنا ہی کام لینا چاہتا ہے جو زبان کا مقصد ہے۔ وہ افہام و تفہیم مدعا سے غرض رکھتا ہے اور اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس کا آلۂ اظہار خیال اصل کی ہو بہو تصویر ہے یا نہیں۔

غرض الفاظ کا معیار حسن مل سکتا ہے تو انھیں الفاظ میں جو ان پڑھ لوگوں نے بنا لیے ہیں۔

انھیں لفظوں کی صورتوں پر غور کرکے یہ پتا لگانا پڑے گا کہ اصل لفظ کیا تھا اور اس کی مسخ شدہ صورت کیا ہے اس کام کے لئے پہلے ہم لفظ کی سنسکرت ہیئت اور اس کے بعد آج جو صورت نظر آتی ہے وہ بتائیں گے اور زمان ارتقاء میں جو کچھ اس پر بیتی ہے اور جو جو روپ وہ بھرتا رہا ہے اس سے بحث نہ کریں گے۔ مثلاً استنباط اصول کے لئے ہم یہ دکھائیں گے کہ اردھ میں سے ر گر گئی اور آدھ رہ گیا۔ اور اشتقاق مرکبات میں آدھ کام آتا ہے۔

(۱) سابقوں کے حرف آخر کا گرنا۔

اُتنگا۔ उत् + टंग = اُت + ٹنگ۔

اٹھنا۔ उत् + ष्ठ = اُت + شٹھا

(۲) لفظوں میں سے حرفوں کا گرنا۔

آرپل۔ आयुर्बल = آیُربل

آرسی۔ आदर्श = آدرش۔

ارنا۔ अरराय = اَرَنیہ

بھنڈار۔ भांड + आगार = بھانڈ + آگار

جی۔ जीव = جیو

چمار۔ चर्म + कार = چرم + کار۔

دودھ۔ दुग्ध = دُگدھ

دُھند ~~अन्ध~~ धूम्र + अन्ध = دُھومر + اندھ۔

(۳) دو لفظوں کو ملاکر نئے معانی کے لئے لفظ بنانا۔

اٹکل۔ अट + कल = اَٹ (گھومنا) + کل (گننا) قیاس۔

اڑتلا۔ आड़ + तल = آڑ + تل = پناہ۔

(۴) لفظوں کے حرفوں یا آوازوں کا بدلنا۔

اَچھر = अक्षर = اَکشر (کش = چھ)

اُڑنا = उड्डयन = اُڈّین (ڈ = ڑ)

اَناڑی = अनार्य्य = اَنارَیہ (ر = ڑ)

برچھہ = वृक्ष = ورکش (و = ب۔ کش۔ چھا)

بجوگ = वियोग = ویوگ (و - ب - ی = ج)

چٹخارا = चटकारा = چٹکارا (ک = خ)

پچھینا = छायरा = کشیبن (کش = چھ + ی = ج)۔

ریخ = रेखा = ریکھا (کھ = خ)

(۵) آوازوں کا گھٹنا بڑھنا۔

اڑبل = آیڑبل۔

اڑتلا = آڑ + تل۔

انچور = आम्र + चुर = آمر + چُر۔

بیبا = مخفف بی بی۔

(۶) سہ حرفی لفظوں میں سے ر (र) کا گرانا اور اکثر حرف علت کی آواز مقصورہ کا ممدودہ کردینا۔

آک = आर्क = ارک

آم = आम्र = آمر

(گھاس) پات = पत्र = پتر

چاک = चक्र = چکر

چاند = चन्द्र = چندر

(کھٹا) چوک = चक्र = چکر۔

چھید = छिद्र = چھدر۔

سدا = सर्वदा = سروَدا

کان = कर्ण = کرن۔

جہاں ر (र) نہیں آئی وہاں متحرک کردی گئی۔

برس = वर्ष = ورش۔

برن = वर्ण = ورن

کارج = कार्य्य = کاریہ

(۷) وہ لفظ جن کا پہلا حرف ساکن ہوتا ہے۔

(۱) اگر یہ حرف س (स) یا ش (श) ہے تو الف بڑھایا جائیگا۔ لفظ سنسکرت کے ہوں یا

انگریزی کے۔

اُستھان = स्थान = ستھان۔

اِسٹام = stamp = سٹامپ۔

اِسٹابری = Strawberry = سٹرابری

اسٹیشن = Station = سٹیشن

اَشلوک = शलोक = شلوک

اشنان = स्नान = سنان۔

(ب) اگر الف نہ بڑھایا جائے گا تو حرف ساکن گرا دیا جائے گا۔

تھان = स्थान = ستھان۔

جواری = द्युत+आचारी = دیوت + اچاری۔

(ج) اگر گرایا نہ جائے گا تو متحرک کر دیا جائے گا۔

دَھونس = घवंस = دھونس۔

دھج = ध्वज = دَھوَج۔

(۹) بوقت ترکیب الفاظ اکثر لفظوں کا اصل کی طرف رجوع کرنا، مگر اکثر کسی قدر تبدیلی کے ساتھ۔

ادھ مرایا ہوا ـــ ادھ = آدھا = अर्ध = اَردھ۔

بڑبولا ـــ بڑ = بڑا = वड़ = وَڈر

بھک منگا ـــ بھک = بھیک = भिक्ष = بھکش۔

پت جھڑ ـــ پت = پات = पत्र = پتر

پٹ رانی ـــ پٹ = پاٹ = पट्ट = پٹ

ٹکسال ـــ ٹک = ٹنک = टंक = ٹنک۔

مذکورہ بالا چند اصول صرف چند لفظوں پر غور کر کے دکھلائے گئے ہیں۔ اور مقصد صرف یہ ہے کہ ان اصول کی طرف توجہ دلائی جائے جن کا الفاظ سازی کے وقت مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

وضع الفاظ کے لئے چاہے جتنی فلسفیانہ بحثیں کر لی جائیں اور طریقے ایجاد کر لئے جائیں۔ لیکن فی الحقیقت ان کی اعلیٰ ٹکسال وہی ہے جو ایک مستند اہل الرائے غالباً پروفیسر آزاد نے بتائی ہے۔ اس کا مقولہ ہے کہ جب علوم و فنون ملک میں رائج ہو جائیں گے تو لفظ بھی خود بخود پیدا ہو جائیں گے

کچھ لفظ اُسی ملک کے لے لئے جائیں گے جہاں سے وہ علم یا فن آیا ہے۔ اور کچھ لفظ یہیں کے لوگ بنائیں گے جس میں عالموں کا حصّہ کم اور جاہلوں کا زیادہ ہوگا۔ میں اس رائے کی اپنے تجربے سے بھی تائید کرتا ہوں۔ چھاپے خانے اس ملک میں رواج پا گئے ہیں۔ اب ان چند لفظوں پر غور کیجئے جو ان میں رائج ہیں۔ یہ تو ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں کہ یہ لفظ کس نے بنائے ہیں۔ اور کس نے ان کو رواج دیا۔ میں تو فقط اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ لفظ مطبعوں میں پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب ہی بے تکلف بولتے ہیں۔ مثلاً Quoin کے لئے گُلّی Mallet کے لئے ٹھوکنا۔ Forme کے لئے فرما۔ Impression کے لئے داب + کیس۔ رول۔ لیڈ۔ اسٹون کے لئے یہی لفظ بولتے ہیں۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو کیسے سیدھے سیدھے لفظ بنائے گئے ہیں۔ اگر آج کسی عالم فاضل کے حوالہ یہ لفظ کر دیئے جاتے تو خدا جانے وہ ایران و توران کا چکّر لگا کر کون سا لفظ لاتا۔ لیکن اپنے نزدیک وہ کیسا ہی اچھا لفظ ڈھونڈھ نکالتا یا وضع کرتا ایسا سیدھا سادہ لفظ جیسا کہ کسی نے Quoin کے لئے گُلّی بنا دیا اسے ہرگز نصیب نہ ہوتا۔

لیکن ملک میں اس وقت اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ جو علوم و فنون جاری ہوئے وہ پہلے پہل انگریزی دانوں کے ہتّھے پڑے۔ مدت تک تو کسی کو اس کا خیال ہی نہ آیا کہ ان اصطلاحات کے اردو مترادف کیا ہیں جب ذرا عمل شروع ہوا اور لوگ اس طرف مائل ہوئے کہ مغربی علوم و فنون اپنی زبان میں پڑھائے جائیں، تو لفظ بنانے کی سوجھی۔ اب اصطلاحیں بنائے تو کون بنائے وہی انگریزی زدہ لوگ جن پر عربی فارسی یا سنسکرت کا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ گستاخی معاف۔ انھوں نے اپنی زبان کے اصول چھوڑ دیے اور خالص سنسکرت یا عربی کے اصول سے کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے ہنگم بیڈول لفظ بنا ڈالے جن کی ثقالت کا شور مچ گیا۔ میرے ایک دوست نے جنھیں ایک کمیٹی نے انجنیری کی کتاب اردو میں ترجمہ کرنے کو دی اور شرط یہ لگائی کہ اصطلاحیں کمیٹی بنا کر دے گی۔ مجھ سے ذکر کیا کہ Connecting rod کے لئے انھیں "جوڑک ڈنڈا" لکھنے کو حکم دیا گیا۔ کہنے لگے بھائی لکھدوں گا لیکن مجھے تو یہ خاصا گورکھ دھندا نظر آتا ہے۔ کاش جیسے اُڑن کھٹولا وغیرہ بنے ہیں، ویسا ہی کوئی اچھا سا لفظ بنایا جاتا ؎۱

؎۱ ناظرین کی تفریح طبع کے لئے پروفیسر کولرکوچ کی ایک کتاب کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ مجھے اپنے ماہران سائنس کے بارہ میں کچھ کہنا ہے۔ وہ دن تو آنے ہی کو تھا کہ لاطینی سے، جس میں تصنیفات سائنس لکھی جاتی تھیں۔ یہ کام نہ لیا جائے اور یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی جگہ کسی موجودہ زبان مثلاً فرانسیسی سے یہ کام لیا جائے۔ لیکن جب ہر قوم نے یہ طے کیا ہے کہ سائنس کی کتابیں ملکی زبان میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میرے نزدیک اچھے اور خوبصورت لفظ جو آسانی سے زبان پر رواں ہو جائیں صرف وہی لفظ ہو سکتے ہیں جن کے بنانے میں زبان کے حقیقی اصول اور قواعد مدنظر رکھے جائیں۔ اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ وہ اصول جو ہماری زبان کو سنسکرت سے ورثہ میں ملے ہیں۔ نیا لفظ بنانے سے پہلے ہم کو یہ سوچنا چاہیئے کہ سنسکرت میں اس کا مترادف ہے یا نہیں۔ اور ہے تو اُردو یا ہندی میں اس کی کیا صورت ہے۔ اگر نہیں ہے تو سب سے پہلے ایک سنسکرت کا لفظ بنائیں اور پھر اس کے مشابہات[۱] سے یہ پتا لگائیں کہ ہمارے بنائے ہوئے لفظ میں کونسی آوازیں کس کس حرف سے بدل دی جانی چاہئیں اور گرا کون کونسی دینی چاہئیں۔ مثلاً تھان کا لفظ لیجئے۔ سنسکرت میں یہ ستھان[۲] ہے یعنی اس کا پہلا حرف ساکن اور دو حرف سے مل کر نکلتا ہے۔ یہ اُردو اور ہندی دونوں کی فطرت و طبیعت کے خلاف ہے ان کے ہاں ابتدا بسکون لفظ نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس میں خواہ مخواہ یا تو ایک لفظ بڑھا کر "استھان" بنا لیا گیا اور الف نہیں بڑھایا گیا تو پہلا حرف ہی گرا دیا گیا اور "تھان" بنا لیا۔ اسی قسم کے چند قواعد ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

لیکن اس طریقہ سے لفظ بنانے کے لئے قواعد سنسکرت کا اچھی طرح جاننا اور اُردو لغات پر کامل عبور ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ایک قدم آگے بھی بڑھانا پڑے گا یعنی ان قواعد پر پھر عمل پیرا ہونا پڑے گا جن سے وہ لفظ بنے ہیں جنھیں ہم نے فہرست محاورات میں لکھ رکھا ہے۔ اور جن قواعد سے ہم اس وقت کام نہیں لیتے۔ علاوہ سنسکرت اور ہندی کے قواعد کے اس کام میں مسٹر گرے اور مسٹر جاگیردار کی تصنیفات[۳] سے اس کام میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

स्थान [۲] Analogues [۱]

[۳] 1. Grey's Indo Aryan Phonology

2. R.V.Jhgirdar's An Introduction to the Comparative Philology of Indo Aryan languages.

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) لکھی جائیں گی تو اس وقت یہ ہرگز خیال نہ تھا کہ اکتشافات فن وضع اصطلاحات کے ہتھے نکل جائیں گے اور جب ماہران سائنس آگے قدم بڑھائیں گے تو جس سائنس سے وہ ناواقف ہیں اسے حقیر سمجھ کر اور بے پرواہ ہو کر ہماری لغات کی کتابوں کو ایسے عجیب و غریب لفظوں سے بھر دیں گے جنھیں دیکھ کر کونسٹی ٹیوشن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلا کا کھلا رہ جائے گا۔ نہیں بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے چاہے وہ کسی زمانے کے کیوں نہ ہوں دانتوں میں انگلیاں دبائیں گے۔

نیازِ عشق

(از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی اے ایل ایل بی)

تجلّیاں مہ و خورشید سے لپٹ کے سوتی تھیں
بہم ستاروں میں سرگوشیاں سی ہوتی تھیں

حصولِ نور کی کاوش فضول ہوتی تھی
دعائے لیلیٰ ظلمت قبول ہوتی تھی

ابھی تبسّمِ گل کھیلتا تھا بجلی سے
سکوتِ ساز پہ نغمے فدا تھے شوخی سے

گلوں میں آرزوئے رنگ و بو کا چرچا تھا
نوا فروشی بلبل کا سر میں سودا تھا

خرد سپردِ جنون شراب ہوتی تھی
شباب کی یونہی مٹی خراب ہوتی تھی

تالِ حسن پہ رونی تھی پھوٹ کے شبنم
ستارے عرش سے گرتے تھے ٹوٹ کے پیہم

نویدِ مقدمِ خورشید جب سحر لائی
نسیم چھاؤں میں تاروں کی یہ خبر لائی

"غرورِ ناز عطا حسن کو جو ہوتا تھا
نیازِ عشق کہیں سر جھکائے روتا تھا"

اب!

(از منشی تلوک چند محروم بی اے)

گزر رہا وہ کا مرحلہ، وقتِ دعا ہے اب
مایوسِ زندگی دلِ درد آشنا ہے اب

دنیا کو خوب دیکھ لیا، ہیچ! ہیچ!! ہیچ!!!
پیشِ نگاہ اے دلِ غمدیدہ کیا ہے اب

اب آرزو یہ ہے کہ نہ ہو آرزو کوئی
باقی نہ مدعا ہو یہی مدعا ہے اب

سر منزلِ بقا کا نشاں موت نے دیا
رہزن جسے سمجھتے تھے وہ رہنما ہے اب

اہلِ جہاں کو نالۂ غم سے رلاؤں کیا؟
مجبورِ خامشی مرا ذوقِ نوا ہے اب

ہماری قومی زبان

از مسٹر سلیم جعفر

جس دن مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم رکھا ہے اُردو کا سنگ بنیاد درحقیقت اسی روز رکھا گیا تھا۔ یہاں کی زبانوں میں ان زبانوں کے لفظ داخل ہونے شروع ہو گئے تھے جو مسلمان بولتے تھے۔ لیکن بدیسیوں کا یہ میل جول دیسیوں کو ہرگز ناگوار نہ تھا۔ کیونکہ انہوں نے خود انھیں اپنے یہاں جگہ دی تھی اور ضروری تھا کہ ان کے ساتھ غیروں کا سا برتاؤ نہ کریں۔ ان بدیسیوں کو انہوں نے اپنا لباس پہنا کر اپنے رسم و رواج کا پابند کر دیا۔ علم ادب کا مطالعہ کرنے والے اس سے بخوبی آگاہ ہیں کہ چند بردائی سے لے کر برج بھاشا کے مستند مصنفوں تک کے کلام میں عربی فارسی کے لفظ بے تکلف ملتے ہیں اور ان مصنفوں نے ان میں اپنی زبان کی طبیعت و فطرت کے موافق کاٹ چھانٹ کر کے انھیں اپنے قواعد کے مطابق برتا ہے۔

لیکن اس یگانگت میں پہلے پہل فرق اس وقت آیا جب مسلمانوں نے دیسی زبان کو ادبی رتبہ دیا۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ ابتدا نظم سے ہوئی اور انہوں نے یا تو اس وجہ سے کہ ہندی عروض سے ناواقف تھے یا واقف تھے تو عربی فارسی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے یک قلم ہندی کے عروض کو چھوڑ کر عربی عروض اختیار کی۔ ہندوستان کو وطن بنا لینے اور اس کی زبان اختیار کرنے کے بعد ان کا یہ طرز عمل خالص حب الوطنی کے نقطۂ نظر سے مجرمانہ تھا۔ مگر ایک اور بات جس نے تفرقہ اندازی میں بہت مدد دی یہ تھی کہ انھوں نے اپنی نظم میں فارسی شاعری کا چربہ اتارا جس سے تمام وہ چیزیں جو فارسی شاعری کی متاع تھیں اردو میں منتقل ہوگئیں اور ایک ہی ملک میں دو طرح کی نظمیں پیدا ہوگئیں۔ جو اپنی نوعیت میں ایک دوسرے سے کسی طرح یکساں نہ تھیں۔

نظم کے بعد نثر کی نوبت آئی اور اس کا اصل آغاز عہد برطانیہ میں ہوا۔ زمانہ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس نے فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل و عقد کو یہ سمجھایا کہ ہندوستان میں ایک ہی زبان کی دو

صورتیں ہیں جن میں سے ایک مسلمانوں کے لئے موزوں و مناسب ہے اور دوسری ہندوؤں کے لئے۔ جو ادیب تصنیف و تالیف کے لئے جمع کئے گئے ان میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ جن کا چشمۂ فیض انوری و خاقانی تھے۔ اور دوسرے وہ جو والمیک اور ویاس کی بارگاہ میں عقیدت کے پھول چڑھاتے تھے۔ لیکن اگر ڈاکٹر گریرسن کا قول صحیح ہے تو اس وقت ملک میں صرف ایک ہی زبان رائج تھی کیونکہ فورٹ ولیم کالج کے استادوں نے ہندی نثر کو اس طرح ایجاد کیا کہ اردو میں سے عربی فارسی کے لفظ نکال دیے اور ان کی جگہ سنسکرت کے یا سنسکرت سے بنائے ہوئے لفظوں کو دی۔

اس تفرقہ پردازی کے بعد دونوں گروہوں کی تحریر و تقریر میں اس وجہ سے سدِ سکندری بنتی چلی گئی کہ دونوں کی مذہبی اور بعض صورتوں میں معاشرتی ضرورتوں نے ایک کو عربی و فارسی اور دوسرے کو سنسکرت کی طرف مائل کر دیا اور خالص دیسی ادبی نمونے پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے دونوں اپنے اپنے کلاسیکل لٹریچر کی نقل کرنے لگے۔

ہندو اور مسلمان دونوں قریب ایک صدی تک اسی راہ پر چلتے رہے جس پر فورٹ ولیم کالج نے ڈال دیا تھا اور اس عرصہ میں آپس میں خوب خوب لڑائیاں ہوئیں جو اب بھی ختم نہیں ہوئیں۔ لیکن سیاسی مشکلات کے حل کا ایک ذریعہ زبان مشترکہ بھی قرار دی گئی۔ اور بعض اصحاب کو یہ جنگ صد سالہ ختم کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ جو تدبیریں سوچی گئیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اردو ہندی دونوں کو خیرباد کہکر ملک کی مشترکہ زبان کا نام ہندوستانی رکھا جائے اور دوسرے یہ کہ زبان میں وہ لفظ استعمال کئے جائیں جو دونوں کی سمجھ میں آجائیں۔

ایک قوم کی زبان کا ایک ہونا اور ایک واحد نام رکھنا نہایت ضروری ہے اور ہندوستان کی مناسبت سے ہندوستانی نہایت موزوں لفظ ہے۔ ڈاکٹر گریرسن مدتوں پہلے کہہ چکے ہیں کہ ہندوستان کی زبان کا نام "ہندوستانی" ہے جس کی ایک قسم کا نام "ہندی" بھی ہے۔ اگر ہندو اور مسلمان دونوں راضی ہو جائیں تو بسم اللہ۔

زبان کا نام بدلنا اس قدر اہم مسئلہ نہیں ہے۔ جسقدر کہ خود زبان کی نوعیت کا بدلنا۔ نیا نام رکھنے سے صرف اتنا ہی فائدہ ہو سکتا ہے کہ اردو کو مسلمان اور ہندی کو ہندوؤں سے جو ایک خصوصیت حاصل ہو گئی ہے اور اس خصوصیت نے جو معرکہ آرائیاں پیدا کر دی ہیں۔ اُن کا

ع۵ ص ۳۶۶ امپیریل گزیٹیر آف انڈیا۔ تیسرا ایڈیشن۔

خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر نوعیت زبان بہت سے فیضوں کا سرچشمہ تصور کی جا رہی ہے وطن پرستی اس زبان کو وصف عمومیت سے متصف دیکھنا چاہتی ہے جسے وہ "ہندوستانی" کا ہر دلعزیز لقب دینے کی خواہشمند ہے۔ اس کا منشا ہے کہ وہ اپنے وطن سے جسے سنسکرت کا جغرافیہ نویس مدھیہ دیش (मध्य देश) سے موسوم کرتا ہے اور کبھی شمال و جنوب میں ہمالیہ سے وندھیاچل تک اور مشرق و مغرب میں سرہند سے گنگا جمنا کے سنگم تک پھیلا ہوا تھا، نکل کر ہمالیہ سے راس کماری تک اور بلوچستان سے برہما تک حکومت کرے۔ لیکن اس وقت یہ بیل پروان نہیں چڑھ سکتی ہے کیونکہ اگر ہندو "ہندوستانی" کا دامن پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہے ہیں تو مسلمان اُسکے گریبان میں ہاتھ ڈالے اپنی طرف۔ اور اس کشاکش میں اس کی جان پر بنگئی ہے۔ بیچاری اس بلا سے نجات پا سکتی ہے تو دونوں کی مصالحت کی صورت میں۔ اس لئے یہ تجویز پیش کیگئی ہے کہ اس کو دونوں کے مقاصد کی جولانگاہ بنا دیا جائے۔ ایک مناسب حد تک ہندو سنسکرت نوازی سے نہ روکے جائیں اور مسلمان عربی پرستی سے باز رکھے جائیں اور وہ اس طرح کہ "ہندوستانی" میں دونوں کے وہ لفظ داخل سمجھے جائیں جو عوام کے فہم سے بالاتر نہیں ہیں مسلمان بے تکلف سنسکرت کے لفظ بولیں اور لکھیں، اور ہندو عربی و فارسی کے۔ اس کے علاوہ علوم و فنون کے واسطے انگریزی کی اصطلاحیں بعد ترمیم مناسب داخل ٹکسال کر لی جائیں۔

مشترکہ فضا پیدا کرنے کا خیال کتنا اچھا اور کتنا مبارک ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ کوئی نئی اور انوکھی چیز ہے یا اس سے پہلے بھی ہندوستان میں موجود تھی اور اب محض نئے انداز سے پبلک سے روشناس کی جا رہی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضا ملک پر قریب قریب ایک ہزار برس سے چھائی ہوئی ہے۔ اُردو اسی فضا کا نتیجہ ہے بحث بھی صرف اسی زبان و بیان سے ہے جو عام طور سے سب کو پسند ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس فضا کو فورٹ ولیم کالج نے خراب کیا۔ اگر اس وقت ایک ہی زبان کی دو صورتیں نہ مان لی جاتیں تو آج ہمارے پاس ایک ہی قومی زبان ہوتی اُردو کے اہل قلم سے اگر کوئی مطالبہ کیا جا سکتا ہے تو اتنا کہ وہ نئے نئے عربی و فارسی کے لفظوں کو زبان میں نہ داخل کریں لیکن اس کے مقابلہ میں ہندی کے مصنفوں سے دوہرا مطالبہ ہے اوّل تو وہ ان لفظوں کو اچھوت نہ سمجھیں جو اسقدر عام ہو گئے کہ انھیں عالم و جاہل سب سمجھتے ہیں۔ مثلاً حکم کی جگہ "آگیا" (आज्ञा) ضرورت کی جگہ "آوشکتا" (आवश्यकता) "تصویر" کی جگہ

پرادھوٗ ([illegible]) اور حاضر کی جگہ اُپستھت (उपस्थित) لکھنا چھوڑ دیں دوسرے وہ بھی متحدہ قومیت کو پیش نظر رکھ کر سنسکرت کے نئے نئے لفظوں سے اپنی عبارت کو پاک صاف رکھیں تو یہ فضا پیدا کرنے کی ایک مسعود و مبارک کوشش "شبد ساگر" کے مؤلفوں نے کی ہے۔ چنانچہ عربی کے جن لفظوں کو میں نے بطور مثال پیش کیا ہے وہ سب اسمیں موجود ہیں اور یہی کیا اس میں تو ایسے ایسے محاورے بھی ملتے ہیں جیسے "ضرب خفیف" اور "حکم کی تعمیل کرنا"۔ یہ ان مؤلفوں کی بلند نظری اور دریا دلی ہے اور قومی نقطہ نظر سے اس کی داد نہ دینا انصاف کا خون کرنا ہے۔ اس کا ثبوت دینے کے لئے کہ جو عربی و فارسی کے لفظ جزو زبان بن گئے ہیں اور ان کو وہ واقعی اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انہوں نے یہاں تک کیا ہے کہ اکثر سنسکرت لفظوں کے معانی و مفہوم بھی عربی و فارسی لفظوں کی مدد سے بتلائے ہیں مثلاً "آیو" (आयु) کے معنی "عمر زندگی" اور "سُشرُت" (सुश्रुत) کے معنی خوب سنا ہوا۔ مشہور بتائے ہیں لیکن مجھے اس میں شک ہے کہ ہندی کے لکھنے والوں میں سے کوئی ایسا ہے جو بے تکلف ان لفظوں کو استعمال کرتا ہو۔ اردو میں سب سے پہلے جو قابل ذکر لغات کی کتاب لکھی گئی ہے وہ غالباً فرہنگ آصفیہ ہے۔ اس کا ہندی کے لفظوں سے پاک ہونا محال ہے مگر معمولی لفظوں کے علاوہ اس میں بے انتہا لفظ اس قسم کے موجود ہیں جو اتفاق باہمی کی شہادت دیتے ہیں مثلاً "ابھشت راج"۔ ڈاکٹر فالن (Fallon) وغیرہ نے جو لغات کی کتابیں لکھی ہیں اُن میں اس سے بھی زیادہ اس قسم کے لفظ ہیں۔

قومی زبان کے حق میں فورٹ ولیم کالج نے جو کانٹے بوئے تھے۔ انھوں نے آخر اس کے پیراہن کو تار تار کر کے چھوڑا اور یہ اب اگر رفو ہو سکتا ہے تو وہی فضا پیدا کرنے سے جو اس کالج سے پہلے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہمیں اگر قومی زبان کو پھر زندہ کرنا ہے تو ایسے مصنف پیدا کرنا چاہیئے جو خود ٹھیٹھ ہندوستانی لکھ سکیں اور آیندہ نسلوں کو سکھا سکیں۔ ہمارے مدرسوں میں فرق رسم الخط کے سوا جو کتابیں پڑھائی جائیں اُن کے مضمون اور عبارتیں ایک ہونا چاہیئے۔

وہ علوم و فنون جو عرصہ سے اس ملک میں چلے آتے ہیں اور کسی معنی میں بھی مغربی علوم و فنون کے مرہون منت نہیں۔ ان کو ہماری زبان بہ خوبی ان لفظوں کی مدد سے سکھا دے گی جو مدت دراز سے ہمارے ملک میں بولے جاتے ہیں لیکن نئی باتوں کے لئے نئے لفظ درکار ہوں گے ان کے بنانے کی نسبت اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کر سکتا جو میں اپنے مضمون "حسن ترکان الفاظ" عرض کر چکا ہوں۔ عربوں نے غیر زبان کے الفاظ کو اپنی زبان میں داخل کرنیکے لئے [illegible]

ہمیں بھی بنا لینا چاہیئے - ہمارے یہاں کوئی قاعدہ تنیذ نہیں ہے - اس کی سخت ضرورت ہے ہمارے اصول کی غرض و غایت یہ ہونا چاہیئے کہ لفظ کی چند آوازیں بدل دی جائیں کیونکہ کسی زبان کی کوئی آواز نہیں جسکو ہندوستانی نہ ادا کرسکتا ہو یا جسکو اس کی رسم الخط ناقص یا کامل طور سے ظاہر کرنے سے عاجز و قاصر ہو - عربی سے ہمارا ایک قدم آگے بڑھا ہونا چاہیئے - ہمیں غیرزبان کے ثقیل وطویل الفاظ اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالکر مختصر اور سڈول کرالینا چاہیئے - یہ کام انجام دینے کے لئے ہمیں ان لفظوں کی ہیئت اور تلفظ پر غور کرنا پڑے گا جو انگریزی وغیرہ سے اُردو میں داخل ہوگئے ہیں - مثلاً سفینہ اور اسٹام وغیرہ (SUB-POENA, STAMP) وغیرہ کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں - لیکن میں اس کی حمایت کرنے سے قاصر ہوں کہ سب علمی اصطلاحیں انگریزی سے جوں کی توں لے لی جائیں - میرا خیال ہے کہ ان کو اسی صورت میں قبول کیا جائے - جب ہماری قوت اختراع جواب دیدے - مثلاً تھرمامیٹر ایک عام لفظ ہے اسے صرف وہی سمجھ سکتے ہیں، جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی جانتے ہیں یا جو انگریزی پڑھوں سے سنتے چلتے رہتے ہیں - اگر اس کی جگہ "تپ پیما" ناپسند ہے کیونکہ اس سے فارسی کی بو آتی ہے تو کیوں نہ "تپ ناپ" یا "تپ نپا" یا "گرمی ناپ"[عہ] یا "گرمی نپا" کو رواج دیں - بیرومیٹر کو کیوں نہ "ہوا ناپ" کہیں - اس قسم کے لفظ پہلے پہل بہت برے معلوم ہوں گے لیکن ہر نیا لفظ جب بنایا جاتا ہے تو اس کو مذاق عام کی جھنجھوڑیں جھیلنی پڑتی ہیں، کبھی تو وہ انھیں جھیل کر بچ جاتا ہے کبھی اس کی صورت بدل جاتی ہے اور کبھی جھیلنے کی سکت نہیں ہوتی تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے - اس قسم کی کوشش کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ جو نئے لفظ قبول کرلیے جائیں گے وہ فہم عوام سے قریب تر ہوں گے اور ہندوستان کی اور زبانوں میں بھی آسانی سے کھپ جائیں گے - لفظ بناتے وقت ہمیں مجاز و استعارہ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے اور اگر ان کی مدد سے کوئی لفظ ہاتھ لگ سکتا ہے تو فوراً جو لفظ زبان میں موجود ہے اس کے معانی میں توسیع کرنی چاہیئے - اس طرح ہم نہایت آسانی سے بہت سی علمی اصطلاحیں بنا سکیں گے - اور وہ مقبول بھی جلد ہو جائیں گی - عربی ایسا کرچکی ہے اور ہم بھی کرسکتے ہیں -

میرا خیال ہے کہ مجھے یہ بحث یہیں ختم نہ کرنی چاہیئے - بلکہ لگے ہاتھوں اس مضمون سے متعلق ایک بات اور بھی کہدینا چاہیئے - اردو ہو یا ہندی دونوں میں کلاسیکل زبانوں کے لفظوں

[عہ] اُردو میں اس کے مشابہات (Analogues) ہیں - چڑی مار - بال توڑ - کام چور - من چلا - کن کٹا - کل جبا -

داخلہ کے سبب بھی دیکھنا چاہیئے۔ میرے نزدیک ٹھیٹھ اُردو یا ہندی کے بیان میں طوالت ہے اور کلاسیکل زبانوں کے لفظ اس طوالت کو اختصار سے بدل دیتے ہیں اس کا باعث ہماری گرامر ہے اس میں اتنے تھوڑے اصول ہیں یا اگر اصول کی تعداد کافی ہے تو ان سے اسقدر کم کام لیا جاتا ہے کہ کلاسیکل زبانوں کے الفاظ اس کمی کو پورا کرتے ہیں۔ میں اسوقت تمام قواعد اردو پر ایک نظر ڈالکر اور کلاسیکل زبانوں کے قواعد کا اس سے مقابلہ کرکے یہ دکھانا نہیں چاہتا کہ کیا کیا کمی ہے۔ دو ایک مثالوں پر قناعت کرتا ہوں۔ مثلاً "بچّوں کی سی حرکتیں" اس کو مختصر طور پر "طفلانہ حرکتیں" کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح "یہ بات میری جانی ہوئی ہے" کی جگہ "یہ بات مجھے معلوم ہے" وغیرہ۔ اس کے علاوہ بعض وقت اردو ہو یا ہندی لفظیات بھی مدد نہیں کرتا۔ مثلاً اگر آپ عربی اور سنسکرت سے بچ نکلنے کو "سبب" اور "کارن" نہ لکھنا چاہیں تو کیا لکھیں گے۔ مجھے تو کوئی لفظ معلوم نہیں۔ جو ان دونوں زبانوں سے تعلق نہ رکھتا ہو اور جسے ٹھیٹھ ہندوستانی کا لفظ کہہ سکیں "تقلید" اور "انوکرن" (अनुकरण) سے بچنا چاہیں تو سوا "پیچھے پیچھے چلنا" یا "جیسا کسی نے کیا ہے آپ کرنا" کے اور کیا لکھ سکتے ہیں اگر ہم دونوں لفظوں کو چھوڑکر بالفرض "پیچھے پیچھے چلنا" لکھیں گے تو اس پر طوالت کا اعتراض ہوگا۔ درحقیقت زبان کی اس قسم کی کمزوری مجبور کر دیتی ہے کہ کلاسیکل زبان سے لفظ لیا جائے یہی زبان میں ادق بدیسی لفظوں کی آمد کے لئے دروازہ کھولدیتی ہے اور اس میں دقت پیدا کرتی ہے یہی مصنّفوں کو للچاتی ہے کہ وہ کلاسیکل زبانوں کے لفظ لے لے کر اپنے مطلب کو واضح طور سے اور خوبصورتی کے ساتھ ادا کریں۔

ابھی تک محض علمی بحث ہوتی رہی ہے۔ اب ذرا حقیقت پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ملک کے طول وعرض میں کسی زبان کے پھیلنے کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ حکومت کی زبان ہے یا نہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ انگریزی آج مملکت متحدہ برطانیہ عظمیٰ کی وسعت میں بے تکلف سمجھی جاتی ہے لیکن اس کا سبب یہ ہرگز نہیں کہ اس میں کچھ خوبیاں ہیں یا اس کے عناصر ان تمام بولیوں میں مشترک ہیں جو اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ اور ویلز میں بولی جاتی ہیں بلکہ اصلی سبب یہ ہے کہ انگلینڈ ان تینوں پر حکمراں ہے اور حکومت کی زبان انھیں سیاسی وجوہ کی بناء پر پڑھنی پڑتی ہے۔ دیکھئے جب ایران کا ایک صوبہ پہلو

عـہ یہاں لسانیاتی بحث نہیں ہے۔

باقی حصہ ملک پر حکمرانی کرنے لگا تو سارے ایران پر پہلوی چھا گئی۔ دُور کیوں جایئے۔ مسلمان ہندوستان کے بادشاہ ہوئے تو عربی و فارسی اپنے ساتھ لائے۔ آج ہندوستان کی کون سی زبان ہے جس میں عربی و فارسی کے لفظ نہیں ملتے۔ اس وقت شاید کوئی حصہ اس کا ایسا ہو جہاں لوگ فارسی نہ جانتے اور سمجھتے ہوں۔ اب انگریز ہماری قسمتوں کے مالک ہیں اور انگریزی کی جو حالت ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ ہم ہندوستانی کو قومی زبان بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن ذرا اور صوبہ والوں سے بھی پوچھ لینا چاہیئے کہ وہ بھی اس پر رضامند ہیں یا نہیں کہ ہندوستانی ان کے سر منڈھ دی جائے۔ مجھ سے پوچھئے تو ہندوستان کی قومی زبان وہ ہوگی جو اس صوبہ میں بولی جاتی ہوگی جس کے باشندے سیاسی قوت و اقتدار میں اور صوبوں کے رہنے والوں سے بڑھے ہوئے ہوں گے۔ اگر بنگالی سب پر غالب آگئے تو بنگلہ راشٹر بھاشا بن کر سب کو دبالے گی اور مرہٹے حاوی ہو گئے تو کل ہندوستان کو مرہٹی گھیر لے گی۔ اس لئے قومی زبان کا مسئلہ ایسا ہے جو کاغذی لڑائی سے طے نہ ہوگا بلکہ سیاست اس کا فیصلہ کرے گی اور سردست اُردو اور ہندی کو اپنی اپنی راہ پر چلنے دیا جائے اور اگر کچھ کوشش کی جائے تو یہ کہ زبان میں سادگی کا حسن پیدا کیا جائے جس میں ایک مقصد یہ بھی مضمر ہو کہ صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ اور دہلی وغیرہ میں کم سے کم ہندو اور مسلمان ایک ایسی زبان بولیں جو وہ آپس میں سمجھ سکیں چونکہ پنجاب اس باب میں ہمارا تبیع ہے اس لئے اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

دو خدائی خدمتگار

مہاتما گاندھی کے نامور سکریٹری مسٹر مہادیو ڈیسائی نے انگریزی زبان میں ڈاکٹر خان اور ان کے چھوٹے بھائی خان عبدالغفار خاں صاحب عرف سرحدی گاندھی کے سوانح حیات اور تحریک خدائی خدمتگاران کے حالات لکھے تھے۔ اب مولانا محمود علی خاں نے اس کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے شروع میں سرحد کا نقشہ اور مہاتما گاندھی کی لکھی ہوئی تقریب ہے۔ اصل کتاب میں حالات زندگی کے علاوہ ضمنی طور پر بہت سی ضروری باتیں بھی آگئی ہیں، جن کا معلوم کرنا ایک طالب علم سیاسیات کے لئے ضروری ہے متعدد تصویروں کی بدولت کتاب کی دلچسپی میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ سرورق پر خان برادران کا فوٹو ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ حجم ۱۱۴ صفحات سائز $\frac{۲۰ \times ۲۲}{۱۶}$، قیمت مجلد ۱۲/ر۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

کشتیِ دل

(پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ایم۔اے آئی۔ای۔ایس)

ناخدا طوفاں میں تو مجھ کو بہہ جانے بھی دے
بحرِ وحدت میں ذرا غوطے مجھے کھانے بھی دے

جانتا ہے تو ہوا کو، لہر کو، گرداب کو
ڈھونڈتی ہوں میں یہاں اک گوہرِ نایاب کو

اب نہ مجھکو چھیڑ مستی میں چلی جاتی ہوں میں
ہو کے بیخود بحرِ ہستی میں چلی جاتی ہوں میں

ڈوب جاؤں گی تو عمرِ جاوداں مل جائے گی
نعمتِ اسرارِ بحرِ بیکراں مل جائے گی

روکتا ہے کیوں مجھے گرداب میں جانے سے تو
کیا تجھے اس سے، اگر میری یہی ہے آرزو

مرغِ آبی ہوں مجھے کیا واسطہ ساحل سے ہے
رہروِ ملکِ عدم ہوں کیا غرض منزل سے ہے

ظلمِ ساحل کا نہ کم تھا جورِ چرخِ پیر سے
قید کر رکھا تھا مجھ کو باندھ کر زنجیر سے

بیخودی کے شوق میں آگے بڑھی جاتی ہوں میں
توسنِ آبِ رواں پر ہاں چڑھی جاتی ہوں میں

موجِ دریا میں حباب اٹھتی ہے اچھل جاتی ہوں میں
ڈر نہیں طوفان کا گر کر سنبھل جاتی ہوں میں

دو گھڑی تو مجھکو آزادی سے جی لینے بھی دے
آبِ حیواں کے مجھے دو گھونٹ پی لینے بھی دے

تو ہو لیکن بیخودی کو سر میں بھر لینے بھی دے
بحرِ لامحدود کی کچھ سیر کر لینے بھی دے

تشنۂ آبِ بقا کو موج ہی پیمانہ ہے
جس کو تو گرداب کہتا ہے مرا میخانہ ہے

شورِ طوفاں کا مجھے اک نغمۂ توحید ہے
درمیانِ قعرِ دریا ساحلِ امید ہے

جس جگہ ارض و سما آپس میں ہم آغوش ہیں
حسن کی چادر میں تارے جس جگہ روپوش ہیں

جس جگہ ہے عمقِ بے پایاں وہاں لے چل مجھے
جس جگہ پھیلا ہے بحرِ بیکراں لے چل مجھے

جس جگہ میں چھوٹ جاؤں ہستیٔ ناشاد سے
چین آئے آسماں کو بھی مری فریاد سے

علامۂ برق مرحوم

(از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی)

حضرت داغ دہلوی کے انتقال پر مولانا حالی نے کہا تھا کہ شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہوگی یارو۔لیکن نہ معلوم دلی کی مٹی میں ایسی کونسی تاثیر ہے کہ داغ کے زیر سایہ ایک ایسا نونہال پروان چڑھ رہا تھا جس نے کچھ ہی دنوں میں پھول پھل کر چمنستان ادب کو ایسے رنگا رنگ اور سدا بہار پھولوں سے بھر دیا جن کی خوشبو رہتی دنیا تک اہل ذوق کے مشام جان کو معطر کرتی رہے گی۔ یہ مافوق الفطرت ہستی علامۂ برق مرحوم کی ذات والاصفات تھی۔ افسوس کہ دنیائے دنی کے ابدی اصولوں نے اس چہکتے بلبل کو عین عالم بہار میں ہمیشہ کے لئے خاموش کرکے اہل دنیا کو اس کی رنگین نوائی سے محروم کردیا۔

اردو کو رونے کے لئے پہلے داغ ہی کیا کچھ کم تھے کہ ظالم قضا نے اس کے خرمن حیات پر ایک اور بجلی گرائی اور حضرت استاد مرحوم ہم سب کو داغ مفارقت دے کر فردوس نشیں ہوگئے۔ ابھی آپ کی بہار زندگی کا بمشکل تینتالیسواں سال تھا۔ دراصل یہ ایسی موت ہے کہ اس پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔یوں تو دنیا اہل کمال سے کبھی خالی نہیں رہتی۔پھر بھی جو اس بھری محفل سے اٹھ جاتا ہے اس کی جگہ ہمیشہ خالی ہی رہتی ہے۔یوں تو اب بھی دہلی میں ساحر سے سحر طراز، معجز سے جادو نگار، شیدا سے عاشق سخن، منور سے روشن دماغ سائل، بیخود اور آغا شاعر سے باکمال موجود ہیں پھر بھی بزم ادب کا چراغ گل اور ساری محفل کی محفل سونی نظر آتی ہے۔

مرحوم کو اپنے معاصرین میں بہت ممتاز جگہ حاصل تھی۔ وہ امرت برسانے والی تلی ہوئی گھٹاؤں میں ہمیشہ نورپاش بجلی کی طرح چمکا کرتے تھے۔فن شعر پر جسقدر عبور و دسترس انھیں حاصل تھی اسکی مثال بہت کم نظر آتی ہے۔ نہایت مختصر مگر انتہائی مصروف زندگی میں بھی مرحوم نے سچے موتیوں کیطرح پاکیزہ اور روشن کلام کا ایک ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔جو بلاشبہ میدان شاعری میں اہل شعور کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہوگا۔اور آنے والی نسلیں اس برق تجلی کے ایک ایک نور شعلے سے اپنے چراغ روشن کریں گی

اس دار فانی سے ایک دن سبھی کو جانا ہے لیکن آپ کے جانے کا ہرگز یہ وقت نہ تھا مگر قضا و قدر کے

سامنے کسی کی کچھ نہیں چلتی ہے۔"اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے"۔

زمانہ نے جس طرح چکبست، سرور، اور رواں کا غم کلیجہ پر پتھر رکھکر سہہ لیا اسی طرح اس صدمہ جانکاہ کو بھی برداشت کرے گا لیکن جو جگہ آج خالی ہوگئی ہے۔ اس کا پُر کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

شاعر دراصل دنیا کا باشندہ ہوتا ہے۔ پھر بھی اختلاف معاشرت کی کوتاہ نظری نے جو جغرافیائی قیود عاید کردیے ہیں اس لحاظ سے ہم اسے کسی خاص ملک یا قوم کا سرمایۂ ناز کہتے ہیں۔ علامۂ مرحوم بلاشک شبہ ہندوستان کے مایۂ نازش و باعث افتخار تھے۔ اردو ادب کو اُن کی ذات بابرکات پر جتنا فخر ہو کم ہے۔ اُن کی تصانیف بلیغ نے نہ صرف اردو زبان کو چار چاند لگا دیے ہیں بلکہ خود انھیں بھی حیات دوام بخش دی ہے۔

مرحوم کی علمی و ادبی قابلیت مسلّمہ تھی ان کی طبع سلیم زمانہ حال کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ پرانی تہذیب و تمدن کا اثر بھی اس قدر گہرا تھا کہ دوست و دشمن ان کے مداح تھے۔ نازک مزاجی کے ساتھ ساتھ شیریں کلامی، خوش اخلاقی، خندہ پیشانی، فراخدلی اور ضروری انکسار کے جوہر ان کی طبیعت میں اس درجہ حلول کر گئے تھے کہ ان کی ذات اپنے پرائے سب کی نظر میں جمیع اوصاف حمیدہ کا مجموعہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ آپ اعلیٰ درجہ کے مہمان نواز، پُرتکلف اور صاف گو واقع ہوئے تھے، اپنی سحر بیانی سے چشم زدن میں اپنے بیگانوں پر اپنا سکّہ بٹھا دیتے تھے حتیٰ کہ حریفوں کے دل بھی مسحور ہوئے بغیر نہ رہتے۔

علامۂ برق شعر پڑھنے میں ترنم سے گریز کرتے تھے اور تحت اللفظ پڑھا کرتے تھے لیکن وہ بھی اس آن و شان کے ساتھ کہ ان کے بعد کسی دوسرے کا رنگ جمنا محال ہو جاتا تھا۔ جہاں تک کلام کا تعلق ہے دنیا اس کی بے پایاں لطافتوں سے فیضیاب ہو چکی ہے۔ کلام میں سلاست، روانی، زور، بندش کی چستی شوکت الفاظ اور ندرت خیال کے ساتھ ساتھ ایک خاص خوبی یہ ہے کہ زبان میں وہی حلاوت وہی رنگینی بھری ہوئی ہے جو داغ کے گھرانے کا حصّہ ہے۔ برق صاحب نے عام لوگوں کے فرسودہ راستہ سے ہٹ کر اپنے لئے ایک الگ جگہ بنالی تھی جس پر آزادی کے ساتھ منزلیں کی منزلیں طے کرتے چلے گئے۔ اُن کی شاندار کامیابی ہر سخن طراز کے لئے باعثِ رشک ہے۔

جولائی ۱۹۳۴ء کے اوائل میں آخری بار مجھے ان کے درشن کرنے کا موقع ملا تھا۔ ان دنوں آپ نہایت نحیف و ناتوان نظر آتے تھے۔ طویل علالت کے باعث طبیعت بشاشس نہ تھی۔

ادھر تعمیر مکان کی کوفت اور پریشان کئے ہوئے تھی۔ پھر بھی مذاق سخن کا یہ عالم تھا کہ دن بھر شعر و شاعری ہی کے چرچے رہتے۔ افسوس اب یہ صحبتیں ہمیشہ کے لئے خواب ہوگئیں۔

مرحوم جب بریلی کالج کے سالانہ مشاعرہ کی صدارت کے لئے بریلی تشریف لائے تھے تو آپ نے ایک ایڈریس کے جواب میں فرمایا تھا کہ اب اردو میں بھی شیلے[۵۱] اور کیٹس[۵۲] پیدا ہو چکے ہیں۔ دراصل کیٹس کا کلام انھیں بہت مرغوب تھا اور وہ بالعموم اُن کے مطالعہ میں رہا کرتا تھا۔ بریلی سے واپسی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد آپ کو ایک ایسا سانحہ درپیش ہوا جس سے اُن کی ساری زندگی تلخ ہوگئی آپ کی پہلی اہلیہ محترمہ سے صرف ایک اولاد تھی جو انھیں بہت زیادہ عزیز تھی۔ لیکن قضائے الٰہی سے ان کی یہ ننھی دختر نیک اختر چراغ کی لَو سے جل کر راہی ملک بقا ہوگئیں جس کا انھیں ہمیشہ ملال رہا۔ بالآخر اسی غم میں چار چھوٹے چھوٹے بچے، وسیع حلقۂ احباب و تلامذہ اہلیہ محترمہ نیز بہت سا غیر مطبوعہ کلام اپنی یادگار چھوڑ کر آپ دارالمحن سے کنارہ کش ہوئے۔

بہرحال ایسی ایسی ہزاروں باتیں ہیں جنھیں یاد کرکے ہم زندگی بھر روئیں گے اگر اسوقت نہایت ضروری بات یہ عرض کرنا ہے کہ بدنصیبی سے مرحوم نے ایک ایسی سرزمین کی آغوش میں پرورش پائی تھی جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور جس کے ناعاقبت اندیش فرزند تعصب بیجا کے صیدزبوں بنے آنکھ بند کرکے اپنی تباہی کی قبر کھودنے میں مصروف ہیں، ایسی حالت میں مرحوم کے بیشمار مداحوں کے موجود ہوتے ہوئے بھی یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ ہم آپ کے بعد آپ کا اتنا ہی پاس و احترام رکھیں گے جس کے کہ وہ مستحق تھے۔ اگر اور کچھ نہیں تو کیا ہم اتنا بھی نہیں کرسکتے کہ مرحوم کے شایان شان ان کی یادگار قایم کرکے اپنی زندگی کا ثبوت پیش کرسکیں؛

مرحوم کی حیات میں میں نے ایکبار یہ تجویز ان کی خدمت میں پیش کی تھی کہ اُن کا سارا کلام کتابی صورت میں شایع ہو کر محفوظ ہو جائے اور اس کے لئے ہمارے صوبہ کے اولوالعزم پبلشر جناب رائے صاحب لالہ رامدیال نے بخوشی اشاعت کی ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں، لیکن اس تجویز کو شرف قبولیت ہو جانے کے باوجود بھی کلام کی مناسب ترین ترتیب نہو سکی اور وہ شایع نہو سکا۔ علامہ برقؔ کا کلام بلاغت نظام قوم کا بیش قدر سرمایہ ہے اور اس کی حفاظت کرنا ہمارا سب کا متحدہ فرض ہے۔

KEATS, ۵۲ SHELLEY, ۵۱

حضرت برق مرحوم

(از حضرت منور لکھنوی)

رخصت ہوئی ہے غالبِ ثانی سے روحِ شعر
اک سخت حادثہ ہے فراقِ دوامِ برق

اب ان کی طبعِ شوخ کی جولانیاں کہاں
تھا آسمانِ اوجِ سخن پر قیامِ برق

اب گلشنِ ادب میں یہ کس کو دماغ ہے
تھا نکہتِ سخن سے معطر مشامِ برق

پائیں گے بزمِ شعر میں اب اہلِ دل کہاں
وہ سحر آفرینی و لطفِ کلامِ برق

ہو خاک کیف پاشیِ صہبائے حسن و عشق
اب محفلِ سخن میں نہیں دورِ جامِ برق

ہے سرزمینِ حالی مرحوم آہ آہ
تو نے سپردِ خاک کیا کیوں نظامِ برق

دیکھو تو آج حلقۂ ماتم کی وسعتیں
کتنا نگاہِ خلق میں ہے احترامِ برق

تھی جادۂ سلوک کی خاموش پیروی
ہے ہر زباں پہ تذکرۂ فیضِ عامِ برق

حسنِ کلام سے جو منور دلوں پہ نقش
صدیوں رہے گا عالمِ امکاں میں نامِ برق

رباعیات حالی

(حرص و ہوس)

دولت کی ہوس اصل گدائی ہے یہ
سامان کی حرص بے نوائی ہے یہ
حاجت کم ہے، تو ہے یہ شہنشاہی
اور کچھ نہیں حاجت تو خدائی ہے یہ

(حیاتِ ابدی)

گر چاہو کہ جیتے جی بھلے کہلاؤ
اپنوں کو سلوکِ نیک سے پرچاؤ
پر مدِ نظر ہو گر حیاتِ ابدی
بیگانوں کو آشنا بناؤ، جاؤ

حشرِ انتقام

قصّہ

(از ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ)

(۱)

وہ بڑبڑاتا ہوا گھر سے نکلا۔ مدہوشی سے اُس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا گرمی ناقابلِ برداشت تھی۔ لیکن اسکو کسی بات کی پروا نہ تھی۔ شاید چلنے سے پہلے اُس نے پوری بوتل پی لی تھی۔ بڑبڑاتے بڑبڑاتے اس کی بدمستی حد سے تجاوز کر گئی اور وہ وجد میں آکر الاپنے لگا۔

"آ۔ آ۔ آ۔ آ ــــــ"

لیکن ابھی گیت کا ایک لفظ بھی اُس کے منھ سے نہ نکلا تھا کہ سامنے سے موٹر کا ہارن بجتا ہوا سنائی دیا۔ نشہ نے اس کی عقل پر پہلے ہی سے پردہ ڈال رکھا تھا۔ موٹر کو اس نے اپنے راگ رنگ میں باعثِ ہرج سمجھا۔ اور "تیری ایسی تیسی" کہتا اور آستین چڑھاتا جھونکے کے ساتھ آگے بڑھا۔ تجربہ کار ڈرائیور نے موٹر کو فوراً روک لیا۔ پھر بھی وہ مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا اُس سے ٹکرا ہی گیا۔ ٹانگوں میں ایک ہلکی سی چوٹ لگی اور خون کی ایک پتلی سی دھار نکلی۔ اب اُس کو کچھ کچھ ہوش آگیا۔ چنانچہ وہ فوراً دامن جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن جھگڑا تکرار کرنے کے بجائے اُس نے سیدھا کچہری کا راستہ لیا۔ ڈرائیور نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی آتے جاتے نہ دکھ پڑا۔ اس لئے اُس نے بھی موٹر اسٹارٹ کی اور رہوا ہو گیا۔ کچہری بالکل قریب ہی تھی، گھاؤ لگنے سے اُس کا نشہ کچھ ہلکا ہو گیا تھا وہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا تھوڑی ہی دیر میں کچہری کے پھاٹک پر پہونچ گیا۔ دریافت کرنے پر کام میں کچھ دیر معلوم ہوئی تو سامنے پیڑ کے سایہ میں بیٹھ گیا۔

زخم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ خون آلودہ تھا ہی، مکھیاں بھنکنے لگیں، اور درد بھی محسوس ہونے لگا۔ مگر اُس نے بوتل منھ سے لگاتے ہوئے کہا "کچھ پروا نہیں۔" اور دو ہی چار گٹ گھٹ میں آدھی بوتل ختم ہو گئی اب اس کو تھوڑا سا آرام ملا۔ اور وہ وہیں لڑھک گیا۔

(۲)

لیکن بیچارے کو خراٹے لگاتے ہوئے دس منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ چپراسی نے زور سے اسکا ہاتھ ہلا کر کہا "دوکان نیلام ہو رہی ہے۔"

"کیا نیلام - این - دُوکان" کہتا ہوا وہ اُٹھ بیٹھا۔ آنکھیں ملکر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا غنودگی میں خواب کا تصوّر کر کے وہ پھر لیٹ رہا۔ مگر اس مرتبہ اُسے نیند نہ آئی۔ درد بڑھنے لگا۔ اُس نے پھر جیب سے بوتل نکالی اور بات کی بات میں باقی ماندہ بھی صاف کر گیا اور انگڑائی لے کر پھر لیٹنا چاہتا تھا کہ اتنے میں چپراسی کی پکار سُن پڑی "مادھو گنج کی دوکان نمبر دو نیلام ہوتی ہے جسکو لینا ہو حاضر ہو۔"

کسی آنے والی خوشی سے اس کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ وہ اُٹھا اور سیدھا اجلاس کے کمرے میں جا گھُسا جہاں اچھا خاصہ مجمع لگا ہوا تھا۔ یوں تو کلّو ساہوکار کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا، لیکن اُن کو اپنے چھوٹے بھائی ملّو سے ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا تھا اس لئے سب سے پہلے اُس نے یہی دیکھا کہ ملّو آیا ہے یا نہیں بڑی تجسّس اور چھان بین کے بعد اُسے اپنے ہی بغل میں کھڑا پایا اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

ڈپٹی صاحب: "تو کیا مادھو گنج کی دُوکان پر اب کوئی نہ بولے گا؟ پچاس روپے پر وہ ملّو کے نام نیلام ہوتی ہے۔" کلّو مادھو گنج اور ملّو کا نام سنتے ہی جلکر کباب ہو گیا۔ چہرہ تمتما اُٹھا۔ بولا "حضور ہمارے ساٹھ لکھئے گا۔" کلّو نے ساٹھ روپے اس لئے کہا تھا کہ ملّو پھر آگے بڑھنے کی ہمّت نہ کر سکے۔ مگر ملّو کو کلّو کی بیوقوفی معلوم ہو گئی۔ اُس نے دل میں سوچا کہ ابھی پہلی ہی بولی پر کلّو ایکدم دس روپے بڑھ گیا۔ تو کوئی تعجب نہیں کہ دو چار سو تک بول جائے۔ اُس نے کہا "اچھا حضور ہمارا ستّر رہے گا۔"

دوسرے ٹھیکہ داروں میں اتنی ہمّت نہ تھی۔ اس لئے ان میں سے اکثر چلے گئے۔ لیکن بعض نتیجہ سننے کی غرض سے برآمدہ میں کھڑے رہے۔

کلّو: تو ہمارے پورے ۱۰۰ لکھ لیجئے۔ جلدی کیجئے۔

ملّو آنکھیں بدلکر "واہ۔ ابھی کیسے؟ حضور ہمارا سوا سو لکھا جائے۔"

کلّو سے نہ رہا گیا۔ جھپٹ کر ملّو کی گردن پکڑ لی۔ چپراسی "ہاں - ہاں" کہتے ہوئے دوڑے۔ ڈپٹی صاحب کے بھی تیور بدلے۔ تب جا کر کلّو نے گردن چھوڑی۔

ملّو کمزور کتّے کی طرح دُم دبائے ہوئے باہر نکلا اور شیخی بگھارنے لگا۔ مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا "بچا کو اسی سال تو معلوم ہو گا جب ڈیڑھ دو سو کی گٹھری نکالنا پڑے گی۔ ابھی کیا ہے نشہ اُترنے پر جان پڑے گی۔" غرض اپنے کئے کی آپ ہی داد دیتے ہوئے ملّو گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ صرف ٹھیکہ کی رقم بڑھانے آیا تھا۔ اور اس میں اُسے اندازہ سے کہیں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔

ڈپٹی صاحب (اسی ناراضگی کے ساتھ) بولو کلّو بولتے ہو یا دوکان ملّو کے نام لکھی جائے۔

کلّو "حضور اس ضد پر تو کلّو ایک لاکھ تک بول سکتا ہے۔ دو چار سو کیا چیز ہے۔"

ڈپٹی صاحب: "ہاں۔ہاں۔یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ تم لاگ کی بات پر کبھی نہیں رُک سکتے۔"

کلّو: "تو ملّو کی بولی کتنی ہے؟"

ڈپٹی صاحب: "سوا سو (۱۲۵)"

کلّو: "تو ہمارا پورے ڈیڑھ سو لکھ لیجئے۔ بس نہ"

ضروری کارروائی کے بعد مادھو گنج کی دُوکان خوردہ کلّو کے نام درج رجسٹر کی گئی۔

کلّو "مار لیا۔مار لیا" کہتے ہوئے باہر نکلا۔ اور لوگوں سے ساری کیفیت بغیر پوچھے بتلانے لگا۔ لوگ بہت خوب کہکر اُس کی پیٹھ ٹھونکتے اور بیوقوفی کی داد دیتے۔ لیکن ڈیڑھ سو کی رقم نے سارا نشہ کرکرا کر دیا تھا۔ نشہ اُتر چکا تھا اور منہ لٹک رہا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ ٹھیکہ کسی طرح ٹوٹ نہ سکتا تھا۔ دل میں کچھ اور مگر ظاہر اکچھ اور کہتے ہوئے وہ گھر آ پہونچا۔ آتے ہی الماری کھولکر ایک اور بوتل نکالی اور اُسے پی کر پڑ رہا۔

(۳)

نشہ کے بعد خمار اور خمار میں اعضا شکنی ہوتی ہے۔ رات بھر تو کلّو بےحس و حرکت چارپائی پر پڑا رہا۔ صبح کو جب نشہ اتر گیا تو رو رو کر اپنی عقل کو کوستا تھا۔ کہ ناحق میں نے یہ وبال اپنے سر لیا۔ آجکل تو کوئی پینے بھی نہیں آتا ہے۔ گاہک پیسے پیسے کو مر رہے ہیں کانگریس والے کمبخت الگ سر پھوڑتے ہیں۔ جہاں دس بوتل روز نکلتی تھی اب دو بوتل بھی مشکل سے بکتی ہے۔ ادھر لڑکی کا بیاہ بھی کرنا ہے۔ بیوی کی فرمایشات الگ ہیں۔ کھیت پر بھروسہ تھا مگر وہ پہلے ہی نیلام پر چڑھ گیا ہے۔ اور نیلام دار بھی کوئی دوسرا نہیں ملّو ہے۔

غرض ان باتوں کو سوچتے سوچتے کلّو پھر جھپکی لینے لگا۔ نیند نے اس کا غم کچھ عرصہ کے لئے دور کر دیا ہوتا۔ لیکن دن زیادہ چڑھ چکا تھا۔ اور دوکان پر دو ایک آدمی بھی آگئے تھے، لڑکی نے ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا۔ کلّو اُٹھا اور ہاتھ منہ دھوئے بغیر ہمہ تن مہمانوں کی خاطر داری میں مشغول ہو گیا۔ بادہ گلرنگ کے دور چلنے لگے۔ منچلے لوگ وجد میں آکر جھومنے لگے۔ ایک روپیہ کی جگہ کسی نے ڈیڑھ دیا کسی نے دو۔ ایک کو بلایا، دو کو پلایا۔ دوسرا گیا تیسرا آیا۔ اس طرح شام تک کل نو ۹ روپے کا ٹوٹل پہونچا کلّو کی آنکھیں کھُل گئیں۔ انھیں نو ۹ روپیوں کو وہ رات بھر گنتا رہا گویا روپیہ کبھی آنکھ سے نہ دیکھا تھا۔

دوسرے دن بھی یہی حالت رہی۔ نت نئے لوگ آنے لگے۔ دوسری دوکان کے لوگ بھی کھنچکر یہیں آگئے۔ جس کی وجہ کلّو کی ایمانداری تھی۔ وہ اور دوکانداروں کی طرح پانی نہ ملاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ

نگین گزک کا سامان بھی رکھتا تھا۔ بہر حال شام تک اس کو سات آٹھ روپیہ مل جاتے تھے۔

(۴)

دنیا میں بہت کم لوگ حسد کی آگ سے بچ سکتے ہیں۔ اس کا تعلق اس غریب کے ساتھ بھی ہوتا ہے جسکو ہم بسا اوقات عیوب سے بری رہنے پر بھی اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ لیکن حسد کے بے قرار شعلے صرف محسود ہی کو نہیں بلکہ حاسد کو بھی انجام کار اُسی نتیجہ پر پہونچا دیتے ہیں۔

خوشامد خود ہی کی تلاش کرتی ہے اور حسد بربادی کی۔ یا حسد کو بربادی کا پیش خیمہ سمجھئے جب دل میں حسد کا بیج بو گیا تو بربادی بن بلائے مہمان کی طرح آجاتی ہے۔

چند روز قبل جو پردہ شراب نے کلو کی عقل پر ڈال رکھا تھا وہی پردہ حسد نے ملو کی آنکھوں پر ڈال رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے کلو کی ترقی بھلا کب دیکھ سکتا تھا۔ اسے تو اس کی بربادی دیکھنے کی خواہش تھی، پہلے اس نے سوچا کہ دھرنا دینے والے خود ہی آئیں گے، لیکن جب دو ہفتے تک کوئی شخص نہ آیا تو اس کے لئے خاموش ہو کر بیٹھ رہنا عذاب جان ہو گیا۔ وہ ایک دن اٹھا اور والنٹیروں کو دعوت دے آیا۔

دوسرے دن کلو سویرے لڑکی کا منھ دیکھ کر اٹھا، ہاتھ منھ دھویا۔ اشنان کیا، دکان لگائی۔ بیوی نے نگین گزک تھال میں باقاعدہ لگا کر رکھدی۔ اتنے میں ادھر سے رنگین طبع لوگوں کا ایک گروہ آتا ہوا دکھائی دیا، کلو خوشی کے مارے پھول اٹھا، چارپائی لاکر ڈالدی، یار لوگ چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کلو بھی بیٹھ گیا۔ سامنے لڑکی کھڑی تھی، گزک کی طرف اشارہ کرکے کہا " دیتی کیوں نہیں سب کو دے۔"

امیروں کے لڑکے اپنے ماں باپ کی حکم عدولی کر سکتے ہیں، لیکن غریب والدین کی محبت اور فرمانبرداری کو اپنا زیور سمجھتے ہیں۔ وفا کی دیوی کی پرستش غریب گھرانوں ہی میں خوب ہوتی ہے بیٹی نے آجتک کبھی باپ کی حکم عدولی نہ کی تھی۔ آنکھیں نیچی کرکے گزک تقسیم کرنا شروع کر دی۔

حسین سے نہ رہا گیا۔ تان چھیڑ دی: " ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن۔"

اس شرافت پر دیوی اندر چلی گئی۔

گزک تقسیم ہو چکی تھی، کلو، تل اور پیالیاں لینے اندر چلا گیا۔

بشیر: "حسین تم بھی بعض وقت بیوقوفی کر جاتے ہو کچھ نہیں تو غزل ہی چھیڑ دی۔"

حسین: "غالب کی غزل کوئی کیا سمجھے۔"

رامداس۔ اس میں کون سے معنی دھرے ہیں۔ اور سمجھی نہیں تو یہاں سے چلی کیوں گئی ہے۔

رامدیال: "ارے یار" . . . . .

رامداس: ارے بھئی اسی کو تو ایک نظر دیکھنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔

اتنے میں کلو سب سامان لیئے آپہونچا۔

گزک کا شغل جاری ہوگیا۔ اور کلو ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اتنے میں یکایک دھرنا دینے والوں کا ایک دستہ سہ رنگا جھنڈا لئے ہوئے دکھلائی پڑا۔ وہ دوڑ کر سب سامان اٹھا کر اندر بھاگ گیا۔ ابھی کسی نے اس جلدی کا مطلب بھی نہ سمجھا تھا۔ کہ سامنے سے "شراب پینا حرام ہے" کا نعرہ سنائی دیا۔

ادھر کلو نے اُن کے پہونچنے سے پہلے ہی سب لوگوں کو سارا معاملہ سمجھا دیا۔ پینے والوں میں سے قریب قریب سب ہی نئے تھے، بدنامی کے ڈر سے بھاگے۔ گناہ جب تک پوشیدہ رہے شیر شکر ہے مگر عیاں ہونے پر زہر۔

ذرا دیر میں والینٹروں کا دستہ آپہونچا۔ کلو دنیا دیکھے ہوئے تھا۔ بڑھکر سرغنہ کے پیر پر گر پڑا۔ لیکن اُس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "ارے یہ کیا کر رہے ہو۔ رام، رام۔ مگر آپ شراب ایسی بھرشٹ چیز کیوں بیچتے ہیں؟"

کلو۔ صاحب! دس گیارہ برس سے یہی کرتا آیا ہوں۔ اس سال نیلام بھی پورے "ڈیڑھ سو" پر ہوا نفع کچھ بھی نہیں رہا۔ ہم تو خود ہی اسے چھوڑ دیں گے۔ اور سچ پوچھئے تو بیچتا بھی نہیں۔ ایسے ہی کسی کو دوا دارو کے لئے دیدی تو دیدی۔ اس دفعہ مال نکل جاتا تو اچھا تھا لیکن جیسا آپ کہتے ہیں تو نہ بیچوں گا۔

دھرنا دینے والوں کا دستہ اطمینان کر کے چلا گیا۔ اور کلو دن بھر کوشش کر کے سب کے گھر بوتلیں پہونچا آیا۔ رفتہ رفتہ اس کا یہی معمول ہوگیا وہ گھوم پھر کر شراب بیچنے لگا۔

(۵)

لیکن شرابی کے لئے مے پرستی سے بڑھکر حسن پرستی ہوتی ہے۔ کلو کے نوجوان گاہک چین سے گھر نہ بیٹھ سکے۔ دوسرے دن بہانہ نکالکر پہونچے۔

والینٹروں کو کلو پر اعتبار نہیں ہوا تھا۔ اتفاق سے اسی دن ان کا سرغنہ خفیہ دیکھ بھال کیلئے آیا تھا جیسے ہی شراب سے لبریز پیالیاں مے پرستوں کے ہاتھوں میں پہونچیں۔ وہ ملو کے اشارہ سے کلو کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ کلو چور نہ تھا بے ایمان نہ تھا۔ پھر بھی والینٹروں کے کپتان کو دیکھ کر کانپنے لگا۔

کپتان۔ "میں نے آپ کی باتوں پر اطمینان کر لیا تھا۔ لیکن دھوکا کھایا۔ خیر اب دھرنا دینا پڑے گا"

دھرنا شروع ہو گیا، لیکن بے سود۔ کلو کا کام بند ہونے والا نہ تھا۔ دن رات میں کسی نہ کسی بہانے سے بیچ ہی لیتا تھا۔

ادھر للو نے بھائی کی یہ چالاکی دیکھ کر قاعدے کے خلاف شراب بیچنے کی رپورٹ کر دی۔ جواب طلب کئے جانے پر کلو نے ایسا بیان دیا کہ للو کا یہ وار بھی خالی گیا۔ اُس نے کہا کہ حضور دھرنا دینے والے ہم کو پریشان کرتے ہیں۔ پھر ہم کیوں نہ اُن کو پریشان کریں۔ دن بھر وہ سر پٹکتے ہیں لیکن ہم کسی نہ کسی ترکیب سے بیچ ہی لیتے ہیں۔ سرکار کا کام بھی بند نہیں ہوتا اور ہمارا [illegible] بھی ہو جاتا ہے۔

کلو جرم ثابت ہونے پر بھی چھوڑ دیا گیا۔ اور اُلٹے ضرورت پڑنے پر پولیس سے مدد لینے کا حکم ملا۔

مگر للو اپنی فطرت سے باز نہ آیا، حالانکہ اس کی دشمنی محض بے بنیاد تھی۔ دونوں ایک باپ لیکن دو ماؤں سے بیٹے تھے۔ للو پہلی بیوی سے تھا اسلئے باپ کی وصیت کے مطابق قریب قریب کل ترکۂ پدری اسی کو ملا تھا۔ اتنا ہونے پر بھی کلو اسے اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ لیکن للو کلو سے جلتا تھا۔ جس کی اصل وجہ یہ تھی کہ کلو کی بیوی ہونے سے پہلے اسی کے عقد میں آنے والی تھی۔ لیکن کلو نے چالاکی اور مکاری کا ایسا جال بچھایا کہ وہ ناکام رہا۔ اور یہ امر [illegible] اس نے للو والدین کا کیا ادا کرتا رہتا تھا۔ مگر کلو اس کے حملوں کو اس طرح برداشت کرتا تھا جس طرح فٹ بال کا کھلاڑی گیند کی ہلکی چوٹ آسانی سے برداشت کر لیتا ہے۔

— باب ۶ —

کلو نے ٹھیکہ بند ہونے پر حساب لگایا تو تین ہزار روپیہ کی آمدنی ہوئی جس کے بھروسے پر اس نے لڑکی کا بیاہ بھی ٹھیک کر لیا۔ اس کے مکان میں تین کمرے ایک آنگن اور ایک دالان تھا۔ دالان کا دروازہ چنوا کر اس نے اپنے لئے ایک کمرہ نکالکر باقی مکان کو اسی روپیہ پر بیع کر دیا اور شادی کی تیاری نہایت پوشیدہ طور سے شروع کر دی یہانتک کہ تلک کی رسم بھی ادا ہو گئی اور کسی کو معلوم تک نہ ہوا۔ لیکن بلائے آسمانی سے کس کا چھٹکارا ہو سکتا ہے۔ عین شادی کی ساعت ثانی عرصہ کے لئے ٹل گئی۔

جب للو کو معلوم ہوا تو وہ ہاتھ مل کر رہ گیا۔ لیکن ابھی آخری تیر اس کے پاس باقی تھا اور شکاری کو اپنے آخری تیر پر بڑا بھروسہ ہوتا ہے۔ اُس نے روزنامچہ نکالکر دیکھا تو کھیت کے نیلام کی تاریخ ختم ہونے کے قریب پہونچ گئی تھی۔ اُسے بھی چال سوجھی کہ دعوے کر دے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ کچہری سے سمن آیا۔ کلو کتے کی طرح وکیلوں کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔ اور اس بات کی پیروی کرنے لگا کہ نیلام کی تاریخ کچھ عرصہ کے لئے ٹل جائے۔ لیکن ساری کوشش فضول ثابت ہوئی۔ بیچارے نے جو کچھ اکٹھا کیا تھا وہ مقدمہ کی نذر ہو گیا۔

غریب کلو کی پریشانیوں کا وہی لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں، جن پر کبھی اس قسم کی مصیبتیں پڑی ہوں۔ دو بھائیوں کا آپس میں ایسا برتاؤ کہ لڑکی کی شادی تک رک جائے۔ اس بے حمیتی کی دوسری مثال شاید کہیں دیکھنے میں آئی ہو۔ بہرحال مصیبت زدہ کلو نے اصلی وجہ چھپاتے ہوئے لڑکے والوں کے پاس خط لکھا۔ ان کو کلو کی مفلسی کا اس سے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا۔ صاف لفظوں میں لکھ دیا کہ تمہاری لڑکی سیانی ہو چکی ہے۔ اب ایک منٹ بھی شادی نہیں ٹل سکتی۔ مہینہ دو مہینے کی مہلت تو بڑی بات ہے تین دن کے اندر جواب دو ورنہ ہم کسی دوسری جگہ بات چیت طے کر لیں گے تو پھر بعد کو نہ کہنا۔ آگے تم کو اختیار ہے۔

خط ملتے ہی کلو سر پیٹ کر رہ گیا۔ اُدھر ماں بیٹی، دونوں روتی تھیں اور اپنے کو اس ہنگامہ کا سبب سمجھتی تھیں۔ کلو روپے کے لئے گھر گھر کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ کھیت کیاری گھر بار کچھ نہ تھا۔ جو بیچ ڈالتا۔ نہ اس کا کوئی یار تھا اور نہ مددگار۔ غرض دو دن اسی طرح گزر گئے۔

تیسرے دن معمول سے زیادہ رات گئے کلو گھر آیا۔ دروازہ بند تھا۔ کنڈی کھٹکھٹائی۔ آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ کواڑ کے پلے کمزور تھے، اتار کر الگ رکھ دئے اور اندر داخل ہوا۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر روز تو ماں بیٹی رات رات بھر اس کا انتظار کرتی تھیں، لیکن آج کسی نے کنڈی کھٹکھٹانے پر بھی کچھ جواب نہ دیا۔ گھبرا کر چراغ جلایا اور بیوی و لڑکی کو پکار پکار کر ڈھونڈنے لگا۔ اس کی گھبراہٹ کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ جب اس نے ماں بیٹی کو صندوق کے پاس اوندھے منھ پڑا پایا۔ قریب آکر دیکھا، ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔ لیکن کسی نے چوں تک نہ کی۔ "کیا زہر کھا کر تو نہیں پڑ رہیں" شبہہ یقین کی صورت اختیار کرنے لگا۔

صبر اور ضبط کی طاقت ہاتھ سے جاتی رہی۔ آخر سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر میں ہوش بجا ہوئے، غور سے دیکھا تو دونوں کے چہرے کالے پڑ گئے تھے اور منھ سے رال ٹپک رہی تھی۔ لگاتار مصیبتوں سے کلیجہ پتھر ہو جاتا ہے۔ وہ سنبھل کر اٹھا کواڑ جیوں کے تیوں لگا لیے۔ چارپائی لایا اور وہیں بچھا کر بیٹھ گیا۔ رات بھر سرد آہیں بھرتا رہا۔ "ملو بھائی ہو کر اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہا ہے"۔ جب دل میں یہ خیال آتا تو اس کا کلیجہ جل اٹھتا تھا۔ لیکن آخرکار وہ اپنی ہی قسمت کو کوسنے لگتا۔ غرض اس طرح آہ و زاری کرتے ہوئے اس نے رات کے آخری دو تین گھنٹے بھی کاٹ دیے۔

ابھی رات کچھ باقی ہی تھی کہ ملو نے آکر آواز دی "کلو، کلو"

دھندا شروع ہو گیا۔ لیکن بے سود۔ کلّو کا کام بند ہونے والا نہ تھا۔ دن رات میں کسی نہ کسی بہانے سے بیچ ہی لیتا تھا۔

ادھر للّو نے بھائی کی یہ چالاکی دیکھکر قاعدے کے خلاف شراب بیچنے کی رپورٹ کر دی۔ جواب طلب ہونے پر کلّو نے ایسا بیان دیا کہ للّو کا یہ وار بھی خالی گیا۔ اس نے کہا کہ حضور دھندا دینے والے ہم کو پریشان کرتے ہیں۔ پھر ہم مجبور ہو کر ان کو پریشان کر دیا۔ دن بھر ہم بیٹھے رہتے ہیں لیکن ہم کسی نہ کسی ترکیب سے بیچ ہی لیتے ہیں۔ مگر کام کا نقصان نہیں ہوتا اور ہمارا اندازہ کبھی ہو جاتا ہے۔

کلّو جرم ثابت ہونے پر بھی چھوڑ دیا گیا۔ اور اسے ضرورت پڑنے پر پولیس سے مدد لینے کا حکم ملا۔ مگر للّو اپنی نظرت سے باز نہ آیا، حالانکہ اس کی دشمنی محض بے بنیاد تھی۔ دونوں ایک باپ لیکن دو ماؤں کے بیٹے تھے۔ للّو پہلی بیوی سے تھا اسلئے باپ کی وصیت کے مطابق قریب قریب کل ترکۂ پدری اسی کو ملا تھا۔ اتنا ہونے پر بھی کلّو اسے اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ لیکن للّو کلّو سے جلتا تھا جس کی اصل وجہ یہ تھی کہ کلّو کی حسین بیوی پہلے اسی کے عقد میں آنے والی تھی۔ لیکن کلّو نے چالاکی اور مکاری کا ایسا جال بچھایا کہ وہ ناکام رہا۔ وہ دن بار بار اس لئے للّو وار پر وار کرتا رہتا تھا۔ مگر کلّو اس کے حملوں کو اس طرح برداشت کر لیتا تھا جس طرح فٹ بال کا کھلاڑی گیند کی ہلکی چوٹ آسانی سے برداشت کر لیتا ہے۔

—— ۶ ——

کلّو نے مہینہ بند ہونے پر حساب لگایا تو ... روپیہ کی آمدنی ہوئی جس کے بھروسے پر اس نے لڑکی کا بیاہ بھی ٹھیک کر لیا۔ اس کے مکان میں تین کمرے ایک آنگن اور ایک دالان تھا۔ دالان کا دروازہ چھوڑ کر اس نے اپنے لئے ایک کمرہ نکالکر باقی مکان کو اسّی روپیہ پر بیع کر دیا اور شادی کی تیاریاں نہایت پوشیدہ طور سے شروع کر دی یہاں تک کہ تلک کی رسم بھی ادا ہو گئی اور کسی کو معلوم تک نہ ہوا۔ لیکن بلائے آسمانی سے کس کا چھٹکارا ہو سکتا ہے۔ عین شادی کی ساعت کافی عرصہ کے لئے ٹل گئی۔

جب للّو کو معلوم ہوا تو وہ ہاتھ ملکر رہ گیا۔ لیکن ابھی آخری تیر اس کے پاس باقی تھا اور شکاری کو اپنے آخری تیر پر بڑا بھروسہ ہوتا ہے۔ اس نے روزنامچہ نکالکر دیکھا تو کھیت کے نیلام کی تاریخ ختم ہونے کے قریب پہونچ گئی تھی۔ اسے بھی چال سوجھی کہ دعوے کر دے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ کچہری سے سمن آیا۔ کلّو کتّے کی طرح وکیلوں کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔ اور اس بات کی پیروی کرنے لگا کہ نیلام کی تاریخ کچھ عرصہ کے لئے ٹل جائے۔ لیکن ساری کوشش فضول ثابت ہوئی۔ بیچارے نے جو کچھ اکٹھا کیا تھا وہ مقدمہ کی نذر ہو گیا۔

غریب کلو کی پریشانیوں کا وہی لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں جن پر کبھی اس قسم کی مصیبتیں پڑی ہوں۔ دو بھائیوں کا آپس میں ایسا برتاؤ کہ لڑکی کی شادی تک رک جائے۔ اس بے حمیتی کی دوسری مثال شاید کہیں دیکھنے میں آئی ہو۔ بہرحال مصیبت زدہ کلو نے اصلی وجہ چھپاتے ہوئے لڑکے والوں کے پاس خط لکھا۔ ان کو کلو کی مفلسی کا اس سے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا۔ صاف لفظوں میں لکھ دیا کہ تمہاری لڑکی سیانی ہو چکی ہے۔ اب ایک منٹ بھی شادی نہیں ٹل سکتی۔ مہینہ دو مہینے کی مہلت تو بڑی بات ہے تین دن کے اندر جواب دو ورنہ ہم کسی دوسری جگہ بات چیت طے کرلیں گے تو پھر بعد کو نہ کہنا۔ آگے تم کو اختیار ہے۔

خط ملتے ہی کلو سر پیٹ کر رہ گیا۔ اُدھر ماں بیٹی دونوں روتی تھیں اور اپنے کو اس ہنگامہ کا سبب سمجھتی تھیں۔ کلو روپے کے لئے گھر گھر کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ کھیت کیاری گھر بار کچھ نہ تھا۔ جو بیچ ڈالتا۔ نہ اس کا کوئی یار تھا اور نہ مددگار۔ غرض دو دن اسی طرح گزر گئے۔

تیسرے دن معمول سے زیادہ رات گئے کلو گھر آیا۔ دروازہ بند تھا کنڈی کھٹکھٹائی۔ آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ کواڑ کے پلے کمزور تھے، اتار کر الگ رکھ دئے اور اندر داخل ہوا۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر روز تو ماں بیٹی رات رات بھر اس کا انتظار کرتی تھیں، لیکن آج کسی نے کنڈی کھٹکھٹانے پر بھی کچھ جواب نہ دیا۔ گھبرا کر چراغ جلایا اور بیوی و لڑکی کو پکار پکار کر ڈھونڈنے لگا۔ اس کی گھبراہٹ کا کچھ ٹھکانا تھا۔ جب اس نے ماں بیٹی کو صندوق کے پاس اوندھے منھ پڑا پایا۔ قریب آکر دیکھا، ہاتھ پکڑ کر ہلایا لیکن کسی نے چوں تک نہ کی۔ کیا زہر کھا کر تو نہیں پڑ رہیں؟ شبہ یقین کی صورت اختیار کرنے لگا۔

صبر اور ضبط کی طاقت ہاتھ سے جاتی رہی۔ آخر سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر میں ہوش بجا ہوئے، غور سے دیکھا تو دونوں کے چہرے کالے پڑ گئے تھے اور منھ سے رال ٹپک رہی تھی۔ لگاتار مصیبتوں سے کلیجہ پتھر ہو جاتا ہے۔ وہ سنبھل کر اٹھا کواڑ جیوں کے تیوں لگا لیے۔ چارپائی لایا اور وہیں بچھا کر بیٹھ گیا۔ رات بھر سرد آہیں بھرتا رہا۔ ملو بھائی ہو کر اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہا ہے؟ جب دل میں یہ خیال آتا تو اس کا کلیجہ جل اٹھتا تھا۔ لیکن آخر کار وہ اپنی ہی قسمت کو کوسنے لگتا۔ غرض اس طرح آہ وزاری کرتے ہوئے اس نے رات کے آخری دو تین گھنٹے بھی کاٹ دیے۔

ابھی رات کچھ باقی ہی تھی کہ ملو نے آکر آواز دی: "کلو، کلو!"

سوچ رہا تھا کلو آیا ہے۔ اپنے دل میں کہا اب یہاں کلو کا کیا کام۔ وہ یہاں کس لئے آیا ہے؟ ہماری دولت اپنے قبضہ میں کرنے آیا ہے؟ یہ کہتے ہوئے اس نے طاق پر سے چھرا اُتار کر ہاتھ میں لے لیا۔ اور دروازہ کی طرف لپکا۔

ادھر ملو نے دو چار مرتبہ پکارنے کے بعد ایسا دھکا مارا کہ دروازہ ہی گر پڑا اور وہ اندر داخل ہوا۔ کلو کمرے میں لگا ہی تھا۔ گھستے ہی ایسا چھرا مارا کہ ملو چیخ مار کر گر پڑا۔

ملو زمین پر پڑا ہوا کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر زبان بند تھی محض آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن میں معافی کی التجا تھی۔ ایسی التجا جو رد نہیں کی جاسکتی جس سے جذبۂ انتقام ہوا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں اسکی آنکھیں بند ہو گئیں۔

کلو کا غصہ پانی کی طرح بہ گیا۔ سامنے بھائی نزع کی حالت میں تڑپ رہا تھا۔ ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھوں سے آنسو نکل کر بھائی کے گالوں پر گرنے لگے۔ دلی جذبے نے جوش محبت کو ابھارا۔ وہ بول اٹھا۔ ملو آج دو مہینوں سے ان آنکھوں میں آنسو نہ آئے تھے۔ شاید تمہارے پہلے پریم کی داد دینے کے لئے جگر کے ٹکڑے آنکھوں سے آنسو بن کر نکل رہے ہیں"۔

بھائی کی آواز سنکر ملو نے آنکھیں کھولیں۔ مگر صرف ایک لمحہ بھر کے لئے۔ "میرا بھی یہی پریم جیت ہے"۔ کہتے ہوئے وہ تیز چھرا کلو نے اپنے کلیجہ میں مارنا چاہا تھا کہ ملو کی آنکھیں پھر کھلیں۔ کلو کو معلوم ہوا کہ آنکھیں اُس سے کہہ رہی ہیں کہ یہاں سے جلد بھاگ جاؤ"۔

کلو نے بھائی کا سر گود میں اُٹھا لیا۔ مگر جان نکل چکی تھی۔ آنکھوں سے چند قطرے نکل کر بھائی کے گال پر گر گئے۔

بے جان بھائی کا آخری دیدار کتنا پیارا تھا لیکن اپنی جان اس سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ وہ زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا۔ اپنا کرتہ اُتار کر کندھے پر ڈالا۔ اور بلا سوچے سمجھے کہ کہاں جا رہا ہے ایک طرف کا راستہ لیا۔ راہ میں اُسے جان پہچان کے دو ایک آدمی بھی ملے۔ لیکن اس خیال سے کہ کہیں وہ صورت سوال بن کر کچھ مانگنے نہ لگے کسی نے اس سے بات تک نہ کی۔

کلو قدم بڑھائے چلا جا رہا تھا۔ اور بھاگنے میں اُس کی بدقسمتی اُسے مدد پہونچا رہی تھی۔

بہار

(از مسٹر حسن یحییٰ عندلیب ایم۔ اے ریلیگ)

پھر جنوں خیز ہواؤں کا لگا ہونے گزر
پھر ہویدا ہوا وہ فصلِ بہاراں کا اثر
پھر ہر ایک شے میں تر و تازگی آتی ہے نظر
پھر ہر اک سمت سے آتی ہے مسرت کی خبر
شکر صد شکر بجے بربط و طنبور و رباب
محفلیں گرم ہوئیں اور چلا دورِ شراب

کس قدر جوش پہ ہے آج یہ سیلابِ نشاط
ساغرِ گل سے چھلکتی ہے مئے نابِ نشاط
حسرت و یاس کو دشوار ہے اب تابِ نشاط
دیکھیے جس کو وہ ہے لطف کشِ خوابِ نشاط
ذرہ ذرہ نظر آتا ہے زمیں کا بے خود
جلوۂ حسنِ خود آرا نے بنایا بے خود

دستِ قدرت نے کیے کیا کیا ہیں سامانِ بہار
دیکھیے سبزۂ نورستہ ہے عنوانِ بہار
ہر کلی میں ہے نہاں ایک گلستانِ بہار
پھول کا ذکر تو کیا خار میں ہے شانِ بہار
فرحت افزا ہے غرض دلکشیِ حسنِ بہار
شاد ہیں دیکھ کے دل طرفگیِ حسنِ بہار

قابلِ دید ہیں اس وقت نہالانِ چمن
جلوہ افگن ہیں بصد ناز عروسانِ چمن
حوض کے گرد ہیں استادہ جوانانِ چمن
عکسِ رخ دیکھتے ہیں ماہ جبینانِ چمن
آتش افروز ہے گلشن پہ دل آرائیِ گل
عندلیب آیا زمانہ کہ ہو شیدائیِ گل

تودۂ خاک میں پنہاں تھے جو اب تک اسرار
موسمِ گل نے کیا یک بیک اُن کا اظہار
کیا کہوں خامۂ فطرت ہے عجب سحر نگار
کل تھا ویران جو دشت آج وہی ہے گلزار
اب جدھر دیکھیے رعنائی و زیبائی ہے
جلوے صدہا ہیں مگر ایک تماشائی ہے

تہی دستی سے ہیں آزاد غم و رنج سے پاک کیسے اشجار ثمر دار کھڑے ہیں بے باک
سبز رنگ کی پہنی ہے انھوں نے پوشاک عظمت و اوجِ فلک اُن کی نظر میں ہے خاک

شفقِ سُرخ میں تاروں نے دکھائی ہے بہار
برگِ لالہ پہ وہ شبنم نے دکھائی ہے بہار

سیرِ گلشن کے لئے کوہ سے دریا نکلا سینہ تانے ہوئے کوئی بتِ رعنا نکلا
سینکڑوں چشموں کو آغوش میں لیتا نکلا کھیلتا ندیوں سے شور مچاتا نکلا

مارِ سیمیں کی طرح کھاتا ہوا بل آیا
کچھ پریشان سا بیتاب سا بیکل آیا

فرطِ عشرت میں وہ پانی کا اُبلنا دیکھے گوہرِ آب کا ہر دم وہ اُچھلنا دیکھے
بیٹھے بیٹھے کسی ہوش کا مچلنا دیکھے کوئی فوارے کا اب باغ میں چلنا دیکھے

قطرے موتی سے چلے آتے ہیں بےتابانہ
دامنِ گل کو بھرے جاتے ہیں آزادانہ

دل سے بیساختہ تعریف نہ نکلے کیوں کر دلفریب و نظر افروز ہے شب کا منظر
پردۂ ابر میں مستور ہیں ماہ و اختر جگنو اڑتے ہیں چمکتے ہوئے مثلِ اخگر

جوشِ باراں سے ہے دریا میں تلاطم پیدا
برق کا حسن تصور سے تبسم پیدا

ہلکی ہلکی یہ پھواریں تری ابرِ نیساں ٹھنڈی ٹھنڈی یہ نسیم سحری مشک فشاں
لہلہاتا ہوا سبزہ، یہ مہکتا میداں اور یہ مرغانِ نواگر، یہ چٹکتی کلیاں

"یہ سلیقہ کہیں نیچر کو تھا گل کاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"

تنقید کتب

شعلۂ طور[1]

یہ حضرت جگر مرادآبادی کا مجموعۂ کلام ہے جس کا مدت سے بےچینی کے ساتھ انتظار تھا۔ شروع کے اٹھارہ صفحوں میں فہرست مضامین ہے۔ اس کے بعد تین صفحوں کا غلط نامہ ہے۔ اس کے بعد میجر نواب زادہ محمد رشید الظفر خاں آف بھوپال کا فوٹو ہے جن کے نام نامی سے یہ مجموعۂ کلام منسوب کیا گیا ہے۔ بعدہٗ جگر صاحب نے خود اپنے قلم سے اپنے کلام کی نسبت کچھ تحریر فرمایا ہے اس میں اگر احباب کو خودستائی کی جھلک نظر آئے تو قابل معافی سمجھنا چاہیے۔

شروع میں چار تازہ غزلیں اور نظم "نغمۂ اسلام" دی گئی ہے۔ اس کے بعد سید سلیمان ندوی کا فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں جگر صاحب کی شخصیت اور ان کے کلام پر تبصرہ کر کے تنقید کا حق ادا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مجموعۂ کلام شروع ہوتا ہے جس کے نو حصے کئے گئے ہیں ایک میں دورِ چہارم یا عہدِ حاضرہ کا کلام ہے۔ دوسرے میں [illegible] تیسرے میں [illegible] جگر کے نام سے دوسرے دور کا۔ چوتھے میں [illegible] کلام [illegible] حال سے زمانہ کا بقیہ کلام۔ چھٹے میں خمسے ساتویں میں مثنوی سرود حقیقت آٹھویں میں [illegible] نویں میں فارسی کلام ہے۔

ظاہر ہے کہ کلام کی یہ ترتیب اُلٹی ہے۔ عموماً اس قسم کے مجموعوں میں دور اوّل سے شروعات کی جاتی ہے۔ نظم نغمۂ اسلام اس مجموعہ میں دو مرتبہ چھپی ہے حالانکہ جگر کے وسیع کل مشرب اور ان کی سچی شاعرانہ طبیعت کو دیکھتے ہوئے اس نظم کو مجموعے میں جگہ ہی نہ ملنا چاہیے تھی ہم کو معلوم ہے کہ یہ نظم ان جذبات کے ماتحت جو درحقیقت حضرت جگر کے دلی جذبات نہیں ہیں۔ بعض فرقہ پرست احباب کو عارضی طور پر خوش کرنے کے لئے لکھی گئی تھی۔ بہرحال ایک ہی مجموعے میں ایک نظم کا دو بار چھپنا معیوب ہے۔ ہر حصے کے صفحات علیحدہ علیحدہ دئے گئے ہیں بہتر ہوتا کہ صفحات کے نمبر مسلسل ہوتے۔

---

[1] قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ سید شمس الحسن بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ بھوپال ہاؤس لکھنؤ۔

۱۹...ء میں مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کے رفقا کار کی کوشش سے حضرت جگر کا مجموعہ کلام شعلۂ طور کے نام سے اعظم گڑھ میں شایع ہوا تھا جس کا مقدمہ خود علامہ سید سلیمان ندوی نے ... شاعر کے عنوان سے لکھا تھا۔ یہ مقدمہ بھی اس مجموعہ کلام یعنی "شعلۂ طور" میں ... ہے۔ اس مجموعے میں حضرت جگر کا پورا کلام نہیں ہے بلکہ انتخاب کرکے درج کیا گیا ہے۔ بہتر تھا اگر جگر صاحب کا مکمل دیوان پیش کر دیا جاتا۔ بصورت موجودہ بعض اچھے شعر بھی نظرانداز ہو گئے ہیں۔ اس قسم کے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جو "شعلۂ طور" میں نہیں ہیں۔

مجھ پر ستم نہ کرنا، مجھ پر ... نہ کرنا — تم کو بھی اب قسم ہے کوئی کہا نہ کرنا
کمال حسن کا عالم دکھا دیا تو نے — چراغ سامنے رکھ کر بجھا دیا تو نے
ترے جمال نے جس کو بنا لیا اپنا — کسی کے سامنے وہ آنکھ ملتجی نہ ہوئی
اے ہم دوست ترے دم سے ہے تعمیر حیات — تو سلامت ہے تو ہستی مری برباد نہیں
آغاز سے آخر تک دل بیخود و حیراں ہے — جب عشق نگہباں تھا اب حسن نگہباں ہے
اب اور نئے جلوے آنکھوں میں سمائیں کیا — دل نے جو بنا لی تھی وہ ... بنا ڈالی
فطرت حسن مقامات بدلتی ہی رہی — ایک عالم میں نہ دیکھا کبھی دیوانے کو

... شعرا میں آجکل حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی کو چوٹی کا شاعر مانا جاتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ بہ لحاظ فن اور سلاست زبان مولانا حسرت، باعتبار تصوف و بلندی خیال فانی، بلحاظ فلسفہ و حکمت اصغر اور باعتبار تغزل جگر مرادآبادی فرمانروائے اقلیم فن ہیں۔ ان میں جگر مرادآبادی کو واردات حسن و عشق کو بیساختگی اور دلآویزی کے ساتھ بیان کرنے میں خاص کمال حاصل ہے۔ ان میں اور دوسرے شاعروں میں یہ بڑا فرق ہے کہ اور شاعر دماغ سے مضامین تراشتے ہیں اور جگر دل کی باتیں کہتے ہیں اسی سے ان کا کلام دل میں جگہ کر لیتا ہے۔ جگر کی دوسری خصوصیت بے تکلفی اور بیساختگی ہے تیسری خصوصیت جگر کے کلام میں یہ ہے کہ وہ شعر میں بعض ایسے ٹکڑے یا الفاظ رکھ دیتے ہیں جس سے اردو لٹریچر میں مستقل اضافہ ہو جاتا ہے۔ جگر کی بعض خصوصیات کی مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

ہستی باری تعالیٰ، وحدت الوجود اور وحدت شہود کے مسائل مشرقی شاعری کی روح رواں رہے ہیں۔ اور شعرا نے بھی ان مسئلوں پر زور طبع دکھایا ہے۔ الٰہیات کا

ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جب کچھ نہ تھا تو خدا تھا اور جب کچھ نہ ہوگا تو خدا ہوگا۔ اسی خیال کو جگر صاحب اس طرح نظم کرتے ہیں۔

تجھی سے ابتدا ہے تو ہی اک دن انتہا ہوگا　　　صدائے ساز ہوگی اور نہ ساز بے صدا ہوگا
تیری نظر نہیں گر آئی تو ہے بے خبر　　　تو ہی سب ہے تو انتہا کے در

عاشقان صادق کو ہر آن معشوق حقیقی ہی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ اسی بات کو جگر صاحب نے کس لطافت سے ادا کیا ہے

چھپتے ہیں اور چھپ نہیں جاتا　　　اس ادائے حجاب نے مارا

یہ حجاب نظر دیکھئے۔

خود نظر بن گئی حجاب نظر　　　ہائے اس بے حجاب نے مارا
تجھی بس ہے مجھے مست سنور ہو کر　　　ہزاروں بار دیکھے ہیں تجھے ہو کر

"راز دہر" اور "ہستی انسان" ہمیشہ رازہائے سربستہ رہے ہیں۔ عمر خیام کی رباعیاں اور مولانا روم کی غزلیں اور مثنوی اس مسئلہ سے بھری پڑی ہیں۔ تو

کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

پھر بھی شعرا اس میدان میں اشہب خیال جولاں کرتے رہتے ہیں۔ دیکھئے جگر انسان اور اس کی ہستی کے بارے میں کیا لکھتا ہے

میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا　　　اس سوال و جواب نے مارا
پرتو حسن ذات نے مارا　　　مجھ کو میری صفات نے مارا
تیرے نظارۂ حیات در بجھے　　　تیرے رازِ حیات نے مارا
موت کیا ہے ایک لفظ بے معنی　　　جس کو مارا حیات نے مارا

یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد بھی انسان کی ہستی بدستور معمہ ہو کر رہ جاتی ہے اور جگر مجبور ہو کر کہہ اٹھتا ہے

میں وہاں ہوں جہاں نہیں میں بھی　　　عالم ماورائے عالم کیا؟

حیات بعد الموت کا مسئلہ بھی ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ کوئی اس کو حشر و نشر سے تعبیر کرتا ہے اور کوئی تناسخ کہتا ہے لیکن جگر جیسے متوالے کے نزدیک محشر کی حقیقت صرف اس قدر ہے

نہیں معلوم ہے ہم سے سنو محشر میں کیا ہوگا　　　سب اس کو دیکھتے ہوں گے وہ ہم کو دیکھتا ہوگا

ہوش ہے پھر مائلِ فرزانگی　　لاشراب او مست ساقی لاشراب
[illegible] کی بے ... نوازی دیکھنا　　منہ سے بول اٹھنے کو ہے جامِ شراب

گرچہ اہلِ شراب ہیں ہم لوگ　　یہ نہ سمجھو خراب ہیں ہم لوگ

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک　　ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

کہاں تک مختلف اشعار پیش کئے جائیں۔ ایک پورا میخانہ نذر کئے دیتے ہیں ؎

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا　　لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا
بے کیفیوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا　　توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرا کے پی گیا
میں مست توبہ آتے ہی جھپٹا کے پی گیا　　ساغر اچھال اچھال کے اٹھلا کے پی گیا
ہمت بقدرِ ذوقِ طلب پا کے پی گیا　　ساقی کی لہر دیکھ کے لہرا کے پی گیا
زاہد یہ میری شوخیِ رندانہ دیکھنا　　رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا
سرمستیِ ازل مجھے جب یاد آ گئی　　دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا
آزردگیِ خاطرِ ساقی کو دیکھ کر　　مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا
اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف　　میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال　　در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا
اس جانِ میکدہ کی قسم بارہا جگر　　کل عالمِ بسیط پہ میں چھا کے پی گیا

دو شعر اور ملاحظہ ہوں ؎

اسے حال و قال سے واسطہ نہ غرض مقام و قیام سے　　جسے کوئی نسبتِ خاص ہو ترے حسنِ برق خرام سے
مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے　　کبھی آ کے منظرِ عام پر کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

مضمون طویل ہوا جاتا ہے مگر چلتے چلتے جگر کے کلام سے تھوڑا لطف اور اٹھا لیجئے ؎

جو اب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا　　تو بس ہاتھ ملتے ہی رہ جائیے گا
نگاہوں سے چھپ کر کہاں جائیے گا　　جہاں جائیے گا ہمیں پائیے گا
ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگ محفل　　کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا

اب نقطۂ حسن کا کہانی یہ فسانہ ہے — سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے
کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے — ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے
جس دل میں تمھیں تم ہو اس کا یہ فسانہ ہے — ٹوٹا ہوا اک موتی بکھرا ہوا دانہ ہے
یا وہ تھے جفا ہم سے یا ہم ہیں جفا ان سے — کل اُن کا زمانہ تھا آج اپنا زمانہ ہے

تری مست نظریں غضب ڈھا رہی ہیں — یہ عالم ہے جب سے اڑا جا رہا ہوں
نہ پروائے ہستی نہ احساس مستی — جدھر چل پڑا ہوں چلا جا رہا ہوں

نالہ پابند نفس اے دل ناشاد نہیں — یہ تو فریاد کی توہین ہے فریاد نہیں

اک ساز محبت بھی کل عالم امکاں ہے — تو چھیڑ تو دے ظالم ہر تار رگ جاں ہے

یہ چند اشعار سرسری نظر میں لے لئے گئے ورنہ تمام مجموعہ کلام اسی قسم کے دلکش اشعار سے بھرا ہے۔

باپ کے خط بیٹی کے نام[1]

یہ کتاب پنڈت جواہر لال نہرو کے اُن سبق آموز خطوں کا مجموعہ ہے جو موصوف نے وقتاً فوقتاً الہ آباد سے اپنی صاحبزادی اندرا نہرو کو منصوری پر قیام کے وقت ۱۹۲۸ء میں ارسال کیے تھے، اصلی خط انگریزی زبان میں لکھے تھے۔ جن کا ترجمہ سلیس اور عام فہم اُردو زبان میں کتابستان" الہ آباد نے کیا اور اکتیس خط جمع کر کے پہلا حصہ شایع کیا۔

اُن خطوط کو پنڈت جی نے نجی طور پر اپنی پیاری بچی کو لکھے تھے لیکن چونکہ ان کا مقصود تعلیم اور توسیع معلومات ہے اس لیے ہر قوم اور ہر فرقہ کا بچہ پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے، بلحاظ مضمون خط مختلف عنوان میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر

---

[1] کتاب کی لکھائی چھپائی دیدہ زیب اور واضح ہے کاغذ سفید جلد انگریزی وضع کی مع نام کتاب مصنف وغیرہ تقطیع ۲۷ × ۱۷ قیمت ۶ر دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ کتابستان الہ آباد

دنیا کی تہذیب و تمدن کی یہ مکمل تاریخ ہیں انکے عنوانات سے ان کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً (۱) زمین کیسے بنی (۲) جانوروں کی پیدائش (۳) انسان کی پیدائش (۴) انسان کی مختلف نسلیں (۵) مختلف زبانیں (۶) تہذیب کیا چیز ہے (۷) مختلف برادریاں (۸) مختلف مذاہب (۹) کھیتی باڑی (۱۰) بادشاہت کی ابتدا (۱۱) پرانے زمانہ کا تمدن (۱۲) بولی، لکھائی، اور گنتی (۱۳) آریا قوم کی تاریخ (۱۴) رامائن اور مہابھارت وغیرہ وغیرہ کتاب پڑھنے سے یہ تمام باتیں کسی استاد کی مدد کے بغیر خود بخود بچہ کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ اس سے پنڈت جواہر لال نہرو کی رواداری اور بے تعصبی کا بھی بخوبی ثبوت ملتا ہے۔ کتاب کا آغاز قرآن شریف کی ایک آیت کے ترجمہ سے کیا گیا ہے جس سے اپنے عجز کا اقرار ہوتا ہے۔

اردو ترجمہ بہت سلیس اور شگفتہ ہے۔ بعض بعض جگہ خفیف سی غلطیاں ہوگئی ہیں مثلاً بعض چھوٹے سیارے جو کسی قریبی بڑے سیارے کے تابع ہوتے ہیں۔ جیسے کرۂ ارض کا تابع چاند ہے اور کرۂ زحل کے تابع چار چاند ہیں جن کو انگریزی میں (SATELLITE) کہتے ہیں۔ فاضل مترجم نے اس لفظ کا ترجمہ "لاگو" کیا ہے۔ فیروز اللغات کے مطابق اس کا ترجمہ "پچھلّو" ہوتا ہے۔ جو ہر وقت ساتھ لگا رہنے والے کو کہتے ہیں (ملاحظہ ہو فیروز اللغات جلد اوّل صفحہ ۲۷۲) "لاگو" بھی ساتھی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر یہ لفظ اس شخص یا جانور کے لئے زیادہ بولا جاتا ہے جو درپے آزار ہو +

رنگین زمانہ[۵۲]

یہ ایک دلچسپ ناول ہے جس میں محبوب حسن صاحب صوفی بی اے نے اب سے سو سال آئندہ یعنی ۲۰۳۴ء کے لکھنؤ کی معاشرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے کتاب کی ہیروئن ایک اعلیٰ تعلیمیافتہ اور حسین لیڈی ڈاکٹر مس شعلہ اور ہیرو ایک اخبار کے ایڈیٹر مسٹر برق ہیں۔ پلاٹ گو فرضی ہے لیکن فاضل مصنف نے کردار نویسی (CHARACTERISATION) اور ادبی حیثیت سے (LITERATURE) اپنا کمال دکھایا ہے۔ اردو زبان کے ہزارہا ناول ہماری نظر سے گزرے ہیں مگر یہ خصوصیات بہت کم مصنفین میں یکجا ہو سکتی ہیں۔ مسٹر سلطان احمد صاحب جوش نے بھی اپنے مشہور ناول "ابن مسلم" میں ان دونوں خوبیوں کو یکجا کر دیا ہے۔ اور اب "رنگین زمانہ" کے لائق مصنف صاحب کو اس مد میں قابل قدر کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ درحقیقت موصوف نے یہ ناول لکھ کر اردو ادب میں ایک گرانبہا اضافہ کیا ہے ہمکو امید ہے اہلِ ذوق اس کے مطالعہ سے لطف اندوز ہونگے۔ لکھائی چھپائی عمدہ ضخامت ۲۲×۱۸ کی تقطیع کے ۲۰۰ صفحے

[۵۲] قیمت ڈیڑھ روپیہ - ملنے کا پتہ: بدر الحسن ریاست ... (لاہور)

بعض اوقات

(از منشی تبال داس ساحر بگانوی)

بعض اوقات ہوتا ہے یہ حال — پھیلتا ہے ایک سُونا سا خیال
اور اُس خالی فضا میں ایک بار — ڈوب جاتا ہے یہ دل ہو کر نڈھال

پھر نہیں ملتا خوشی کا کچھ نشاں — غم سے بھی آزاد ہو جاتی ہے جاں
بیخودی تو واقعی ہوتی نہیں — بیخودی کا پھر بھی ہوتا ہے سماں

بھول سی جاتی ہے خود کو اپنی یاد — محو سا ہوتا ہے سارا اعتقاد
اور اُس حالت میں ہو جاتا ہے ہیچ — کفر و ایماں کا قدیمانہ عناد

جھوٹ، سچ، کچھ بھی کہیں ہوتا نہیں — وہم ہوتا ہے نہ ہوتا ہے یقیں
زندگی کا سا نظارہ ہر طرف — دیکھتا ہے دیدۂ باریک بیں

دیکھتا ہے وہ نمائش دہر کی — آسماں پہ رنگ تصویریں سبھی
اصل میں گویا بیکاری کا نشاں — صرف رکھتی ہے ہوائی زندگی

یہ ندی، یہ بن، یہ میداں، یہ پہاڑ — سب میں ہے یکسر نظر آتا بگاڑ
یہ گھنی یہ گونجتی آبادیاں — سب کے سب دکھلائی دیتی ہیں اُجاڑ

یہ درخشاں انجم و شمس و قمر — بنتے ہیں کچھ اُڑتے بجھتے سے شرر
آسماں بن کر دکھاتی ہے زمیں — ایک دھوکے کا تماشا سر بسر

الغرض الطاف فطرت ہیں آشکار جس قدر بھی خاک کے نقش و نگار
مل کے سب اسطرح ہوتے ہیں عیاں اڑ رہا ہے جیسے ہلکا سا غبار

جس کے ذرے ذرے سے اپنا وجود ہے دکھاتا تابہ توسن کا نمود
اور وہی ذرے ٹکرا کر بہم ہیں سناتے ایک روحانی سرود

وصل ہوتا ہے وہیں تغییر کا گونج اٹھتی ہے ترنم سے فضا
چھائے تنہائی ہو چھا جاتی خامشی پھر کسی کا بھی نہیں لگتا پتا

شور و غل رہتا ہے لیکن دور دور اور طبیعت ہو نہیں سکتی نفور
عین بیداری میں یوں ہوتا ہے سحر خواب کا سا ایک کیف آگیں سرور

جذبات بسمل

(جناب بسمل الہ آبادی)

آتی ہے صدا کٹ چکے بہر کیوں درد بھری ویرانے سے آباد ہوئی دنیائے جنوں پھر تیرے کسی دیوانے سے
ساقی تجھے پیمانے کی قسم مخمور نہ رکھ پیمانے سے مے خانے میں ہم بھی آنکلے کچھ بھیک ملے میخانے سے
دل جس نے لگایا ہوگا کبھی وہ دل کی لگن کو سمجھے گا سوزِ غم الفت کیا شے ہے پوچھے کوئی پروانے سے
بنیادِ حقیقت کو سمجھے ہر طالبِ تحقیق رہ طلب کچھ دور یہ جگہ ملتی ہے کعبے کی مرے بتخانے سے
جب شمع سرِ محفل آئی تو آگ محبت کی بھڑکی جذبات دبی روکے نہ رکے دم بھر کیلئے پروانے سے
جی بھر کے پلائے جا ساقی بدمست بنائے جا ساقی ہم روزِ ازل سے پیاسے ہیں ٹلنے کے نہیں میخانے سے
تکمیل جنوں کا رنگ ہے یہ سرخی جو زبانِ خار میں ہے صحرا بھی ہوا اب رشکِ چمن اے رشکِ چمن دیوانے سے
روشن ہوا نامِ شمع بہت فانوس کے پردے میں چھپ کر کس دن کے لئے اب چھپتی ہے بیکار کو وہ پروانے سے

بسمل حسینوں کا جمگھٹ یہ اُن کی اداؤں کا منظر
ہم کیونکر اٹھائیں اپنے قدم اٹھتا نہیں دل بتخانے سے



مولانا راشدالخیری مرحوم

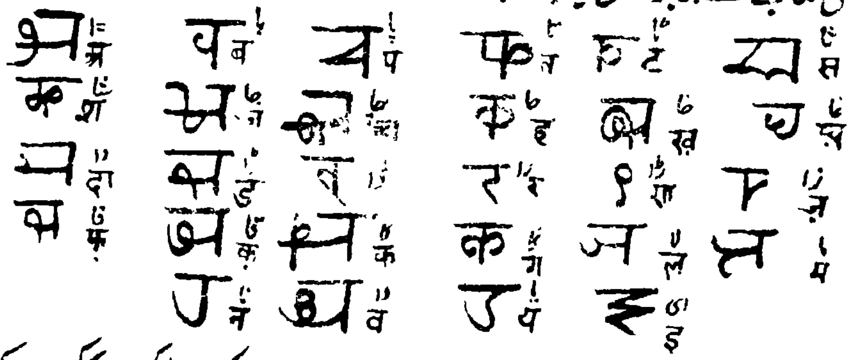
زمانہ

جلد ۶۶ مارچ ۱۹۳۶ء نمبر ۳

اُردو کی رسم الخط

(از مسٹر سلیم جعفر)

اردو رسم الخط کی ہستی پر سب سے پہلے ۱۸۸۹ء میں حملہ کیا گیا۔ منشی جے لال صاحب ورما کا ایتھہ ماتھر ویدانتی ونجی ساکن راج جھالاواڑ نے "پراکرت اردو بھاشا" کیلئے "پراکرت بینجنی" اختراع و ایجاد کی جس کے حرفوں کی صورت نقشہ ذیل سے عیاں ہے جو موصوف کی کتاب سے ہو بہو درج کیا جاتا ہے۔



موصوف کی دماغ سوزی کو میں مختصراً اپنی زبان میں بیان کر دیتا لیکن چونکہ کسی کے مطلب کو جن لفظوں میں اس نے بیان کیا ہے اس سے بہتر الفاظ میں کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ اس لئے طوالت کی معافی چاہ کر میں "پراکرت بینجنی" سے کچھ عبارت نقل کرتا ہوں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مؤلف کی حمیت نے گوارا نہ کیا کہ ایک دیسی بدیسی لباس پہنے۔

ظاہر کیا جاتا ہے کہ جس طرح دیو بھاشا سب سے پہلی زبان ہے اسی طرح اس کے لکھنے کیلئے دیو اکشر سب سے پہلے حروف ہیں کہ جن کو دیوناگری کہتے ہیں۔ اس کے بعد جس طرح زبانے علیحدہ

علیحدہ قایم ہوتی گئیں اسی طرح اس کے لکھنے کے لئے حروف بھی علیحدہ بنتے گئے چنانچہ زبان عربی اور اس کے لئے حروف عربی اور زبان فارسی اور اس کے لکھنے کے لئے حروف فارسی اور زبان انگریزی اور اس کے لکھنے کے لئے حروف انگریزی دانشمندوں نے ایجاد کئے جس طرح کہ زبانیں آمیزش ایک دوسرے سے بنائی گئی ہیں اسی طرح حروف کچھ کچھ ایک دوسرے کے ہم شکل معلوم ہوتے ہیں اور ان دنوں ہمارے آریہ ورتی دیش میں علیحدہ علیحدہ بود و باش ہونے کی وجہ سے بہت طرح کی زبانیں اور ان کے لکھنے کے حروف مروج ہیں۔ دیکھو بنگلہ زبان اور بنگلہ حروف۔ کرناٹک زبان اور کرناٹک حروف اور اردو اور زبان اور اردو حروف"

"علاوہ اس کے جب تک کہ اس دیش میں چندر بنسی اور سورج بنسی راجوں کا راج رہا کل کارروائی روزمرہ دفتر کچہریات وغیرہ میں دیوناگری کے ذریعہ سے ہوتی رہی اور بول چال روزمرہ کی بھی پراکرت بھاشا کا برچار رہا کہ جس میں کچھ تلفظ تو سنسکرت کے اور کچھ لفظوں کا تلفظ بدل کر صاف اور سیدھے آسان طور پر جن کو زبان سے ادا کرنے میں کچھ وقت واقع نہ ہو رواج پایا۔ اس کے بعد جب کہ خاندان شاہ تیموریہ نے اس ملک پر حکمرانی کی اسوقت سے فارسی زبان کا اس ملک میں رواج شروع ہوا اور کارروائی دفتر کچہریات میں کچھ تو بدستور ناگری میں رہی اور کچھ فارسی کا برتاؤ ہو گیا۔ اور چونکہ اسوقت اس ملک میں ہر ایک ملک کا آدمی موجود تھا اور باہم ایک دوسرے سے خلاف ملل ہونے اور اپنی اپنی بولی بولنے کی وجہ سے اردو پراکرت بھاشا کا رواج پھیلا اور اسی وجہ سے اس زبان میں ہر ایک ملک کے لفظ شامل کر کے برتے جاتے ہیں۔ اب جبسے کہ یہ ملک ہماری بادشاہ حضور فیض گنجور رحمت و نعمت فیاض یعنی ملکہ معظمہ قیصرہ ہند دام اقبالہ کی تحت حکومت میں آیا۔ اسوقت سے علاوہ انگریزی زبان کے اس زبان پراکرت اردو بھاشا کو اس قدر رونق ہوئی کہ کل کارروائی روزمرہ دفتر کچہریات وغیرہ میں یہ حرف فارسی جاری ہو گئی اور فارسی زبان کا بالکل برتاؤ کم ہو گیا۔

"دیکھو وید پران سب دیوناگری اکشروں میں لکھے ہوئے ہیں اور قرآن عربی حرفوں میں اور بائبل انگریزی حرفوں میں وغیرہ مگر اس زبان اردو بھاشا کے لکھنے کے لئے آج تک کوئی حرف مقرر نہیں کئے گئے۔ اب تک فارسی ناگری انگریزی کے ذریعے سے جس کو رومن کہتے ہیں، تحریری پوشاک پہنائی جاتی ہے۔ کہ جس کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسطرح کوئی شخص مانگی ہوئی پوشاک پہن کر اپنی وضع کو بے موزوں جانتا ہو۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ دانشمندوں نے آجتک کبھی اس طرف نظر توجہ سے نہیں دیکھا اور پرم آتما نے بھی کسی وقت ان کے دلوں میں کچھ پریرنا نہیں کی کیونکہ انسان کی رائے کو کیا دخل ہے کہ ایسی قسم کی تصنیفات کو اپنے ذہن کی رسائی کا کارن سمجھیں۔ لہذا برہمہ کا جگیا سو جے لال درماں

خلف منشی کنہیا لال صاحب کالیستھ ماتھر چترگپت دیسی ساکن بندرابن پرماتما کی کرپا اور اوگرہ کے ذریعہ سے پراکرت اردو بھاشا کی پراکرت اکشروں کو عمدہ صورت کے ساتھ انتخاب کرکے بنا بر یادگار جشن جوبلی پنجاہ سالہ حضور ملکہ معظمہ قیصرہ ہند دام اقبالہا کی ایجاد کرتا ہے اور نام اس کتاب کا پراکرت ابجد قرار دیتا ہے۔

"اور ایک خاص سبب اس کے رواج کی بابت اور ظاہر کرتا ہوں کہ ورنیولا جو فارسی حرفوں میں اردو زبان لکھی جاتی ہے اس کے اختلاف کا سبب سب صاحبوں کو بخوبی روشن ہے کہ جس کی وجہ سے اکثر مرتبہ بوجہ اختلاف تحریر دھوکا ہو جاتا ہے کہ لفظ کچھ لکھا گیا اور کچھ کا کچھ پڑھا جاتا ہے۔ دیکھو لعل، اس کو کتنے ناموں سے پڑھتے ہیں اور جو شکست کے قاعدہ سے لعل لکھا گیا تو اس کے پڑھنے کی کچھ تعداد ٹھیک مقرر نہیں ہو سکتی اور جو سنسکرت خواہ انگریزی زبان میں لکھا جاوے تو وہ بالکل صحیح نہیں پڑھے جاتے۔

"مگر ناظرین کو یہ خیال نہ گزرے کہ کاتب یہ منشا کچھ فارسی کی طرف سے بد ہے۔ تو بہ توبہ یہ خیال ہرگز ہرگز دل میں پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ فارسی زبان ہم لوگوں کا خاص علم ہے ہم لوگ اس علم کی بہت بڑی تعظیم کرتے ہیں کہ جس کی بدولت ہم کو اس قدر فیض ہوا کیونکہ مبتدی کی زبان بدون پڑھنے فارسی زبان کے ہرگز ہرگز شستہ نہیں ہوتی۔

"مگر چونکہ یہ پراکرت حروف فارسی ناگری انگریزی سے انتخاب کئے گئے ہیں اسوجہ سے جو زبان ان حرفوں میں لکھی جاوے گی وہ بخوبی ہر ایک کی سمجھ میں آجاوے گی اور بہت صاف پڑھی جاوے گی"۔

اس ابجد کو رواج دینے کیلئے مؤلف نے ہر طرح کی امکانی کوششیں کیں۔ لیکن یہ دور تقلید تھا۔ اس لئے کسی نے اس کی طرف نظر التفات سے نہ دیکھا اور یہ اس بچے کی طرح پیدا ہوتے ہی مر گئی جو اس عالم رنگ و بو میں آتے ہی اس کی دلچسپیوں پر ایک نظر ڈالکر ہمیشہ کیلئے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

جس زمانہ میں پراکرت ابجد لکھی گئی ہے اس زمانہ میں لوگ مروجہ رسم تحریر سے بیزار نہ تھے لیکن اسکی پیچیدگیوں کا احساس ضرور سر اٹھانے لگا تھا گو اس کے اسباب کچھ اور ہی تھے ملک میں مطبع جاری ہو رہے تھے اور گو نسخ کا ٹائپ ایجاد ہو چکا تھا مگر صرف عربی خط کا ٹائپ نکالا ہوا ہے کے ہنسے چپانا تھا۔ چنانچہ "السید عبداللہ رضوی سابق مدرس فارسی آگرہ کالج" نے مطابع کے لئے بطرز جدید حروف منفردہ" اختراع کئے۔ چونکہ میں نے التزام یہ کیا ہے کہ ہر شخص کے اختراع کو اسی کے لفظوں میں ناظرین کے سامنے لاؤں۔ اسلئے رضوی صاحب کی تالیف سے اقتباس پیش کرتا ہوں۔

قدیم طرز تحریر میں حرفوں کے جوڑ بند میں جو مشکل پیش آئی ہے اس کا علاج ٹائپ بنانے کیلئے یہ کیا ہے کہ مختلف قسم کے جوڑ ایجاد کئے ہیں اور حرفوں کی صورتوں کو توڑ مروڑ کر کچھ کا کچھ کر دیا ہے اور ان کا نام ابتدائی وسطی خاتمہ کے حروف رکھا ہے جو بجائے خود نہایت پریشان کن ہیں ان سے چھاپہ کے کام میں سخت رکاوٹ پیدا ہے کیونکہ اس میں روپیہ اور وقت اور جگہ کا زیادہ صرف ہے۔"

"عرب ایران ہند میں جہاں اس خط میں کتابیں لکھی گئی ہیں اور درس و تدریس میں رہی ہیں اور اب بھی درس و تدریس میں ہیں بلکہ یورپ میں بھی جو فی زمانہ علم و ایجاد کا منبع و مخزن ہے کسی نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی کہ کتابت کی پیچیدگیاں و مشکلات و زوائد کو دور کر کے ایک ایسے حروف تہجی تجویز کیے جاتے جن کے ذریعہ چھاپہ سہل اور خواندگی سہل ہو جاتی اور ملنے کی وجہ سے جو صورتیں بعض حروف حاصل کرتے ہیں ان کی تعداد کم ہو جاتی۔ پس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ رائج الوقت حروف تہجی کو قطعاً چھوڑ کر ایک جداگانہ حروف تہجی ایجاد کیے جاتے بلکہ منشا یہ ہے کہ ہر ایک حرف کی رائج الوقت صورتوں میں سے صرف ایک ایک صورت پسند کی جاتی اور صورت حسب تفصیل مندرجہ ذیل شرائط پر منتخب ہوتی۔"

اول۔ حرف لفظ کے آخر میں ہو یا وسط میں یا اول ہمیشہ ایک ہی صورت پر لکھا جائے۔

دوم۔ رائج الوقت حروف کا اول حصہ ہو یا آخر حصہ جو کار آمد نہ ہو یا زائد حصہ سمجھا جائے قطع کر دیا جائے اور کوئی ایک حصہ قائم رکھا جائے جس سے اب تک مطلب حاصل ہوتا رہا ہے۔

سوم۔ اگر کسی حرف میں کچھ اضافہ کیا جائے تو صرف اتنا ہی کیا جائے کہ رائج الوقت تحریر کے پڑھنے والے کو اس قدر اضافہ ہونے پر حروف کی شناخت میں زیادہ تکلف نہ ہو۔ اگر خفیف تکلف ہو تو مضائقہ نہیں۔

چہارم۔ حروف کی اونچائی برابر ہو تاکہ دو خطوط متوازی کے درمیان ہر حرف آجائے اور اگر کوئی حرف خطوط متوازی مذکورہ سے باہر نکلا ہوا ہو تو وہ حرف لمبائی یعنی ایک ثلث سے زائد اونچا نہ ہو۔

پنجم۔ اکثر حروف کے عرض و طول میں تفاوت کم ہو۔

ششم۔ ہر حرف واضح ہو اور علامت جس سے وہ حرف اپنے ہم صورت حرف سے تمیز ہو سکے صاف ہو۔

ہفتم۔ ہر حرف میں سادگی رہے پیچیدگی نہ ہو۔

ہشتم۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے اعراب میں لوگ غلطی زیادہ کرتے ہیں اور خاص حرف پر اعراب لگانے سے لفظ صحیح پڑھ لیا جاتا ہے تو وہاں اعراب لگایا جاوے +

نہم۔ بعض حروف کے تلفظ خاص مقام پر خاص قسم کے ہوتے ہیں ان کی علامت بھی حرف میں موجود ہو۔

دہم۔ جملہ حروف علیحدہ علیحدہ رہیں کوئی ایک دوسرے سے نہ ملے اور لفظ کے درمیان بھی فاصلہ لازم ہے تاکہ پڑھنے میں دقت نہ ہو۔

"پس امور شرائط متذکرۂ بالا کو پیش نظر رکھ کر میں نے حروف تہجی رائج الوقت سے بدلہ حروف تہجی تجویز کئے اُنکا نام حروف منفردہ رکھا۔ اور ضمیمہ اخبار مہر سپہر شاہ گنج آگرہ مطبوعہ ۱۵۔ اپریل ۱۸۹۹ء میں جس کا میں اُس وقت مؤلف تھا شایع کیا بعدہٗ ۱۹۰۸ء میں کچھ ترمیم کرکے طبع کرایا۔ چنانچہ آج یوم مبارک پنجشنبہ ۱۵ جنوری ۱۹۱۴ء کو خفیف تغیر عمل میں لاکر اور اپنی دانست میں تکمیل کو پہونچا کر اپنے اتنے عرصے کے نتیجۂ فکر کو شایع کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔"

صور حروف منفردہ

"حروف منفردہ کی اساس صرف (۱۴) چودہ صور پر منحصر ہے۔"

ا ں ح د ر س ص ط ع و ہ م ہ ر ک

اُن چودہ صور میں نشانیاں اور نقطے لگا کر حسب ذیل ۳۶ حروف کے صور بنائے

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ

و ؤ ق ل ک گ م ن ہ ی ے

نمونہ ہندی

اک ت و ن ی ن ا م د ھ ب ھ ر ے اَور د و ج ھ ن ۔

اک تو نینا مدھ بھرے اور دوجے

نمونہ اُردو

ما ں ب چ ہ ک و گ و د م ی ں ل ئ ے ب ی ٹ ھ ی ۔

ماں بچہ کو گود میں لے بیٹھی

اس رسم تحریر کی پیچیدگیوں کا خیال پیدا ہونے کے بعد دردمندوں میں ٹیس اٹھتی رہی چنانچہ ۱۹۰۸ء میں پادری جے۔ نولز Rev. J. Knowles نے ہندوستان بھر کی

زبانوں کے ناقص حروف اور ملک کی جہالت سے متاثر ہوکر براہ ہمدردی انگریزی میں ایک پمفلٹ لکھا ہندوستان بھر کی رسوم تحریر پر قلم پھیر کر سب کی جگہ رومن حرفوں کا اکھنڈ راج قایم کرنا چاہا جس کا نمونہ یہ ہے -

ہندی کے لئے حروف تہجی

a अ   ā आ   i इ   ī ई   u उ   ū ऊ   ṛ ऋ   e ए
ai ऐ   o ओ   au औ   k क   kh ख   g ग   gh घ   ṅ ङ
c च   ch छ   j ज   jh झ   ñ ञ   ṭ ट   ṭh ठ   ḍ ड   ḍh ढ
ṇ ण   t त   th थ   d द   dh ध   n न   p प   ph फ
b ब   bh भ   m म   y य   r र   l ल   v w व -
ś श   ṣ ष   s स   h ह
اردو وغیرہ = ə ا   ɜ ع   ɜ غ   ḥ ح   x خ   ṭ ط   ẓ ظ -
q ق   f ف   ẓ ژ   z ز   ẕ ذ   s ث   ẓ ض   ṣ ص

نوٹ :- مذکورۂ بالا کتابی حرف ہیں تحریری ،حرف لیسے جا ہیں جیسے کہ انگریزی میں مروج ہیں مگر حسب ضرورت ترمیم بھی کی گئی ہے -
ʌ g ɚ h.

جس وقت یہ کتاب شایع ہوئی ہندوستانی گہری نیند سے سوتے سے جاگ اٹھے تھے ہندی جرائد نے خبر لی - اُردو دانوں نے ادھر توجہ کی یا نہیں مجھے اس کا علم نہیں لیکن اتفاقیہ جب ۱۹۱۷ء میں یہ پمفلٹ میرے ہاتھ لگا تو جو کچھ میرے فہم ناقص میں آیا میں نے اسے " اردو رسم الخط کا ایک نیا ریفارمر" کے عنوان سے اخبار وکیل امرتسر کے ذریعہ عرض کیا -
غرض اس خط سے بیزاری کی لے بڑھتی ہی رہی اور اس نے بہی خواہان اُردو کو مضطرب کر دیا - ہر علیم نے اس مریض کی نبض دیکھ کر ایک نسخہ تجویز کیا چنانچہ طرح طرح کے اردو کے قاعدے لکھے گئے -

اب میں چند قاعدوں پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں اور ان کو انھیں کے مؤلفین کے

Our Duty to India and Indian Illiterate . ۵ل

نقد و نظر سے پڑھکر جو نتیجہ ان کے متعلق نکالا ہے وہ ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ میں خود بھی ایک قاعدہ کا مؤلف ہوں اور جس کا ذکر آگے آئے گا۔

پرانی طرز کے قاعدے ان قاعدوں کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ کل دارومدار حافظہ پر رکھا گیا ہے۔ پوری تختی تہجی کے بعد یہ پہلی منزل ہے اور اس سے حرفوں کے نام سکھانا مقصود ہوتا ہے، وہی تختیاں دُہرائی گئی ہیں مگر اعراب لگا کر یہ دوسری منزل ہے۔ اس میں اعراب کا مدعا سکھایا گیا ہے، پھر دو دو حرف ملائے گئے ہیں مگر اس میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ پہلے الف مسلسل تختی تہجی پر لگایا گیا ہے۔ پھر بَ وغیرہ اور اِ۔اُب ثلاثہ کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا ہے بجائے اس کے کہ الف سے تختی تہجی کے باقی حرفوں کو ملا کر تین الگ الگ تختیاں بنائی جائیں۔ یہ تیسری منزل ہے جہاں سے حرفوں اور اعراب کی مدد سے لفظوں کے تلفظ کی تعلیم شروع ہوتی ہے اور حرفوں کی وہ مختصر صورتیں سمجھائی جاتی ہیں جو ترکیب الفاظ میں کام آتی ہیں، اس تفصیل کے بعد پھر اجمال شروع ہو جاتا ہے۔ تین تین چار چار حرف ملا کر چند لفظ بنائے جاتے ہیں۔ مگر بچے کو اس منزل پر پہونچا کر یہ قاعدہ اعراب سے احتراز کرتا ہے بچہ اگر حرف پہچانتا بھی ہے تو تلفظ صحیح کے رہنما اشارات ندارد ہیں۔ لفظ دیکھ کر اسے ایک ہیئت کا وقوف و شعور ہوتا ہے اور وہ اس کا تجزیہ و تحلیل بھی کر سکتا ہے لیکن ہیئت پیش نظر میں یہ قابلیت قطعی نہیں ہوتی کہ وہ اس کے اعضائے صوت کو حرکت میں لا کر ان سے آواز نکلوا سکے۔ بچہ اس معراز اعراب لفظ کے اجزائے ترکیبی کے نام لے سکتا ہے کیونکہ اس کی نظر کے سامنے چند حرف ایک مخصوص ہیئت و ترتیب میں رکھے ہوئے ہیں مگر وہ علامتیں جو حرفوں کی آواز میں فرق و امتیاز پیدا کرتی ہیں کہاں ہیں کہ اس کا دماغ اعضائے صوت سے ایک مطلوب و مقصود طریقے سے کام لے۔ اس قاعدے کے مؤلف کا دماغ اس خیال سے پریشان نہیں ہوتا کہ بچے کو کتنا وقت لگ جائیگا اس کے سامنے کام کی ایک خاص مقدار ہے وہ اس کو پورا کرانا ضروری سمجھتا ہے، ذکی و فہیم اسے جلد ختم کر لے گا اور کند ذہن گھنٹوں مہینوں سر کھپاتا رہے گا۔ اس نے تسلیم کر لیا ہے کہ نفس تحریر میں چند مشکلیں ہیں جن کے رفع کرنے کی کوشش کرنا فسق سے بڑھ کر ہے معلمین میں یہ گروہ جبریہ کا رتبہ رکھتا ہے۔

نئی طرز کے قاعدے صورتِ حالات و واقعات مجبور کر رہی تھی کہ نستعلیق خط سیکھا جائے کیونکہ وہ آلہ ہے ایسی زبانوں کے سیکھنے کا جو

دنیا کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ہیں لیکن جب زمانہ نے ورق الٹا اور کشمکش حیات نے نئے نئے مسئلوں سے دو چار کر دیا تو اس پر تنقید و اعتراض کی نظریں پڑنے لگیں، بار بار واعظ نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ رسم تحریر مشکل ہے اور اس سے وقت ضائع ہوتا ہے سہولتیں پیدا کرو۔ چنانچہ کوششیں ہونے لگیں اور طرح طرح کے قاعدے لکھے گئے۔

اردو کا نیا قاعدہ[1] اس قاعدہ کا مرتب قدیم طرز ہجا کو جس میں حرفوں کے نام لئے جاتے ہیں بچوں کے لئے الجھن کا سبب بیان کرتا ہے کہ اس کو صرف اُن کی آوازیں بتائی جائیں ... یہ فرض کر کے کہ پوری توجہ سے کام نہیں لیتا اسکے ساتھ ہی ساتھ تاکید کرتا ہے کہ "وہ بورڈ پر دیکھ کر منہ سے صرف بولتے ہوئے اپنے سیٹ پر لکھتا جائے وہ حرفوں کے نام بتانے کا مخالف نہیں ہے وہ اصوات میں کامل مشق ہو جانے کے بعد حروف کے نام بتا دیئے جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں"۔ وہ موجودہ ترتیب حروف تہجی کو بھی ناقص سمجھتا اور اس میں ردو بدل کرتا ہے۔ سب سے پہلے وہ "حروف انفرادی" یعنی وہ حرف سکھانا چاہتا ہے "جو مفردات کی طرح مرکبات میں بھی منفرد ہیں یعنی الگ الگ لکھے جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے مل کر نہیں لکھے جاتے اور جن کی صورت و شکل باقی حروف کے مقابلہ میں بالکل سیدھی سادی اور مختصر ہے۔ اپنے طریقہ تعلیم اردو کا نام اس نے "طریقہ نوشت و خواند" رکھا ہے کیونکہ حرفوں کی آواز کے ساتھ ان کے لکھنے پر زور دیا جاتا ہے۔

اس طریق تعلیم سے صاف صاف ظاہر ہے کہ اس میں محض حافظہ پر بھروسا کیا گیا ہے۔ لڑکا منھ سے بولے تاکہ کان سنیں اور پھر ان کی مدد سے آواز کو محفوظ کر لے۔ آنکھ سے دیکھے تاکہ حرف کی شکل حافظہ پر نقش ہو جائے۔ ہاتھ سے لکھے لیکن وہ لکھ تو تب ہی سکتا ہے کہ جب حافظہ ہاتھ کی رہنمائی کرے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ناطقہ و باصرہ وغیرہ سے جو کام لیا گیا ہے وہ محض حافظہ کی مدد تک محدود و مقصود ہے۔ اس سے اور اور فائدے بھی ہیں مگر میں اسکو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوں کہ ان کے عمل سے حافظہ کو مدد نہیں ملتی۔ اس قاعدے سے ممکن ہے کہ ہجے کی مشکل کسی قدر آسان ہوگئی ہو۔ لیکن چونکہ تحریر اس طریقہ کا ایک جزو ہے اس میں میرے نزدیک کوئی آسانی نہیں ہوتی مثلاً مرکبات میں ہو کر "جا" کو سمجھانے کے لئے بالترتیب "ج ا" اور "جا" پہلے یہ دو صورتیں دکھائی گئی ہیں بچے کے لئے ابھی یہ معمہ باقی رہتا ہے کہ "ج" نے "حہ" کی صورت کیوں اختیار کی۔ یا جملہ میں اس کی

[1] لہ ... اردو

صورت بدل کر "کیوں ہو گئی۔ کلید قاعدہ میں یہ تاکید تو اکثر ہے کہ حرفوں کے نام نہ لیے جائیں۔ لیکن ضبط تحریر میں لاکر یہ کہیں نہیں سمجھایا گیا کہ حرفوں کی آواز کیونکر ادا کی جائے کہ مقصد مرتب کے خلاف نہ ہو۔ یہ ایک مبہم ہدایت ہے۔ اس کی تعمیل میں شخصی رائے کو اس قدر دخل ہو سکتا ہے کہ مرتب کی محنت پر پانی پھر سکتا ہے۔

اس قاعدے میں تصویروں کی مدد سے بھی پڑھنا سکھانے کی کوشش کی گئی ہے مگر یہ اس کی ممتاز خصوصیت نہیں۔

بچوں کا قاعدہ[1]

مرزا صاحب کا قاعدہ بصری اصول پر رکھا گیا ہے۔ اس لئے نہایت ضروری تھا کہ تصویروں کی کثرت ہو تصویریں ہی نہوں گی تو آنکھ کیا دیکھے گی اور اعضائے صوت کا محرک کہاں سے آئے گا۔ میرے نزدیک اس قاعدہ میں عقل کو درجۂ اوّل اور حافظہ کو درجۂ ثانی پر رکھا گیا ہے۔ عقل و شعور آنے کے بعد سے قاعدہ شروع کرنے تک حافظہ جو کام کر چکا ہے اسی سے پڑھنا سکھانے کا کام لیا گیا ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حافظہ پر زور دیا گیا ہے۔ یہاں تو اصول یہ ہے "دیکھو بولو" لیکن بچہ کچھ دیکھ کر اسی وقت بولے گا جب اس میں اتنی عقل ہو گی کہ چند آڑی ترچھی لکیریں دیکھ کر اس کی قوت فیصلہ یہ کام دے کہ ان لکیروں سے فلاں چیز بنانی مقصود ہے۔ اگر اس کی عقل نے دھوکا دیا اور وہ "دروازہ" کو "الماری" سمجھ گیا تو وہ شئے تصویر کا غلط نام لے گا۔ عقل سے کام لے چکنے کے بعد اس کے حافظہ کے کام کی باری آئے گی جو ان آڑی ترچھی لکیروں کا محافظ بنے گا جو چند مخصوص آوازوں کی علامتیں ہیں۔

بعض باتوں میں یہ قاعدہ بھی انجمن ترقی اردو کے قاعدے کے اصول پر کاربند ہوا ہے۔ مثلاً پرانے طریق ہجا کا یہ بھی مخالف ہے۔ حرفوں کو ترکیب دینے کا طریقہ وہی ہے وغیرہ وغیرہ۔

رہنمائے تعلیم یعنی سہل آموز اردو قاعدہ[2]

انجمن کا قاعدہ حرفوں کے نام بتانے کی اجازت دیتا ہے مگر کب جب وہ انکی آوازوں سے بخوبی واقف ہو جائیں اور مرزا صاحب اس کی ممانعت فرماتے ہیں شیخ صاحب اُن کے ہمنوا ہیں۔ رہنمائے تعلیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماہر حاشیات کی طرح "تقسیم کار" کا معتقد ہے۔ حرفوں کی آواز، ان کی صورت اور اعراب کا ایک ہی دفعہ یاد کرنا

[1] مرتبۂ سجاد مرزا صاحب ایم، اے۔ (کنٹب) [2] مرتبۂ شیخ چاند بھائی، بی، اے۔ (راجکوٹ)

بچوں کے حافظہ پر ایک بار گراں ہے جسے وہ نہیں برداشت کر سکتے۔ اسلئے اس نے اسکے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ترقی میں تدریج پیدا کر دی۔ پہلی منزل ارتقا صرف آوازوں سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں ہر ممکن طریقے سے صرف دو حرفی یا سہ حرفی لفظ لے کر اور ہر حرف کو بہت ہی واضح طور سے بول کر علم حساب سے کام لے کر۔ غرض جس طرح ممکن ہو گا استاد تختی ہجی کے جملہ عناصر کی آوازیں ذہن نشین کرے گا۔ لفظوں کے جزو بتانے کو ہر لفظ میں جتنی علامات اصوات ہیں انکو لکھے گا اور انھیں اعضائے صوت سے ادا بھی کرے گا، مگر علامات اصوات کے نام نہ لے گا۔

دوسری منزل میں پہونچ کر بچوں کو حرف پہچنوائے جائیں گے اور ان کا ملانا بتایا جائے گا۔ اس کے نئے طریقوں سے مدد لی جائے گی۔ ہاتھ اور ہاتھ کی انگلیاں حرف بتائیں گی۔ آوازوں کے فرق سمجھائے جائیں گے۔ اور جب بچہ آوازوں کو حرف سے منسوب کرنے کے قابل ہو جائے گا تب تیسری منزل میں داخل ہو گا یہاں اسے اعراب، حروف علت اور نون غنہ سمجھائے اور ہندی حرف مثل تھ اور جھ وغیرہ سمجھائے جائیں گے۔ یہ قاعدہ پرانے اور نئے قاعدوں کا معجون مرکب ہے۔ پرانے طریق ہجا کی مخالفت کرتا اور وقت کو بے حقیقت سمجھتا ہے۔ دماغ کو کوفت سے بچانے کی تدبیریں بتاتا ہے۔

طرز جدید کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ حرفوں کو آوازوں کی علامت تصور کر کے ان کے نام لینا نہیں چاہتا۔ وہ چاہتا ہے کہ آواز کی علامت آنکھ کے سامنے آتے ہی دیکھنے والا جھٹ سے وہ آواز منھ سے نکالے جس کی طرف علامت اشارہ کرتی ہے۔ یہ بات کیسی ہی طبعی، فطری اور مقصد ایجاد حروف کے مطابق کیوں نہ ہو مگر ان اصولوں کے خلاف ہے جس پر موجودہ طریق تحریر کا مدار ہے۔ صدیوں کی ذکاوت وجودت نے دماغ سوزی اور عرق ریزی کے بعد لفظوں کی آوازوں کے لئے مفرد علامتیں ایجاد کیں اور ان میں یہ صفت پیدا کیا ہے کہ وہ ایک ہی آواز کی مختلف ہیئتوں کو ظاہر کر سکے۔ اس نے ایک قسم کی سادہ آوازوں کو اساس و بنیاد مان کر ان میں جو اتار چڑھاؤ پیدا ہوتے ہیں انھیں بتانے کو ان سادہ آوازوں کی علامتوں میں کچھ اور علامتیں بڑھائی ہیں۔ یعنی علامتیں دو طرح کی مقرر کی ہیں۔ ایک مفرد جو مفرد آواز کی مظہر ہوتی ہیں اور دوسری مرکب جو مفرد آواز کی مختلف شکلوں کی جانب رہنمائی کرتی ہیں۔ مفرد آواز جب منھ سے نکلتی ہے ہمیشہ بہ حیثیت مطبوع و محکوم نکلتی ہے۔ اسکے آگے یا پیچھے کسی آواز کی وہ شکل ضرور موجود ہو گی جس کو مفرد علامت ظاہر نہیں کر سکتی۔

قواعد نویس صاحب اگر پاپلیٹ رو میں ہیں تو اس مفرد علامت کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ consonaunt (con+sono = مل کر آواز دینا) کاشی کے پنڈت جی تاپ فرماتے ہیں - व्यंजन (वि + अंज + अन) بے انجن کی گاڑی ہے آپ نہیں چل سکتی۔ اور شیخ حرم ہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ "صحیح" ہے۔ اسے کوئی روگ نہیں لگ سکتا ہمیشہ بحال خود قایم رہتا ہے۔ اگر آپ اس کا بحال خود قایم رہنا پسند نہیں کرتے تو حرکات و سکنات یعنی اعراب کی کل لگا دیجیے۔ رنگ بدلنے لگے گی۔ اب متفقہ فیصلہ تو یہ ہے کہ حرفوں کی بہت بڑی تعداد آواز نہیں دے سکی۔ جب تک کہ اُسے اور علامتوں سے نہ ملایا جائے" اور طرز جدید کہتی ہے کہ حرفوں کی آواز سکھاؤ۔ کیا یہ دنیا بھر کے اساتذہ اصول تدریس کے خلاف نہیں۔ اسکا بھی مضایقہ نہیں اگر اس سے کوئی مقصد بہ فائدہ ہوتا اگر "الجھن" جس سے بچنے کی اتنی فکر ہے وہ اب بھی موجود ہے۔ فرض کیجیے کہ بچہ کو ق۔ ل۔ م یہ تین آوازیں سکھادی گئیں اور وہ ان کی علامتیں بھی پہچانتا ہے۔ مگر ان تینوں نقوش کے نظر کے سامنے آتے ہی "قلم" کیوں کر کہے گا۔ وہ صرف مسلسل تین آوازوں کو ادا کر جائے گا۔ یہ مجموعہ اصوات ضرور اس لفظ کے اصلی تلفظ سے بعید ہے۔ اگر حرفوں پر اعراب لگا کر ان کی آوازیں سکھائی جائیں گی تو دو علامتوں سے ایک آواز کا کام لینا بھی اس کے دل میں شک و شبہ پیدا کر کے اسے الجھن میں پھنسا دے گا جس سے بچنے کے لیے یہ سب جتن کیے گئے تھے۔

بے انتہا قاعدوں کی تالیف سے بھی یہ مسئلہ حل نہ ہوا تو وہی مرض رہتے مریض والی ترکیب خود بخود پیدا ہو گئی۔ مسیحی پادری تو درکنار بعض مسلمان بھی رومن حرفوں کے حامی ہو گئے اور ایک اُردو ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ایک معزز مقنن عہدے نے بھی یہی صدا بلند کی۔ یا للعجب۔ جس وقت ہال میں سائنٹفک رسم الخط کی صدا گونج رہی تھی [illegible] اللہ

جو دماغ قانونی گتھیاں سلجھانے میں اس قدر براق ہے وہ کس طرح تقلید کا اس حد تک بندہ ہو گیا ہے کہ اس سے قوت ایجاد سلب ہو گئی۔ اگر اُردو کی رسم تحریر میں پیچیدگیاں ہیں تو آپ اسے درست کیجیے، اس کو عیبوں سے پاک کیجیے۔ اگر ممکن ہو تو آپ ہی کوئی "ایجاد بندہ" پیش کر دیں جو عیبوں سے پاک ہو۔

بہر حال داستان پاستان سنا چکا۔ اب اصل مسئلہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ آج تک

جو قاعدے لکھے گئے ہیں ان سب کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اصل سے کسی سلئے اعراض انحراف نہیں کیا۔ کوششوں کا مرکز صرف یہ رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح بچوں کو حرفوں کی مختلف صورتیں سمجھا دی جائیں۔ ان کوششوں نے درد دل کا علاج نہ کیا اس لئے توجہ اب اس طرف مبذول ہے کہ اس خط ہی کو ترک کر دیا جائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعضوں کی رائے ہے کہ رومن حروف مناسب تبدیلی کے ساتھ اختیار کر لیے جائیں۔ میرے نزدیک اس کی ضرورت ہی نہیں۔ رومن اور ہندی وغیرہ حرفوں کی خصوصیت تو یہی ہے کہ وہ صورت نہیں بدلتے۔ اگر یہی بات ہے تو مولوی عبداللہ صاحب رضوی کی تجویز مان لی جائے۔ اس سے حرف صورت نہ بدلیں گے طباعت بڑی آسانی پیدا ہو جائیگی اور بچے آسانی سے پڑھ بھی لیں گے۔ اب رہا تحریر کا سوال۔ اس خط کی مشق ہو جانے پر وقت نہ ہونی چاہیے۔ آخر ہندی کے حرف بھی تو الگ الگ لکھے جاتے ہیں۔ یہ کہنا کہ اس کے حرفوں میں اس باب میں ایک خاص صلاحیت ہے درست ہے لیکن اردو میں یہ بات محض اس واسطے بعید نظر آتی ہے کہ ہم ابھی تک مجموعہ ہائے حروف لکھنے کے عادی ہیں جب موجودہ صورت کچھ عرصہ بعد معدوم ہو جائے گی اس وقت شکایت بھی جاتی رہیگی۔ تحریر جس طرح ہندی میں لکھنے والے کی طبیعت کا انداز جھلکتا ہے یعنی ہر شخص اپنی اپنی طبیعت کے بموجب اصل سے ملتا ہوا حرف بناتا ہے۔ اُردو والے بھی یہی کریں گے۔ ژند یا پہلوی میں بھی حرف الگ الگ لکھے جاتے ہیں اور داہنے حرف سے بائیں طرف کے چند حرفوں کی شکل بھی اردو سے ملتی جلتی ہے مگر اس کی نسبت کوئی شکایت نہیں ہے بمبئی کے قومی پارسی اسکولوں میں یہ بچوں کو پڑھایا اور سکھایا جاتا ہے تاکہ اوستا کو اصلی حرفوں اور عبارت میں پڑھ سکیں۔

اگر یہ بھی گوارا نہیں تو میں ایک خط کے حروف تہجی درج ذیل کرتا ہوں۔ انھیں اختیار کر لیا جائے۔ خدا جانے کس کا ایجاد ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں یہ خط اودھ میں عورتوں اور جاہلوں کو لکھتے دیکھا تھا۔ یہ لوگ آواز کو اپنا رہنما بنا کر اپنی تحریری ضرورتیں پوری کیا کرتے تھے۔



ا ب ج د ر س ص ط ف ک ل م ن و ی

یہ الگ الگ لکھے جاتے ہیں۔ ان میں اعراب لگاکر چھاپنے میں بھی آسانی ہوگی اور بالکل ہندی کی طرح مع ماترا چھاپے جاسکتے ہیں۔

زمانۂ حال کے اہل الرائے لوگوں میں سے مسٹر فیاض احمد خاں صاحب۔ فیاض نے ایک تجویز پیش کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُردو کو اس کی موجودہ وضع قطع سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ حرفوں کے جوڑ توڑ بچوں کو سمجھا دیے جائیں۔ موصوف نے اس باب میں کہ اصول قایم کئے ہیں۔ بعینہ انھیں اصولوں کو مدنظر رکھکر میں نے ۱۹۳۱ء میں ایک قاعدہ چھپوایا تھا۔ میں اپنے قاعدہ کی اسکیم عرض کرتا ہوں

میں اساسی اصول سے چلا ہوں کہ (۱) حرف صورت نہیں بدلتے بلکہ بغرض ترکیب[1] مختصر کئے جاتے ہیں (۲) دو حرفوں کو ملانے کے لئے ان حرفوں کے سوا جو اپنے مابعد سے ملنے کی صلاحیت نہیں رکھتے باقی کے تمام حرف علامات ربط یا الحاق کے ذریعہ سے ملائے جاتے ہیں (۳) علامات الحاق کا فیصلہ جو دو حرف ملانے مقصود ہیں ان میں سے دوسرے کے وصف سے کیا جاتا ہے (۴) ہر حرف اپنی ہیئت کے لحاظ سے اپنے پہلے ایک خاص طرح کی علامت کا طالب ہے اور (۵) یہ علامتیں کل تین طرح کی ہیں۔ اجمال کی تفصیل میں قاعدہ کے سبقوں کو مختصراً عرض کرتا ہوں۔

نمبر سبق (۱) صرف حرفوں کی شکلیں ہیں۔ ایک سطر میں ایک خاندان کے حرف ہیں۔ یہ سبق حرفوں کے نام سکھاتا اور ان کی شکلوں کو ذہن نشین کرتا ہے۔

(۲) یہ سمجھایا گیا ہے کہ حرف مستوی کون کون میں سیدھے دائرے کن کن حرفوں میں ہیں اور اُلٹے کن کن حرفوں میں وغیرہ۔

(۳) اعراب کا سمجھانا۔ بچہ حرفوں کی صورت دیکھ کر منہ سے آواز نکالے۔ ہجے نہ کرے۔

(۴) (۱) علامات الحاق بتائی گئی ہیں۔

(ب) کون سا حرف اپنے پہلے کس علامت کا طالب ہے۔

(۵) حرفوں کی پوری (۳)، اور ادھوری شکلیں (۳) بتائی گئی ہیں اور یہ بھی کہ کون سا حرف ہر حال میں یکساں رہتا ہے۔

(۶) حرف ملاکر دکھائے گئے ہیں اور یہ کہ جب کسی ح، کو ملانے کی ضرورت ہوگی تو بحال خود قایم رہے گا۔ ب کے خاندان کے حروف جو بہروپ بھرتے ہیں وہ دکھایا گیا ہے۔

(۷) مشق۔ (۸) ک۔ گ۔ جب الف اور لام سے ملتے ہیں تو کیا شکل ہوتی ہے۔
(۹۔۱۰) مشقیں۔

(۱۱) دو دو حرف ملا کر اور اعراب لگا کر آوازیں بتائی جائیں۔ یہاں سے ہجے اور روان کی مشق بھی شروع ہوتی ہے۔
(۱۲۔۱۳) مشقیں۔ (۱۴) واؤ معروف کی آواز الٹا پیش لگا کر بتائی گئی ہے اور بغرضِ نفع الناس اس کا نام بجائے پیش کے ضمہ سکھایا گیا ہے۔
(۱۵) اب تک ہر سبق میں دو دو سے زیادہ حرف نہیں ملائے گئے تھے اور سب لفظوں کے ٹکڑے فَعْ کے وزن پر تھے۔ اس سبق سے ایک متحرک کے ساتھ دو دو ساکن آئیں گے لیکن حرف ہر صورت میں دو ہی ملائے جائیں گے لفظ کے ٹکڑے فَاعْ کے وزن پر ہونگے یا فَعْ اور فَاعْ دونوں سے مل کر لفظ بنا ہوگا۔
(۱۶) نون غنہ اور نون بالاعلان کا فرق۔
(۱۷) ایک متحرک کے ساتھ تین ساکن مگر دو حرف سے زیادہ کسی لفظ میں نہ ملے ہوں گے۔
(۱۸) دو متحرک کے ساتھ ایک ساکن بروزن فَعَلْ۔

یہ میری تالیف کے پہلے حصہ کا خاکہ ہے۔ دوسرے حصے میں حرفوں کے ملنے سے جو جو صورتیں پیدا ہوتی ہیں سب دکھائی ہیں اور تنوین حروف شمسی و قمری وغیرہ سے بحث ہے میرے نزدیک میرے قاعدہ اور مسٹر فیاض کی تجویز میں کوئی خاص فرق نہیں۔
اب اس قاعدہ کی نسبت رائیں اور اس کا حشر بھی سن لیجئے طباعت سے پہلے میں نے اس قاعدہ کو دوستوں کو سنایا۔ اکثر جواب یہی ملا قاعدہ اچھا ہے۔ لیکن اس کیلئے پڑھانیوالا چاہیئے۔ مگر ہر علم کے لئے یہ بات ضروری ہے۔
طباعت کے بعد حشر یہ ہوا کہ جو نسخے میں نے احباب کو نذر کردئے وہ گویا بک گئے۔ باقی دو میں ایک کرمفرما کے گھر میں بجنسہ رکھے ہوئے ہیں۔ ایک صاحب جو دری کتابوں کے مؤلف ہیں اور ان کی نشر و اشاعت ایجنٹوں کے ذریعہ کرتے ہیں انھوں نے فرمایا کہ قاعدہ میرے ایجنٹوں نے چند جگہ دکھایا اس میں جدت اس بلا کی ہے کہ لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔
میں نے آپ بیتی اس لئے سنائی تاکہ مسٹر فیاض اپنی تجویز کے حشر کا اندازہ لگا سکیں۔

بھوکا ہندوستان

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

ایک مفلس کے مکاں میں کل ہوا میرا گزر
خاک پر بیٹھا تھا بچہ اور بیوی تخت پر

تخت اینٹوں کی کمی بیشی سے ناہموار تھا
وزن اک نازک سی عورت کا بھی جس پر بار تھا

تیرہ قسمت گھر کا مالک پائمالِ صد جنوں
بوریئے پر اک طرف بیٹھا ہوا تھا سرنگوں

فرقِ پیشانی پہ تھا چھایا ہوا دل کا دھواں
جس میں رقصاں تھیں شرافت کی سبک چنگاریاں

اس کی ہستی تھی اک ایسی ہستیِ نامعتبر
مارتے ہیں قہقہے جہال جس کے علم پر

تھا وہ یوں اس ناسزا دنیا میں پابندِ قلق
ہر سبک سر کو تھا جس پر معترض ہونے کا حق

تھا وہ اس عالم میں جب ہستی نہیں جمتی پر آب
مانتا ہے شیب کے دعوے جب انساں کا شباب

منہ یقیں کا جانبِ اوہام پھر جاتا ہے جب
آدمی خود اپنی ہی نظروں سے گر جاتا ہے جب

فاقہ کش انسان جب ہوتا ہے یوں زیر و زبر
جھینپتا ہے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر

جب سبک ہوتا ہے اس درجہ محبت کا نیاز
خود شریکِ زندگی بھی ترک کر دیتی ہے ناز

جب کوئی عزت سے پیش آتا ہے تو مردِ حزیں
سوچنے لگتا ہے یہ ہم کو بناتا تو نہیں

زندگی جس وقت ہو جاتی ہے یوں زار و حزیں
وہم بن جاتا ہے خود اپنی شرافت کا یقیں

دل میں جب احساسِ رحمت کا نہیں رہتا ہے دم
کفر کی سرحد پہ جب پڑتے ہیں انساں کے قدم

جب زبون و خستہ جاں انسان کا ذوقِ وفا
خلق کی نظروں میں ہوتا ہے مدد کی التجا

زندگی ہوتی ہے جب اس درجہ حسرت آفریں
تخلیے کا دوست بھی موقعہ کبھی دیتا نہیں

جب خذف معلوم ہوتے ہیں خود اپنے ہی گہر
وہم ہوتا ہے رکاکت کا خود اپنی وضع پر

رُخ پہ جب ہوتے ہیں ایسی خستہ حالی کے نشان
جس کے سچ پر جھوٹ کا ہوتا ہے دنیا کو گمان

اس مصیبت سے تھی اس کی زندگی زیر و زبر
جس مصیبت پر شرافت تولنے لگتی ہے پر

اس کے سر پر تھا تہیدستی کا وہ بارِ گراں
بولنے لگتی ہیں جس سے زندگی کی ہڈیاں

مفلسی کے اس کنارے پر تھا وہ گرمِ خرام
ترک کر دیتا ہے بیٹا باپ کا جب احترام

الغرض چھائی ہوئی تھی یاس سقف و بام پر
روح تھرانے لگی میری یہ منظر دیکھ کر

گمرتھا یا اک کارواں بھٹکا ہوا کھویا ہوا
خفتہ تھی قسمت مکینوں کی مکاں سویا ہوا

یہ کھنڈر اس قصرِ عالی کا تھا اک ایسا مقام
تھا جہاں کل اس کے آبا کے غلاموں کا قیام

جس طرف اس کا لڑکپن بھول کر آتا نہ تھا
عہدِ طفلی میں جدھر یہ کھیلنے پاتا نہ تھا

جو مکاں کل نغمۂ خدّام سے پُرجوش تھا
آج آقا کو لئے آغوش میں خاموش تھا

پوچھتا جاتا تھا لیکن خیر سے تو ہیں مکیں
مجھ میں اک مدّت سے کوئی قہقہہ گونجا نہیں

طاق پر رکھا ہوا تھا ایک سویا سا چراغ
طاق کے نیچے تھے کڑوے تیل کے دو ایک داغ

تیل بہنے کا نشاں دیوار پر اصلا نہ تھا
ایک دن بھی وہ دیا شاید کبھی چھلکا نہ تھا

اس حقیقت کو سمجھ سکتے نہیں اہلِ فراغ
اور ظلمت کو بڑھا دیتا ہے مفلس کا چراغ

سرد چولھے کے قریب اڑتا ہوا ہلکا غبار
الگنی پر چند کپڑے اور وہ بھی تار تار

ایک گوشے میں تھا بستر کے عوض تھوڑا پیال
جس پہ دو ٹکڑے دری کے اور اک صد پارہ شال

شال کے ہر تار میں خوابیدہ سو نقش و نگار
عہدِ ماضی کی لے دے کے تھی یہی اک یادگار

بچّہ بہلا سا ہوا تھا خاک کے اک ڈھیر سے
ماں دوپٹہ سی رہی تھی سر جھکائے دیر سے

کھیلنے میں طفلکِ گلفام تھا ڈوبا ہوا
آئی اتنے میں گلی سے آم والے کی صدا

کانپتی آئی صدا ہلنے لگا بچے کا دل
سانس لی یوں جیسے رکھی ہو کوئی چھاتی پہ سِل

ہوگئی اگلی ضدوں کی یاد سے دنیا سیاہ
ماں کے چہرے کی طرف ڈالی جھجکتی سی نگاہ

ماں کی نظریں اٹھ گئیں اٹھ کر پڑیں پھر جھک گئیں
ہائے میرے لال میرے پاس تو کچھ بھی نہیں

دیکھ کر ماں کی اداسی ہوگئی پامال یاس
انکھڑیوں میں آم کی سرخی تخیل میں مٹھاس

ہونٹ کانپے خود بخود اور رہ گئے پھر کانپ کے
آنکھ میں غلطاں ہوئے ماضی کے دھندلے تجربے

راستے میں آگئی دیوار نالے چڑھ گئے
منہ میں تھرّائی زباں الفاظ آگے بڑھ گئے

چھا گیا آنکھوں میں سنّاٹا دلِ ناکام کا
اشک بن کر آنکھ سے ٹپکا تصوّر آم کا

چہرہ مرجھایا نفس بوجھل سا کچھ ہونے لگا
دل کے سنّاٹے میں بچپن کھو گیا سونے لگا

نیم جاں ماں باپ کی نظروں کے خط ملنے لگے
باپ کا سر اور دکھیا ماں کے لب ہلنے لگے

علّامہ راشد الخیری

از

مسٹر اویس احمد ادیب ایم-اے

مولانا راشد الخیری جنکی وفات پر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں آنسو بہائے جارہے ہیں انکے جدِ اعلیٰ مولانا ابوالخیر خیر اللہ صاحب شاہجہاں کے عہد حکومت میں عرب سے وارد ہندوستان ہوکر دہلی میں اقامت گزیں ہوئے تھے۔ اسی خاندانی مناسبت سے مولانا اپنے نام کے آخر میں "الخیری" لکھا کرتے تھے۔ آپ کا تمام خاندان بھی اس لفظ کو امتیازی طور پر اپنے نام کے آخر میں لکھتا ہے۔ یہ خاندان بڑا علم دوست خاندان تھا۔ مولانا عبدالقادر صاحب، مولانا عبدالخالق صاحب اور مولانا عبدالرّب صاحب جیسی باکمال ہستیوں نے اس خاندان کو اور فروغ دیا۔ مولانا عبدالخالق صاحب، علامہ راشد الخیری صاحب کے پردادا تھے۔ مولانا نذیر احمد دہلوی آپکے حقیقی پھوپھا اور استاد تھے۔ مولانا بھی اپنے اُستاد کے نقشِ قدم پر چلے اور صحیح معنی میں انکے جانشین بن گئے۔

پیدائش اور تعلیم | آپ ۱۸۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مولوی واحد صاحب آپکے پدر بزرگوار تھے۔ جو ریاست حیدرآباد میں محکمۂ بندوبست کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ نو سال کی عمر میں آپکے والد کا سایہ آپکے سر سے اٹھ گیا۔ اسوقت آپ عربک کالج دہلی میں تعلیم پاتے تھے جہاں سے آپ نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اپنے شفیق چچا مولانا عبدالقادر صاحب ڈپٹی کلکٹر کی وساطت سے محکمۂ بندوبست میں ایک معقول تنخواہ پر ملازم ہوگئے مگر ملازمت کے دوران میں بھی آپ اپنے کو طالب علم ہی سمجھتے رہے اور برابر مطالعہ کتب میں مصروف رہے۔ ۱۸۹۰ء میں مولانا کی شادی ہوئی۔ آپ کی زوجہ مولانا عبدالرحیم صاحب کی صاحبزادی ہیں جو اسوقت تک بقید حیات ہیں۔

ادبی زندگی | یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مولانا کی ادبی زندگی کی کس طرح شروعات ہوئی مگر آپکی سب سے پہلی تصنیف "حیاتِ صالحہ" ہے جو ۱۸۹۵ء میں لکھی گئی اور ۱۹۰۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ یہ کتاب مولانا نے ضلع اناؤ ہی میں تصنیف کی تھی۔ اسکے بعد آپ دہلی آئے یہاں انہیں دنوں شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹری پاس کرکے آئے تھے اور اپنے ساتھ رسالہ "مخزن" بھی دلی

لیتے آتے تھے۔ شیخ صاحب موصوف نے مولانا کو "مخزن" کا جائنٹ ایڈیٹر بنالیا۔ بالآخر اپنی ذاتی استعداد کی بدولت اس پرچے کے ایڈیٹر ہوگئے اور اپنے فرائض انتہائی ہوشیاری اور دیانتداری سے انجام دئے جس سے شیخ صاحب کو آپ پر اسقدر اعتماد ہوگیا کہ وہ "مخزن" کو مولانا کے بھروسے پر چھوڑ کر بھی لاہور چلے گئے۔ مگر مولانا کو اس رسالے میں اپنی دلچسپی کا کافی سامان نہیں ملا۔ کیونکہ "مخزن" صرف ایک ادبی پرچہ تھا اور مولانا کی طبیعت کسی اور میدان کی متلاشی تھی۔

۱۹۰۸ء میں آپ نے ملازمت چھوڑ دی۔ اسی زمانے میں شیخ محمد اکرم صاحب جو اسی زمانے میں بیرسٹر ہوکر دہلی آئے تھے، مولانا کی ملاقات ہوگئی۔ دونوں نے مشورہ کیا کہ دہلی سے ایک زنانہ رسالہ نکالا جائے چنانچہ رسالہ "عصمت" نکالا گیا اور مولانا اپنا تمام وقت اسی میں صرف کرنے لگے۔ اسی سلسلے میں آپنے ۱۹۱۱ء میں ایک اور رسالہ "تمدن" کے نام سے نکالا۔ جسمیں آپکو نقصان کثیر اٹھانا پڑا۔ چنانچہ اسکا اثر "عصمت" پر بھی پڑا اور اسکی مالی حالت خراب ہوگئی۔ لیکن آپنے "عصمت" کو بند نہیں ہونے دیا اور اسکو برابر شائع کرتے رہے۔

مولانا راشد الخیری تمام زندگی تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ آپنے متعدد ناول اور کثیر التعداد مضامین لکھے۔ ۱۹۲۲ء میں آپنے مسلمان لڑکیوں کیلئے "تربیت گاہ بنات" کے نام سے ایک یتیم خانہ قائم کیا جو اسوقت تک کامیابی کیساتھ چل رہا ہے۔ مولانا علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو زبان کے ممتحن بھی تھے۔ ۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ بہار نے آپکو اردو اور ہندی کی ترقی کے سلسلہ میں طلب کیا تھا۔

تصانیف | مولانا نے اپنی یادگاریں اپنی تصنیف کی ایک کثیر تعداد چھوڑی ہے۔ اس مختصر مضمون میں آپکی سب تصانیف کے نام دینے کی گنجایش نہیں ہے چیدہ چیدہ کتب کے نام درج کرنا ضروری ہے۔ آپکی سب سے پہلی تصنیف "حیات صالحہ" کے بعد تصانیف کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا۔ صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی، نوحہ زندگی، نسوانی زندگی، الزہرا، طوفان حیات، قلب حزیں، منازل السائرہ، شہید مغرب، عروس کربلا، سیدہ کالال، آمنہ کالال، وداع ظفر، موؤدہ، امت کی مائیں، جوہر عصمت، منظر البس، ماہ عجم اور دُرِ شہوار آپکی خاص خاص کتابیں ہیں۔

حلقۂ احباب | مولانا کے احباب کا حلقہ بہت محدود تھا۔ آپکے دوستوں میں مولوی اشرف حسین

صاحب مرحوم، مرزا محمد اشرف گورگانی مرحوم اور قاری سرفراز حسین مرحوم کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تینوں حضرات مولانا کی حیات ہی میں ہگرائے عالمِ جاودانی ہو گئے تھے آپ بھی جوان تینوں حضرات کی موت پر آنسو بہانے کے لئے رہ گئے تھے ۳ رفیقِ زندگی کو جل بسے طالبعلمی کے زمانے میں بھی آپکے دوستوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن جن احباب سے ایکدفعہ آپکا رابطۂ محبت قائم ہوگیا وہ آخر وقت تک قائم رہا، اخلاص، دوستی، بے تکلفی تو آپکے مزاج میں بدرجہ اتم دخل تھا۔ مولانا واحدی و مولانا ہسوی مرحوم سے آپکے خاص تعلقات تھے۔ مگر مولانا طبعاً زیادہ ملنے جلنے سے گھبراتے تھے۔ کبھی کسی جگہ دس منٹ نہ بیٹھے۔ بلکہ پانچ منٹ بیٹھکر چل دیتے۔ تصانیف کے سلسلے میں بھی انکا یہی حال تھا کہ وہ پانچ منٹ بیٹھکر لکھتے تو دس منٹ باہر نکل کر ٹہلنے لگتے۔

عادات وخصائل مولانا بالکل سادہ زندگی پسند کرتے تھے۔ بے تکلف دوستوں سے بہت زیادہ بے تکلف ہو جاتے تھے۔ لیکن جہاں انکو تکلف کرنا پڑتا تھا وہاں ہرگز نہیں جاتے تھے۔ اگر کوئی اجنبی آدمی ان سے ملنے آتا تھا تو ملتے ضرور تھے مگر گھبراتے رہتے تھے کیونکہ وہاں پر مولانا مرحوم پہ پابندیاں عائد ہو جاتی تھیں۔

مولانا کی آخری زندگی کا حصہ صرف ایسے کاموں میں صرف ہوا جو قوم اور ملک کیلئے انتہائی مفید تھے۔ "تربیت گاہِ بنات" کی وہ خود ہی دیکھ بھال کرتے تھے۔

رحلت رحلت کیوقت مولانا کی عمر ۶۷ سال کی تھی آخر میں علالت کے باعث آپ بہت کمزور ہو گئے تھے حتیٰ کہ ۳ر فروری ۱۹۳۶ء کو قوائے جسمانی جواب دے گئے اور تمام احباب و اعزاء کو روتا ہوا چھوڑ کر آپ راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔

آپ کا چہرہ نورانی تھا۔ اس پر سفید داڑھی سونے پر سہاگہ تھی۔ قد درمیانی اور جسم دوہرا تھا۔ لباس ہمیشہ معمولی پہنا۔ چہرہ کتابی۔ آنکھیں بڑی اور روشن تھیں۔ آواز گرجدار تھی۔ چلتے وقت پشت کا بالائی حصّہ جھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آپ کا رنگ گندمی تھا۔

آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اسلامی تاریخ سے آپ کو خاص ذوق تھا۔ ادبیات پر پوری طور سے حاوی تھے۔ مثنوی میر حسن سے خاص اُنس تھا۔

ایک ناول نگار کی حیثیت سے سب سے پہلے مولانا نذیر احمد دہلوی نے لڑکیوں کیلئے ایسی کتابیں لکھیں جنمیں انکے تحفظ حقوق پر مدلل بحث موجود ہے۔ انہوں نے مسلمان خواتین کی فلاح و بہبود کیلئے مراۃ العروس، بنات النعش اور ایامیٰ

جیسی بلند پایہ کتابیں لکھیں جنہیں یہ بتایا ہے کہ بد مزاج اور بری عادتوں کی لڑکیوں کو زندگی میں کیسی مصیبت اٹھانا پڑتی ہے۔ اور وہ کس طرح دوسروں کی نظروں میں ذلیل ہو کر سوسائٹی میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتیں۔ ایسی لڑکیوں سے انکی سہیلیاں اور محلہ والیاں تک پریشان ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد کو مسلمان گھروں کے حالات قلمبند کرنے میں غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں مسلمان عورتوں کو رسوم اور دیگر قیود کا شکار دکھلایا ہے۔ خانہ داری کے متعلق ہر ایک بات تبلا دی ہے۔ اور باتوں ہی باتوں میں عورتوں کو میل جول کے طریقے بھی سکھا دیے ہیں۔ عورتوں کے توہمات پر نہایت شگفتہ بیانات تحریر کئے ہیں۔ والدین کا ادب، پڑھنے لکھنے کا شوق۔ سچی باتیں اور بھلائی کے کام انکے ناولوں کا موضوع ہیں۔ انہوں نے ان مظالم کے خلاف جو عورتوں پر ڈھائے جا رہے تھے صدائے احتجاج بلند کی۔ بیواؤں کے نکاح ثانی کی مخالفت بھی ان میں سے ایک ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ بیوہ کا دوبارہ نکاح کرنا اپنے خاندان کو بدنام کرنا اور اپنی عزت و حرمت میں بٹہ لگانا ہے مگر مولانا نذیر احمد نے اپنے لکچروں اور کتابوں میں اس بات پر نہایت زور دیا کہ ان کا نکاح مذہب اور معاشرتی ضروریات دونوں لحاظ سے ضروری ہے اس بارے میں ان کا یہ شعر ان کے دلی خیالات کا ترجمان ہے ؎

بُرا دستور، بے جا بات، ناہنجار شیوہ ہے
بڑی خوف و خطر کی جائے ہے جس گھر میں بیوہ ہے

مولانا نذیر احمد کے نظریہ کی کافی تقلید ہوئی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں مراۃ النسا، مفید النسا اور زینت العروس جیسی کتابیں شائع ہو گئیں۔ یہ سب کتابیں مولانا نذیر احمد کی کتابوں کا چربہ تھیں اس وجہ سے عوام کی انکی طرف کچھ توجہ نہیں ہوئی۔ زینت العروس ایک مثنوی ہے جس میں مراۃ العروس کا قصہ ہو بہو نظم میں پیش کیا گیا ہے۔ گو اس کے مصنف نے دیباچہ میں اور اصل مثنوی میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے کہ اس نے مراۃ العروس سے فیض حاصل کیا ہے۔ البتہ مولانا نذیر احمد صاحب کی شان میں چند اشعار ضرور لکھے ہیں لیکن مثنوی پڑھتے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے مضامین مراۃ العروس سے لئے گئے ہیں۔

مولانا راشد الخیری بھی ڈاکٹر نذیر احمد کے داغ بیل ڈالے ہوئے راستہ پر چلے مگر اسطرح

کہ انہوں نے صاحب ممدوح کے موضوع کو اور وسعت دیدی اور اس کے ہر جزو پر اپنا زورِ قلم صرف کیا۔ مولانا راشد صاحب نے بھی اپنے ناولوں میں "عورت" ہی کو اپنا موضوع بنایا مگر انہوں نے صرف مشرق کی عورت سے بحث کی ہے اسلئے انکی کتابوں میں حسن وعشق کی طولانی داستانیں نہیں ہیں بلکہ انہوں نے جہاں کہیں عورتوں کا ذکر کیا ہے شرم وحیا اور لحاظ وغیرہ اس کے ضروری اوصاف قرار دئے ہیں۔ انہوں نے مسلمان عورتوں کی پست حالت کو پیش کیا مگر اس حالت اور اس پستی کا مقابلہ ان شریف اور پاکباز خواتین سے کیا ہے جنہوں نے اسلام کے نام پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ انہوں نے اسلام کی ابتدائی زمانہ کی عورتوں کی مثالیں پیش کرکے ہر جگہ یہی دکھلایا ہے کہ مسلمان عورتیں پہلے کیا تھیں اور اب کیا ہیں۔ زمانہ قدیم میں مسلمان مائیں اپنے بچوں کو کس طرح پالتی تھیں۔ اور ان کے فرزند کس طرح ملک اور مذہب پر نثار ہوتے تھے۔ مولانا نے ہندوستانی مسلمان گھروں کی موجودہ ماؤں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ نماز اور روزہ سے بیگانہ ہوگئی ہیں۔ محبت اور خلوص سے ناآشنا ہیں۔ میاں بیوی کے باہمی تعلقات کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ سلیقہ اور کفایت شعاری انکو آتی ہی نہیں۔ انکی تمام ہنرمندی فیشن پرستی اور آرام طلبی اور نازک مزاجی تک محدود ہے۔

ایک صاحب کا اعتراض ہے کہ مولانا مرحوم نے مسلمان عورتوں کو جس پست حالت میں پیش کیا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انکی نظر وسیع نہیں ہے اور انکی نگاہ ہمیشہ عیوب ہی پر پڑتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مولانا ایک دردمند دل لیکر پیدا ہوئے تھے اور حقیقی معنوں میں مسلمان تھے اور ہر مسلمان عورت اور مرد کو اُن اُصولوں کا پابند دیکھنا چاہتے تھے جو کہ بانیٔ اسلام کے زمانے سے مسلمانوں کیلئے طُرّۂ امتیاز رہے ہے۔

بعض اصحاب مولانا عبدالراشد کو قدامت پسند سمجھتے ہیں۔ انکا خیال ہے کہ وہ مسلمانوں کو تہذیب حاضرہ کا حامی نہیں دیکھنا چاہتے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ کے یہاں قدامت پسندی کے معنی لکیر کے فقیر بنے رہنا نہیں ہے بہت سی باتوں میں وہ جدید تہذیب کے حامی ہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو ترک کرنا پسند نہیں کرتے اور اسلام کے زرین اصولوں کی طرف رجوع کرنیکے معنی یہ نہیں ہیں کہ باوا آدم کے زمانہ کے طور طریقے رائج ہو جائیں۔ اس بارے میں مولانا کے اصلی خیالات کا صحیح اندازہ "ستونتی" نامی کتاب سے ہوسکتا ہے جسمیں انہوں نے ایک مسلمان بیوی کو پیش کیا ہے جو جاہل نہیں بلکہ تعلیمیافتہ ہے بزدل نہیں شجاع اور طوطا چشم نہیں بلکہ وفادار ہے۔

وہ ضرورت کے وقت ایثار سے کام لیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ سمجھتی ہے کہ شریف عورت کیلئے شوہر سے بڑھ کر دنیا کی اور کوئی نعمت نہیں ہوسکتی۔

یہ تعلیم ان کی متعدد کتابوں میں موجود ہے مگر یہاں اسکے متعلق "شامِ زندگی" کا ایک مختصر اقتباس پیش کرنا بے جا نہ ہوگا جس میں مولانا نے اپنے ان خیالات کو سمویا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ نسیمہ کا شوہر بے توجہی کرتا ہے۔ بچے کو گود تک میں نہیں لیتا مگر اسمیں ایکدم تبدیلی ہوتی ہے اور وہ معافی کا خواستگار ہوتا ہے۔ اس پر نسیمہ (بیوی) یہ کہتی ہے۔

"خدا اس سر کو ہمیشہ بلند رکھے، اس سر سے میری عزت اور اس زندگی سے میری وقعت ہے؛ تمہارے در پر میری پالکی آئی ہے اور کھٹولی جائے گی، جیوں تو تمہاری اطاعت میں اور مروں تو تمہاری خدمت میں، آرزو ہے کہ تمہارے ساتھ عزت آبرو سے زندگی بسر ہو اور ارمان ہے کہ تمہارے ہاتھ سے پیوند زمین ہوں، باپ کا سایہ میرے سر سے اٹھ چکا۔ بھائی کوئی موجود نہیں۔ سچے وارث اور حقیقی مالک تم ہو۔ زندہ لائے ہو، مردہ بھیجدینا۔ میری زندگی کی مراد، میرے دل کا ارمان اگر ہے تو اتنا کہ بڑوں کی لاج اور بڑوں کی آن میں فرق نہ آئے۔ جس ہاتھ سے پکڑا ہے، اسی ہاتھ سے سپرد خاک کردینا۔"

مولانا ہر مسلمان خاتون کو اس حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں وہ ان کے حقوق کے لئے بھی لڑتے ہیں مگر وہ خوب جانتے ہیں کہ عورت چاہے تو اپنی اور مرد کی زندگی کو نمونۂ جنت بنا سکتی ہے اور خزاں کو بہار سے تبدیل کرسکتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ عورت میں اس بات کا حس پیدا ہو کہ وہ کیا ہے؟ اور اس کی زندگی کا مقصدِ اصلی کیا ہے؟ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ عورتیں مردوں کو بخوبی سمجھنے کی کوشش کریں اور اس بات سے واقف ہو جائیں کہ انکی زندگی کی کیا ضروریات ہیں؟ اور قدرت نے عورت کو کہاں تک مرد کا شریک بنایا ہے سلیقہ مند گھر والی شوہر کا دل موہ لیتی ہے۔ تہذیب حاضرہ کی ماری ہوئی لڑکیوں کی طرح نہیں کہ شوہر کی طرف سے لاپروا، زندگی کا خیالی آئیڈیل تو بہت بلند مگر گھر میں صبح سے شام تک لڑائی جھگڑے، اور دونوں کا منہ پھولا ہوا، گھر بار کی تباہی اور بدنامی۔ وہ ان باتوں سے ہر مسلمان عورت کو دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں وٹیڈیا کی سرگذشت کا ذکر کردینا بھی ضروری ہے۔ جہاں انہوں نے اسلامی معاشرت کو مدنظر رکھا ہے وہاں دوسروں کی حیات پر بھی ایک غائر نظر ڈالی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک انگریز خاتون کی کہانی بیان کی ہے جس میں انگریز میاں بیوی کے تعلقات پر روشنی

ڈالی ہے۔

مولانا نے بھی جہاں کہیں کسی بات کی تعلیم دی ہے وہاں اکثر ایک کردار ایسا پیش کر دیا ہے جو اس کی خلاف ورزی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور پھر اپنے کئے پر پچھتاتا ہے اور اپنی غلطیوں کی سزا پاتا ہے۔ مولانا عورت کی زندگی کو بچپن سے لیکر موت تک گہری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ صبح زندگی میں انہوں نے ایک نیک چلن لڑکی نسیمہ عرف نسو کو پیش کیا ہے جو ایک نیک نفس اور خوش سلیقہ پھوپھی کے پاس پرورش پاتی ہے۔ دوسری طرف اسکے بالکل برعکس اسکی بڑی بہن کو پیش کیا ہے۔ نسیمہ کی پھوپھی قدم قدم پر اس کی روک ٹوک کرتی ہے۔ وہ اسکو تعلیم دیتی ہے کہ کسی کا حق نہ مارو، جانوروں پر ظلم نہ کرو۔ دکھیاروں کی مدد کرو۔ چنانچہ ان تمام باتوں کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ وہ ہم کو اپنی تمام عمر میں نہ تو کسی کا حق مارتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ نہ جانوروں کو ستاتی ہے بلکہ دکھیاروں کی مدد کرتی ہے۔ سقہ کے یہاں عین عید کے روز موت ہوتی ہے۔ اس کا کوئی روادار نہیں ہوتا کہ تہوار کے دن اس بری خبر کو سنے سقن جہاں جاتی ہے وہیں سے بھگائی جاتی ہے۔ جس وقت وہ اپنی تمام روئداد نسیمہ کے گوش گزار کرتی ہے تو وہ بیتاب ہو جاتی ہے اور اپنے عیدی کے چھ روپیہ میں سے پانچ روپیہ نکال کر اسکو دے دیتی ہے۔ جس سے وہ غریب اپنے مردے کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرتی ہے۔ اسیکے ساتھ ساتھ نسیمہ کی بڑی بہن کا کریکٹر ملاحظہ ہو:۔

> "صبح سے جو اس غریب کتیا کو جو "ممانی جان کی کتیا" کہلاتی ہے۔ اس نے مارنا شروع کیا تو دوپہر کر دی۔ بانس کی موٹی کھپچی کے پرزے اڑ گئے مگر یہ دھندا ختم نہ ہوئی۔ مارتے مارتے تھک گئی تو تھوڑی سی دیر دم لے لیا۔

ان باتوں کے علاوہ ایک لڑکی کو کنوارتے میں جن باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے انکو بھی مولانا موصوف نے اپنی کتابوں میں بیان کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انکے لئے قدم قدم پر مفید و دلچسپ قصے بھی موجود ہیں جو بیکار نہیں ہیں اور جس سے وہ اصل قصہ کی دلچسپی قائم رکھتے ہیں اور ناظرین کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کئے رہتے ہیں۔ اسی دوران میں مولانا اپنے مدنظر اصولوں کو ناظرین کے دل و دماغ پر نقش کرتے رہے ہیں۔ اس طور سے کتاب کا حجم بھی پورا ہو جاتا ہے اور افسانے کا اصلی پلاٹ بھی واضح ہوتا رہتا ہے۔ "صبح زندگی" میں مولانا نے ان زرین اصولوں کو جمع کر دیا ہے جو انکی رائے میں ایک کنواری لڑکی کے لئے بہت ضروری ہیں۔ لڑکیوں کو زبان درازی سے پرہیز کرنا چاہیئے گھر کا کام کاج محنت سے سیکھنا چاہیئے۔ بھائی بہنوں کی عزت کرنا چاہیئے۔ ماں باپ کے سامنے

شرم اور لحاظ کو مدِنظر رکھنا چاہئیے۔ دوسروں کے ساتھ برابر کا برتاؤ کرنا چاہئیے۔ یا اپنے گھر کی چیزیں کسی کو چوری چھپا کر نہ دینا چاہیئے۔ انہوں نے دو کرداروں کے ذریعہ ان تمام ضروری باتوں کو پیش کر دیا ہے لڑکیوں کی شادی کے سلسلے میں مولانا نے اُن کا جہیز بھی سامنے پیش کر دیا ہے۔ وہ فضول رسموں اور دوسری بیہودگیوں کا تدارک کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی ہمدردی کرنا ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ ایک لڑکی اسلام کے زرین اصولوں پر چلتی ہے دوسری گمراہ ہوجاتی ہے الغرض مولانا ان مثالوں سے وہ درد اور اثر پیدا کر کے اپنے ناظرین کو متاثر کرتے ہیں ان کو ایک بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔

مولانائے مرحوم نے مختلف ناولوں میں مختلف رسوم ورواج پر مدلل بحث کی ہے اور اُن کے بُرے نتائج پیش کئے ہیں۔ "طوفانِ حیات" میں وہ قبیح رسوم اور بدعتوں کے خلاف سختی سے لکھتے ہیں۔ جو مسلمانوں کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہی ہیں اس میں وہ اپنی ہیروئن کی مشرکانہ زندگی پیش کرتے ہیں اور اس کا اس طرح مضحکہ اڑاتے ہیں کہ پڑھنے والا شرم سے گردن جھکا دیتا ہے۔

مولانا کی ایک اور تصنیف "حیاتِ صالحہ" ہے جس میں انہوں نے یہ دکھلایا ہے کہ وہی باپ جو اپنی اولاد کو کبھی پھول کی پنکھڑی سے بھی نہیں مارتا تھا کس طرح اس کا دشمن ہو جاتا ہے اسمیں بیبیوں کی رقابت یا سوکن کا جلاپا بھی دکھایا ہے جو بچوں کے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہوتا۔ ان کا جلاپا انکے بچوں کی زندگی خراب و برباد کر دیتا ہے۔ مگر یہ ناول اب سے چالیس سال پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اسلئے اسمیں اب سے چالیس سال قبل کے واقعات درج ہیں۔

"مسلم کرانیکل مدراس" میں ایک صاحب نے مولانا کے ناولوں پر یہ اعتراض کیا ہے کہ انکے ناولوں میں صداقت نہیں ہوتی ہر جگہ انہوں نے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ مگر میں اس کے جواب میں یہ عرض کرونگا کہ معترضین کو ہمیشہ کتاب کی تاریخ تصنیف کا خیال رکھکر رائے قائم کرنا چاہئیے۔

مولانا نے بعض ناولوں میں قدامت پرستی اور فیشن پرستی کے حامیوں میں جنگ بھی دکھلائی ہے۔ چنانچہ "جوہرِ قدامت" میں دو بہنوں کی داستانیں درج ہیں جن میں سے ایک مشرق کی خوبیوں کی پرستار اور دوسری تہذیب جدید کی حامی ہے۔ دونوں کے خیالات اور اطوار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی سلسلہ میں مولانا نے مسلمان عورتوں کی پچاس سال قبل کی حالت بھی پیش کر دی ہے اور موجودہ روش پر بھی روشنی ڈال کر مغرب پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی ہے۔

آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہندوستان کی مسلمان عورت پر مولانا کی نظر کتنی گہری پڑی تھی۔ انہوں نے اسکی زندگی کے متعلق ایک ایک بات کو لیا اور اس پر ایک ایک ناول لکھ ڈالا۔ "سودائے نقد" نامی ناول میں مولانا نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ جوان لڑکیوں کا گھر میں بٹھائے رکھنے کا سوسائٹی پر کیا خراب اثر پڑتا ہے۔

مولانا نے تاریخی ناول بھی کثیر تعداد میں لکھے ہیں ان کے موضوع دو حصوں میں منقسم کئے جاسکتے ہیں۔ کچھ ناولوں کا تعلق اسلامی تاریخ سے ہے اور کچھ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے متعلق ہیں۔ لیکن اول الذکر کے مقابلے میں آخر الذکر کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔

ان ناولوں میں بانیٔ اسلام سے لیکر خلفائے راشدین تک کے تمام واقعات مختلف شکلوں اور صورتوں میں پیش کرئے گئے ہیں۔ مثلاً "الزہرا" کو جوان کا ایک مشہور و معروف ناول ہے اگر تاریخ اسلام کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ اسمیں بنت رسولؐ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ کے کارنامے درج ہیں۔ خاتمہ پر ایک مفصل بحث شہادت اہلبیت پر بھی لکھی ہے۔ میدان کربلا کے واقعات بھی اس میں موجود ہیں۔ "عروس کربلا" بھی اسی موضوع پر ہے" یا سمین شام" ان کا ایک اور تاریخی ناول ہے جسمیں انہوں نے خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے زمانے کی لڑائیوں کا حال لکھا ہے۔ یہ بھی بتلایا ہے کہ مجاہدین اسلام کس طرح سرفروشانہ قربانیاں کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ مسلمان عورتیں کس طرح جنگ میں حصہ لیتی تھیں۔ مولانا نے اپنے زور قلم سے ان ناولوں میں ایک تڑپ اور ایک رُوح پیدا کر دی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم اسلامی کارناموں کو بیان کرتے وقت ان کے اندر ایک جذبہ پیدا ہو جاتا تھا جس کے ماتحت وہ مسلمانوں کے پُرجوش ایمانی انکی جرأت اور جانبازی کی مکمل تصویریں پیش کر دیتے تھے۔

" محبوبۂ خداوند" میں انہوں نے قرون اولیٰ کے پاکباز اور نیک نفس مسلمانوں کی جانبازیوں کی تصویر دکھائی ہے۔ اس ناول میں مسلمانوں کی قلیل جماعت کو عیسائیوں کی ٹڈی دل فوجوں سے جنگ و جدال کرتا دکھایا ہے اور عہد عثمانی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ جسمیں طرابلس کا مقدس خداوند حسینہ سفیریہ کو اپنے قبضہ میں کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اسلام قبول کر کے اپنی عزت اور حرمت بچاتی ہے۔

مولانا کے ناولوں کے پلاٹ بھی انھیں واقعات سے تیار کئے گئے ہیں جو کہ انکے اشخاص ناول کو پیش آئے ہیں۔ سوشل یا سماجی ناولوں میں رسم و رواج کی پابندیاں

اور جتنی تلخیاں کھائی گئی ہیں جنکی مسلمان مستورات شکار ہو رہی ہیں تاریخی ناولوں میں اسلامی تاریخ کے ان واقعات کو بیان کیا ہے جو گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔ مولانا نے ان واقعات سے بے نظیر پلاٹ تیار کیئے ہیں۔ ان کے ناولوں کے پلاٹ بہت سوچ سمجھ کر قائم کئے گئے ہیں۔ ان میں بدنظمی یا بے ترتیبی کا اب پتہ نہیں۔ اکثر تاریخی ناولوں (مثلاً ماہ عجم"، "دو رشہوار") میں پلاٹ واقعات کی رفتار اور ہیروئن کے کریکٹر کے ساتھ ساتھ ترقی پاتے رہتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی معاشرت کے متعلق جو ناول ہیں ان کے پلاٹ پہلے ہی تیار کر لئے گئے ہیں اور پھر ان کے مطابق کریکٹر لے گئے ہیں "صبح زندگی"، "اور شام زندگی" سب سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

بعض ناولوں کے پلاٹ بظاہر پیچیدہ معلوم ہوتے ہیں مگر دراصل ایسا ہے نہیں۔ ہم لوگ اسلامی تاریخ سے اسقدر نابلد ہیں کہ جب کبھی قدیم واقعات ہمارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں تو ہمکو ان سے الجھن سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ ناول نگار کا قصور نہیں ہے بلکہ ہماری لاعلمی سے اس کا پلاٹ کسی قدر گنجلک معلوم ہونے لگتا ہے۔ بہر حال پلاٹ میں مولانا نے واقعات اور اپنے افراد ناول کے تعلقات کو ہر وقت اپنے پیش نظر رکھا۔ لیکن چونکہ اسلامی تاریخ کے وہ اوراق جو تبلیغ اسلام سے متعلق ہیں جنگ و جدال سے پُر ہیں اسوجہ سے مصنف کو مجبوراً ان تاریخی واقعات کو بھی بیان کرنا پڑا لیکن اسمیں بھی مولانا نے غیر ضروری واقعات کو ہوشیاری سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند ناولوں کے علاوہ مولانا کے تمام ناولوں میں ہیروئن کے کردار زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ ہیرو صرف کہیں کہیں نمودار ہو جاتا ہے۔ انکے تاریخی ناولوں کی بھی یہی خصوصیت ہے۔ "ماہ عجم" "دُرِ شہوار" وغیرہ ان کے تاریخی ناولوں کا یہی حال ہے۔ ان کے ناولوں میں اشاعت اسلام کے علاوہ "حسن و عشق کی جنگ" بھی آپ کو جگہ جگہ ملے گی۔ ایسی لڑائیاں ہیروئن ہی کی وجہ سے ہوئی ہیں۔

مولانا کے سماجی ناولوں کی ہیروئن دو طرح کی ہیں۔ مگر دونوں اپنے اپنے ارادوں میں آخر تک قائم رہتی ہیں۔ یہ رسوم کی شکار رہیں۔ اسکی بدولت اکثر روٹیوں تک کو محتاج ہیں اپنے طرف سے وہ مذہب کی سختی سے پابندی کرتی ہیں۔ بعض کردار ایسے بھی ہیں جو مغربیت کے زیر اثر ہیں مگر زمانے کی ٹھوکریں کھا کر وہ پھر راہ راست پر آ جاتی ہیں "ستونتی" کی ہیروئن سلیقہ شعار تعلیم یافتہ شجاع اور وفادار ہے۔ مولانا راشد الخیری اسی طرح کی ہیروئن "ہر مسلمان گھر میں دیکھنا چاہتے تھے" مولانا کے ناولوں میں ہر کردار کا نفسیاتی تجزیہ بھی موجود ہے۔ بعض معترضین کا خیال ہے

کہ ان میں کرداری ارتقا نہیں دکھایا گیا ہے لیکن "صبح زندگی" اور "شام زندگی" میں بچپن سے لیکر مرتے دم تک کے واقعات پیش کئے گئے ہیں اور وقتی تبدیلیاں اور تمام انقلابات بھی جو بچپن سے بڑھاپے تک ہر عورت میں پیدا ہوتے رہتے ہیں بیان کرئے گئے ہیں۔ اس ناول میں مولانا نے کردار نگاری کی بہترین مثال پیش کر دی۔ اگر مولانا کو اپنے دوسرے ناولوں میں اس قدر وضاحت کے ساتھ کردار نگاری کا موقع نہیں ملا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کے یہاں یہ عنصر مفقود ہے۔ اس سے وہ عاجز تھے۔ وقتی اور ذیلی کردار بھی سب اپنے اپنے موقع اور محل سے نظر آتے ہیں اور اپنی جداگانہ وسعت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر ناولوں کے کرداروں میں یکسانیت پیدا ہو گئی ہے مگر خیال رہے کہ انہوں نے پچاس سے زیادہ ناول لکھے ہیں۔ جملہ کرداروں میں یگانگت کا پیدا ہونا تعجب کی بات نہیں۔ یہ بلکہ ایک قدرتی بات ہے۔

تاریخی ناولوں میں کہیں کہیں پر دو ایک نام دو مختلف ناولوں میں استعمال ہوا ہے مگر اس میں مجبوری یہ ہے کہ تاریخی ناموں میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

تاریخی ناولوں میں لباس کو خاص اہمیت حاصل ہے مسلمان مختلف لباسوں میں نظر آتے ہیں اور عیسائی مختلف یعنی ایک ناول ہی کی ہیروئن حسب موقع مختلف لباسوں میں نظر آتی ہے۔

مولانا کے ناولوں میں اجتماعی کردار نگاری کے موقع بھی بکثرت آتے ہیں دراصل جب کبھی مولانا عورت ذات کے متعلق کوئی بات لکھتے ہیں تو کبھی کسی ایک عورت پر نظر نہیں رکھتے۔ بلکہ کل طبقہ نسواں پر لحاظ کر کے اظہار خیالات کرتے ہیں اسی طرح جب وہ کسی فوج کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی ہر خوبی اور خصوصیت پر نظر ڈالتے ہیں۔ اکثر مقامات پر مولانا اجتماعی کردار نگاری کے سلسلے میں انفرادی کریکٹر کی طرف بھی چلے گئے ہیں مگر اس میں مولانا کی کوئی خامی نہیں ہے کیونکہ انفرادیت ہی سے اجتماعی زندگی وجود میں آتی ہے۔

یہ ضروری ہے کہ مولانا راشد الخیری مکالمہ میں ڈاکٹر نذیر احمد سے ہمسری نہیں کر سکتے۔ جزئیات میں وہ ان سے بڑھے ہوئے ہیں، لیکن طوالت تقریروں میں الفاظ کی چستی باقی نہیں رہتی۔ مکالمہ میں انہوں نے سوسائٹی کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ ان کے مکالمے موضوع کے مطابق ہیں۔ ان میں بیکار باتیں نہیں ہوتیں لیکن جب وہ اپنے کرداروں سے طول طویل لیکچر دلوانے لگتے ہیں اس وقت بیشک طوالت ہو جاتی ہے۔

بحیثیت علامہ راشد الخیری کا فلسفۂ حیات اسلامی اصولوں پر کاربند رہنا ہے۔ انکی

رائے میں ہر عورت اور مرد کو ان پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ روزہ نماز، خلق، سچائی، محبت و یگانگت وغیرہ ہر مسلمان مرد اور عورت کے لئے ضروری ہیں۔ دوسرے ایک مسلمان کو مرد ہو یا عورت اپنے تمام فرائض کو انتہائی ایمانداری اور دیانتداری سے انجام دینا چاہیئے تاکہ وہ خداوند عالم کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔ وہ مصیبت زدگان کی امداد، یتیموں کی سرپرستی، بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک کی قدم قدم پر تلقین کرتے ہیں یہی ان کا پیغام ہے جسکو انہوں نے ناولوں کے ذریعہ اپنے ناظرین تک پہونچایا ہے۔ غرض موضوع کے لحاظ سے مولانا راشد الخیری نے شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی کی پیروی کی ہے اور انکا انداز بیان بھی بہت کچھ مولانا سے ملتا جلتا ہے۔ درحقیقت اُنہوں نے ابتداء میں مولانا کے طرز کی پیروی کی تھی مگر رفتہ رفتہ انکا ایک اسلوب خود بخود علیحدہ ہوگیا۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں دلی کی ٹھیٹ زبان استعمال کی ہے نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"بیوی ہوئی کرو، ان ہوئی نہ کرو۔ بیٹی جب میکے سے رخصت ہوئی تو اسکو سسرال آباد کرنی ہے۔ دہیں رہنا، وہیں بسنا ایک تم انوکھی بیٹی نہیں ہو۔ دنیا جہان کی بیٹیاں جاتی ہیں۔ امیروں کی بھی اور غریبوں کی بھی، بڑی بڑی سونے جوڑنے والیاں پھٹے پرانے پہنتی ہیں اور اُف نہیں کرتیں۔ تم نے کیا شانہ ہوگا۔ "لائے سجنوں کی بیٹیاں رکھیں جو پنچوں کی لاج"

دہلی کی بیگماتی زبان پر مولانا کو خاصہ عبور حاصل تھا۔ مصنف "اُردو کے اسالیب بیان" نے مولانا کی زبان اور اسلوب بیان کی تعریف کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے :۔

" ان کی تصانیف کے وہی پارے زیادہ قابل قدر ہیں جن کی باعث انہیں مصور غم کا خطاب ملا ہے۔ اور جو بنی نوع انسان کی ایک ہی صنف اور پھر اس صنف کی فطرت کے ایک خاص پہلو یعنی رنج والم کی ترجمانی کرتے ہیں"

اکثر مولانا موضوع کے لحاظ سے اپنے اسلوب بیان میں تبدیلیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً "ماہِ عجم" میں ان کا طرز بیان بدلا ہوا ہے جس سے مولانا کی اُردو زبان پر قدرت کا اظہار ہوتا ہے مگر اس طرح نہیں تصنع اور بناوٹ کا گزر ہوگیا ہے۔

انکی زبان میں دِلی کے بیشمار محاورات استعمال ہوئے ہیں۔ ضرب الامثال بھی بکثرت آئی ہیں۔ مگر زبان دلی کی خاص بیگماتی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ تاریخی ناولوں میں مولانا مرحوم نے دلی کی ٹکسالی زبان نہیں استعمال کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ناولوں کے لکھتے وقت وہ ٹھیٹ زبان بالکل بھول گئے۔ بہرحال مولانا کی وفات سے اُردو کا ایک بڑا مصنف اور طبقۂ نسواں کا سچا ہمدرد اٹھ گیا؟

نسیم سحر

(جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی)

آغوشِ شب سے نکلی پیارے وطن میں آئی پہلی کرن سے پہلے صحنِ چمن میں آئی
آئی ہنسی گلوں کو بے اختیار آئی باغِ جہاں میں گویا روحِ بہار آئی
کہنے کو تو فلک پر رہتے ہیں گھر ہے میرا لیکن یہ واقعہ ہے ہر جا گزر ہے میرا
اڑتا ہے میرا پرچم فردوس کے چمن میں آنکھیں بچھی ہوئی ہیں تاروں کی انجمن میں
بھرتا ہے دم صبحدم گلشن تمام میرا منہ کھولتی ہیں کلیاں لے لے کے نام میرا
دنیا کی خاک میں نے بیتاب چھان ڈالی لیتی پھری تلاشی پتوں کی ڈالی ڈالی
پاکر ذرا اشارہ شبنم کی چشم تر سے بادل سے آسماں پر کہنے گئی کہ برسے
پھولوں کے کان اینٹھے غنچوں کے منہ کو کھولا سبزہ کو گدگدا کر دامن کہیں ٹٹولا
موجوں میں لوٹے گل کے دریا بہا رہی ہوں شبنم کے آنسوؤں کے موتی لٹا رہی ہوں
ہر صبح گلستاں میں پھولوں سے کھیلتی ہوں لیکن کڑی بھی ہنسکر کانٹوں کی جھیلتی ہوں
شیدائے رنگ و بو ہوں بیتاب آرزو ہوں روزِ ازل سے یونہی سرگرم جستجو ہوں
گلہائے تر جہاں کے ہیں میرے دیکھے بھالے ایسا ملا نہ کوئی کانٹا مرا نکالے
پھولوں کے پیرہن سے اس گل کی بو نہ آئی سنبل کے گیسوؤں میں ویسی مہک پائی
ابتک یہی خلش ہے میرے دل و جگر میں اتنی بدل گئی ہوں آتی نہیں نظر میں

شبنم جو دیکھ پاتی رو رو کے جان کھوتی؟
اے کاش چشم نرگس تیرے زبان ہوتی!

واردات

از حضرت فروغ علوی کاکوروی بی اے

ترکِ الفت تو کر چکا ہوں مگر اب بھی وہ یاد آئے جاتے ہیں
اے وہ کہ مبتلائے الم جس نے کر دیا اب بھی تیری نگاہ کا امیدوار ہوں
دیکھتا ہوں تمہیں اور دیکھ کے کھو جاتا ہوں جاگتے جاگتے اک بار میں سو جاتا ہوں

حضرت برق مرحوم

(از منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی)

پچھلے دو تین سال کے اندر موت کے ناہنجار ہاتھوں نے اُردو علم و ادب کے کتنے محسنوں کو ہم سے چھین لیا۔ ریاض، رواں، عزیز، [illegible] یکے بعد دیگرے راہگرائے عالم جاوداں ہوگئے۔ ابھی ان باکمالوں کی دائمی جدائی کا صدمہ دلوں سے بھولا نہ تھا کہ علامہ راشد الخیری نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں اور حال میں حضرت برق دہلوی کی ناگہانی وفات نے اور بھی غضب ڈھا دیا۔

۵ فروری ۱۹۳۶ء کو آپ اپنے ایک شاگرد کے اصرار سے ایک شادی کے سلسلے میں بال بچوں کے ساتھ پانی پت تشریف لیگئے ۱۳ فروری کی صبح کو دلّی واپس آنیوالے تھے لیکن مشیت ایزدی کچھ اور ہی تھی۔ ۱۲ فروری کی شب آپکے لئے شب قیامت ثابت ہوئی۔ ۱۲ بجے رات کے دفعتاً ہچکی پیدا ہوئی اور قلب کی حرکت بند ہونے لگی علاج و معالجہ کا بندوبست بھی نہ ہونے پایا تھا کہ آن واحد میں اس باکمال شاعر نے نہایت خاموشی کے ساتھ موت کے نہ ٹلنے والے فرمان کے سامنے سر جھکا دیا۔ افسوس ؎

عمر برق و شرار ہے دنیا کتنی ناپائدار ہے دنیا

منشی مہاراج بہادر برق کا نام اور کلام اُردو شاعری کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آپ کی زندگی ذاتی استعداد کا بہترین نمونہ تھی۔ اوائل عمر ہی سے آپ نے ترقی کرنے کی انتہائی کوشش کی اور اسمیں شک نہیں کہ ادبی اور نجی دونوں حیثیتوں سے آپ نے حتی الامکان کافی ترقی کی۔

جناب برق مرحوم کے حالات مختصراً رواں مرحوم نے آپکے مجموعہ نظم یعنی "مطلع انوار" کے مقدمے میں درج کئے ہیں۔ خمخانہ جاوید میں بھی آپکا ذکر ہے۔

مرحوم کا سال پیدائش ۱۸۶۴ء اور وطن خاص دلّی ہے آپکے آباواجداد مقام سکیٹ ضلع ایٹہ کے رہنے والے تھے۔ بقول حکیم اسد علی خاں صاحب مضطر دہلوی، شاعری مرحوم کیلئے بزرگوں کا ایک متبرک ورثہ تھی۔ آپکے والد منشی ہرنرائن داس صاحب حسرت دلّی کی بزم سخن کے ایک ممتاز رکن تھے آپکے نانا رائے دولت رام صاحب جو عبرت تخلص کرتے تھے۔ ایک بلند پایہ ادیب، خوش فکر شاعر صاحب دیوان اور خاقانی ہند ذوق دہلوی کے تلامذہ میں تھے۔

جناب برق کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ راقم السطور سے فرمایا کرتے تھے کہ پہلے انکا کچھ اور تخلص تھا۔ لیکن ایک موقع پر جب آپکو میرے والد مرحوم ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد صاحب اُفق سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ تو وہ جناب برق کی طباعی، ذہانت اور خوشگوئی سے بہت متاثر ہوئے لیکن آپ کا تخلص پسند نہ آیا۔ چنانچہ انہیں کے ایما سے آپنے برقؔ تخلص اختیار کیا۔

اس تخلص میں ایک خاص خوبی ہے۔ جن دیگر شعرا نے یہ تخلص اختیار کیا ہے انہیں سے اکثر جناب برق ہی کی طرح آسمان سخن پر خوب چمکے ہیں۔ لکھنؤ کے مشہور استاد محمد رضا برق نیز منشی جوالا پرشاد برق کے نام نامی سے کون واقف نہیں ہے۔ اس زمانہ میں بھی جناب برق شاہجہانپوری اور جناب برق غازی آبادی نہایت کامیاب شعرا میں ہیں۔ مگر دلی کے منشی مہاراج بہادر برق کا کلام ان تمام باکمالوں کے بمقابلہ ایک خصوصیت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ بقول روآں مرحوم اس اسکول سے تعلق رکھتے تھے جس کی بنا حالی اور آزاد نے ڈالی تھی۔ آپ کا سلسلہ تلمذ افسر الشعراء حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی کے ذریعہ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی سے ملتا ہے اور آپکی ایک آدھ غزل کو آخر الذکر سے اصلاح پانے کا شرف حاصل ہو چنانچہ ایک طرف حالی و آزاد کی روش اور دوسری طرف داغ کے رنگ سخن کے ملنے سے ایک نئی چیز پیدا ہوئی اور اس کا ظہور برق مرحوم کی ذات سے ہوا۔ یوں تو دلی کے موجودہ شعرا میں اور بھی حضرات اپنے اپنے رنگ کے استاد ہیں لیکن دور جدید کے تشنہ کامان سخن کی نظریں برق مرحوم ہی کی طرف اٹھتی تھیں کیونکہ وہ داغ کے اسکول کی شگفتہ کلامی کے ساتھ ساتھ جدید خیالات کی ترجمانی فرماتے تھے۔

برق صاحب فرمایا کرتے تھے کہ شروع شروع میں وہ منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی کے کلام سے بہت متاثر ہوئے، اور طرز جدید کی شاعری کی طرف متوجہ ہونیکا سبب بھی زیادہ تر سرور مرحوم ہی تھے۔ دوسری طرف مغربی شعرا مثلاً ورڈ سورتھ، کیٹس، شیلی اور براؤننگ کے کلام کے مطالعہ نے انکی شاعرانہ نگاہ کو اور بھی وسیع بنا دیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ برق مرحوم کو غزل اور نظم دونوں میدانوں میں یکساں کامیابی نصیب ہوئی۔ انکا کلام کیا بلحاظ حسن زبان اور کیا بلحاظ تخیل دور جدید کے کامیاب سے کامیاب شاعر کے کلام سے ٹکر لیتا ہے۔ اردو شاعری کی جس ارتقائی منزل پر اقبال، محروم، چکبست، سیماب، جگر، اور عزیز مرحوم پہونچ چکے ہیں۔ وہی جناب برق دہلوی کے حصہ میں آئی تھی۔

آپ کی ناوقت وفات سے اردو شاعری کو جو نقصان پہونچا ہے اسکی تلافی ناممکن ہے۔ دیگر

خصوصیات کے علاوہ برق کے کلام کی ایک خصوصیت شکوہ الفاظ ہے۔ بندش کی چستی موضوع کے حسب حال الفاظ کا مناسب انتخاب ندرت بیان اور جدت آفرینی یہ تمام باتیں برق کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ زبان کا لطف بھی بخوبی ہے اس لحاظ سے مرحوم خواجہ آتش کے پیرو تھے۔ آپ کے دل میں آتش اور انیس کے کلام کا خاص احترام تھا۔ آپ کی غزلوں میں داغ سی شگفتہ بیانی کے ساتھ ساتھ آتش اور نظموں میں انیس کا رنگ صاف جھلک رہا ہے۔ تشبیہات آپ کے کلام کی جان ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ صائب کے کلام کے دلدادہ تھے اور غزل میں نظیری کو اُستاد مانتے تھے۔ آپ کے نظموں کے مجموعہ "مطلع انوار" میں وہ تمام نظمیں شامل ہیں جو ۱۹۲۹ء تک لکھی گئی تھیں۔ بعد کے کلام میں ایک خاص تبدیلی نظر آئیگی۔ اگرچہ جناب برق اپنی فطری زندہ دلی اور خوش طبعی کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اور وہ ہر وقت بشاش رہنے کی کوشش کرتے تاہم اسطرف آپ افسردہ خاطر رہا کرتے تھے جسکا اثر رفتہ رفتہ آپکی صحت پر بھی نمایاں تھا۔ اس کا اصل باعث آپکی صاحبزادی جگراج کنور کی ناوقت وفات تھی۔

آپ بڑے سریع الحس تھے۔ ذراسی بات سے متاثر ہو جاتے اور ہر وقت سفر آخرت کے لئے تیار رہتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا سے دل برداشتہ ہو گئے ہیں چنانچہ یہ ذہنی کیفیت آپ کے کلام سے بھی ظاہر ہونے لگی تھی اور دفتر تیج کے ایک مشاعرہ میں انکی ایک نظم

"گئی شباب کی رنگینیاں شباب کے ساتھ"

نے تمام سامعین پر رقت کا عالم طاری کر دیا تھا۔

رواں مرحوم نے "مطلع انوار" کے مقدمے میں آپکے کلام کے متعلق تفصیلی بحث کی ہے۔ جناب اصغر گونڈوی نے بھی آپکی نظموں پر محققانہ نظر ڈالی ہے۔ ہم انکی چند تازہ نظمیں اور غزلیں لیکر انکے کلام پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

جناب برق مرحوم کی غزل میں جہاں ایکطرف عشق و حسن کی پر لطف رنگینیاں "سحر سامری" کا کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں وہاں دوسری طرف فلسفۂ معرفت اور اخلاق کی تعلیم بھی موجود ہے اور ہر شخص اپنی اپنی پسند کے مطابق اس جواہر خانہ سے جواہرات چن سکتا ہے۔ اسمیں موتی بھی ہیں۔ لعل بھی ہیں۔ زمرد اور نیلم بھی ہیں۔ دنیائے حسن و عشق کے مناظر دکھاتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

دل کی بساط کیا صفِ مژگاں کے سامنے — ایک قطرہ خوں ہے جنبشِ پیکاں کے سامنے
جنت ہے ہیچ محفلِ جاناں کے سامنے — کیا قدر خار زار گلستاں کے سامنے



منشی مہراج بہادر برق دہلوی مرحوم

لیکن وجود عالم کے عمیق راز سے بھی اُلجھکر انسانی عقل و فہم کی بے بضاعتی تسلیم کرتے ہیں ؎

کھلتی نہیں حقیقتِ دنیائے بے ثبات | اک خواب سا ہے دیدۂ حیراں کے سامنے

اسکی بے ثباتی کے متعلق فرماتے ہیں ؎

پیوندِ خاک خاک کے پتلے ہیں رات دن | ہستی ہے گردِ گورِ غریباں کے سامنے

اور پھر اپنے دل کے تاثرات سے مجبور ہو جاتے ہیں ؎

کسکو ہے ہست و بود کے انجام پر نظر | کچھ سوجھتا نہیں غمِ دوراں کے سامنے

تغزل کا رنگ بھی اپنی جگہ پر نمایاں ہے ؎

دیتا ہے آگ میرے نشیمن کو باغباں | میں ہوں اسیرِ دام گلستاں کے سامنے

شاعرانہ خودستائی بھی جو بقول مرحوم شاعری کے نشے کے بمنزلہ ہے۔ موجود ہے کہتے ہیں ؎

گلزار میں ہے بلبلِ رنگیں نوا خموش | پھیکا ہے رنگ برقِ سخنداں کے سامنے

انسانی حیات غرض و غایت سے خالی نہیں ہوتی۔ اور جناب برقؔ کی نظر میں ؎

ہر نفس شکرانۂ معبود ہونا چاہئے | زندگی کا کچھ نہ کچھ مقصود ہونا چاہئے
کعبہ و بتخانہ کیوں مسجود ہونا چاہئے | لاتعیّن کس لئے محدود ہونا چاہئے
عالمِ اسباب ہے یک جلوۂ حسنِ ازل | ذرہ ذرہ کعبۂ مقصود ہونا چاہئے
جوشِ ہمت کا تقاضا ہے اک اک گام پر | صرف راہ منزلِ مقصود ہونا چاہئے

پھر ؎ رکھ لے پہلو میں بے لوث غبارِ آرزو | دل کا آئینہ زنگ آلود ہونا چاہئے،

شوخ کلامی کا یہ عالم ہے۔ کہ ؎

برق میخانہ میں ہوگی منعقد بزمِ سخن | آپکو تو کم سے کم موجود ہونا چاہئے

یک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لذتِ گویائی مستور خاموشی میں ہے | ایک محویت کا عالم خود فراموشی میں ہے
کھیل قسمت کے زمانہ کی دورنگی دیکھئے | کوئی صرفِ غم ہے کوئی شغلِ مے نوشی میں ہے
خود حجابوں سے نہاں ہے اور جلوے بے حجاب | حسنِ مطلق تیری روپوشی بھی روپوشی میں ہے
زندگی کی کشمکش کا راز و مفہوم سکوں | دن کے ہنگاموں میں ہے راتوں کی خاموشی میں ہے

عالمِ حسرت و یاس میں بیچارگی کے باعث قلبِ انسانی کی حالت ناگفتنی ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

حسرت آلودہ نگاہیں لب پہ ہے مُہرِ سکوت | برقؔ دردِ عشق کی تصویر خاموشی میں ہے

برق ہمہ تن برق تھے۔ کلام میں تڑپ ہے۔ اضطراب ہے۔ شوخی ہے۔ کہتے ہیں:۔

ادھر ذوق تماشا اور ہے حسرت فزوں وہ بھی
ادھر اک بے نیازی دشمن صبر و سکوں وہ بھی

اسی کو عشق میں کیا اضطرابِ شوق کہتے ہیں
کشیدہ جتنے تم ہوتے ہو۔ ہوتا ہی فزوں وہ بھی

نگہ سے جان لے لینا اشارے سے جلا دینا
کرشمہ تیرا اک یہ بھی ہے چشم پرفسوں وہ بھی

آخری شعر ان شعرا ہندی دوہے کا پرتو معلوم ہوتا ہے ؎

امی ہلاہل مدھ بھرے سویت شیام رتنار
جیت مرت جھک جھک پرت جہیں چتوت اک بار

اور پھر اپنے حقیقی فلسفیانہ انداز کی طرف مائل ہو جاتے ہیں ؎

حیات اک رمز پنہاں ہے فنا اک راز سربستہ
حد ادراک انسانی سے ہے یہ بھی بروں وہ بھی

ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں انداز بیان قابل قدر ہے

نظارہ گم ترے جلووں کی آب و تاب میں ہے
ترا جمال ہے بے پردہ یا حجاب میں ہے

نظر نظر تری ڈوبی ہوئی شراب میں ہے
جہان کیف تری چشم نیم خواب میں ہے

گلوں کو تازگی بلبل کو خوش نوائی دی
کسے کلام ترے حسنِ انتخاب میں ہے

اور پھر دنیا کی ناپائداری پر نظر ڈالتے ؎

لئے ہیں ہستیِ فانی ہیں سانس گنتی کے
شمار عمر دو روزہ کسی حساب میں ہے

بقائے زیست میں ہے رازِ ہستیِ فانی
یہ خواب وہ ہے کہ تعبیر جسکی خواب میں ہے

شوخی طبع یہاں بھی اپنا کام کر رہی ہے ؎

اٹھا وہ ابر کرم۔ برق میکدے چلئے
کہ لطف بادہ کشی دامن سحاب میں ہے

عشق اور حسن دنیا کی جان ہیں۔ کہتے ہیں ؎

انھیں دونوں کے جلووں سے جہاں فردوسِ منزل ہے
محبت شمع محفل حسن مطلق رنگ محفل ہے

کرشمہ سازی حسن نظر دنیا کی محفل ہے
اس آئینہ میں عکس جلوہ نیرنگی دل ہے

اسی زمین میں بعض اشعار کیا خوب ہیں:۔

ہیں لبریز نوائے راز پردے ساز ہستی کے
کہ پیدا ذرے ذرے سے صدائے ربطِ دل ہے

محرک کوشش برباد ہے سعی مکرر کی
مرا یہ داغ ناکامی چراغ راہ منزل ہے

داغ ناکامی کو چراغ راہ منزل قرار دیکر کس خوبی سے درس عبرت دیا ہے۔

بیاضِ صبح پر ہے نقش سوز و ساز کا منظر
شکستہ ہیں پر پروانہ کشتہ شمع محفل ہے

عبث بیتاب ہے وقفِ طلسم آرزو ہو کر
سکونِ قلب ترکِ لذتِ دنیا کا حاصل ہے

جہاں معرفت ہے گو بظاہر پارۂ گل ہے
فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا تارا مرا دل ہے

اور پھر شاعرانہ مستی سے جھوم کر کہتے ہیں ؎

فصاحت سے پڑھوں میں برقؔ یا رنگِ ترنم سے
مرے ہر شعرِ تر میں نغمۂ فردوس شامل ہے

شاعروں میں مرحوم غزلیں تحت اللفظ پڑھتے تھے مگر اس انداز سے تمام مشاعرہ پر چھا جاتے تھے آخر میں انکی غزلوں کا رنگ بالکل بدل گیا تھا اور تمام تر اشعار قریب قریب معرفت و حقیقت کے رنگ میں ڈوبے ہوتے تھے تر گونڈوی کی غزل جس زمین میں اپنا جواب نہیں رکھتی اسی میں برقؔ نے بھی ضیا پاشی کی ہے :-

دل جو صورت گر معنی کا صنم خانہ بنے
آنکھ جس شے پہ پڑے جلوۂ جانانہ بنے

آتشِ عشق بہر رنگ ہے جاندادۂ حسن
سرد ہوجائے جو آگ تو پروانہ بنے

تا درِ یار پہونچتا ہے وہ خود رفتۂ شوق
اپنی ہستی سے جو اس راہ میں بیگانہ بنے

اتنے ہی ہوگئے ہم منزلِ عرفاں کے قریب
جس قدر رسم و رہِ دہر سے بیگانہ بنے

ظرف مے ٹوٹ کے بھی ہونے نہ پائے بیکار
ہو شکستہ کوئی شیشہ تو وہ پیمانہ بنے

سعیِ ناکام سے میں ہاتھ اٹھاؤنگا نہ برقؔ
میری بگڑی ہوئی تقدیر بنے یا نہ بنے

میرے سامنے اسوقت مرحوم کی چند غزلیں ہیں اور انہیں کے اقتباسات اس مضمون میں پیش کئے گئے ہیں مگر غزلیات کا مجموعہ بہت کافی ہے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ تمام غزلیات کا ایک علیحدہ دیوان "تجلیات برقؔ" کے نام سے ترتیب دیکر جلد شائع کردیا جائے۔ انکی باہمت رفیقۂ حیات خود اس مجموعہ کو شائع کرنے کیلئے تیار ہیں، بہرحال برقؔ کا کلام اردو کے تمام مشہور رسائل و اخبارات میں شائع ہوچکا ہے اسلئے انکے متعلق زیادہ لکھنا بھی بے سود ہے۔ یہاں میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ برقؔ نے اپنے مخصوص رنگ میں کسطرح غزل ایسی نازک اور لطیف ترین صنفِ سخن کو دلاویز اور پُرکیف بنا دیا ہے۔ آپکا کلام پڑھکر طبیعت شگفتہ ہوجاتی ہے اور دراصل ناظرین کو ایک خاص تازگی اور فرحت محسوس ہونے لگتی ہے۔

برقؔ کی نظموں کا پایہ نہایت بلند ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر انہوں نے قلم نہ اٹھایا ہو

مگر ابتدائی نظموں میں پہلا سا جوش نہیں پایا جاتا ہے راقم سے کسیقدر بے تکلفی ہونیکے باعث اکثر کلام کے متعلق تبادلہ خیالات ہوا کرتا تھا اور خود انکو میرے خیال سے اتفاق تھا۔

زمانہ کانپور اور تیج دلی سے جناب برق کو خاص اُنس تھا۔ پچھلے دنوں زیادہ تر نظمیں تیج دیکلی میں شائع ہوئیں۔ اسکے کرشن نمبر میں تو مرحوم نے کئی لاجواب نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں "دروپدی کا چیر" "تلا دان"۔ "شباب اور گوپی غریباں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بعض نظموں کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ گراموفون کے ریکارڈوں پر قلمبند ہوگئی ہیں۔ "دان دیر کرن" اس قسم کی ایک نظم ہے۔

دروپدی کے چیر کے مندرجہ ذیل شعر:۔

دروپدی کو ابھی بیگانۂ داماں کردو
شمع کو پردۂ فانوس سے عریاں کردو

کا دوسرا مصرعہ تشبیہ کے لحاظ سے فیضی کے اس شعر کے ہم پلہ ہے

تنش را پیرہن عریاں ندیدہ
چوں جاں اندر تن و تن جاں ندیدہ

یہ شعر کسقدر پُر درد ہے:۔

چشم خورشید نے بھی جسکو نہ عریاں دیکھا	اس نے تقدیر سے یہ روز پریشاں دیکھا

"چیر کھینچنے کا نقشہ بھی کتنا دل ہلا دینے والا ہے

تیرا لالہ کی جو سنکٹ میں دیا ئے تے شنی	دیر پل بھر کی نہ بھتیا کے مٹانے میں لگی
پردے پردے میں ہوئے تھان پہ سو تھان بہم	پردہ پوشی کا ہوا غیب سے سامان بہم
بڑھ گیا چیر پلک مارتے بے حد وحساب	دیکھنے والوں کی آنکھوں پہ تھا داماں حجاب
کھینچتے کھینچتے شل دست ستمگار ہوئے	فرش پر چیر کے انبار کے انبار ہوئے
کھینچے چیر کو رہ رہ کے وہ بے طور بڑھا	جسقدر چیر بڑھا اور بڑھا اور بڑھا

"تلا دان" میں ستیہ بھاما کی زبان سے کسقدر شیریں کلامی کیساتھ فرمایا ہے ؎

ان کا میں حسن عقیدت سے تلا دان کروں	پران پیارے کو نئے رنگ سے مہمان کروں

اور پھر "تلا دان" میں اپنی ناکامی پر رکمنی جی سے ست بھاما کا یہ کہنا بھی کیا خوب ہے

کسی تدبیر سے پورا ہو تلا دان کہیں	روٹھ جائیں نہ گھر آئے ہوئے مہمان کہیں

رکمنی جی بھی پریم کے جذبات سے متاثر ہوکر ست بھاما سے کہتی ہیں

سنکے بولیں کہ بہن تم بھی ہو نادان بہت
حسن صورت میں ہو گیا گرانجان بہت

سنگر بڑوں سے سری کرشن تلا کرتے ہیں؟
یوں کہیں پریم کے جوہر بھی کھلا کرتے ہیں!

میں ابھی ان کا تلادان کئے دیتی ہوں
کار دشوار کو آسان کئے دیتی ہوں

لعل و گوہر سے کیا پلۂ میزاں خالی
دنیوی جاہ و حشم کا کیا ساماں خالی

ایک تلسی جی کے پتے پہ لکھا کرشن کا نام
رکھدیا پھر اسی پلڑے میں جو خالی تھا تمام

برگ تلسی کے اثر سے اٹھے یکسر پلڑے
تل گئے نوک پہ کانٹے کے برابر پلڑے

دونوں عالم کا جو تھا بار اٹھانے والا
سر انگشت پہ پربت کا نچانے والا

برگ تلسی کی لطافت سے سبکسار ہوا
تل گیا چشم زدن میں نہ گرانبار ہوا

پریم مورت کو نہیں مال و مدارات کی قدر
ہے مگر پریم میں ڈوبے ہوئے جذبات کی قدر

آخری تین شعر برق کے کمال فن کی بین دلیل ہیں۔ دیوالی کے متعلق آپ کی فصیح و بلیغ نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

غیرتِ محفل انجم ہے چراغاں کی بہار
جلوہ افزا ہے شب نورِ بداماں کی بہار

قابل دید ہے ایوان و شبستاں کی بہار
برق نظارہ ہے اب عالم امکاں کی بہار

روز روشن ہے خجل۔ مہر کو حیرانی ہے
شب تاریک میں عالم ہمہ نورانی ہے

اسی نظم میں ایک جگہ فرمایا ہے:۔

آج بن باس سے واپس سری رام آئے ہیں
دیپ مالا نہ ہو کیوں ماہ تمام آئے ہیں

کوئٹہ کے زلزلے کی تباہ کاریاں برق مرحوم کے حساس دل کیلئے ناقابل برداشت تھیں آپکی نظم کے چند اشعار یہ ہیں:۔

اجل گرفتوں کی کھلنے نہ پائی خواب سے آنکھ
مکاں گر پڑے سوتے ہوئے مکینوں پر

یہ دم زدن میں قیامت بپا ہوئی کیسی
کہ ڈھیر خاک کے تپلے ہوئے زمینوں پر

یہ خوفناک تباہی مقام عبرت ہے
اجل کے بھیس میں آیا ہے زلزلہ کیسا

ہزاروں خاک کا پتلے ہو گئے صد حیف
اٹھا تھا قلب زمیں میں یہ ولولہ کیسا

دلی میں نشانتی کماری کے گذشتہ زندگی کے جو واقعات بیان کئے اس سلسلے میں آپنے مسئلہ تناسخ کے متعلق کیا خوب فرمایا ہے:۔

آواگون ہزاروں جنموں کی اک لڑی ہے — جو اپنی زندگی ہے۔ زنجیر کی کڑی ہے
ہے زیست کا تسلسل روزِ ازل سے قائم — زیرِ نگین فطرت یہ تا ابد ہے دایم
سیلِ روانِ ہستی ہر سمت جاوداں ہے — کیا وار پار اس کا اک بحرِ بیکراں ہے
بھرتا ہے از سرِ نو خالی ایاغ ہستی — ہوتا ہے برق روشن بجھ کر چراغِ ہستی

شاعر کے متعلق ارشاد ہے:۔

اسکے اشعار میں رنگینیٔ جذبات بھی ہے — کیف بھی درد بھی نغمہ بھی محاکات بھی ہے
حسنِ تاثیر بھی پرداز خیالات بھی ہے — لذتِ عشق بھی ہے معرفتِ ذات بھی ہے

ملہمِ غیب ہے خلاقِ معانی ہے یہ،
نکتہ آرائے موزِ ہمہ دانی ہے یہ،

موقلم ہے اسے درکار نہ پرکار سے کام — لے کا محتاج نہیں ہے یہ مغنیٔ کلام
غیب سے ہوتا ہے ہوتا ہے جو اسکو الہام — لبِ گفتار سے دیتا ہے یہ قدرت کا پیام

بحرِ معنی کا شناور ہے۔ گہر باشِ سخن
حسنِ فطرت کا مصور ہے یہ نقاشِ سخن

خودشناسی کے زیرِ عنوان درسِ عبرت دیا ہے۔ کہ:۔

جسم فانی جہان فانی ہے — نشۂ زیست سرگرانی ہے
نقش برآب زندگانی ہے — ٹوٹتے ہی حباب پانی ہے

بحرِ ہستی سے تو کنارا کر
ساحلِ موج کا نظارا کر

مائلِ جلوہ مجاز نہ ہو — غافلِ چشمِ امتیاز نہ ہو
ناشناسیٔ نوائے راز نہ ہو — حسنِ معنی سے بے نیاز نہ ہو

حق رسی مدعا شناسی ہے
خودشناسی خداشناسی ہے

شاید یہ نظم مرحوم کی آخری نظم ہے۔ محبی جناب برق نے ناچیز تنور کی بھگوت گیتا کے لئے

ایک منظوم تقریظ عنایت فرمائی تھی۔ افسوس اب ہم اس باکمال شاعر کے فیض کلام سے محروم رہیں گے۔

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برق مرحوم نے بحیثیت شاعر کے دنیا کو پیغام کیا دیا ہے۔ میرے خیال میں اس کا جواب انکی ابتدائی نظم "عمل خیر" سے ملتا ہے وہی آخر تک "خودشناسی" کی نظم میں بھی موجود ہے۔ برق سیاسی شاعر نہ تھے نہ انھیں اپنی زندگی میں انقلاب کے آثار دکھائی دیتے تھے اسی لئے وہ اس میدان میں خاموش تھے اور یہ خاموشی بھی مصلحت سے خالی نہ تھی۔

جذباتِ ناشاد

(پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ایم اے)

جسے لوگ کہتے ہیں زندگی یہ وہ شے نہیں جو مدام ہو
ہے جہاں کی ہستی عارضی اسے کس طرح سے قیام ہو

مرے دل کو تو نہی ہے آرزو کہ ہم ایک بار ہوں روبرو
میں زمیں پہ جب ہوں تڑپ رہا تو وہ جلوہ گر لب بام ہو

کوئی ہوگا سالک باخبر بھلا مجھکو اس سے ہے کیا غرض
اُسے ہو ضرورت راہبر جسے رسم و راہ سے کام ہو

میں ہوں تشنہ لب مجھے اس سے کیا کہ ہو دور بزم میں چل رہا
ہو کسی کے سامنے خم دھرا کہ کسی کے ہاتھ میں جام ہو

ہوئی شام تو ہوئیں منتظر مری آنکھیں صبح اُمید کی
ہوا دن تو دل میں یہ فکر ہے کہ الٰہی کب اُسے شام ہو

کوئی ہونگے لاکھ میں ایک دو مرے درد کا جنھیں درد ہو
مرا غم وہ جنس گراں نہیں جو قبول خاص و عوام ہو

کرے وار تیغ ادا جو اک تو بسک بھی جان کی بند ہو
چلے ایک برچھی نگاہ کی تو جگر کا کام تمام ہو

کہاں ایسی بزم نشاط ہے جہاں مست شام و سحر رہیں
کہاں ایسی مجلس انس ہے جہاں دور جام مدام ہو

کلامِ برق پر ایک نظر

(از مسٹر ستیش چندر طالب بی۔ اے۔ دہلوی)

ارادہ ہے کہ اُستاد مرحوم جناب برق دہلوی کی مذہبی نظموں کے متعلق ایک مختصر سا مضمون سپرد قلم کیا جائے۔ شاعر کا کلام خود اُسکا اپنا بہترین تعارف ہے۔ اس لیے بلا کسی تمہید مزید کے براہِ راست مضمون کیجانب رجوع کرتا ہوں۔

(برق صاحب نے "بھرت ملاپ" کے عنوان سے ایک بے نظیر نظم لکھی ہے چند اشعار پیش کرتا ہوں

حیات تازہ ملی سن کے مژدۂ جاں بخش
بھرت کی جان میں جان آگئی جو رام آئے
گلے لگانے کو یوں آئیں تینوں ماتائیں
کہ جیسے پیاس بجھانے کو تشنہ کام آئے
بھرت نے دوڑ کے خاک قدم رکھی سر پر
ہجوم شوق کا آنسو لیے پیام آئے
نہ نکلی بات بھی پوری برائے پرسش حال
لبوں تک آئے تو کچھ لفظ ناتمام آئے

پریم کا تحفہ" یا بھیلنی کے بیر کی سرخی کے عنوان سے یوں گہر افشانی کی ہے

بھگوان نے اخلاص و مدارات کو دیکھا
وارفتۂ دیدار کے جذبات کو دیکھا
کچھ ذات کو دیکھا نہ کچھ اوقات کو دیکھا
دیکھا تو فقط پریم کی سوغات کو دیکھا
ڈوبے ہوئے تھے بیر محبت کے جوش میں
خود پریم کے ساگر بھی ہوئے پریم کے بس میں

"گرو نانک کے چرنوں میں کیا خوب شردھانجلی پیش کی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے۔

شمع جاں افروز۔ لعلِ شب چراغِ معرفت
جلوہ پاشِ نورِ حق روشن دماغِ معرفت
بےخودِ توحید۔ سرمستِ ایاغِ معرفت
خضرِ منزل۔ سالک کُنجِ فراغِ معرفت
تیری ہستی تھی سراپا پردۂ سازِ لطیف
جسکے نغموں میں نہاں قدرت کا تھا رازِ لطیف
سب میں ایک اونکار کا جلوہ نظر آیا تجھے
شش جہت میں حُسن یکرنگ نظر آیا تجھے

رُوکشِ خورشید ہر ذرہ نظر آیا تجھے　　　قطرہ ہم پیمانۂ دریا نظر آیا تجھے
تھی نگاہِ حق نگر تیری حقیقت آشنا
منزلِ عرفاں تھا دل تھی آنکھ وحدت آشنا

گرو نانک کی تعلیم کا نظریہ جس اختصار اور جامعیت کے ساتھ نظم فرمایا ہے وہ آپکا ہی حصہ تھا کیا خوب کہا ہے

چشمِ عرفاں میں تری تھے کافر و دیندار ایک
جلوہ گر دیر و حرم میں تھا جمالِ یار ایک

"بانسری" کو موضوعِ نظم قرار دیتے ہوئے اُسے ان الفاظ سے مخاطب فرمایا ہے۔

اے کیفِ مجسّم! دلِ وارفتہ کی دمساز　　　اے جانِ ترنّم! ہمہ تن شعلۂ آواز
اے مایۂ صد سوز! طلسمِ اثر انداز　　　اے پیکرِ نیرنگِ نوا! زمزمہ پرداز
تجھ میں ہے لبِ پردہ درِ راز کا اعجاز
تو ساز کا اک ساز ہے اعجاز کا اعجاز

دیگر اوصاف کو مدِنظر رکھتے ہوئے بانسری کی اہمیت کو یوں نمایاں کیا ہے

کھلتا ہے نوا سے تری آغوش بھری ہے　　　رگ رگ میں تری آتشِ خاموش بھری ہے
ساغر میں ترے بادۂ سرجوش بھری ہے　　　بجلی کوئی بربادیِ ہوش بھری ہے
کیا بانس کی پوری میں ہیں تاثیر کے انداز
سحرِ نگہِ ناز کی تسخیر کے انداز

آگے چلکر بانسری کی خصوصیت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں۔

کوئل کی صدا اتنی دل افروز کہاں ہے　　　بلبل کا ترانہ عیش انداز کہاں ہے
دنیا کے کسی ساز میں یہ سوز کہاں ہے　　　نغمہ کوئی اتنا سبق آموز کہاں ہے
قدرت کا کرشمہ ہے تری سحر طرازی
تو کھولتی ہے رازِ حقیقی و مجازی

مستی و بیخودی کی کیفیات کو اس انداز سے نظم فرمایا۔

تصویر بنی گوپیاں خاموش کھڑی ہیں مخمور مئے عشق ہیں۔ مدہوش کھڑی ہیں
بنسی کی صدا پر ہمہ تن گوش کھڑی ہیں مشتاق ہیں۔ کھولے ہوئے آغوش کھڑی ہیں

گوکل کے گوالے نگہِ مہر ادھر بھی
کچھ اپنے پرستاروں پہ ہے تجھکو نظر بھی

کرشن بھگوان کو دعوت دیتے ہوئے یک عالم خود فراموشی میں یوں گویا ہوتے ہیں۔

اے مطرب نغمہ نواز آجا اے ساحر سحر طراز آجا
اے عقدہ کشائے مجاز آجا اے ساقیِ بادۂ راز آجا

دے مژدہ کیف دوام ہمیں
اے شیام! نہ رکھ ناکام ہمیں

اے حسن سراپا ناز آجا مشتاق کے محرمِ راز آجا
پھر چھیڑ دینا کوئی ساز آجا پھر قلب ہوں صرف گداز آجا

پھر نغمۂ روحانی سن لیں
کلہائے ریاضِ جناں چن لیں

پھر آنکھ ملا کر ساغر دے صہبائے طرب دل میں بھر دے
بیگانۂ ہوش و خرد کر دے اٹھ جائیں جو حائل ہیں پردے

بیخود ہوں خودی کی نوبت ہے
وحدت میں دوئی کی نوبت ہے

آخری بند اس کیف بیخودی کا ماحصل ہے جسکا لازمی نتیجہ وصل ہے۔

"کرشن بھگوان" کے عنوان سے جو بلند پایہ فلسفیانہ خیالات آپنے قلمبند فرمائے ہیں اُن سے ناظرین کو محروم رکھنا مناسب نہوگا۔ چند اقتباسات پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیں۔

نقش بندِ ہر یک پھر دونوں عالم سے الگ رنگ ہے نیرنگِ ہستی سے جداگانہ تیرا

اس سلسلے میں خود اپنا بھی ایک شعر پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ شاید حقِ توضیح ادا ہو جائے۔

ذرے ذرے میں ہے گو مین کے اسکا ہی ظہور دونوں عالم سے ہے پھر جلوۂ جانانہ جدا
بحرِ ہستی میں کنول کی طرح تر دامن نہیں ہوشمندِ خود فراموشی ہے دیوانہ تیرا

بھگوں کرشن کے بھگتوں کی بے لوثی کی یوں تصویر کھینچی ہے۔ یہی مفہوم ذرا وضاحت کے ساتھ بہ عنوان فلسفہ گیتا یوں نظم ہوا ہے۔

جب تک ہے گر سانس عمل کی ہو ضرورت — آزاد نہیں کرم سے مٹی کی یہ مورت
نشکام ہے لیکن رہے یہ کام کی صورت — آئینۂ دل کو نہ لگے زنگ کدورت

بے لوث کنول کی طرح رہ باغ جہاں میں
کثرت میں ہو وحدت کی تجلی دل و جاں میں

"جیسی جس کی بھاونا تیسا تس کو دیکھ" کے مفہوم پر ایک خوبصورت پرتو زبان اردو میں ملاحظہ فرمائیں۔

سب کی نظروں میں سماتا ہے بقدرِ شوقِ دید — چشمِ نظارہ میں ہے جلوہ جداگانہ ترا

"وراٹ روپ" کی تصویر دیکھیئے۔

قطرہ قطرہ بن گیا خمخانۂ وحدت اثر — جوشِ مستی میں ذرا چھلکا تھا پیمانہ مرا

آپکی نظم گنگا جی سے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ اسکے بارے میں تمہید کے طور پر کہنا کافی ہوگا کہ مذہبی جذبات کے علاوہ تواریخی حوالہ جات دیکر عوام میں حب الوطنی کے جذبات کے تلقین کی بھی کوشش کیگئی ہے۔

اے منبعِ تقدس! گہوارۂ تمدن — تھے فیضیاب تجھ سے آوارۂ تمدن
عہدِ سلف سے جاری ہے فیض عام تیرا — مستِ مئے حقیقت پیتے ہیں جام تیرا
دامن میں تیرے پنہاں خاکسترِ سلف ہے — گنجِ گہر نہاں ہے جسمیں تو وہ صدف ہے
مسکن ہے تو قدیمی اسلاف کا ہمارے — ڈالے رہے ہیں ڈیرے صدیوں ترے کنارے
تہذیب کی شعاعیں پھیلیں تری جبیں سے — آثار عہدِ زریں پیدا ہوئے یہیں سے
تھا شاندار کیسا دورِ کہن ہمارا — فردوسِ بر زمیں تھا گویا وطن ہمارا
مہرِ عروج اپنا نصف النہار پر تھا — وقفِ خزاں یہ گلشن اپنی بہار پر تھا
ہے تجھکو یاد از بر وہ داستاں ہماری — لہریں تری ورق ہیں تاریخ کے ہماری

روئے معاشرت کا غازہ ہے خاک تیری
پربت کی پاک دیوی ہر شے ہے پاک تیری

اب بھی ترے کنارے یوگی ہیں محوِ طاعت — گوشہ نشیں ہیں صدہا جویائے رازِ وحدت
ساحل پہ تیرے ہوتا ہے اژدہام اب بھی — سیراب تجھ سے ہوتے ہیں تشنہ کام اب بھی

جب وقت نزع سر پہ آتی ہے جان شیریں آب بقا سے تیرے پاتی ہے روح تسکیں

محشر میں تیری ملک ہستی ہو پاک تیری

اے کاش یوں ٹھکانے لگ جائے خاک میری

آپکی نظم کرشمۂ صد ساماں "میراں بائی" اور فلسفۂ گیتا پر ارادتاً تبصرہ نہیں کیا گیا ہے کیونکہ اول تو رسالہ کے صفحات محدود ہیں دوسرے ناظرین کی تشنگی ذوق مطالعہ بھی باقی رہنا چاہیے۔ درحقیقت ان نظموں کے پڑھنے والے پر چند ساعات کیلئے ایک عجیب محویت طاری ہو جاتی ہے اور شاعر کے لطیف جذبات ناظرین پر غالب آ جاتے ہیں چونکہ مرحوم کے جذبات صادق تھے اور کلام آمد کا نتیجہ ہوتا تھا اسلیے عام ناظرین بھی شاعر کے دلی جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے میں اور اسپر شاعر کو جس قدر فخر ہو کم ہے۔

کوئل

از نوابزادہ مرتضیٰ علی خاں صاحب ...

کوئل ایک صدائے مجسم ایک تجسس مبہم ایک آواز دلکش۔ ایک نعرۂ تمنا۔ ایک ترنم جانفزا۔ ایک نالۂ حسرت۔ ایک چھپی ہوئی کہانی ایک ارمان۔ ایک روپوش حیا۔ ایک آنکھوں سے اوجھل جان فرسائی۔ وہ تو ہے جسے عالم میں کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ فریاد جان گسل ہے جو کلیجہ چھیدتی ہوئی اندر نکل جاتی ہے۔ وہ غم پرور نغمہ جو کبھی تو پتوں کی آغوش میں بیٹھکر اپنے سوگ کا گیت گاتی ہے اور کبھی فضائے آسمانی میں تیرتی ہوئی قصۂ غم سناتی اور اوجھل ہو جاتی ہے۔

اے قتیل محبت طائر! تیری ہی فریاد صبح صبح نیند کے سوتوں کو جگاتی ہے اور تیرا ہی جان فرسا شیون برگ شجر میں جدائی غم انگیز ... تو ہی بالیدن کی بہار آفرینی کا راگ الاپتی ہے تو ہی موسم گل کی آمد کے گیت گاتی ہے؟

اے بادلوں کی گرج بھرے سروں سے اپنی سریلی تانیں ملا دینے والی مغنیہ! تجھ ہی سے بہار کی بہاریں ... راتوں میں تیری صدا فضائے عالم میں ایک سرور انگیز دلکشی پیدا کر دینے والی ہوتی ہے تو اندھیری راتوں میں تیری ... والے تڑپ تڑپ جاتے ہیں سچ تو یوں ہے کہ تیری کوک دلوں میں عجیب ہوک پیدا کر دیتی ہے۔

ان کو برکھا رت میں سب غم میں چھوڑ دیے ہوتے ہیں ان کی محبت کی امنگیں تڑپتی ہیں تو تیری شیریں صدا ... کیسے ... پیا یون پر وفاداری کی ...

اے عشق کی سچی اور زندہ تصویر تیرے وفاداری اور بے بہم محبت کے افسانے دنیا کے گوشہ گوشہ میں بلند ہیں! آہ تو کہاں ہے!

بادہ و مطرب و گل جملہ مہیا است ولے عیش بے یار مہیا نشود، یار کجا است

ترانۂ بہار

(از مسٹر ویسرلت سربشن لائلپور)

بشارت باد اے یارانِ زندہ دل بہار آئی
چمن زار جہاں میں فصلِ نظّارہ نگار آئی

یگانہ خو کا سرو ہمرانہ عمل اُٹھا
زمانے میں نعمت کی پری بنکر بہار آئی

فراقِ اضطراب انگیز کے منحوس دن گذرے
بہارِ جانفزا آئے کر پیام وصلِ یار آئی

خزاں نیستی پرور ستم سے گلستاں چھوٹا
جلو میں لطفِ حق کے زندگی لیکر بہار آئی

تہی بختانِ دنیا کی شکایت دور کرنے کو
سوادِ خلد دو ترستہ ہوئے خوشگوار آئی

سی رنگیں ادا دلبر کے آنیکی خبر لیکر
پیا پے پھول پھراتی نسیم مژدہ بار آئی

کی عنبریں زلفوں کی بو دامن میں لپٹائے
دماغِ عیش بھرنے کو صبائے مشکبار آئی

ہنساتی، گدگداتی، چومتی، ناطورۂ گل کو
مچلتی، جھومتی، بادِ صبا مستانہ وار آئی

و نورِ تازگی سے دشت و در سب لہلہا اُٹھے
دوائے دردِ جانِ سوختہ ہوکر بہار آئی

چمن زار جہاں میں جشنِ نوروزی منانے کو
گلوں کا روپ بھر کر رحمتِ پروردگار آئی

مرغِ نوا پرواز نے یہ زمزمہ گایا
بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی

ہزاروں نازنیں نوخیز کلیاں ساتھ میں لیکر
کرشمہ کاریاں کرنے کو عذرائے بہار آئی

ے ناز و ادا سے شان و تمکیں سے گلستاں میں
سیاہ حوریانِ گل قطار اندر قطار آئی

ہنگوں کے چمن پھولے، ترنگوں میں سبھی جھولے
ہر اک شاخِ گلِ رعنا سے گلبانگِ ہزار آئی

ں میں کیف بھرتی دعوتِ رقصِ طرب دیتی
گلستاں سے نوائے عندلیبِ نغمہ کار آئی

چکوروں، کوئلوں، میناؤں نے خوش زمزمہ چھیڑا
نوائے قمریاں و طوطی و دُرّاج و سار آئی

سحابِ لطفِ باری نے غبارِ روح دھو ڈالا
بیاباں اور صحرا سے پپیہے کی پکار آئی

ی محبوب ہرجائی کے جلوے چارسو پاکر
پپیہے کی صدائے "پی کہاں" والہانہ وار آئی

فضا میں مختلف رنگوں کی دلکش تتلیاں جھلکیں
شگوفہ زارِ فطرت میں بہار اندر بہار آئی

ہر اک سرمست بھونرا بین کی تانیں اُڑا نکلا
چمن سے بھینی بھینی نکہتِ مشکِ تتار آئی

حسیں، شاداب بن میں مست چرواہے کی نے گونجی
بہشت گوش آوازِ ربابِ شاخسار آئی

ہوائے سرو کی موجوں کے نشّے میں جہاں ڈوبا
ہر اک موجِ ہوا سرشارِ صہبائے بہار آئی

نظارہ گاہِ فطرت پر فسوں گستر سماں چھایا
سکوت افزا نظاروں سے نزاہت آشکار آئی

ربابِ چشمۂ جوشاں سے شیریں زمزمے پھوٹے
نشاط انگیز آوازِ خرامِ جوئبار آئی

ترنم زارِ فطرت میں اثر زا گیت لہرائے
فرازِ کوہ سے دلکش صدائے آبشار آئی

فضا میں کالی کالی عیش پرور کالیں کھولے
سوارِ باد ہو کر لیلیِ ابرِ بہار آئی

ہر اک دل کیف و شادابی کے ساماں دیکھ کر اچھلا
گھٹا بنکر امینِ رحمتِ پروردگار آئی

گھٹا کے دلکشا نعروں سے قصرِ آسماں گونجا
لبِ طاؤسِ مستانہ سے پی ہو کی پکار آئی

چمن میں دیکھ کر کالی گھٹا کو بادہ کش چہکے
لبِ مینا سے قلقل کی صدائے خوشگوار آئی

گلستانوں میں غنچوں نے دکانیں عطر کی کھولیں
ہر اک غنچے سے شانِ حسنِ فطرت آشکار آئی

وہ ایک ایک بیل بوٹے سے رُوپہلی کونپلیں پھوٹیں
کتابِ زرنگارِ معرفت بنکر بہار آئی

چمن میں سبزۂ تر پُر تکلف شان سے لہکا
عروسِ سنبل اپنے گیسوئے پیچاں سنوار آئی

گلوں کے لطف پرور ساغروں سے انگبیں چھلکا
پرِ زنبورِ پرّاں سے نوائے صرفہ کار آئی

درختوں نے زمیں سے رنگہائے نو بہ نو چوسے
ہر اک شاداب پتی میں نظر شکلِ بہار آئی

عروقِ بوستاں میں جاذبیت کے نقوش ابھرے
نمو کے فیض سے جادو جگانے کو بہار آئی

فلک نے بادۂ پُر نور کے دھارے سے برسائے
زمیں نے منعقد کی ایک بزمِ عیش آرائی

شباب و حسن و رعنائی کے جلوے جا بجا چمکے
زمانے میں شرابِ رنگ و بُو لیکر بہار آئی

لطافت اور رنگینی کے دریا چار سُو امڈے
شبیہِ جنتِ ذوقِ نظر بنکر بہار آئی

نباتات و جمادات اپنے اپنے رنگ میں نکھرے
تمام اشیائے عالم پر قیامت کی بہار آئی

ہر اک سینہ چراغِ آرزو سے جگمگا اٹھا
ہر اک روحِ زمانہ وجد میں بے اختیار آئی

زمیں کی خاک کے ذرّوں سے نورِ حسنِ حق پھوٹا
ضیائے مہر ہر ذرّے پہ ہونے کو نثار آئی

دلِ شاعر سے جذبے شعر بن بنکر ابل نکلے
مصور کے قلم میں جنبشِ فطرت نگار آئی

جمالِ شاہدِ فطرت نے خود پردہ کشائی کی
دعائے عاشقانِ پاک خو برُوئے کار آئی

صبا سنکی، شجر جھومے، شگوفے مسکرا اٹھے
ہر اک دل میں کسی عالم کی یادِ خوشگوار آئی

بحمد اللہ سروشؔ اس نے یہ دورِ عیش دکھلایا
بڑے کام آج اپنے گردشِ لیل و نہار آئی

بیاہی بیوہ

(از بیگم وفیسہ عبدالقادر سرودی۔ ایم، اے، ایل، ایل، بی)

راحت حسین سے میری شادی اسوقت ہوئی تھی۔ جب شائد انٹرمیڈیٹ پاس کرکے محکمۂ تعلیمات میں نوسّے روپیہ کے ملازم ہوئے تھے اسوقت میری عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ شادی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ہم دونوں میں بڑی محبت ہوگئی۔ وہ میری ہر خواہش کی قدر کرتے تھے۔ اور میں ہر معاملے میں ان کی رضاجوئی مقدم رکھتی تھی۔ اُن کے والد، اُن کی بہنیں، اُن کی والدہ بھی میری سلیقہ مندی اور فرمانبرداری کی وجہ سے میری قدر اپنی دوسری بہوؤں سے زیادہ کرتی تھیں۔ صرف اُن کی والدہ عام عورتوں کی طرح کبھی کبھی بے وجہ مجھ سے ناراض ہوجاتیں۔ لیکن ایسی ناراضیوں کو بھی میں خوش اسلوبی سے نباہ لیتی۔

راحت حسین بہت سادہ مزاج اور کم سخن آدمی تھے۔ اُن کی عادتیں معین، اُن کی ضروریات مختصر اور خواہشات کم تھیں۔ سگریٹ، چاء وغیرہ سے ان کو نفرت تھی سینما اور دوستوں کا بھی اُنھیں زیادہ شوق نہ تھا۔ مدرسے سے گھر آئے، کھانا کھایا، نماز پڑھی اور کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ کبھی قرآن شریف کی تلاوت کرنے لگے۔ یا پھر اگر مدرسے کے کچھ لڑکے آگئے تو انھیں سبق پڑھا دیا۔ بہت مرنجان ومرنج طبیعت کے آدمی تھے۔ اپنی عمر میں شاید ہی کسی سے لڑائی کی ہو۔ اُن کی دلچسپی کا سب سے بڑا مشغلہ اُن کے بھتیجے اور بھانجے تھے۔ جن سے یہ دل لگی مذاق کرلیا کرتے تھے۔ کسی مرد کی یہ ایسی صفات ہیں، جن سے بہت کم بیویوں کو سابقہ پڑتا ہوگا۔ اس فضا میں رہ کر میرے لئے کسی شکایت کا موقع ہی پیدا نہیں ہوا۔ چھ سات سال اسی میں گذر گئے۔ لیکن شاید سکون کے بعد طوفان کا آنا انسان کی زندگی کے لئے بھی ضروری ہے میرے عارضی اطمینان کے مقابلے میں میری مصیبت بہت زیادہ ثابت ہوئی۔

شادی کے چار پانچ سال بعد سے راحت حسین کو میری صحت کا ضرورت سے زیادہ خیال ہوگیا۔ میں اچھی خاصی تندرست تھی، لیکن وہ یہی کہتے تھے کہ میری صحت خراب ہوتی جارہی ہے۔ حکیموں ڈاکٹروں کے پاس لئے لئے پھرتے۔ میں ان کی ہمدردی اور محبت۔

مغلوب ہو کر بھی انکار نہ کرتی طرح طرح کی دوائیں آتیں، میں بغیر چون و چرا کھا لیتی۔ بعض دفعہ ایسی دوائیں بھی آئیں جنھیں عام صحت کی درستی سے دور کا بھی تعلق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لیکن مجھے طب کی معلومات کا دعویٰ بھی نہیں تھا۔

پہلے تو میں بڑے دھوکے میں رہی۔ اس دوڑ دھوپ کو محبت کا نتیجہ سمجھ کر راحت حسین سے میری عقیدت آخری حد تک پہونچ گئی۔

مگر اس دوڑ دھوپ کا راز اتفاقیہ طور پر دیر میں کھلا۔ ایک حکیم صاحب نے جو میرے علاج کیلئے طلب کئے گئے تھے۔ میری عام صحت کے متعلق کچھ پوچھنے کے بجائے ایسے سوالات کئے جن سے مجھے دفعتاً پتہ چل گیا کہ اس تمام علاج معالجے کا مقصد کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہماری شادی کو چھ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ لیکن ہم اولاد سے محروم تھے۔ اور جیسا ہماری سماج کا قاعدہ ہے، اولاد نہ ہونے کا سارا الزام عورت کے سر تھوپا جاتا ہے فطرت نے ایک ناکردہ گناہ کی سزا بھگتنے کے لئے میرا ہی انتخاب کیا۔

ایک روز دوپہر کو میں اپنے کمرہ میں بیٹھی، حافظ نذیر احمد کی کتاب "محصنات" پڑھ رہی تھی قصہ ایسا دلچسپ معلوم ہوا کہ ایک ہی نشست میں تین فصلیں ختم کر دیں۔ جب عارف اور مبتلا کی بحث پر پہونچی تو طبیعت اکتا گئی۔ کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی اور خود پلنگ پر لیٹ گئی غنودگی کی حالت میں پڑی تھی کہ بڑے دالان میں آہستہ آہستہ گفتگو کی آوازیں آنے لگیں۔ میں ہوشیار ہو گئی۔ اور دیکھا کہ میری ساس نندیں، دیورانیاں جٹھانیاں سب جمع ہیں اور کسی اہم مسئلے پر راز داری کے ساتھ گفتگو ہو رہی ہے۔ میں اپنے کمرے کی طرف تجسس کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے میرا ماتھا ٹھنکا۔ قاعدہ ہے کہ اس طرح کی راز داری سننے والے کو خواہ مخواہ متوجہ کر لیتی ہے۔ میری جو شامت آئی، تو آرام سے سو رہنے کے بجائے میں نے وہ گفتگو سننے کی کوشش کی۔ پوری گفتگو کا سننا تو میرے امکان سے باہر تھا۔ صرف چند جملے وہ بھی ادھورے کانوں میں پڑے میری ساس کہہ رہی تھیں۔

راحت کو فکر نے آدھا کر دیا۔ .... بانجھ عورت ..... گھر کیلئے گھن ہوتی ہے

مجھے ایسا محسوس ہوا گویا یہ الفاظ میرے ہی دل سے نکلے ہیں مجھ پر دفعتاً اثر ہوا۔ سر چکرانے لگا۔ اور میں دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔

راحت کی خواہش کا مجھے پہلے ہی علم ہو چکا تھا، ساس اور نندوں کی ادھیڑ بُن سے بھی میں بے خبر نہ تھی۔ لیکن اس کا مجھے بھول کر بھی خیال نہیں آیا تھا۔ کہ اس معاملہ کو اسقدر اہمیت دی جائے گی۔ راحت حسین کے تمام رشتہ دار مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اور جب اس معاملہ کی اہمیت کا مجھے احساس ہوا، تو اسقدر اچانک اور شدت کے ساتھ کہ میں اسکو برداشت کرنے کی خود میں قوت نہیں پاتی تھی۔

میں اس سے خوب واقف تھی کہ میری جنس کی فطرت عجیب ہوتی ہے۔ یہ بلا ان کر جسکے سر نازل ہوتی ہے تو بھلے بُرے کا امتیاز مٹا دیتی ہے۔ اب روز روز کی بزم آرائیوں اور رائے زنیوں کے خیال سے میرا دل بیٹھنے لگا۔ میرے متعلق وہ جو کچھ کہتے اور سوچتے ہوں گے یا جو کچھ وہ چاہتے ہوں گے، اس سب کا ایک دھندلا سا نقشہ میرے ذہن میں کھنچ گیا۔ اور اب مجھے ان لوگوں کا سامنا کرنے سے حجاب آنے لگا۔

خود اس واقعہ کی مجھے اتنی فکر نہ ہوتی۔ ساس، نندوں، پڑوسنوں غرض کسی کی بدگوئی کا مجھے ڈر نہیں تھا۔ ڈر تھا تو صرف اس بات کا کہ اس تمام ہلچل کا آخر کیا نتیجہ ہوگا۔ اور اس نتیجے کے خیال ہی سے میری روح کانپ اٹھتی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میکے سے آئے مجھے پانچ چھ روز ہوئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا اور یہی وقت گھر والیوں کی بزم آرائی کا ہوتا ہے۔ اسی وقت دنیا جہان کے معاملے طے ہوتے ہیں۔ میں ذرا سی پلنگ پر لیٹی، لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ کچھ دیر بعد جاگی تو دالان میں گھُس پھُس ہو رہی تھی اب میں بھی اپنی عادت کے خلاف اس طرح کی کانا پھوسیوں کو سننے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ خوب کان لگا کر سُنا۔ تو میری بڑی نند کہہ رہی تھیں۔

"...... اماجان! اس میں ان بیچاری کا کیا قصور ہے۔ جو آپ اُن سے ناراض ہو رہی ہیں۔ یہ تو اللہ کی مرضی ہے......"

"میں اسکو کب کچھ کہہ رہی ہوں۔ تقدیر سے گلہ ہے۔ کس منحوس گھڑی بات ٹھہری تھی کہ بیاہ ہوا نہ ہوا برابر ہو گیا۔"

"مشیت میں کس کو دخل ہے۔ اور ابھی تو اللہ اور اللہ کے حبیب سے آس ہے۔"

"شہر بھر کے حکیم، ڈاکٹر، ملا، سیانے سب ختم ہو چکے، سال دو سال نہیں پورے

چھ سال گذر گئے۔ بیٹی! ابھی تم اُس لگائے بیٹھی ہو۔ اب کون افلاطون خاں پیدا ہوں گے جو تمہاری بھاوج کا علاج کرنے آئیں گے؟"

"تیری دیورانی کو بھی تو سات سال کے بعد بچہ پیدا ہوا تھا...."

"اُن کی بات اور تھی۔ بچہ جننے والیوں کے طور ہی جُدا ہوتے ہیں بانجھ عورت کو کون بچہ دے سکتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ علاج فضول ہے۔ ان کو اللہ پر چھوڑ دو۔ اسحاق بیگ کی لڑکی جسکو میں بارھویں کی مجلس میں دیکھ آئی ہوں، اچھی ہے۔ تمہارے ابا اسحاق بیگ سے بات چیت کریں گے تو وہ ٹالنے کے نہیں...."

"راحت کو کیوں جنجال میں ڈالنا چاہتی ہو؟" بڑی نند نے کہا۔

"کیا کہا! جنجال؟ واہ سبحان اللہ! شادی بیاہ جنجال ہے۔ اب کے زمانہ کی لڑکیاں دو حرف کیا لکھ پڑھ لیتی ہیں کہ خدا اور رسول کے احکام پر بھی نکتہ چینی کرنے لگتی ہیں۔ جس کا خدا نے حکم دیا اور جس کو رسول نے جائز کیا اس پر کس کا کیا اختیار۔ جب تمہارا زمانہ آئیگا۔ تم سرے سے شادی ہی نہ کرنا کیا کرستانی خیالات ہیں۔"

مجھے جس بات کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ وہ جلد ہی سامنے آ گئی۔ راحت کی والدہ کی یہ تحریک کسقدر معصوم تھی۔ گھر کی فضا کا اثر انسان پر پڑنا نہ ضروری ہے۔ آزاد سے آزاد خیال انسان بھی اس سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے۔ راحت تو پھر قدامت پرست انسان ٹھیرے۔ وہ ماں بہنوں کے خیال سے متاثر ہوئے بغیر کیونکر رہ سکتے تھے چنانچہ میرا شبہہ بے بنیاد نہیں تھا۔ اس تحریک کو پیدا ہوئے ابھی چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ انکی مغلوبیت کا اظہار ہونے لگا۔

ایک دفعہ میں اپنے والد کے گھر گئی۔ پہلے راحت حسین ہفتہ عشرہ کے اندر ہی گھر چلنے کا تقاضا شروع کر دیتے تھے۔ اس مرتبہ خلاف معمول خاموش ہو رہے بیس دن پچیس دن، پورا مہینہ گذر گیا۔ میرے شبہات قوی ہوتے گئے آخر میں نے پہل کی۔ اور گھر چلنے کو کہا۔ وہ ٹالنے لگے۔ یہ ابھی کچھ روز یہیں رہیئے۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ میں آپ کے آرام کے لئے کہہ رہا ہوں ورنہ گھر آپ کا ہے۔ جب جی چاہے چلی آنا۔ میری طبیعت تو اچھی خاصی تھی مگر یہ صرف اُن کے بہانے تھے۔ میں تکلف کو بالائے طاق رکھکر ان کی مرضی کے بغیر ہی سسرال چلی آئی۔

سسرال آنے پر مجھے بڑی تبدیلی معلوم ہوئی۔ گھر کے لوگ مجھ سے کم ملنے لگے تھے۔ اور تو اور میری چھوٹی نند بھی جس کا مجھ سے بے حد ربط ضبط تھا، وہ مجھ سے کترانے لگیں۔ میں نے بہت غور کیا کہ ممکن ہے یہ میرے ہی دل کا چور ہو۔ لیکن اس سے میری تسلی نہو سکی میں نے جب کبھی اس معاملے پر غور کیا میرے دل نے یہی تصفیہ کیا کہ تبدیلی یقیناً ہوئی ہے۔ خود راحت بھی مجھ سے کھل کر کچھ کہتے سنتے نہیں تھے۔

بارہا میں نے ان سے اس معاملہ کو چھیڑنا چاہا۔ لیکن مدعا نے دل زبان پر پہونچ کر کانٹا بن گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ جاری کیا ہے۔ مصیبت جس قدر دیر میں آئے اچھا ہے لیکن میرے اس استدلال سے دل کو تسلی کیا ہوسکتی تھی۔ اُلٹا جی گھبرانے لگا۔ بالآخر میں نے اپنے پہلے فیصلے کے خلاف یہ طے کرلیا کہ اس تذبذب کی زندگی سے یقین کی تکلیف بھلی۔ میں اسطرح اندھیرے میں تو نہ پڑی رہوں گی۔

یہ طے کرکے ایک روز راحت سے میں نے ان کی سرد مہری کا سبب پوچھا۔ وہ کہنے لگے "یہ تمہارا خیال ہے۔ مجھے تو کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔"

ادھر سے بھی مایوسی ہوئی تو میری بے چینی میں اور بھی اضافہ ہوتا گیا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کس سے بھید لوں۔ سب سے بڑھکر فکر یہ تھی کہ اب سرگوشیاں بھی کم ہوگئی تھیں۔ یہ تو ناممکن سی بات تھی کہ معاملات اسقدر آگے بڑھکر رک جائیں۔ سوچتے سوچتے آخر ایک صورت نظر آئی۔ میں نے چھوٹی نند کو گانٹھنے اور ان کی ہمدردی حاصل کرنیکی کوشش شروع کی۔ اس کے کھنچے رہنے اور کم ملنے کا خیال گویا میں نے دل سے نکال ڈالا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں انھیں اپنے کمرہ میں کھینچ لانے اور پہلے سے زیادہ محبت کا سلوک کرنے لگی۔ کبھی انھیں کچھ پڑھا دیتی۔ اور کسی وقت سینے پرونے یا کردشیا کے کام میں انکا ہاتھ بٹاتی۔ لڑکی تو تھی ہی، تھوڑے عرصہ کے اندر پھر بے تکلّف ہوگئی۔

جب میں نے اسے اچھی طرح پرچا لیا، تو آہستہ آہستہ نفس معاملہ کی طرف لانے لگی۔ میں اپنی بدنصیبی اور دکھ کی داستان اس سے کہتی، تو وہ دلسوزی سے سُنتی، لیکن اپنی طرف سے واقعات کو ظاہر کرنے کی اس نے کبھی کوشش نہ کی۔ آخر میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بیگم کچھ روز پہلے اماں جان کس کے پیام سلام کی گفتگو کررہی تھیں......؟" سوال سنتے ہی اس کے چہرہ کا رنگ متغیر ہوگیا۔ ہاں، ہوں، نہیں کہکر ٹال دیا۔ میں نے تھوڑی دیر کے بعد پھر

اصرار سے پوچھا تو بات بتادی کہ آپا جان کے چھوٹے دیور کی بات تھی۔ میں نے شکوہ کیا کہ "چھپاتی کیوں ہو۔ مجھے معلوم ہے۔ اسحاق بیگ کی لڑکی کس کے لئے مانگی جانیوالی ہے"

اس اچانک افشائے راز پر وہ کچھ بوکھلاسی گئی۔ میز پوش جس پر وہ کروشیا کا کام کر رہی تھی، ہاتھ سے گر پڑا اور اُسنے بات بنانیکی کوشش کی۔

"بھائی جان! آپ کو شبہہ ہوگیا۔ یونہی باتوں باتوں میں ان کا ذکر آیا ہوگا۔۔۔۔ اماں جان اسی لڑکی کی بڑی تعریف کرتی ہیں۔۔۔۔ بارھویں کی مجلس میں اسے مرشد کے ہاں دیکھ لیا تھا۔ شاید"

میں نے اس نفسیاتی لمحہ سے فائدہ اٹھایا۔

"شرما کیوں رہی ہو۔ بیگم تمھارے بھائی ہی نے تو کچھ اپنے متعلق کہا تھا۔۔۔۔؟"

میرا دل دھڑکنے لگا۔ وہ میری طرف سے منہ پھیر کر باہر کی طرف دیکھنے لگی۔

"بھائی جان نے آپ سے کہہ دیا!۔۔۔۔۔ کیا کہا تھا انھوں نے؟"

"صاف تو کہا نہیں۔ بس یہی۔۔۔۔ یہی کہ وہ۔۔۔۔ اماں جان اس کو مانگنے والی ہیں۔ اور شاید اسحاق بیگ راضی بھی ہیں۔۔۔۔؟"

"بھابی جان! آپ کو معلوم ہے کہ یہ کام خوشی سے نہیں ہو رہا ہے۔ اماں جان اور خود بھائی جان کو بچے کی بڑی آرزو ہے۔۔۔۔"

"ہاں ہاں یہ تو چھپی بات نہیں ہے۔۔۔۔ تو پھر عقد کب ٹھیرا ہے۔۔۔۔؟" میری آواز بھرا گئی جس کا اثر بیگم پر اچھا پڑا۔ اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات اُبھر آئے اور اس نے کہا۔

"بھائی جان ابھی تک ناراض ہیں۔ میاں (والد) اور اماں جان کا اصرار ہے۔ لیکن ابھی آپ کی شادی ہوئے ایسے کتنے دن گذرے ہیں۔ خدا سے امید ہے۔ بھابی جان۔ بچہ ہو جاتا تو یہ جھگڑا کیوں ہوتا۔۔۔۔ مجھے جب سے یہ حال معلوم ہوا ہے۔ آپ کے لئے دل مسوس رہا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو کھیل رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط ہو سکا مدت کے بعد ایک ہمدرد ملا تھا۔ رقت طاری ہوگئی۔ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

بیگم مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سنبھلی۔ لیکن میری رقت کم نہ ہوئی، اس نے سمجھانا شروع کیا۔

"بھابی جان! آپ دل کو سنبھالیں۔ مقسوم کا لکھا ہو کر رہتا ہے۔۔۔۔۔ اور ابھی تو [illegible] ہوتے اسحاق"

اپنی ان بیاہی بیٹی" کیوں دینے لگے ....."

جب ذرا طبیعت سنبھلی تو میں نے عذر کیا۔

بیگم تمہاری ہمدردی سے 'میرا دل' امڈ آیا۔ میں سب حال جانتی تھی۔ لیکن شاید 'اماں جان' 'آبا جان' اور خود تم بھی ..... مجھ سے اس معاملے کو چھپانا چاہتی ہو .... نہیں اس میں تمہارا کیا گلا ہے ..... بات ہی ایسی تھی۔ لیکن انسان ہوں۔ خیال آتا ہے کہ میں ایسی کیا غیر ہوگئی کہ اتنا سب کچھ ہوا۔ کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ وہ تو اتفاق سے اتنا بھی معلوم ہوگیا۔"

"بھابی جان" آپ فضول بدظن ہو رہی ہیں۔ .... اماں جان نے آپ سے شاید اس لئے نہیں کہا ہوگا کہ ابھی کچھ بات ہی ٹھیک نہیں ہوئی ....."

"سچ ہے بیگم شادی میں تو میری دعوت ہی ہوتی نا۔ اب پہلے سے مجھے سنانے سے کیا فائدہ تھا" لیکن مجھے خیال آیا کہ کہیں اس تلخ گفتگو سے بیگم برا نہ مان جائے۔ اب کے بگڑی تو پھر منانا مشکل ہوگا۔ اس لئے میں نے سنبھل کر کہا۔

"بیگم تمہاری ہمدردی نے میرے زخم پر پھاہے کا کام کیا۔ تم نہ ہوتیں تو شاید میں آپ ہی آپ گھٹ کر مرجاتی۔"

"میں کیا ہمدردی کرسکتی ہوں....."

"نہیں بیگم یہ نہ کہو .... تمہاری بڑی مہربانی ہے جو اس طرح میرے غم میں شریک رہتی ہو۔ تم سے کہہ سن کر میری کچھ بھڑاس تو نکل جاتی ہے۔"

راحت حسین سے میں اس واقفیت کے حال کو چھپانا چاہتی تھی۔ لیکن شاید کسی دوسرے معاملے میں عورت اپنے جذبات کو چھپانے میں اسقدر ناکام نہیں رہتی جیسی سوت کے معاملے میں میری پیش بندیوں کے باوجود میرے خیالات اُن پر ظاہر ہی ہوگئے۔ میں نے راحت سے شکایت کی شکایت کیا کی جتنی تلخی میری سرشت میں مضمر تھی، وہ سب اس شکایت میں۔ پہلی دفعہ اُن کے سامنے ظاہر ہوگئی۔

شکایت غلط نہیں تھی۔ وہ اس پر نادم معلوم ہو رہے تھے۔ لیکن اپنی ندامت کو انہوں نے خوب چھپایا۔ اس کا کچھ الزام میرے سر تھوپا۔ اور کچھ والدین کے۔ میں نے پوچھا۔

"آپ ننھے بچے تو نہیں ہیں۔ اگر آپ کا دل نہ چاہتا ہو تو والد کیا مجبور کریں گے؟"

میں نے انھیں سمجھا تو دیا، لیکن وہ نہ مانیں تو مجھ پر کیا الزام ہے۔"
" آپ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ یہ عقد مجھے منظور نہیں ہے۔ کیا آپ نے کبھی صاف صاف اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا؟"
"میں سب کچھ کر سکتا ہوں، لیکن اماں جان اور میاں جان کو اس ضعیفی میں رنج نہیں دیکھتا۔"
"یہ احساس فرمانبرداری اسی موقعے کے لئے ہے یا کبھی اور بھی اس شدومد کے ساتھ اس پر عمل کیا گیا تھا؟"
"جہاں تک مجھے یاد ہے۔ میں نے دانستہ انھیں رنج پہونچانے کی کوشش نہیں کی۔ اگر غیر ارادی طور پر انھیں تکلیف پہونچی ہو تو اس کا معاف کرنے والا خدا ہے۔"
"تو یہ کہئے کہ یہ شادی ہو کر رہے گی؟"
"اگر مشیئت یہی ہے تو کیا چارہ ہے۔"
" بیشک آپ تو مجبور محض ہیں۔ تو کہئے کہ اب بات چیت سب ٹھیک ہو چکی ہے؟"
" میں کچھ نہیں جانتا والد سے پوچھو یا والدہ سے ......" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

غالبًا میری اسی گفتگو کا نتیجہ تھا کہ اس معاملے میں اب اگلی سی رازداری نہیں برتی جاتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بات مجھ سے بھی کہہ دی جاتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے میری بے چینی تو دور ہو گئی۔ لیکن یقین کی اثر آفرینی شروع ہو گئی۔ راحت حسین نے والدین کا جس طرح سہارا لیا تھا اس میں میرے کچھ کہنے سننے کی گنجایش ہی باقی نہیں رہی تھی۔ اور گنجایش ہوتی بھی تو میرا کیا بس چل سکتا تھا۔ سماج میں عورت کی بے بسی کا حقیقی احساس مجھے اب ہونے لگا۔

ایک روز بیگم نے آکر کہا کہ آیندہ جمعہ کو لڑکی کی رونمائی مقرر ہوئی ہے۔ اس خبر پر میں اپنی حسرتوں کا ماتم ابھی پوری طرح کرنے نہ پائی تھی کہ شام کو راحت نے مجھ سے کہا کہ رونمائی میں مجھے بھی جانا چاہیئے۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ تو وہ بہت برافروختہ ہوئے اور اپنی عادت کے خلاف ہماری ازدواجی زندگی میں پہلی دفعہ انتہائی سخت لہجہ میں مجھ سے کہا۔
اچھا آپ انتقام لینا چاہتی ہیں؟"
میری زبان سے بے اختیار نکل گیا" خدا نے گا۔ میرے بس میں کیا ہے۔"

اس جواب پر تعجب ہے کہ وہ خاموش ہو گئے۔ اور مفاہمت کے انداز میں کہنے لگے۔

"آپ کا جانا اس لئے ضروری ہے کہ وہ..... اسحاق بیگ کی بیوی آپ سے بھی گفتگو کرنا چاہتی ہیں۔ اگر آپ کو جانے سے انکار ہے تو خیر۔ لیکن اس میں والد کی بڑی سُبکی ہوگی۔ ان کو سکا جس قدر بھی ملال ہو کم ہے۔ بہرحال جبر تھوڑے ہی ہے۔ خوب غور کر لیجئے۔ ابھی تو چار پانچ دن باقی ہیں"

راحت کے لہجے میں کچھ ایسی مایوسی تھی کہ اس کا میرے دل پر اثر ہوا۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ ساس سسرے کے خلاف مرضی کوئی کام کرکے اس گھر میں رہنا میرے لئے دوبھر ہو جائیگا۔

میں نے جواب دیا:

"اچھا۔ اگر اپنے قتل کے محضر پر آپ ہی دستخط کرنے کی کوئی رسم ہے تو میں حاضر ہوں"

راحت حسین نے کہا: "میں دس دفعہ اس معاملے کی صورت حال سمجھا چکا۔ لیکن معلوم نہیں کہ تمھاری کیا عقل ماری گئی ہے کہ تم سیدھی طرح سوچتی ہی نہیں"

لڑکی کو دیکھنے میں بھی گئی میری حالت بہت نازک تھی۔ ہزار بے تعلقی ظاہر کرنا چاہتی تھی لیکن رنج گلوگیر تھا۔ آخر مجھے ڈر ہونے لگا کہ کہیں کوئی نامناسب حرکت نہ صادر ہو جائے۔

اسحاق بیگ کی بیوی میری طرف خاص طور پر متوجہ تھیں۔ چائے وغیرہ سے فراغت پانیکے بعد وہ میرے ہی قریب آکر بیٹھیں۔ اور میرے حالات پوچھنے لگیں۔ راحت حسین کے عادات و اطوار کے متعلق بھی دو چار باتیں پردے پردے میں پوچھیں۔ اپنی بہن سے میرا تعارف کرایا۔ اور کہنے لگیں: "شریف بیویاں ایسی ہوتی ہیں کہ اپنی خوشی سے خاوند کے لئے لڑکی کا انتخاب کرتی ہیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ انھیں باور کرایا گیا تھا کہ یہ شادی میری خوشی سے ہو رہی ہے، میں نے خاموش رہنے کی لاکھ کوشش کی لیکن زبان سے نکل ہی گیا" جی ہاں شریف بیویوں کو ایسا بھی کرنا پڑتا ہے" شاید آگے اور کچھ کہہ دیتی، لیکن بیگم میرے برابر بیٹھی تھیں۔ ٹہوکا دیکر مجھے ہوشیار کر دیا۔ اس جواب پر اسحاق بیگ کی بیوی تو مطمئن نظر آتی تھیں، لیکن میری ساس کے ابرو پر بل پڑ گئے۔ میں نے توقع کے خلاف اپنے آپ کو بہت سنبھالا اور یہ رسم خیر خوبی سے ختم ہوئی۔

گھر پہونچتے ہی لڑکی، لڑکی کے گھر اور لڑکی والوں کی تعریف کے راگ شروع ہو گئے، لیکن مجھے ہر چیز میں ہزار عیب نظر آئے۔ ممکن ہے یہ میرا ذاتی خیال ہو۔ بہرحال اسکا اثر کیا پڑ سکتا تھا۔

عقد کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس منحوس کاروبار سے میں اب مانوس سی ہو چکی تھی، کیوں کہ رات دن، اٹھتے بیٹھتے یہی میرا وظیفہ ہو گیا تھا۔ پھر بھی جب اس ناٹک کے پورے ارتقا اور منتہیٰ پر نظر پڑتی تھی تو میرے دل میں مایوسی کے جذبات عجیب طرح امڈے آتے تھے یہ تعلّی نہیں کہ میں اپنے خاندان کی لڑکیوں میں سب سے زیادہ سمجھدار اور لکھی پڑھی تھی اور دنیا کے واقعات پر عام عورتوں کے مقابلے میں زیادہ معقولیت سے نظر ڈالنے کی عادی تھی۔ لیکن یہاں میری معقولیت پسندی کورا جواب دے گئی۔ عقل جذبات کے تابع ہے اور ہر چیز جذبات کے توسط سے عقل تک پہونچتی ہے۔ پھر اس ٹھیٹ جذباتی معاملے میں میری عقل کس طرح غیر متاثر رہ سکتی تھی؟ آنے والے واقعات کا ناٹک میرے تصور میں ہر روز کھیلا جا رہا تھا۔ وہی واقعات پہلو بدل بدل کر پیش ہوتے تھے۔ خود ساختہ دلیلوں سے دل کو تسلّی دینے کی ہزار کوشش کرتی لیکن بے فائدہ۔ انتہائی مایوسی کا یہ اصول کہ "جو چیز اختیار سے باہر ہو۔ اس کو برداشت کیے بغیر چارہ نہیں" ہمیشہ میرا سہارا ثابت ہوا تھا۔ لیکن اس کا جادو یہاں کچھ کام نہ آیا۔ میرا تصور نئی دلہن کو راحت حسین کے پہلو میں۔ وہ پہلو جس میں کبھی میری اور صرف میری جگہ تھی۔ بٹھا کر پیش کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ میری بے بسی پر مسکرا رہی ہے۔ کبھی وہ میرے ساتھ ہمدردی کرتی نظر آتی۔ لیکن اس کی ہمدردی کا خیال، اس کے زہر خند سے زیادہ سوہانِ روح تھا۔ یہ وہ ہمدردی ہے جو ایک جیتنے والے کو ہارنے والے کے ساتھ اور ایک طاقتور کو کمزور کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ دنیا کے مصائب میں سب سے زیادہ ذلیل کرنے والی مصیبت ہے۔

مرد کی فطرت کا اگر مجھے کچھ تجربہ ہے تو کہہ سکتی ہوں کہ اس کا دو بیویوں کے ساتھ برابری کی محبت کا دعویٰ ڈھکوسلا ہے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے تو ایک حسّاس عورت اس شرکتِ غیر کو خدا جانے کیسے گوارا کر سکتی ہوگی؟ جنسی اختلاف، جذبات کا اختلاف نہیں ہے تو پھر کس کو یہ کہنے کی جرأت ہے کہ مرد بے روک ٹوک ایک سے زیادہ بیویاں کر سکتا ہے؟ جنسی تعلقات پر لکھنے والوں میں سے بعضوں نے عورت کو ڈرانے کی ایک دلیل اچھی تراشی تھی کہ ماں بننے کا خطرہ اور اولاد کی پرورش کا مقدس فریضہ تعددِ ازدواج میں رکاوٹ ہے۔ لیکن ضبط تولید کے وسائل کی موجودہ ترقیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اکثر انصاف پسندوں نے اس رکاوٹ کو بھی من گھڑت ثابت کر دیا۔ خدا معاف کرے! انتہائی مجبوری اور شدید مایوسی کا وہ احساس جو اس وقت مجھ پر طاری ہے۔ اور جس سے دنیا کا کوئی مرد واقف نہیں ہو سکتا۔ ان خیالات کی پیدائش کا باعث ہوتا ہے۔

اس بحث کو جانے دیجئے، میں صرف ایک بات پوچھتی ہوں۔ کیا مرد اس بات کا بھی روادار ہو سکتا ہے کہ کوئی غیر مرد اس کی بیوی کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھے؟ کتنے بزدل ہوتے ہیں یہ مرد کہ وہ سمجھتے ہیں ایک عورت ان کے مطلب کی نہیں، لیکن پھر بھی اُسے آزادی نہیں دیتے تاکہ ان پر سماج کا دھبہ کارنہ پڑے۔ اپنی اس بزدلی کو وہ وفا شعاری اور خدا جانے کس کس پردے میں چھپاتے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ سماج کے قانون بنانے میں ہم عورتوں کو بھی دخل ہوتا! یہ بھی ہمارے طاقتور صنف کی ایک خود غرضی ہے کہ بے ثمر شادی کا سارا بوجھ وہ عورت ہی کے کمزور کندھوں پر رکھنا چاہتی ہے۔

اس کرب اور مایوسی کی حالت میں بارہا مجھے خیال آیا اور نہایت شدت سے، کہ اس ضبطِ تولید کے عالمگیر احساس کے عہد میں کاش میں کسی روشن خیال مرد کے پلّے باندھی گئی ہوتی! کیا ستم ظریفی ہے کہ جہاں ضبطِ تولید کا قدرتی انتظام ہے وہاں اولاد کی خواہشیں دامنگیر ہیں، اور جہاں اولاد کے نام سے بیزاری ہے، اولاد کی پرورشوں سے سنبھلنا دشوار ہے۔ اولاد کی خواہش کس عورت کو نہیں ہوتی لیکن اس محرومِ تمنا کے پاس بے ثمر شادی کا کیا علاج ہے؟

گفتگو طویل ہوگئی اور کسی قدر تلخ بھی، لیکن انصاف پسندوں کے پاس مری اس تلخ نوائی کے لئے شدید دردِ دل کا عُذر موجود ہے۔

آخر وہ منحوس گھڑی بھی آگئی جب راحت حسین دوسری لڑکی کو بیاہ کر گھر لائے۔ دوسری دفعہ دُولہا بنے، دوسری دفعہ شادی کی خوشگوار رسمیں ادا ہوئیں۔ سبقِ شوق کی تکرار ہوئی۔ اب تک میرا رنج و غم خیالی تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اصلی رنج سے اِسے دور کا تعلق بھی نہیں۔ یہ زہر میں بجھا ہوا تیر سب سے پہلے میرے دل میں اسوقت پیوست ہوا۔ جب راحت حسین اپنی نئی دُلہن کو گود میں اٹھا کر حجلۂ عروسی میں لے جا رہے تھے۔ کتنے ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے؟ ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں، ان کی نظریں میری طرف سے کتنی پھر گئی تھیں کہ مجھ بدنصیب پر ایک نظر — ایک ہمدردی کی نظر — تک نہ ڈالی۔

پھر جب رات کو پہلی دفعہ — اُنہوں نے میرا ساتھ چھوڑا۔ پہلی دفعہ اپنے پہلو میں اُنکی جگہ خالی پائی۔ سامنے کے کمرے کی طرف میری مایوس نگاہیں بے اختیار اُٹھ گئیں جس کے سُرخ پردے میرے خون شدہ دل کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ سات سال پہلے کی ایک رات مجھے

یاد آگئی جب یہ سارا اہتمام میرے لئے تھا۔ مجھے یاد ہے اور اچھی طرح یاد ہے سات سال پہلے ـــ اسی طرح کی ایک رات۔ اسی کمرے کے اندر دیوار میرے سامنے اس شخص کے پیمانِ محبت کو سن رہے تھے جو آج ایک دوسری بھولی بھالی لڑکی کے معصوم دل پر نقش پانے کے لئے نقشِ الفت جما رہا تھا۔

خدا کی پناہ کس قدر شدت کا درد میرے دل میں اُٹھا۔ کیسی رقت طاری ہوئی۔ پکار کر رو نہیں سکتی تھی کہ اُن کا عیش بے مزہ ہونے کا ڈر تھا، گھر کے لوگوں کی خوشی ملحوظ تھی۔ اور یہ سب کچھ لحاظ اس کے لئے ہیں، جس کو مرد شرارت سے "صنفِ نازک" کہتے ہیں! فرطِ غم سے دل پھٹا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکل جائے گا۔

کاش یہی ہوتا تو کس قدر آسان تھا لیکن میری قسمت میں تو ایک طویل ـــ ایک غیر معین ـــ مدت کے لئے مرنا لکھا تھا۔ تکیوں کے سینکڑوں غلاف آنسوؤں سے تر کرنا تھے۔

غزل

(از جناب گیان پرکاش ورما اختر بریلوی)

رُک کے آہیں وجہِ شورِ شبہائے پنہاں ہوگئیں / آہ یہ موجیں نہ اٹھنے پر بھی طوفاں ہوگئیں
وہ جو آئے جگمگا اُٹھا جہانِ آرزو / دل کے گوشے گوشے میں شمعیں فروزاں ہوگئیں
درد گویا زندگی تھا، درد کی تاثیر سے / دل میں جتنی بھی رگیں تھیں سب رگِ جاں ہوگئیں
دل شکستہ ہوں میں زاہد میرے ایماں کو نہ پوچھ / جو صدائیں دل سے نکلیں جزوِ ایماں ہوگئیں
دیکھ کر رنگِ جہاں جب دل بنا مشکل پسند / مشکلیں بھی شومیٔ قسمت سے آساں ہوگئیں
اُف وہ آنکھیں اُٹھتے اُٹھتے جھک گئیں جو شرم سے / آہ وہ نظریں کہ پیوستِ رگِ جاں ہوگئیں
شوخیٔ پردہ نے کھینچا صاف خطِ امتیاز / چھپکے تنویریں تری کیا کیا نمایاں ہوگئیں
وائے محرومیٔ قسمت، اٹھ گئے جب سب حجاب / اپنی نظریں خود نقابِ روئے جاناں ہوگئیں
آگیا فرطِ الم سے تیری ہستی کا یقیں / سرجھائے غم شعاعِ نورِ عرفاں ہوگئیں
سوزِ پنہاں نے دکھائیں گرمیاں کیا کیا مگر / رفتہ رفتہ پھر وہ محوِ سوزِ پنہاں ہوگئیں

چھاگئی پھر دل پہ اے اختر بہارِ جانفزا
پھر تصور کی فضائیں گل بداماں ہوگئیں

NATIONAL MUSEUM ... DELHI

تنقید کتب

اُصول تعلیم[1]

خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی ضخیم کتاب نہایت محنت و دماغ سوزی کیساتھ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی فرمایش پر لکھی گئی ہے شروع میں سر راس مسعود سابق وائس چانسلر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی وحال وزیر تعلیم ریاست بھوپال نے ایک مختصر سا مقدمہ لکھا ہے جس کے بعد مصنف کا دیباچہ ہے۔ کل کتاب تین حصوں میں تقسیم کی گئی (۱) تعلیم و تمدن (۲) درسی تعلیم (۳) اخلاقی و معاشرتی تربیت۔ پھر مختلف حصوں کے موضوعات کے جزئیات پر مختلف ابواب میں بحث کی گئی ہے۔ اس طرح پوری کتاب کے سولہ باب ہوگئے ہیں۔

اسکے مصنف اپنی ذاتی اعلیٰ قابلیتوں کے علاوہ خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی کی اولاد میں ہیں۔ گویا فن تصنیف و تالیف اور درس و تدریس، جس سے اس کتاب کا خاص تعلق ہے۔ آپکا آبائی ورثہ ہے۔ پانی پت مضافات دہلی میں شمار کیا جاتا ہے اور سیاسی لحاظ سے وہ دہلی کا دروازہ ہے۔ چنانچہ دہلی کے تخت و تاج کا ہمیشہ پانی پت ہی میں فیصلہ ہوتا رہا ہے۔ بہرحال یہی وجہ ہے کہ مصنف نے "تعلیم" جیسے خشک و فلسفانہ موضوع پر ایسی سلیس و دلچسپ زبان میں بحث کی ہے کہ پڑھنے والے کے دماغ پر زیادہ زور نہیں پڑتا۔ مثلاً ہندوستانی گھرانوں میں بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں جو ڈھنگ عموماً برتے جاتے ہیں ان پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے خواجہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"بعض اوقات یعنی بچوں کی اس قدر بیجا نازبرداری اور رعایت کی جاتی ہے کہ وہ بڑے ہوکر معاشرتی زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ یا بہت سے تلخ تجربات اٹھانے کے بعد دوسروں کے حقوق اور فرایض کا احترام کرنا سیکھتے ہیں۔ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ کبھی کبھی ان کے ساتھ اسقدر بے جا سختی کا برتاؤ کیا جاتا ہے کہ ان میں آزادی

---

[1] تقطیع ۲۶ × ۲۲ / ۸ حجم ساڑھے پانسو صفحات ہی۔ قیمت کتاب چھ روپیہ، ملنے کا پتہ:۔ دفتر ہندستانی اکیڈمی، الہ آباد

سے کام کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، ان کی اُپج دب جاتی ہے، ان کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے، یا ان کے دل میں والدین اور عزیزوں کی طرف سے نفرت اور خوف کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، جو انہیں اندر ہی اندر "باغی" اور "سرکش" بنا دیتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اکثر ایک ہی بچہ کے ساتھ دونوں قسم کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ کبھی تو والدین ان کیساتھ حد سے زیادہ لاڈ پیار کرتے ہیں، ان کی ہر بات اور ہر ضد کو مان لیتے ہیں، اور کبھی کم از کم بچوں اور نوجوانوں کے خیال میں، منطق کے تمام تلّے توڑ کر خواہ مخواہ ان پر ناراض ہوتے ہیں اور ان کی قدرتی خواہشوں کو روکنا چاہتے ہیں۔ یا والدین میں سے ایک بیجا نازبرداری اور دوسرا غیر ضروری سختی کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ اپنے بڑوں کیساتھ صحیح اور مستحکم تعلقات قائم نہیں کر سکتا، اور اسوجہ سے ان کی صحبت کے عمدہ اثرات سے بھی مستفید نہیں ہو سکتا۔ کچھ عرصہ بعد جب بچہ بڑا ہو کر نوجوانی کی منزل میں قدم رکھتا ہے تو یہ قباحت پیدا ہوتی ہے کہ والدین اور گھر کے دوسرے لوگ ان تبدیلیوں اور انقلابات کی پوری اہمیت کو نہیں سمجھتے جو اس زمانہ میں ہوتے ہیں۔ اسوقت بھی وہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کیساتھ وہی سلوک کرنا چاہتے ہیں جو بچوں کیساتھ کیا جاتا ہے۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ اب ان کو زیادہ آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل حاصل ہونا چاہئیے اور بجائے تحکمانہ برتاؤ کے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا زمانہ آگیا ہے۔"

اس اقتباس سے کتاب زیر تنقید کی تمام خوبیاں واضح ہو جاتی ہیں۔ کتاب کی سلیس و عام فہم زبان کا بھی یہ اچھا خاصہ نمونہ ہے اور تربیت اطفال کے جو عمدہ اصول بیان کئے گئے ہیں انکا بھی ان سے پورا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اسکی سلیس و عام فہم زبان اُردو مصنفین و مؤلفین کیلئے ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔ اسی قسم کی زبان مقبول عام ہو سکتی ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں ان تعلیمی مسائل سے بحث کی گئی ہے جو موجودہ زمانہ کی بدولت پیدا ہو گئے ہیں۔ اسی سلسلہ میں لائق مصنف نے تعلیم کے نتائج سے بحث کی ہے تاکہ معلّموں کو اپنے کام کی اہمیت اور حیثیت ذہن نشین ہو جائے دوسرے حصہ میں ذہنی، جسمانی تربیت و نصاب تعلیم وغیرہ سے بحث کی گئی ہے اور عملی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ تیسرے حصہ میں اخلاقی اور معاشرتی تربیت کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔ اور بتایا گیا ہے کہ ہر طرح کی تعلیم کا اصلی مقصد

[illegible]

یادِ رفتگان

پچھلے چند ماہ کے اندر زمانہ کے کئی قدردان اور اُردو ادب کے کئی محسن ہمکو داغ مفارقت دے گئے۔ خان بہادر حافظ ہدایت صاحب بیرسٹر ایم۔ ایل۔ سی۔ اور کرنل بھولا ناتھ صاحب آئی۔ ایم۔ ایس دونوں اپنے وقت کے بہترین ہندوستانیوں میں شمار ہوتے تھے۔ دونوں گورنمنٹ سے عزت یافتہ تھے دونوں کو شارہ ہند کا معزز خطاب مل چکا تھا۔ حافظ صاحب صوبہ متحدہ ضلع فتحپور کے رہنے والے تھے۔ انگلستان سے واپسی کے بعد وہ صوبہ متوسط میں منصفی کے عہدہ پر ممتاز ہوئے، مگر بعد چندے کانپور آکر بیرسٹر کی حیثیت سے آباد ہو گئے۔ ... میں فروغ حاصل کرنیکے بعد وہ صوبہ کی قانونی کونسل میں داخل ہو کر قومی تحریکوں میں اپنا وقت دینے لگے۔ انکی کونسل ممبری جداگانہ طریقہ نیابت جاری ہونیکے بعد شروع ہوئی اس لیے ان کی بیشتر توجہ مسلم مطالبات کی تائید پر مبذول رہی حتیٰ کہ کونسل میں وہ مسلم گروپ کے زبردست لیڈر تھے۔ اور گول میز کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں بھی اسی حیثیت سے شریک ہوئے۔ لیکن نجی زندگی میں ہندو مسلمان دوستوں کے ساتھ ان کا برتاؤ ہمیشہ یکساں رہا اور سوشل تعلقات یا پرائیویٹ معاملات میں انھیں مختلف طبقات کے دوستوں کا یکساں اعتماد حاصل تھا۔ انھوں نے قدرت سے مرنجاں مرنج طبیعت پائی تھی۔ احباب کی خدمت و خیرخواہی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ سیاسی حیثیت سے انکا طرز عمل کانگریس کے برعکس اور عموماً ہندو لیڈروں سے علیحدہ رہتا تھا لیکن نجی معاملات میں انکے ہندو دوستوں کو شاید ہی کبھی شکایت کا موقع ملا ہو چھوٹے چھوٹے بیسیوں ترقی ان انھوں نے اپنے کانگریسی دوستوں کی امداد کی ہو گی۔ ہندو دوستوں کی تعداد بھی کم نہ تھی اور جس خلوص و محبت سے وہ ان سے ملتے تھے اس سے انکی نیک نفسی و بزرگی ثابت ہوتی تھی۔ بظاہر انگریزی وضع سے رہنے کے باوجود وہ عملی حیثیت سے نہایت سادہ اور بلند خیالی کی زندگی بسر کرتے تھے سودیشی تحریک کے بھی بڑے حامی تھے۔ اور کاڑھا وغیرہ بکثرت استعمال کرتے تھے۔ ان کے مزاج میں شوق یا آرام طلبی کو مطلق دخل نہ تھا۔ معلومات حاصل کرنیکا انھیں بڑا ذوق تھا دن رات مطالعہ کتاب و اخبار بینی میں مصروف رہتے تھے۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تحریر و تقریر کی انھیں غیر معمولی مہارت تھی۔ بڑی بڑی کانفرنسوں کے ایڈریس وہ قلم برداشتہ لکھ ڈالتے تھے۔ اردو ادب کی ترقی سے خاص دلچسپی تھی اور شاید اسی وجہ سے زمانہ کے ایڈیٹر پر ہمیشہ انکی خاص عنایتیں رہیں۔ رسالہ کی امداد کے لیے بھی وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے

گو ہم نے اس قسم کی کبھی کوئی تکلیف نہین دی۔ لیکن اُن کی ذات بابرکات سے زمانہ کو ہمیشہ بڑی تقویت حاصل رہی۔

اس طرف آپ ہندو مسلمانون کے سیاسی اتفاق کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ محسوس کرنے لگے تھے اور اس کے لیے خاص کوشش کرنے کا بھی ارادہ رکھتے تھے مگر افسوس زندگی نے وفا نہ کی۔ آخری بار لندن سے واپسی کے بعد کثرت کار سے آپ کی صحت مستقل طور پر خراب ہو گئی۔ اور باوجود علاج طبیعت درست نہوئی۔ آخر ۱۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو قلب کی حرکت بند ہو جانے سے دفعۃً عالم جاودانی ہو گئے۔ افسوس!

کرنل بھولا ناتھ صاحب کی ناگہانی وفات بھی قلب کی حرکت بند ہو جانے سے لاہور مین ہوئی آپ پچھلے سال آل انڈیا میڈیکل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اور آپ کی صدارتی تقریر اپنی اولوالعزمی اور آزاد خیالی دونون لحاظ سے سیاسی طبقون اور طبی حلقون مین خاص طور پر پسند کی گئی تھی۔ آپ انڈین میڈیکل سروس کے ممتاز رکن تھے اور اسکی انتہائی منزل تک ترقی کرکے ریٹائر ہوئے تھے۔ آپ نے جنگ کے زمانہ مین عراق و عرب کے محاذ پر غیر معمولی مشکلات کی موجودگی مین قابل قدر طبی خدمات انجام دی تھین جس کے صلے مین گورنمنٹ ہند نے آپکو سی۔ آئی۔ ای کا معزز خطاب عطا فرمایا تھا۔ آپ ایک صاف گو افسر تھے۔ اور ملازمت کی پابندیون کے باوجود حق بات اور اصول کے معاملے مین بڑے سے بڑے سرکاری افسرون سے لڑ جاتے تھے۔ میڈیکل سروس مین محض اپنی قابلیت کے زور پر ترقی کے مدارج طے کئے تھے ملازمت کے دوران مین آپ کو بعض عہدہ دارون کے تعصبات کا بھی مقابلہ کرنا پڑا تھا مگر آپ نے مقابلے سے کبھی گریز نہین کیا۔ اور خوشامد اور تملق سے ہمیشہ دور رہے۔ اپنی خودداری قایم رکھنے کے لیے آپ ہر قت ایثار کیلئے بھی تیار رہتے تھے۔ اردو فارسی زبان کے بڑے ماہر و قدردان تھے۔ یورپ کے علاوہ آپ تمام بلاد اسلامیہ کا مفصل دورہ کر چکے تھے۔ جس سے آپ کو مسلم معاشرت کا خاص تجربہ حاصل تھا۔ مصری۔ ایرانی اور ترکی لٹریچر سے بھی آپ کو خاصی واقفیت اور انگریزی طریق علاج کے ماہر ہونیکے علاوہ آپ کو یونانی اور آیورویدک طریقون سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ درحقیقت آپ علم و فن کے بڑے قدردان تھے۔ اردو ادب کے آپ خاص طور پر دلدادہ تھے اور تصوف و فلسفہ سے آپ کو دلی لگاؤ تھا۔ زمانہ کی پرانی جلدون مین آپ کے کئی بلند پایہ مضامین شایع ہو چکے ہین۔ آپ نے کئی ضخیم اور قابل قدر کتابین بھی لکھین جس مین سے علم و عمل خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ زمانہ پر آپ کی خاص نظر عنایت تھی۔ کئی سال تک آپ نے اسکی بیس کاپیان خرید کر مستحقین مین تقسیم کین۔ دو ایک موقعون پر آپ اس سے ناراض بھی ہو گئے۔ لیکن یہ ناراضگی ہمیشہ عارضی ثابت ہوئی اور چند دنون بعد آپ کے لطف و کرم کا سلسلہ پھر اسی طرح جاری ہو گیا۔ آپ سچے محب وطن اور آزاد خیال و صاف باطن بزرگ تھے۔ اور علم و ہنر کی قدردانی اپنا فرض سمجھتے تھے۔

پچھلے سال آپ نے میڈیکل ایسوسی ایشن کے توسیع مقاصد کے خاطر تمام ہندوستان کا دورہ کیا۔ غرض جو کام ہاتھ میں لیتے اُسے پوری قوت کے ساتھ انجام دیتے، اور جس تحریک کو شروع کرتے اسکو انتہائی منزل تک پہونچانے کے لئے مستعد ہو جاتے تھے۔ وطن کی محبت اور اہل قلم کی عزت آپ کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ہر ایک سے کشادہ دلی سے ملتے۔ خانگی زندگی میں آپکو اکثر مشکلات سے سامنا رہا جسکی وجہ سے آپ آخر میں کسی قدر دل گرفتہ رہنے لگے تھے۔ چند ماہ پیشتر آپ کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تھا جس کا آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ افسوس اب آپکی خدمات سے بھی ملک محروم ہو گیا۔

اردو شعرا اور مصنفین میں دو موتین بہت افسوسناک ہوئی ہیں۔ علامہ راشد الخیری اور حضرت ثاقب دونوں اردو زبان کے محسن تھے۔ مولانا راشد الخیری ایک مشہور و معروف صاحب طرز مصنف تھے۔ انھوں نے بیسیوں قابل قدر تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں جس خلوص و دلسوزی سے انھوں نے مسلمانوں میں تعلیم نسوان کی تحریک جاری کی جس استقلال و پامردی کے ساتھ انھوں نے عورتوں کے حقوق کی وکالت کی۔ انکی روزمرہ مصائب کا جو درد انگیز نقشہ اپنے افسانوں میں کھینچا وہ اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیگا۔ اس معنی میں مولانا مرحوم کو ایک مصلح اعظم کی حیثیت حاصل تھی۔ شروع سے آخر تک وہ طبقہ نسوان کے زبردست ہمدرد تھے۔ البتہ ہندوستان کی عورتوں کو مشرقی روایات کے ماتحت ہی ترقی و ناموری حاصل کرنیکا موقعہ دینا چاہتے تھے مغربیت سے انھیں کوئی اُنس نہ تھا۔ مذہب کے بھی دل سے پابند تھے۔ عورتوں کو تمام شرعی حقوق دلانے کے طرفدار تھے۔ لیکن معاشرت خیالات و جذبات ہر لحاظ سے یہی چاہتے تھے کہ وہ مشرقی اوصاف سے بیگانہ نہ ہونے پائیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کلیہ ملک کے حسب حال نہیں ہے۔ کم سے کم عوام کے لیے تو اصلاح و ترقی کا یہی راستہ بہتر ہے۔ اور [illegible] درجے کے ہندوستانیوں کی [illegible] میں عافیت ہے۔

مولانا راشد الخیری کی وضعداری۔ انکی نیک نفسی اور جفاکشی ضرب المثل تھی۔ انھوں نے اردو ادب کی اہم خدمات انجام دی ہیں جن کے بار احسان سے اُردو زبان کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی انکی ادبی خدمات کے متعلق ہم اسی نمبر میں ایک مضمون شایع کر رہے ہیں۔ اُردو کے لیے یہ خوش نصیبی کی بات ہے کہ مولانا مرحوم کی لایق و سعادتمند اولاد کے بدولت انکی قابل قدر ادبی خدمات کا سلسلہ آئندہ بھی ترقی کے ساتھ جاری رہیگا مولوی رازق الخیری صاحب مولانا کے بڑے صاحبزادے اُن کے مشہور رسالہ عصمت کے ایڈیٹر ہیں۔ اور ان کے چھوٹے بھائی صادق الخیری صاحب رسالہ جوہر نسوان کے ذمہ دار ہیں۔ دونوں پرچے اپنی اپنی جگہہ تعلیم نسوان کی توسیع و ترقی میں مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔

منشی مہاراج بہادر برق دہلوی کی ناگہانی وفات سے جدید اردو شاعری کو جو صدمہ پہونچا ہے۔ اس کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی — آپ کی ذات سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ آپ کی زندگی کا بڑا حصہ کشمکش حیات کے مقابلے میں گذرا۔ اب ذرا اطمینان کی صورت بندھی تھی تو مرگ بے ہنگام نے آپ کو ہم سے چھین لیا۔ اس سانحہ عظیم کا کہانتک ماتم کیا جائے۔ چکبست۔ سرور۔ رواں کے بعد آپ ہی طرف آنکھیں اُٹھتی تھیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا کلام محاسن ظاہر و باطن دونوں سے آراستہ تھا۔ اُردو شاعری جس قید و بند میں گرفتار ہے اس لحاظ سے اس میں زمانہ حال کی ضروریات کے لحاظ سے غیر معمولی مشکلات کا سامنا ہے۔ لیکن آپ جس آسانی سے ان تمام مشکلات پر حاوی آجاتے تھے۔ اس سے آپ کے کمال فن اور استادانہ مہارت کا پورا ثبوت ملتا تھا۔ غزل کے میدان میں بھی آپ اپنے بہترین معاصرین کے ہمدوش تھے اور مسلسل نظموں میں آپنے ہندوستانی شعرا کے سامنے جو قابل قدر نمونے پیش کئے وہ اُردو ادب میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ سرور کی طرح آپ نے بھی قدیم ہندوستان کے شجاعانہ کارناموں کے متعلق کئی قابل ذکر نظمیں لکھیں۔ راماین و مہابھارت کے بہت سے واقعات اس خوبی سے نظم کئے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ہم کو آپ کے بڑھتے ہوئے زور قلم سے بڑی بڑی اُمیدیں تھیں۔ افسوس اب یہ سب ناتمام رہ گئیں۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بہرحال مشیت ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے۔ زمانہ کے ساتھ مرحوم کا تعلق بہت پرانا تھا۔ آپ کی بعض بہترین نظمیں اسمیں شایع ہو چکی ہیں۔ موت سے چند ہی روز پہلے آپ نے اپنے نئے مکان میں سکونت پذیر ہونے کی اطلاع دیکر تبدیل پتہ کی ہدایت کی تھی۔ کیا معلوم تھا کہ یہ آخری تحریر ہے جس کے بعد دنیا میں آپ کا پتہ ہی نہ رہے گا۔

افسوس انسانی زندگی کیسی بے اعتبار اور بے حقیقت ہے۔ خداوند تعالیٰ آپ کی روح پُرفتوح کو غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔



ہز اِکسیلنسی لارڈ لنلتھگو گورنر جنرل و وایسرائے ہند

زمانہ

جلد ۶۵ — اپریل ۱۹۳۶ء — نمبر ۴

ادب کی غرض و غایت[۱]

(از منشی پریم چند بی اے پریسیڈنٹ آل انڈیا پروگریسو رائٹرس کانفرنس لکھنؤ)

حضرات! یہ جلسہ ہماری ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ ہمارے سمیلنوں اور انجمنوں میں ابتک عام طور پر زبان اور اُس کی اشاعت سے بحث کی جاتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ اُردو اور ہندی کا ابتدائی لٹریچر جو موجود ہے اُس کا منشا خیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں تھا بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا۔ وہ بھی نہایت ہی اہم کام تھا۔ جبتک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کرلے اُس میں خیالات اور جذبات ادا کرنے کی طاقت ہی کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے پائنیروں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کرکے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لئے ہم اُن کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی۔ لیکن زبان ذریعہ ہے منزل نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کرلی ہے کہ ہم زبان سے گذر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اس پر غور کریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیونکر پورا ہو۔ وہی زبان جس میں ابتداءً باغ و بہار اور بیتال پچیسی کی تصنیف ہی معراج کمال تھی اب اس قابل ہوگئی ہے کہ علم اور حکمت کے مسائل بھی ادا کرے۔ اور یہ جلسہ اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔ زبان بول چال کی بھی ہوتی ہے اور تحریر کی بھی۔ بول چال کی زبان تو میر امن اور للولال کے زمانہ میں بھی موجود تھی۔ انھوں نے جس زبان کی داغ بیل

---

[۱] ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ ۱۰۔اپریل ۱۹۳۶ء میں یہ مضمون صدارتی خطبہ کی حیثیت سے پڑھا گیا۔

والی وہ تحریر کی زبان تھی، اور وہی ادب ہے۔ ہم بول چال سے اپنے قریب کے لوگوں سے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں، اپنی خوشی یا رنج کے جذبات کا نقشہ کھینچتے ہیں، ادیب وہی کام تحریر سے کرتا ہے۔ ہاں اس کے سننے والوں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور اگر اس کے بیان میں حقیقت اور سچائی ہے تو صدیوں اور قرنوں تک اس کی تحریریں دلوں پر اثر کرتی رہتی ہیں۔ میرا یہ منشا نہیں کہ جو کچھ سپردِ قلم ہو جائے وہ سب کا سب ادب ہے۔ ادب اُسی تحریر کو کہیں گے جس میں حقیقت کا اظہار ہو، جس کی زبان پختہ، شستہ اور لطیف ہو۔ اور جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو۔ اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کئے گئے ہوں۔ طلسماتی حکایتوں یا بھوت پریت کے قصوں یا شہزادوں کے حسن و عشق کی داستانوں سے ہم کسی زمانہ میں متاثر ہوئے ہوں لیکن اب اُن میں ہمارے لئے بہت کم دلچسپی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرت انسانی کا ماہر ادیب شہزادوں کے حسن و عشق اور طلسماتی حکایتوں میں بھی زندگی کی حقیقتیں بیان کر سکتا ہے اور ان میں حسن کی تخلیق کر سکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی اسی حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ لٹریچر میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار ہو۔ پھر اُسے آپ جس پس منظر میں چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ چڑے کی حکایت یا گُل و بلبل کی داستان بھی اس کے لئے موزوں ثابت ہو سکتی ہیں۔

ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقیدِ حیات ہے۔ چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو، یا افسانوں کی، یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیئے۔ ہم جس دور سے گذرے ہیں اُسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخیلات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے۔ کہیں فسانہ عجائب کی داستان تھی، کہیں بوستان خیال کی اور کہیں چندر کانتا سنتتی کی۔ ان داستانوں کا منشا محض دل بہلاؤ تھا اور ہمارے جذبۂ حیرت کی تسکین۔ لٹریچر کا زندگی سے کوئی تعلق ہے، اس میں کلام ہی نہ تھا، بلکہ وہ مسلم تھا، قصہ قصہ ہے، زندگی زندگی، دونوں متضاد چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ شعراء پر بھی انفرادیت کا رنگ غالب تھا۔ عشق کا معیار نفس پروری تھا اور حسن کا دیدہ زیبی۔ انھیں جنسی جذبات کے اظہار میں شعرا اپنی جدت اور جولانی کے معجزے دکھاتے تھے۔ شعر میں کسی نئی بندش، یا نئی تشبیہ یا نئی پرواز کا ہونا داد پانے کے لئے کافی تھا۔ چاہے وہ حقیقت سے کتنی ہی

بعید کیوں نہ ہو۔ یاس اور درد کی کیفیتیں، آشیانہ اور قفس، برق اور خرمن کے تخیل میں اس خوبی سے دکھائی جاتی تھیں کہ سننے والے دل تھام لیتے تھے، اور آج بھی وہ شاعری کس قدر مقبول ہے اسے ہم اور آپ خوب جانتے ہیں، بیشک شعر اور ادب کا منشا ہمارے احساس کی شدت کو تیز کرنا ہے۔ لیکن انسان کی زندگی محض جبنسی نہیں ہے۔ کیا وہ ادب جس کا موضوع جبنسی جذبات اور اُن سے پیدا ہونے والے درد و یاس تک محدود ہو یا جس میں دنیا اور دنیا کی مشکلات سے کنارہ کش ہونا ہی زندگی کا ماحصل سمجھا گیا ہو۔ ہماری ذہنی اور جذباتی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے؟ جنسیت انسان کا ایک جزو ہے اور جس ادب کا بیشتر حصہ اسی سے متعلق ہو وہ اس قوم اور اس زمانہ کے لئے فخر کا باعث نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے صحیح مذاق ہی کی شہادت دے سکتا ہے۔ کیا ہندی اور کیا اُردو شاعری، دونوں کی ایک ہی کیفیت ہے۔ اس وقت ادب اور شاعری کا جو مذاق تھا اُس کے اثر سے بے نیاز ہونا آسان نہ تھا۔ تحسین اور قدردانی کی ہوس تو ہر ایک کو ہوتی ہے۔ شعرا کے لئے اپنا کلام ہی ذریعہ معاش تھا۔ اور کلام کی قدردانی، رؤسا اور اُمرا کے سوا اور کون کر سکتا۔ ہمارے شعرا کو عام زندگی کا سامنا کرنے اور اس کی حقیقتوں سے متاثر ہونے کے لئے یا تو موقعے ہی نہ تھے۔ یا ہر خاص و عام پر ایسی ذہنی پستی چھائی ہوئی تھی کہ ذہنی اور شعوری زندگی رہ ہی نہ گئی تھی۔ ہم اس وقت کے ادیبوں پر اس کا الزام نہیں رکھ سکتے۔ ادب اپنے زمانہ کا عکس ہوتا ہے۔ جو جذبات اور خیالات لوگوں کے دلوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں، وہی ادب میں بھی اپنا سایہ ڈالتے ہیں۔ ایسی پستی کے زمانہ میں یا تو لوگ عاشقی کرتے ہیں یا تصوف اور ویراگ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس دور کی شاعری اور ادب دونوں اسی قسم کے ہیں۔ جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی غالب ہو اور ایک ایک لفظ یاس اور شکوۂ روزگار اور معاشقہ میں ڈوبا ہوا ہو تو سمجھ لیجئے کہ قوم جمود اور انحطاط کا شکار ہو چکی ہے اور اس میں سعی اور اجتہاد کی قوت باقی نہیں رہی اور اُس نے درجات عالیہ کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں، اور مشاہدے کی قوت غائب ہو گئی ہے۔

مگر ہمارا ادبی مذاق بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے، ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے۔ وہ اب محض عشق اور عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے، ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے، وہ اب تحریک یا ابہام کیلئے حیرت انگیز واقعات تلاش نہیں کرتا یا قافیہ کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا۔ بلکہ اس کو اُن مسائل

سے دلچسپی ہے جن سے سوسائٹی یا سوسائٹی کے افراد متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی فضیلت کا موجودہ معیار جذبات کی وہ شدت ہے جس سے وہ ہمارے جذبات اور خیالات میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ اخلاقیات اور ادبیات کی منزل مقصود ایک ہے صرف اُن کے طرز خطاب میں فرق ہے۔ اخلاقیات دلیلوں اور نصیحتوں سے عقل اور ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے ادب نے اپنے لئے کیفیات اور جذبات کا دائرہ چن لیا ہے۔ ہم زندگی میں جو کچھ دیکھتے ہیں یا ہم پہ جو کچھ گذرتی ہے وہی تجربات اور وہی چوٹیں تخیل میں جاکر تخلیق ادب کی تحریک کرتی ہیں شاعر یا ادیب میں جذبات کی جتنی ہی شدت احساس ہوتی ہے اُتنا ہی اُس کا کلام دلکش اور بلند ہوتا ہے۔ جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح نہ بیدار ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے ہم میں قوت اور حرکت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے۔ جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لئے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لئے بیکار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا زمانہ قدیم میں مذہب کے ہاتھ میں سوسائٹی کی لگام تھی۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی تہذیب مذہبی احکام پر مبنی تھی، اور وہ تخویف یا تحریص سے کام لیتا تھا۔ عذاب و ثواب کے مسائل اُس کے آلۂ کار تھے۔ اب ادب نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی ہے، اور اس کا آلۂ کار ذوق حسن ہے۔ وہ انسان میں اسی ذوق حسن کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کوئی انسان نہیں جس میں حسن کا احساس نہ ہو۔ ادیب میں یہ ذوق جتنا ہی بیدار اور پُر عمل ہوتا ہے اتنی ہی اُس کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے۔ فطرت کے مشاہدے اور اپنی ذکاوت احساس کے ذریعے اس میں جذبۂ حسن کی اتنی تیزی ہو جاتی ہے کہ جو کچھ قبیح ہے۔ غیر مستحسن ہے انسانیت سے خالی ہے، وہ اس کے لئے ناقابل برداشت بن جاتا ہے۔ نیز وہ بیان اور جذبات کی ساری قوت سے وار کرتا ہے۔ یوں کہیئے کہ وہ انسانیت کا، علویت کا، شرافت کا علم بردار ہے۔ جو پامال ہیں، مظلوم ہیں، محروم ہیں، چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت، اُن کی حمایت اور وکالت اس کا فرض ہے۔ اُس کی عدالت سوسائٹی ہے۔ اسی عدالت کے سامنے وہ اپنا استغاثہ پیش کرتا ہے۔ اور عدالت کے احساس حق اور انصاف اور جذبۂ حسن کی تالیف کرکے اپنی کوشش کو کامیاب سمجھتا ہے۔ مگر عام وکلا کی طرح وہ اپنے مؤکل کی جانب سے جا و بیجا دعوے نہیں پیش کرتا، مبالغہ سے کام نہیں لیتا۔ اختراع نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ ان ترکیبوں سے وہ سوسائٹی کی عدالت کو متاثر نہیں کرسکتا۔ اس عدالت کی تالیف جبھی ممکن ہے جب آپ

حقیقت سے ذرا بھی منحرف نہ ہوں ورنہ عدالت آپ سے بدظن ہو جائیگی اور آپ کے خلاف فیصلہ سُنا دیگی۔ وہ افسانہ لکھتا ہے مگر واقعیت کے ساتھ، وہ ایک مجسمہ بناتا ہے مگر اس طرح کہ اس میں حرکت بھی ہو اور قوتِ اظہار بھی ہو، وہ فطرت انسانی کا باریک نظروں سے مشاہدہ کرتا ہے، نفسیات کا مطالعہ کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کے کیرکٹر ہر حالت میں اور ہر موقع پر اس طرح برتاؤ کریں جیسے گوشت پوست کے انسان کرتے ہیں۔ وہ اپنی طبعی ہمدردی اور حُسن پسندی سے زندگی کے اُن نکات پر جا پہونچتا ہے جہاں انسان اپنی انسانیت سے معذور ہو جاتا ہے۔ اور واقعہ نگاری کا رجحان یہاں تک روبہ ترقی ہے کہ آج کا افسانہ ممکن حد تک مشاہدے سے باہر نہیں جاتا۔ ہم محض اس خیال سے تسکین نہیں پاتے کہ نفسیاتی اعتبار سے یہ سبھی کیرکٹر انسانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ بلکہ ہم یہ اطمینان چاہتے ہیں کہ وہ واقعی انسان ہیں، اور مصنف نے حتی الامکان اُن کی سوانحعمری لکھی ہے۔ کیونکہ تخیل کے انسان میں ہمارا عقیدہ نہیں۔ ہم اس کے فعلوں اور خیالوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ ہمیں یہ تحقیق ہو جانا چاہیئے کہ مصنف نے جو تخلیق کی ہے وہ مشاہدات کی بنا پر۔ یا وہ خود اپنے کیرکٹروں کی زبان سے بول رہا ہے۔ اسی لئے ادب کو بعض نقادوں نے مصنف کی نفسیاتی سوانحعمری کہا ہے۔ ایک ہی واقعہ یا کیفیت سے سبھی انسان یکساں طور پر متاثر نہیں ہوتے، ہر شخص کی ذہنیت اور زاویہ نظر الگ ہے۔ مصنف کا کمال اسی میں ہے کہ وہ جس ذہنیت یا زاویہ سے کسی امر کو دیکھے ہمیں اُس کا پڑھنے والا بھی اُس کا ہم خیال ہو جائے، یہی اُس کی کامیابی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم ادیب سے یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ وہ اپنی بیدار مغزی سے، اپنی وسعت خیال سے ہمیں بیدار کرے، ہم میں وسعت پیدا کرے۔ اس کی نگاہ اتنی باریک، اتنی گہری اور اتنی وسیع ہو کہ ہمیں اُس کے کلام سے روحانی سرور اور تقویت حاصل ہو۔

بہتر بننے کی تحریک ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ ہم میں جو کمزوریاں ہیں وہ کسی مرض کی طرح چمٹی ہوئی ہیں جیسے جسمانی تندرستی ایک فطری امر ہے اور بیماری بالکل غیر فطری۔ اسی طرح اخلاقی اور ذہنی صحت بھی فطری بات ہے اور ہم ذہنی اور اخلاقی پستی سے اسی طرح مطمئن نہیں ہوتے جیسے کوئی مریض اپنے مرض سے مطمئن نہیں ہوتا ہے۔ جیسے وہ ہمیشہ کسی طبیب کی تلاش میں رہتا ہے اُسی طرح ہم بھی اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی کمزوریوں کو پرے پھینک کر بہتر انسان بن جائیں۔ اسی لئے ہم سادھو اور فقیروں کی جستجو کرتے ہیں، پوجا پاٹ کرتے ہیں، بزرگوں کی صحبت

بیٹھتے ہیں، علما کی تقریریں سنتے ہیں اور ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور ہماری ساری کمزوریوں کی ذمہ دار ہماری بدمذاقی اور محبت کے جذبہ سے محروم ہونا ہے جس میں صحیح ذوق حسن ہے جس میں محبت کی وسعت ہے وہاں کمزوریاں کہاں رہ سکتی ہیں۔ محبت ہی تو روحانی غذا ہے اور ساری کمزوریاں اسی غذا کے نہ ملنے سے یا مضر غذا کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ آرٹسٹ ہم میں حسن کا احساس پیدا کرتا ہے اور محبت گرمی، اس کا ایک فقرہ، ایک لفظ، ایک کنایہ اس طرح ہمارے اندر جا بیٹھتا ہے کہ ہماری روح روشن ہو جاتی ہے، مگر جب تک آرٹسٹ خود جذبۂ حسن سے سرشار نہ ہو اور اس کی روح خود اس نور سے منور نہ ہو تو ہمیں یہ روشنی کیونکر عطا کر سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ حسن کیا شئے ہے؟ بظاہر یہ ایک مہمل سا سوال معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حسن کے متعلق ہمیں کسی طرح کا شبہ نہیں ہے۔ ہم نے آفتاب کا طلوع و غروب دیکھا ہے، شفق کی سرخی دیکھی ہے، خوشنما اور خوشبودار پھول دیکھے ہیں، خوشنوا چڑیاں دیکھی ہیں، نغمہ خواں ندیاں دیکھی ہیں، ناچتے ہوئے آبشار دیکھے ہیں۔ اور یہی حسن ہے۔ ان نظاروں سے ہماری روح کیوں کھل اٹھتی ہے؟ اس لئے کہ ان میں رنگ یا آواز کی ہم آہنگی ہے، سازوں کی ہم آہنگی ہی سنگیت کی دلکشی کا باعث ہے۔ ہماری ترکیب ہی عناصر کے توازن سے ہوئی ہے اور ہماری روح ہمیشہ اسی توازن، اسی ہم آہنگی کی تلاش کرتی ہے ادب آرٹسٹ کی روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے۔ اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے، تخریب نہیں۔ وہ ہم میں وفا اور خلوص اور ہمدردی اور انصاف اور مساوات کے جذبات کی نشو و نما کرتی ہے۔ جہاں یہ جذبات ہیں، وہیں استحکام ہے، زندگی ہے، جہاں ان کا فقدان ہے وہیں افتراق، خود پروری ہے، اور نفرت اور دشمنی ہے اور موت ہے۔ یہ افتراق غیر فطری زندگی کی علامتیں ہیں جیسی بیماری غیر فطری زندگی کی، جہاں فطرت سے مناسبت اور توازن ہے وہاں تنگ خیالیوں اور خود غرضیوں کا وجود کیسے ہوگا۔ جب ہماری روح فطرت کی کھلی ہوئی فضا میں نشو و نما پاتی ہے تو خباثتِ نفس کے جراثیم خود بخود ہوا اور روشنی سے مر جاتے ہیں۔ فطرت سے الگ ہو کر اپنے کو محدود کرنے سے ہی یہ ساری ذہنی اور جذباتی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں اسی کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ یہی اس کا مقصد اولیٰ ہے۔

ترقی پسند مصنفین کا عنوان میرے خیال میں ناقص ہے، ادب یا آرٹسٹ طبعاً اور خلقتاً

ترقی پسند ہوتا ہے۔ اگر یہ اس کی فطرت نہ ہوتی تو شاید وہ ادیب نہ ہوتا، وہ آئیڈیلیسٹ ہوتا ہے، اُسے اپنے اندر بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے اور باہر بھی۔ اسی کمی کو پُورا کرنے کے لئے اس کی روح بیقرار رہتی ہے۔ وہ اپنے تخیل میں فرد اور جماعت کو مسرت اور آزادی کی جس حالت میں دیکھنا چاہتا ہے وہ اُسے نظر نہیں آتی۔ اس لئے موجودہ ذہنی اور اجتماعی حالتوں سے اس کا دل بیزار ہوتا ہے۔ وہ ان ناخوشگوار حالات کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہے تاکہ دنیا جینے اور مرنے کے لئے بہتر جگہ ہو جائے۔ یہی درد اور یہی جذبہ اُس کے دل ودماغ کو سرگرم کار رکھتا ہے، اُس کا حساس دل اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک جماعت کیوں معاشرت اور رسوم کے قیود میں جکڑ کر اذیت پاتی رہے۔ کیوں نہ وہ اسباب مہیّا کئے جائیں کہ وہ غلامی اور عسرت سے آزاد ہو۔ وہ اس درد کو جتنی بیتابی کے ساتھ محسوس کرتا ہے اتنا ہی اُس کے کلام میں زور اور خلوص پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کو جس تناسب سے ادا کرتا ہے وہی اس کے کمال کا راز ہے۔ مگر شاید اس تخصیص کی ضرورت اس لئے پڑتی کہ ترقی کا مفہوم ہر ایک مصنف کے ذہن میں ایکساں نہیں ہے۔ جن حالات کو ایک جماعت ترقی سمجھتی ہے انھیں کو دوسری جماعت عین زوال سمجھ سکتی ہے اسلئے ادیب اپنے آرٹ کو کسی مقصد کے تابع نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے خیال میں آرٹ صرف جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ ان جذبات سے فرد یا جماعت پر خواہ کیسا ہی اثر پڑے ترقی کا ہمارا مفہوم وہ صورت حالات ہے جس سے ہم میں استحکام اور قوت عمل پیدا ہو، جس سے ہمیں اپنی خستہ حالی کا احساس ہو، ہم دیکھیں کہ ہم کن داخلی اور خارجی اسباب کے زیر اثر اس جمود اور انحطاط کی حالت کو پہونچ گئے ہیں، اور انھیں دُور کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے لئے وہ شاعرانہ جذبات بے معنی ہیں جن سے دنیا کی بے ثباتی ہمارے دل پر اور زیادہ مسلط ہو جائے، جن سے ہمارے دلوں پر مایوسی طاری ہو جائے۔ وہ حسن و عشق کی داستانیں جن سے ہمارے رسائل بھرے ہوتے ہیں ہمارے لئے بے معنی ہیں اگر وہ ہم میں حرکت اور حرارت نہیں پیدا کرتے۔ اگر ہم نے دو نوجوانوں کے حسن و عشق کی داستان کہہ ڈالی، مگر اس سے ہمارے ذوق حسن پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اور پڑا بھی تو صرف اتنا کہ ہم اُن کی ہجر کی تکلیفوں پر روئے تو اس سے ہم میں کون سی ذہنی یا ذوقی حرکت پیدا ہوئی ان باتوں سے کسی زمانہ میں ہم کو وجد آیا ہو مگر آج کے لئے وہ بیکار ہے۔ اس جذباتی آرٹ کا زمانہ اب نہیں رہا۔ اب تو ہمیں اُس آرٹ کی ضرورت ہے جس میں عمل کا پیغام ہو۔ اب تو

حضرت اقبال کے ساتھ ہم بھی کہتے ہیں:-

رمز حیات جوئی؟ جز در تپش نیابی — در قلزم آرمیدن ننگ است آب جو را

بہ آشیاں نہ نشینم ز لذت پرواز — گہے بشاخ گلم گاہ برلب جو ئم

چنانچہ ہمارے مشرب میں داخلیت وہ شے ہے جو جمود پستی اور سہل انگاری کی طرف لے جاتی ہے، اور ایسا آرٹ ہمارے لئے نہ انفرادی حیثیت سے مفید ہے اور نہ اجتماعی حیثیت سے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کے میزان پر تولتا ہوں۔ بیشک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہے، اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے۔ لیکن ایسی کوئی ذوقی، معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شے ہے، اور ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی ہے اور غم بھی۔ آسماں پر چھائی ہوئی شفق بیشک نہایت خوشنما نظارہ ہے۔ لیکن اساڑھ میں اگر آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ ہمارے لئے خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے۔ اس وقت تو ہم آسمان پر کالی کالی گھٹائیں دیکھکر ہی مسرور ہوتے ہیں۔ پھولوں کو دیکھکر ہم اس لئے محظوظ ہوتے ہیں کہ ان سے پھل کی امید ہوتی ہے، فطرت سے ہم آہنگی اسی لئے ہماری روحانی مسرت کا باعث ہے کہ اس سے ہمیں زندگی میں نمو اور تقویت ملتی ہے فطرت کا قانون نمو اور ارتقا ہے، اور جن جذبات، کیفیات یا خیالات سے ہمیں مسرت ہوتی ہے، وہ اسی نمو کے معاون ہیں۔ آرٹسٹ اپنے آرٹ سے حسن کی تخلیق کرکے اسباب اور حالات کو بالیدگی کے لئے سازگار بناتا ہے۔

مگر حسن بھی اور چیزوں کی طرح مطلق نہیں، اس کی حیثیت بھی اضافی ہے، ایک رئیس کے لئے جو چیز مسرت کا باعث ہے وہی دوسرے کے لئے رنج کا سبب ہو سکتی ہے۔ ایک رئیس اپنے شگفتہ و شاداب باغیچہ میں بیٹھکر چڑیوں کے نغمے سنتا ہے تو اسے جنت کی مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن ایک نادار لیکن باخبر انسان اس امارت کے لوازمے کو مکروہ ترین چیز سمجھتا ہے جو غریبوں اور مزدوروں کے خون سے داغدار ہو رہی ہے۔ اخوت اور مساوات، تہذیب اور معاشرت کی ابتدا سے ہی آئیڈیلسٹوں کا زریں خواب رہی ہے۔ پیشوایان دین نے مذہبی اخلاقی اور روحانی بندشوں سے اس خواب کو حقیقت بنانے کی متواتر ناکام کوششیں کی ہیں۔ مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ حضرت محمد سبھی نبیوں نے اخلاقی بنیادوں پر اس مساوات کی عمارت کھڑی کرنی چاہی مگر کسی

کو کامیابی نہ ہوئی، اور آج اعلیٰ اور ادنیٰ[1] کی تفاوت جتنی بیدردی سے نمایاں ہو رہی ہے شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔ آزمودہ را آزمودن جہل است کے مصداق اب بھی دھرم اور اخلاق کا دامن پکڑ کر ہم اس مساوات کی منزل پر پہونچنا چاہیں تو ہمیں ناکامی ہی ہوگی کیا ہم اس خواب کو پریشاں دماغ کی خلاقی سمجھکر اسے بھول جائیں؟ تب تو انسان کی ترقی اور تکمیل کے لئے کوئی آئیڈیل ہی باقی نہ رہ جائیگا۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ انسان کا وجود ہی مٹ جائے جس آئیڈیل کو ہم نے تہذیب کے آغاز سے پالا ہے جس کے لئے انسان نے خدا جانے کتنی قربانیاں کی ہیں جسکی تکمیل کے لئے مذاہب کا ظہور ہوا، انسانی معاشرت کی تاریخ اسی آئیڈیل کے تکمیل کی تاریخ ہے، اسے مسلمہ سمجھکر ایک نہ مٹنے والی حقیقت سمجھکر ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے ایک نئے نظام کی تکمیل کرنی ہے جہاں وہ مساوات محض اخلاقی بندشوں پر نہ رہ کر قوانین کی صورت اختیار کرے۔ ہمارے لٹریچر کو اُسی آئیڈیل کو پیش نظر رکھنا ہے، ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا، ابھی تک اُس کا معیار امیرانہ عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا، انھیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انھیں کی خوشیوں، اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں، چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح اور تفسیر آرٹ کا مقصد تھا، اس کی نگاہ محلسراؤں اور بنگلوں کی طرف اُٹھتی تھی، جھونپڑے اور کھنڈر اس کی التفات کے قابل نہ تھے۔ انھیں وہ انسانیت کے دائرے سے خارج سمجھتا تھا۔ اگر کبھی ان کا ذکر بھی کرتا تھا تو مضحکہ اڑانے کے لئے اُس کی دہقانی وضع اور معاشرت پر ہنسنے کے لئے۔ اس کا شین قاف درست نہ ہونا یا محاوروں کا غلط استعمال ظرافت کا ازلی سامان تھا۔ وہ بھی انسان ہے، اس کے بھی دل ہے اس میں بھی آرزوئیں ہیں یہ آرٹ کے ذہن سے بعید تھا۔ آرٹ نام تھا اور اب بھی ہے، محدود صورت پرستی کا۔ الفاظ کی ترکیبوں کا، خیالات کی بندشوں کا۔ اس کے لئے کوئی آئیڈیل نہیں ہے زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں ہے۔ بھگتی اور ویراگ اور تصوف اور دنیا سے کنارہ کشی اس کے بلند ترین تخیلات ہیں۔ اس کے نزدیک یہی معراج زندگی ہے، اس کی نگاہ ابھی اتنی وسیع نہیں ہوئی ہے کہ وہ کشمکش حیات میں حسن کا معراج دیکھے۔ فاقہ و عریانی میں بھی حسن کا وجود ہو سکتا ہے، اسے شاید وہ تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے لئے حسن حسین عورت میں ہے، اُس بچوں والی غریب بے حسن عورت میں نہیں جو بچے کو کھیت کی مینڈ پر سُلائے پسینہ بہا رہی ہے، اس نے طے کر لیا ہے کہ رنگے ہونٹوں اور رخساروں اور ابرؤں میں فی الواقعی حسن کا باس ہے، اُلجھے ہوئے بالوں،

---

[1] ترک دنیا

پپڑیاں پڑے ہوئے ہونٹوں اور کمھلائے ہوئے رخساروں میں حسن کا گذر کہاں۔ لیکن یہ اسکی تنگ نظری کا قصور ہے۔ اگر اس کی نگاہ حسن میں وسعت آجائے تو وہ دیکھے گا کہ رنگے ہونٹوں اور رخساروں کی آڑ میں اگر نخوت اور خود آرائی اور بے حسی ہے تو ان مرجھائے ہونٹوں اور کمھلائے ہوئے رخساروں کی آڑ میں ایثار اور عقیدت اور مشکل پسندی ہے۔ ہاں اس میں نفاست نہیں، نمو نہیں، لطافت نہیں۔ ہمارا آرٹ شباب کا شیدائی ہے اور نہیں جانتا کہ شباب سینے پر ہاتھ رکھکر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اسکی خود پسندیوں اور چونچلوں پر سر دھننے میں نہیں ہے۔ شباب نام ہے آئیڈیلزم کا، ہمت کا، مشکل پسندی کا، قربانی کا۔ اسے تو اقبال کے ساتھ کہنا ہوگا۔

از دست جنون من جبریل زبوں صیدے   یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

یا

چو موج ساز وجودم ز سیل بے پرواست   گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جویم

اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوگی جب ہماری نگاہ حسن عالمگیر ہو جائیگی۔ جب ساری خلقت اس کے دائرہ میں آجائیگی۔ وہ کسی خاص طبقے تک محدود نہ ہوگا۔ اس کی پرواز کے لئے محض باغ کی چہار دیواری نہ ہوگی، بلکہ وہ فضا جو سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ تب ہم بدمذاقی کے متحمل نہ ہونگے۔ تب ہم اس کی جڑ کھودنے کے لئے سینہ سپر ہو جائیں گے۔ تب ہم اس معاشرت کو برداشت نہ کرسکیں گے کہ ہزاروں انسان ایک جابر کی غلامی کریں۔ تب ہماری خود دار انسانیت اس سرمایہ داری اور عسکریت اور ملوکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی۔ تبھی ہم صرف صفحۂ کاغذ پر تخلیق کرکے خاموش نہ ہو جائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اور مذاق اور خودداری اور انسانیت کا منافی نہیں ہے۔ ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے۔ وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ اُن کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔

ہمیں اکثر یہ شکایت ہوتی ہے کہ ادیبوں کے لئے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے یعنی ہندوستان کے ادیبوں کو۔ مہذب ملکوں میں تو ادیب سوسائٹی کا معزز رکن ہے اور وزرا اور امرا اس سے ملنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں مگر ہندوستان تو ابھی تک قرون وسطیٰ کی

حالت میں پڑا ہوا ہے مگر ادب نے جب امراء کی دریوزہ گری کو ذریعۂ حیات بنا لیا ہو اور ان تحریکوں اور ہلچلوں اور انقلابوں سے بے خبر ہو جو سوسائٹی میں ہو رہے ہیں۔ اپنی ہی دنیا بنا کر اسمیں روتا اور ہنستا ہو تو اس دنیا میں اس کے لئے جگہ نہ ہونا انصاف سے بعید نہیں ہے۔ جب ادیب کے لئے موزوں طبیعت کے سوا اور کوئی قید نہیں رہی یا اسی طرح جیسے مہاتما بن کے لئے کسی قسم کی تعلیم کی ضرورت نہیں، اُن کی روحانی بلندی ہی کافی ہے تو جیسے مہاتما لوگ در در پھرنے لگے اسی طرح ادیب بھی لاکھوں کی تعداد میں نکل آئے۔ اسمیں شک نہیں کہ ادیب پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جاتا، لیکن اگر ہم تعلیم اور طلب سے اس فطری عطیے میں اضافہ اور وسعت پیدا کر سکیں تو یقیناً ہم ادب کی زیادہ خدمت کر سکیں گے۔ ارسطو نے بھی اور دوسرے حکما نے بھی ادیبوں کے لئے سخت شرطیں عاید کی ہیں اور ان کی ذہنی، اخلاقی، روحانی، جذباتی تہذیب اور تربیت کے لئے اصول اور طریقے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ مگر آج تو ادیب کے لئے محض ایک رجحان کافی سمجھا جاتا ہے اور بس۔ اور کسی قسم کی تیاری کی اس کے لئے ضرورت نہیں۔ وہ سیاسیات یا معاشیات، یا نفسیات وغیرہ علوم سے بالکل بیگانہ ہو، پھر بھی وہ ادیب ہے۔ حالانکہ ادب کے سامنے آج کل جو آئیڈیل رکھا گیا ہے اس کے مطابق یہ سبھی علوم اس کے جزو خاص بن گئے ہیں اور اُس کا رجحان داخلیت یا انفرادیت تک محدود نہیں رہا، وہ نفسیاتی اور معاشی ہوتا جاتا ہے۔ وہ اب فرد کو جماعت سے الگ نہیں دیکھتا بلکہ فرد کو جماعت کے ایک حصہ کی شکل میں دیکھتا ہو اس لئے نہیں کہ وہ جماعت پر حکومت کرے، اُسے اپنے غرض کا آلہ بنائے۔ گویا جماعت میں اور اسمیں ازلی دشمنی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ جماعت کی ہستی کے ساتھ اس کی ہستی بھی قائم ہے اور جماعت سے الگ وہ صفر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں جنھیں بہترین تعلیم اور بہترین ذہنی قویٰ ملے ہیں ان کے اوپر سماج کی اتنی ہی ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے۔ جس طرح سرمایہ دار کو ہم غاصب اور جابر کہتے ہیں اس لئے کہ وہ عوام کی محنت سے خود زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اُسی طرح ہم اس ذہنی سرمایہ دار کو بھی پرستش کے قابل نہ سمجھیں گے جو سماج کے پیسے سے اونچی سے اونچی تعلیم پا کر اُسے خالصاً اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ سماج سے ذاتی نفع حاصل کرنا ایسا فعل ہے جسے کوئی ادیب کبھی پسند نہ کریگا۔ اس سرمایہ دار کا فرض ہے کہ وہ جماعت کے فائدہ کو ذات سے زیادہ توجہ کے لائق سمجھے۔ اپنے علم و کمال سے جماعت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانے کی کوشش کرے وہ ادب کے کسی صنف میں بھی قدم کیوں نہ رکھے اُسے اس صنف پر خصوصاً

اور عام حالات سے عموماً واقف ہونا چاہیئے۔ اگر ہم بین الاقوامی ادیبوں کی کانفرنسوں کی رپورٹیں پڑھیں، تو ہم دیکھیں گے کہ ایسا کوئی علمی، معاشی، تاریخی اور نفسیاتی مسئلہ نہیں ہے جس پر ان میں نبادلۂ خیالات نہ ہوتا ہو۔ اس کے برعکس ہم اپنے مبلغ علم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی بے علمی پر شرم آتی ہے۔ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ حاضر طبیعت اور رواں قلم ہی ادب کے لئے کافی ہے۔ مگر ہماری ادبی پستی کا باعث یہی خیال ہے۔ ہمیں اپنے ادب کا علمی معیار اونچا کرنا پڑیگا تاکہ وہ جماعت کی زیادہ قابل قدر خدمت کر سکے۔ تاکہ جماعت میں اُسے وہ درجہ ملے جو اُسکا حق ہے، تاکہ وہ زندگی کے ہر شعبے سے بحث کر سکے اور ہم دوسری زبانوں اور ادیبوں کے دسترخوان کے جوٹھے نوالے ہی کھانے پر قناعت نہ کریں، بلکہ اس میں خود بھی اضافہ کریں۔ ہمیں اپنے مذاق اور طبعی میلان کے مطابق موضوع کا انتخاب کر لینا چاہیئے اور اس موضوع پر عالمانہ عبور حاصل کرنا چاہیئے۔ ہم جس اقتصادی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اُس میں یہ کام مشکل ضرور ہے، لیکن ہمارا معیار اونچا رہنا چاہیئے۔ اگر ہم پہاڑ کی چوٹی تک نہ پہونچ سکیں گے تو کمر تک تو پہونچ ہی جائیں گے جو سطح زمین پر پڑے رہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اگر ہمارا باطن محبت سے منتور ہو اور خدمت کا معیار ہمارے پیش نظر ہو جو اسی محبت کی ظاہری صورت ہے تو ایسی کوئی مشکل نہیں جس پر ہم فتح نہ پا سکیں جنھیں ثروت اور دولت پیاری ہے اُن کے لئے ادب کے مندر میں جگہ نہیں ہے، یہاں تو اُن اُپاسکوں کی ضرورت ہے جنھوں نے خدمت کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھ لیا ہو، جن کے دل میں درد کی تڑپ ہو اور محبت کا جوش ہو۔ اپنی عزت تو اپنے ہاتھ ہے۔ اگر ہم سچے دل سے جماعت کی خدمت کریں گے تو اعزاز و امتیاز اور شہرت سبھی ہمارے قدم چومیں گی، پھر اعزاز و امتیاز کی فکر ہمیں کیوں ستائے؟ اور اس کے نہ ملنے سے ہم مایوس کیوں ہوں خدمت میں جو روحانی مسرت ہے وہی ہمارا صلہ ہے، ہمیں جماعت پر اپنی حقیقت جتانے کی، اس پر رعب جمانے کی ہوس کیوں ہو؟ دوسروں سے زیادہ آرام اور آسایش سے رہنے کی خواہش بھی ہمیں کیوں ستائے؟ ہم امرا کے طبقہ میں اپنا شمار کیوں کرائیں؟ ہم تو جماعت کے علم بردار ہیں، اور سادہ زندگی کے ساتھ اونچی نگاہ ہماری زندگی کا نصب العین ہے۔ جو شخص سچا آرٹسٹ ہے وہ خود پروری کی زندگی کا عاشق نہیں ہو سکتا۔ اُسے اپنے قلب کے اطمینان کے لئے نمایش کی ضرورت نہیں، اس سے تو اُسے نفرت ہوتی ہے۔ وہ تو اقبال کے ساتھ کہتا ہے :۔

مردم آزادم و آں گونہ غیورم کہ مرا
می تواں کشت بہ یک جام زلال دگراں

ہماری انجمن نے کچھ اسی طرح کے اصولوں کے ساتھ میدانِ عمل میں قدم رکھا ہے، وہ ادب خمریات و شبابیات کا دست نگر نہیں دیکھنا چاہتا۔ وہ ادب کو سعی اور عمل کا پیغام اور ترانہ بنانے کا مدعی ہے۔ اُسے زبان سے بحث نہیں، آئیڈیل کی وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہو جاتی ہے۔ حسنِ معنی آرائش سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ جو ادیب امرا کا ہے وہ امرا کا طرزِ بیان اختیار کرتا ہے، جو عوام الناس کا ہے وہ عوام کی زبان میں لکھتا ہے۔ ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا پیدا کر دینا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے اور نشو و نما پا سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب کے تعمیری رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں، مضامین پڑھے جائیں، مباحثے ہوں، تنقیدیں ہوں، جبھی وہ فضا تیار ہوگی، جبھی ادب کے نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوگا۔ ہم ہر ایک صوبہ میں، ہر ایک زبان میں ایسی انجمنیں کھولنا چاہتے ہیں، تاکہ اپنا پیغام ہر ایک زبان میں پہونچائیں۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ یہ ہماری ایجاد ہے۔ نہیں، ملک میں اجتماعی جذبات ادیبوں کے دلوں میں موجود ہیں۔ ہندوستان کی ہر ایک زبان میں اس خیال کی تخم ریزی فطرت نے اور حالاتِ روزگار نے پہلے ہی سے کر رکھی ہے۔ جا بجا اس کے انکھوئے بھی نکلنے لگے ہیں، اس کی آبیاری کرنا، اس کے آئیڈیل کو تقویت پہونچانا ہمارا مدعا ہے۔ ہم ادیبوں میں قوتِ عمل کا فقدان ہے، یہ ایک تلخ حقیقت ہے، مگر ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ابھی تک ہم نے ادب کا جو معیار اپنے سامنے رکھا تھا اُس کے لئے عمل کی ضرورت نہ تھی، فقدانِ عمل ہی اُس کا جوہر تھا۔ کیونکہ بسا اوقات عمل اپنے ساتھ تعصب اور تنگ نظری بھی لاتا ہے۔ اگر کوئی شخص پارسا ہو کر اپنی پارسائی پر غرور کرے تو اس سے کہیں اچھا ہے کہ وہ پارسا نہ ہو کر رند ہو۔ رند کی شفاعت ہو تو گنجائش ہے پارسائی کے غرور کی تو کہیں شفاعت نہیں۔ بہرحال جب تک ادب کا کام محض تفریح کا سامان پیدا کرنا، محض لوریاں گا گا کر سُلانا، محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا اُس وقت تک ادب کے لئے عمل کی ضرورت نہ تھی، وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے، مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے، ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حُسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سُلائے نہیں، کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔

---

[1] ترقی پسند مصنفین کی انجمن۔

شراب عشق

(از منشی جگدیش سہائے سکسینہ بی۔اے۔ ایل ایل۔بی)

ایک دن میں نے کہا پیرِ مغاں سے رو کر
بادۂ عشق سے محروم ہوں انساں ہو کر

آسماں بارِ امانت سے بہت ڈرتا تھا
میں نے معبود سے پیمانِ وفا باندھا تھا

دل مرا دیکھ کے پروانہ کو شرماتا ہے
ایسے کیڑے کے مقدر پہ بھی رشک آتا ہے

شعلۂ شمعِ محبت کا جو شیدائی ہو
جس نے دنیا میں فنا ہو کے بقا پائی ہو

حیف صد حیف مئے عشق سے محروم رہوں
فخرِ ہستی ہوں مگر فانی و معدوم رہوں

مدتوں دخترِ رز کا میں طلبگار رہا
خوب افشردۂ انگور سے سرشار رہا

اب ہوا اور سمائی ہے دلِ مضطر میں
بادۂ عشقِ حقیقی کا ہے سودا سر میں

اے کہ کونین کا حاصل ہے ترا جامِ شراب
بوالہوس کو سمِ قاتل ہے ترا جامِ شراب

مستیِ عشق کے اسرار بتا دے مجھکو
ایک ساغر مئے الفت کا پلا دے مجھکو

طلبِ عشق میں جب قلب کو صادق پایا
پیرِ میکش نے بصد لطف و کرم فرمایا

بادۂ عشق عجب بادۂ روحانی ہے
اس کے قطروں میں نہاں بحر کی طغیانی ہے

شیرۂ رز کی طرح یہ مئے گلفام نہیں
اس کی مستی کا ہے آغاز پر انجام نہیں

جو اسے پیتے ہیں دانائے رموزِ جاں ہیں
اسکی سرمستیوں پر ہوش و خرد قرباں ہیں

اللہ اللہ نگۂ شوق نے کیا کیا دیکھا
اس کے ساغر میں رخِ یار کا جلوہ دیکھا

آبِ انگور تو اربابِ طرب پیتے ہیں
یہ وہ صہبا ہے جسے سوزِ طلب پیتے ہیں

بادۂ عشقِ حقیقی خمِ آزار میں ہے
پھول یہ جلوہ نما وادیِ پرخار میں ہے

چشمِ تر جب صفتِ ابرِ سیہ روتی ہے
جب کڑک تلخیِ دوراں کی بہم ہوتی ہے

دلِ پرداغ کی ہم سیر کیا کرتے ہیں
کنجِ تنہائی میں اس مے کو پیا کرتے ہیں

تو جو صہبائے محبت کا تمنائی ہے
کچھ غم و رنج سے بھی تیری شناسائی ہے

مئے الفت اسے دیتے ہیں جو رنجور بھی ہے
آتشِ غم میں تجلیِ سرِ طور بھی ہے

جناب برق دہلوی مرحوم

(از منشی اقبال ورما سحر ہتگامی)

جدید اردو کے مایۂ ناز شاعر منشی مہاراج بہادر برق دہلوی جن کا فروری ۱۹۳۶ء پانی پت میں دفعتاً انتقال ہو گیا۔ مجھے اول اور آخر مرتبہ کانپور کے آل انڈیا مشاعرہ واقعہ دسمبر ۱۹۳۳ء میں صرف چند منٹ کی ملاقات ہوئی تھی۔ گورے رنگ کے دبلے پتلے آدمی تھے۔ چہرہ شگفتہ مگر صحت خراب معلوم ہوتی تھی۔ اس کے قبل آپ نے اپنے ۲۵ جولائی ۱۹۳۳ء کے خط میں لکھا بھی تھا:۔

"۔۔۔۔ مگر افسوس، ناموافقت زمانہ سے بہت افسردہ و غمزدہ ہوں۔۔۔۔ اور صحت بھی بہت خراب ہو گئی ہے برائے نام زندہ ہوں"

افسوس! اب اس "برائے نام" زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ آپ کی بیوقت وفات سے اردو کی بزم ادب میں جو جگہ خالی ہو گئی ہے اس کا بھرنا مشکل نظر آتا ہے۔ اگرچہ آپکی شاعری فی الجملہ بزمیہ شاعری ہے مگر کہیں کہیں درد و رقت کی تصویر کھینچنے میں بھی کمال دکھایا ہے۔ "یتیموں کی فریاد" کے عنوان سے لکھتے ہیں:۔

آوارۂ جہاں ہیں برباد خانماں ہیں
بیزار زندگی ہیں قسمت کے نوحہ خواں ہیں

ہم سر سے پاؤں تک ہیں اک نقش نامرادی
تصویر بیکسی ہیں روداد بیکساں ہیں

خانہ بدوش ہیں ہم، حسرت فروش ہیں ہم
ہم نالۂ مجسم سرتاپا فغاں ہیں

غم سے شکستہ دل ہیں صدموں سے مضمحل ہیں
فاقوں سے جاں بلب ہیں فاقوں سے نیم جاں ہیں

کانوں پہ ہاتھ رکھکر سنتا ہے جسکو عالم
وہ درد کا بیاں ہیں وہ غم کی داستاں ہیں

غربت نصیب ہیں ہم خود اپنے ہی وطن میں
جلجائیں شاخ پر جو وہ پھول ہیں چمن میں

کہیں کہیں رزمیہ مضامین پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ تیغ ہندی نامی مسدس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

تو وہ ہے بحر رواں جس سے روانی مانگے
تیرا مارا ہوا میداں میں نہ پانی مانگے

چشم بد دور وہ بانکی ہیں ادائیں تیری
ملک الموت بھی لیتا ہے بلائیں تیری

زخم دیدوں کے دم مرگ خبر لیتی ہے
چادر خوں سے شہیدوں کو کفن دیتی ہے

فیصلہ کرتی ہے دو ٹوک وہ بے لاگ ہے تو
خشک و تر سب کے جلانے کیلئے آگ ہے تو

لوہا مانے ہوئے بیٹھا ہے زمانہ تیرا   کہ لب زخم پر اب تک ہے فسانہ تیرا!

مختصر یہ کہ آپ کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی تھی۔ طباعی کا یہ عالم تھا کہ فی البدیہہ نظمیں اور غزلیں کہہ سکتے تھے۔ اصلاح دینے کا بھی ملکہ تھا، صاحب تلامذہ تھے۔ چنانچہ حضرت بیتاب بریلوی جیسے ممتاز شاعر و ادیب کو آپ سے تلمذ کا فخر حاصل ہے۔

آپ نے ابتدا میں ڈرامہ نویسی بھی اختیار کی تھی مگر وہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ آپ نے ۲۵ جولائی ۳۲ء کے خط میں لکھا تھا:-

"ایک دو ڈرامے بھی لکھے.... انہیں سے ساوتری کئی بار اسٹیج پر کھیلا گیا۔ پسند عام ہوا افسوس، اب اس کا مسودہ تک میرے پاس نہیں، شائع نہ ہو سکا۔"

حسن تخیل کے علاوہ حسن اخلاق بھی تھا۔ میں نے مارچ ۳۲ء میں بلا کسی ذاتی تعارف کے فتح پور کے ایک مشاعرہ میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ آپ نے جوابی خط میں تحریر فرمایا تھا:-

"صرف تشریف آوری کا ذکر فرما کر آپ نے ناحق مجھے محجوب کیا ہے۔ ایسی باتوں کا اظہار مراسم برادرانہ کے خلاف ہے جہاں ہم محض تفریح و دیگر مشاغل کے لئے صدہا روپیہ صرف کر دیتے ہیں تو پھر ملاقات باہمی اور علمی دلچسپیوں کے خاطر کچھ صرف کرنا بار خاطر نہیں ہو سکتا۔"

کسی قدر زود رنج ضرور تھے مگر وہ جذبہ دیرپا نہ ہوتا تھا کیونکہ آپ کی فطری محبت بہت جلد اس پر غالب آ جاتی تھی۔

برق صاحب سکسینہ کایستھ تھے۔ شاعری ترکہ میں ملی تھی، باپ اور ماں کے دونوں طرف سے۔ آپ کے والد کا نام منشی ہرنراین داس حسرت تھا۔ آپ کے نانا منشی دولت رام عبرت ایک بلند پایہ شاعر اور ملک الشعراء ذوق کے شاگرد تھے۔ برق کی والدہ بہت زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر وہ ننھے شاعر کو روزانہ رامائن سنایا کرتی تھیں انہوں نے مثنوی گلزار نسیم کے چند اشعار بھی انہیں یاد کرا دئے تھے۔ جیسے:-

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون   ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
شبنم کے سوا چرانے والا   اوپر کا تھا کون آنے والا
جس کف میں ہو گل وہ داغ ہو جائے   جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

قدرت کی سب سے بڑی دین یہ تھی کہ ان کا جنم دہلی جیسے مشہور شہر میں ہوا تھا جسکی دلکش و لطیف فضا میں اب بھی اردو شاعری کی گونج ہے۔ اسی شہر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسکی خاک

پاک سے میر، غالب، ذوق، مومن، داغ، جیسے اساتذۂ فن اُٹھے جن کا مدِ مقابل نہ دنیا پیدا کر سکی نہ آئندہ پیدا کر سکے گی۔ ایسے مقام کے بود و باش سے تو خشک مزاجوں میں بھی رنگینی پیدا ہو سکتی ہے پھر اُس وجودِ مسعود کا کیا کہنا جسکی سرشت ہی میں شاعری کا خمیر ہو اور جسکو وہاں رہتے پشتیں گزر چکی ہوں آپ کے خاندان کا اصلی وطن قصبہ سکیت ضلع ایٹہ ہے جہاں سے اُن کے آباؤ اجداد اسلامی عہد میں دہلی حاکر بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر مامور ہوئے تھے اور اس طرح دہلی کی سکونت بھی اختیار کر لی تھی۔

برق صاحب جولائی ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے شاعرانہ آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ لکھنے کے قبل انہیں اشعار کے سننے میں لطف آتا تھا اور صدہا اشعار نوکِ زباں ہو گئے تھے وہ انہیں اپنے طفلانہ لہجہ میں مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے تعلیم کیساتھ شاعری میں بھی ترقی ہونے لگی۔ باپ خود شاعر تھے اور ان کے شاعرانہ رجحان کی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے اشعار سنکر خوش ہوتے اور کبھی کبھی اصلاح بھی دیدیتے تھے۔ باپ کو ان سے بہت زیادہ محبت تھی۔ کیونکہ برق اپنے پانچ چھ بھائیوں اور ایک بہن کی وفات کے بعد باپ کی ڈھلتی عمر میں پیدا ہوئے تھے۔ ادھر خود مجھے لکھا تھا:-

"بچپن کا زمانہ جیسے ناز و نعم میں گذرا وہ اطمینانِ قلب عمر کے کسی حصہ میں مجھے پھر نصیب نہ ہو سکا"

مگر شعر و سخن کے معاملہ میں باپ نے بیٹے کی اس اندیشہ سے کہ مبادا تعلیم میں ہرج واقع ہو۔ زیادہ حوصلہ افزائی نہ کی گر اندیشہ بے بنیاد ثابت ہوا کیونکہ تعلیم میں بھی فرق نہ آیا اور شاعری میں بھی ترقی ہوتی گئی ۱۹۰۱ء میں انٹرنس پاس کیا اور اسکے ساتھ ہی اس قابل بھی ہو گئے کہ مشاعروں میں شریک ہو کر کلام کی داد پانے لگے۔

تعلیم کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ فروری ۱۹۰۵ء میں شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ چلتے ہوئے کام میں رکاوٹ پیدا ہو گئی اور برق کو مجبوراً پڑھنا چھوڑ کر اسی دفتر میں ایک معمولی نوکری کرینی پڑی جسمیں وہ بالآخر افسری کے عہدے تک پہونچ گئے گر ملازمت کی مجبوریوں کے باوجود بھی شعر و سخن کا مشغلہ جاری رہا۔ پوسٹل آڈٹ آفس دہلی میں سپرنٹنڈنٹی کے ذمہ دارانہ عہدے پر ہوتے ہوئے بھی آپ اپنے فطری مشاغل سے باز نہ رہ سکے گو آپ کو عدیم الفرصتی کی ہمیشہ شکایت رہی انھیں مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے اپنے ۲۵ رجولائی ۱۹۳۳ء کے خط میں لکھا تھا:-

"حضرت داغ دہلوی سے ۱۹۰۴ء میں معدودے چند غزلوں پر اصلاح لی تھی۔ جو پہلی غزل اُنہیں

ارسال کی تھی اس کا ایک مطلع اور ایک شعر یاد ہے جو حسب ذیل ہے :-

ہمارے خون کی مہندی لگا لو دستِ خنجر میں　　قسم ہے ایک ہو گئے تم ہی تم نکلو گے محشر میں
سوال بوسۂ ابرو پہ جھنجھلا کر کہا اُس نے　　کوئی تلوار کا بھی نام لیتا ہے بھرے گھر میں

جناب داغ نے میرے ابتدائی کلام کی بہت حوصلہ افزائی فرمائی لیکن چونکہ خط و کتابت میں تاخیر ہوتی تھی۔ میں نئے نئے شوق کیوجہ سے جلد اصلاح کا تقاضا کرتا تھا اسلئے انہوں نے بخیال سہولیت مجھے افسر الشعراء حضرت آغا شاعر سے مشورہ کا حکم دیا ... جناب شاعر صاحب کیساتھ جو سب سے پہلی غزل دہلی کے ایک عظیم الشان مشاعرہ میں پڑھی تھی اس کا مطلع ابتک یاد ہے ؎

مثلِ شمشیر کھنچا جاتا ہے قاتل اپنا　　خاک ارمان نکالے کوئی بسمل اپنا

یہ مطلع بہت مقبول ہوا تھا اور بہت داد ملی تھی ...... دوسری غزل جو پھر ایک بڑے مشاعرہ میں پڑھی اُس کا مطلع اور ایک شعر یہ ہے :-

"ہمیں تو ہیں بھلائی میں بُرائی دیکھنے والے　　وفا ہیں کرکے تم سے بیوفائی دیکھنے والے
نقاب اُلٹی صبا نے سامنے میرے تو فرمایا　　کہ ابتو ہر طرح تیری بن آئی دیکھنے والے"

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ وہ پہلے فصیح الملک داغ اور پھر جناب آغا شاعر دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ مگر فی الحقیقت انکا تلمذ محض برائے نام تھا، اسلئے کہ شاگرد کا طرزِ تصنیف اُستادوں سے جداگانہ ہو چلا تھا اور وہ خود شاگردی کے درجہ سے تیزی کیساتھ گزرتا ہوا استاد بننے کے قابل ہو رہا تھا!

یہاں یہ بھی تبلا دینا ضروری ہے کہ باپ کا سایہ اُٹھ جانے کیوجہ سے برق صاحب کی تعلیم میں جو خامی رہ گئی تھی اُسے بھی اُنھوں نے اپنی دلی لگن اور اَن تھک کوشش سے پورا کر لیا۔ ۱۹۱۷ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا وہ پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات میں پرائیویٹ طور پر بیٹھ گئے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں ایف اے اور ۱۹۲۰ء میں بی اے پاس کر لیا۔ پھر ۱۹۲۲ء میں اپنی محکمہ سرکار کے "سب اکاؤنٹ سروس" کا امتحان پاس کیا جس سے آئندہ ترقی کا دروازہ کھل گیا۔ سرکاری ملازمت اور مشقِ سخن جاری رکھتے ہوئے بھی جس عجلت سے یہ سارے امتحانات پاس کئے اُس سے اُنکی غیر معمولی ذہانت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

شروع میں عام رواج کے مطابق آپ بھی صرف غزلیں لکھتے تھے۔ اسکے متعلق خود تحریر فرما

تھا کہ

"میری سب سے پہلی نظم جو ۱۶ء میں رسالہ زبان دہلی میں شائع ہوئی تھی وہ "کارِ خیر" ہے۔ اس نظم نے غیر معمولی مقبولیت و شہرت حاصل کی اور فی الحقیقت میری نظم نگاری اور شہرت کا یہ بنیادی پتھر ہے۔ اس سے قبل میری شاعری مشقِ غزل تک محدود تھی۔"

یہ نظم اسقدر مقبول ہوئی کہ کئی بار علیحدہ پمفلٹ کی صورت میں چھاپی گئی۔ نظم نہایت دلکش، مؤثر اور پُر شکوہ ہے۔ پہلے ہی مصرعہ میں شاعر پوچھتا ہے ع بتا اے خاک کے پتلے کہ دنیا میں کیا کیا؟ سوالات کا سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے اور ہر سوال ایک سبق آموز جواب رکھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں:-

شریکِ دردِ دل ہو کر کسی کا دُکھ بٹایا ہے ... مصیبت میں کسی آفت زدہ کے کام آیا ہے
پرائی آگ میں پڑ کر کبھی دل بھی جلایا ہے ... کسی بیکس کی خاطر جان پر صدمہ اُٹھایا ہے
کبھی آنسو بہائے ہیں کسی کی بدنصیبی پر
کبھی دل تیرا بھر آیا ہے مفلس کی غریبی پر

کبھی امداد دی تو نے کسی بیکس بیچارے کو ... سخی بنکر دیا کچھ تو نے مفلس کے گزارے کو
تسلی دی کبھی تو نے کسی آفت کے مارے کو ... کبھی تو نے سہارا بھی دیا ہے بے سہارے کو؟
کبھی فریادرس بنکر خبر لی بے نواؤں کی
لگی ہے چوٹ بھی دل پر صدا سنکر گداؤں کی

لطف یہ ہے کہ شاعر ایک ہی بات کو مختلف طریقہ پر بیان کرتا ہے مگر اس طرح کہ نظم کی شگفتگی میں فرق نہیں آتا۔

اسی تحصیل کی اور نظم "راجہ اج کا ولاپ" ہے جو زمانہ بابت ماہ جون ۲۳ء میں چھپی تھی۔ اندومتی ایک بد دعا کے سبب آسمانی مالا کے گرنے سے دفعتاً مر جاتی ہے اور راجہ وقفِ ماتم ... زورِ بیان اور رنگِ تاثیر ملاحظہ ہو:-

اُف اُف یہ دردناک صدا کس غضب کی تھی ... آوازِ دلخراش یہ کس جاں بلب کی تھی
... یہ شکستِ خموشیِ شب کی تھی ... یہ آہِ دل گداز کس ایذا طلب کی تھی
یہ کون چُپ ہوا نفسِ سرد کھینچکر،
دی کس نے جان نالۂ پُر درد کھینچکر؟

اے جوشِ اضطراب بتا ماجرا ہے کیا بیتاب کیوں ہے اے دلِ دردآشنا ہے کیا
اے فرطِ غم یہ حادثۂ جانگزا ہے کیا اے چشمِ نم یہ منظرِ حسرت فزا ہے کیا

حیرت بنا کہ نقشِ بدیوار کیوں ہوں میں
اے فرطِ یاس جان سے بیزار کیوں ہوں میں

مجموعۂ خیال پریشاں تو یہ نہیں ہنگامۂ تصورِ ہجراں تو یہ نہیں
نیرنگِ خوابِ دیدۂ حیراں تو یہ نہیں فتنہ طرازیٔ غمِ پنہاں تو یہ نہیں

وہم غلط نہ ہو کہیں عین الیقیں مجھے،
دھوکا نہ دے رہی ہوں نگاہیں کہیں مجھے؟

آخری بند شاعرانہ اعتبار سے تعریف سے مستغنی ہے۔

گو یہ نظم اسوقت کی ہے جب نازک خیال شاعر کو نظمیں لکھتے ہوئے تقریباً پانچ سال ہو چکے تھے اور انہیں پختہ مشقی کی جھلک آ چلی تھی۔ در اصل شاعر کی پہلی ہی نظم حسنِ تخئیل و چستی بندش کے لحاظ سے بعد کی نظموں کا پیش خیمہ تھی اور اسی کے چھپتے ہی لوگوں کو برق صاحب کی قابلیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ انکی نظموں کے لئے زمانہ، ادیب، مخزن وغیرہ مشہور ادبی رسالوں کے صفحے کھلے رہتے تھے۔ غرض برق شعرائے اردو کے اولیں صف میں جگہ پانے کے اہل بن رہے تھے۔ نظم کیسا تھ ہی غزلوں کا سلسلہ بھی جاری تھا مگر موضوع کے اعتبار سے غزلیں بھی نظموں کی روش ہی پر جا رہی تھیں۔

آپ کی نظموں کا مجموعہ "مطلعِ انوار" ۱۹۲۹ء میں شائع ہو کر اردو کی دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ غزلوں کی اشاعت کے متعلق آپ نے ۲۵ر جولائی ۱۹۳۳ء کے خط میں لکھا تھا:—

"غزلوں کا دیوان بھی تقریباً مرتب ہے۔ فرصت ملنے پر ایک نظر ڈال کر پریس میں بھیجونگا مگر فرصت کے لمحے میرے لئے عنقا صفت ہیں"

یہ مجموعہ "تجلیاتِ برق" کے نام سے چھپنے والا تھا۔ افسوس مرگِ بے ہنگام نے اس حسرت کو پورا نہ ہونے دیا۔

"مطلعِ انوار" مذہبی، سماجی، تاریخی، سبھی طرح کی نظموں کا مجموعہ ہے یوں تو سبھی نظمیں قابلِ قدر ہیں لیکن مجھے جو نظمیں خاص طور پر پسند ہیں یہ دونوں اچھوت اُدّھار پر ہیں

ایک تاریخی ہے جسمیں شاعر نے مہاراجہ رام چندرؔ اور شبریؔ کے ساتھ حُسن سلوک کی مثال کو ہمارے سامنے رکھتے ہوئے اپنی بات میں زور پیدا کیا ہے۔ دو بند درج ذیل ہیں۔ رامچندرجی بن باس کی حالت میں گھومتے ہوئے اچھوت شبری کے جھونپڑے میں پہونچتے ہیں۔ شبری عقیدت اور روحانی مسرت کیساتھ "بیر" لاکر انکے سامنے رکھتی ہے۔ شاعر کہتا ہے :-

بھگوان نے اخلاص و مدارات کو دیکھا　　وارفتۂ دیدار کے جذبات کو دیکھا
کچھ ذات کو دیکھا نہ کچھ اوقات کو دیکھا　　دیکھا تو فقط پریم کی سوغات کو دیکھا
ڈوبے ہوئے تھے بیر محبت کے جو رس میں
خود "پریم کے ساگر" بھی ہوئے پریم کے بس میں

ہے رسم محبت کی زمانہ سے نرالی　　بھگتی کبھی تاثیر سے رہتی نہیں خالی
منظور کیا رام نے یہ تحفۂ عالی　　بنیاد جہاں میں محبت کی وہ ڈالی
اے کاش اچھوتوں کو گلے ہم بھی لگائیں
اس پریم کے افسانے کو آدرش بنائیں

یہ دوسری نظم کا پہلا بند اور کچھ متفرق اشعار دئیے جاتے ہیں۔ نظم مسدس ہے اور اسکا عنوان ہے "چھوتوں سے نفرت فضول ہے"

سب کچھ ہے ہر کہیں ان قدرت کا فیض جاری　　مفلس ہو یا تونگر، راجہ ہو یا بھکاری
اونچی سی جھونپڑی ہو یا قصر کا اٹاری　　دونوں پہ مہر انور کرتا ہے جلوہ باری
ہیں خاک بوس کرنیں مہتاب ضو فشاں کی
ہر گھر میں روشنی ہے قندیل آسماں کی

[illegible] جو ہے قائم یہ غیرت. رتی ہے　　اسفل بھی آدمی ہے، افضل بھی آدمی ہے
زیبا نہیں کسی سے بیجا سلوک کرنا　　منھ سے اچھوت کہنا، نفرت سے نام دھرنا

تذلیل دوسروں کی تحقیر ہے خود اپنی　　اپنوں کو غیر کہنا تشہیر ہے خود اپنی
اس خاک کے ہیں پتلے بھارت سپوت ہیں سب　　گر یہ اچھوت ہیں تو ہم بھی اچھوت ہیں سب!

یہ نظم کس موثر پیرائے پر شروع کیگئی اور کسقدر صاف، سادہ اور مدلل ہے۔ اچھوتوں کیلئے اس سے زیادہ پر زور اپیل ہو ہی نہیں سکتی آخری شعر تو بڑے ہی غضب کا اور دل میں اتر جانے والا ہے۔ بیشک ہم سبھی بھارت ماتا کی دلاری سنتان ہیں، قدرتاً سب میں برادرانہ محبت

ومساوات ہونی چاہیئے۔

مذکورہ بالا نظموں میں پہلی ۱۹۲۲ء اور دوسری ۱۹۲۵ء میں تصنیف ہوئی تھی۔ وہ وقت چھوت اُدھار کی موجودہ تحریک سے برسوں پہلے کا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ برق صاحب میں ابتدا ہی سے کتنی فراخدلی اور رواداری تھی اور اُنکی نگاہ کتنی دور اندیش تھی!

"میرا بائی" کی نظم بھی نہایت پُر لطف ہے اسکی روحانیت پر بے اختیار دل وجد کرنے لگتا ہے۔ نظم تاریخی اور مذہبی ہے۔ اُسمیں وہی سادگی اور روانی ہے جو بھگتی سے بھری ہوئے سیدھے سادے دل میں ہوسکتی ہے۔ واقعہ نگاری کیساتھ ہی مختلف جذبات کو منظوم کرنا کمال شاعری ہے۔ بھگوان کو رجھانا سہل نہیں۔ وہ اپنے بھگت کی آزمایش ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ سختی کیساتھ کرتے ہیں اور بالآخر جب وہ مطمئن ہوکر ریجھ جاتے ہیں تو پھر بھگت کی ساری مشکلیں دُور کرکے اُس کے دل کو ہرطرح کی روحانی اور مادّی خوشیوں سے بھر دیتے ہیں۔

میرا کو کرشن جی کا عشق تھا۔ اُسکی پُرجنوں بھگتی کا بکھان سُنکر خود شہنشاہ اکبر اعظم تان سین کے ساتھ اُسکے پاس جاتا ہے اور میرا کی محویت پر وارفتہ ہوکر مؤدبانہ عرض کرتا ہے :۔

اے دیوی! کرشن مُراری کو ہم بھینٹ چڑھانے آئے ہیں
تیرے روحانی نغموں سے کھنچکر دیوانے آئے ہیں
لے یہ ہیروں کی مالا ہے یہ ادنےٰ نذر ہماری ہے
کرارپن اُس کی سیوا ہے تو جس کی پریم بھکاری ہے

معصوم میرا اکبر کے ہاتھ سے مالا لیکر مورت کے گلے میں ڈالدیتی ہے۔ رانا سنتا ہے اور مشتعل ہوجاتا ہے۔ میرا کیلئے یہ سزا تجویز ہوتی ہے کہ اُس کے پاس زہر بھرا پیالہ بھیجا جاتا ہے۔ بے ڈرتا میرا خوشی سے پی لیتی ہے مگر اُس پر زہر کا اثر نہیں ہوتا۔ رانا اُسے جلاوطن کرتا ہے۔ میرا وہاں سے رخصت ہوکر سیدھے بھگوان کرشن کے برندابن دھام میں چلی جاتی ہے اور وہاں بھی اپنا وہی پرانا راگ چھیڑتی ہے۔

برندابن سارا گونج اُٹھا جوگن کی مست صداؤں سے
درشن کو لوگ اُمنڈ آئے شہروں سے گانوں گانوں سے

رفتہ رفتہ میرا کی بھگتی کا اتنا شہرہ ہوتا ہے کہ رانا خود متاثر ہوکر فقیر کا بھیس بناکر فرط عقیدت سے اُس کے پاس جاکر یوں کہتا ہے :۔

رانا نے کہا اے پریم نِتا — میں تیرا ادنےٰ خادم ہوں
ہرزد جو خطائیں مجھ سے ہوئیں — سو دل سے اُن پر نادم ہوں

یہ سُنکر سیتا کا نرم و نازک دل پگھل جاتا ہے۔ وہ رانا کو معاف کر دیتی ہے۔ اُس کا گلا رقت سے بھر جاتا ہے، بول نہیں سکتی مگر شاعر کے الفاظ میں۔

بیساختہ دونو ہاتھ اپنے — رانا کے گلے میں ڈالدئے
آدرش دکھایا بھگتی کا — سب شکوے دل سے نکالدئے

بیشک بھگتی کا آدرش (معیار) یہی ہے کہ دل میں پریم کے سوا اور کسی کی گنجائش ہی نہو ایسے دل میں شکوے کے خیال کا گزر تو وہاں ہو ہی نہیں سکتا۔

بھگتی کے ایسے ہی آدرش کو سیتا جی نے بھی پورا کر دکھایا تھا۔ برق نے سیتا جی (اشوک بن میں) کے عنوان سے بھی ایک نظم لکھی تھی جو اگست ۱۹۳۱ء کے ادیب میں شائع ہوئی ہے۔ اسکے چند اشعار بھی درج ذیل ہیں۔ باکمال شاعر کو سیتا جی کی جسمانی اور جذباتی تصویر کھینچنے میں جو کامیابی ہوئی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے:-

سراپا یاس کی صورت مجسم نقش حیرانی — کھڑی ہیں سرنگوں زیر شجر سیتا مہارانی
پریشاں تا کمر ہیں موئے سر بیگانۂ تزئین — لباس جوگیا ہے پردہ دار جسم نورانی
برستا ہے ملال دلنشیں مغموم چہرے سے — نگاہ مضطرب ہے ترجمان درد پنہانی
ہجوم درد میں پنہاں ہو جیسے شعلۂ آتش — نہاں اُلجھے ہوئے بالوں میں یوں نور پیشانی
قد موزوں جو تھا بوٹا سا اعضائے تناسب سے — نظر آتا ہے اب کاہیدگی سے سرو طولانی

سیتا جی کی زبانی

یہ کن کرموں کا بدلا لے رہا ہے او فلک مجھ سے — یہ کن پاپوں کے کارن ہوں گرفتار پریشانی
غضب ڈھایا اکیلا پاکے مجھکو دُشٹ راون نے — دیا دھوکا خلاف رسم آئین جہانبانی
"پتی ورت دھرم سے لیکن گرا سکتا نہیں مجھکو — میں ستونتی ہوں میں کرکے رہونگی اپنی من مانی
زمین و آسماں زیر و زبر ہو جائیں ممکن ہے — مگر یہ غیر ممکن ہے میں ہوں لنکا کی "پٹ رانی"
مری رگھناتھ جی ہیں پرش اور میں اُنکی چھایا ہوں — ازل کے دن سے ہے میرا تعلق جسمی و جانی

اِس بند کا حُسن محاکات ملاحظہ ہو۔ سُداماں کرشن جی کے ہم سبق تھے۔ افلاس سے تنگ آکر دستگیری کی اُمید میں کرشن جی کے یہاں جاتے ہیں کرشن اُسوقت چوسر کھیل رہے

تھے مگر۔

سُنا جب لکشمی پت نے تو ہو کر بیقرار اُٹھے — طلائی تخت سے چشم سراپا انتظار اُٹھے
رہی جو سر کے پاؤں کی سُدھ بے اختیار اُٹھے — فدا ہونے کو روئے یار پر پروانہ وار اُٹھے
جھپکتے ہی پلک سیراب نظارہ نگاہیں تھیں
سُدا ماں کے گلے کا ہار موہن کی باہیں تھیں

نظم سراپا سبق آموز ہے اور ہمارے دیرینہ اخلاق و مراسم پر روشنی ڈالتی ہے۔

جگنو پر علامہ اقبال کی نظم بڑی مشہور اور لاجواب ہے جس میں شاعر نے تشبیہات و استعارات کا عدیم المثال نمونہ پیش کرتے ہوئے آخر میں ایک فلسفیانہ نکتہ کی نہایت کامیاب تشریح کی ہے۔ برق کی جگنو والی نظم میں وہ بات نہیں، مگر اُس کی خصوصیت نئی نئی تشبیہوں کی تلاش میں ہے جو بہتات سے ہیں اور جن سے نظم میں خاصی دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:—

محوِ پروانہ یہ مشعل بنی ہے شاید — اُڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہے شاید
کسی ناشاد کی آہوں کا شرارا تو نہیں — آسماں سے کوئی ٹوٹا ہوا تارا تو نہیں

شوخیوں میں ہیں تری برقِ نظر کے انداز — تیری پرواز میں ہیں رقصِ شرر کے انداز
تیرے جلوے سے منور ہوا صحنِ گلشن — تو ہے وہ شمع کہ ہے موجِ ہوا پر روشن

آخری شعر خوب ہے۔ گلشن کی وسیع فضا میں شمع کا جلنا بالکل قدرتی امر ہے۔ ساتھ ہی جگنو کی چمک سے اُجالا بھی ہو رہا ہے۔ پس شاعر نے جگنو کو ہوا میں جلنے والا چراغ کہکر بجا فرمایا ہے۔

"جوشِ بہار" والی نظم میں بھی شاعر نے ایسے چُن چُن کر الفاظ رکھے ہیں کہ نظم میں موسیقیت پیدا ہوگئی ہے جو شاعری کی جان ہے۔ پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہار کی لہر رگ رگ میں دوڑ رہی ہے اور انمیں وہ رس بھر رہی ہے جس سے بہار کے آتے ہی ساری کائنات تر و تازہ ہو جاتی ہے۔ غضب کی تحریک اور جانفزائی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

گھرا ہوا سرِ فلک جو ابر قطرہ بار ہے — خزاں پہ اوس پڑ گئی چمن چمن بہار ہے
گلوں کے روئے صاف پر کمال کا نکھار ہے — ورق ورق ہرا ہرا خوشنما نظر [illegible]
جمی تھی برگ برگ پہ جو گرد اب وہ دھل گئی
کلی کلی نکھر گئی گرہ دلوں کی کھل گئی
نمو کا آشکار ہے بساطِ خاک سے نشاں — بچھا ہے فرش مخملی [illegible]

گل رہی ہے لعل اب زمین باغ بیگماں — روش روش کھلے ہیں گل چمن ہے دلکش جناں

کلی ہے نیم وا کوئی دلھن ہے یا حجاب میں
کھلا ہوا ہے نیم رخ، ہے نیم رخ نقاب میں

مطلع انوار میں قدرتی مناظر پر عمدہ عمدہ نظمیں ہیں مگر اس کے جوڑ کی بہت کم ملیں گی۔
ایک اور نظم "دو رنگی زمانہ" ہے جسمیں شاعر نے دنیا کی دو رنگی پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ نظم کے آخری حصے میں دنیوی حالت کا تغیر دکھلاتے ہوئے انسانوں میں یقینی اور حقیقی مساوات کے دکھلانیکی کوشش کی گئی ہے:-

دو رنگی دنیائے دوں کے تماشے — دکھاتی ہے گردش یہاں ہر کسی کو
نزاکت سے پھولوں میں تلتا ہے کوئی — میسر ہے کانٹوں کا بستر کسی کو
کوئی خاک افتادہ و بینوا ہے — میسر ہے اورنگ و افسر کسی کو
مگر کوئی سلطاں ہو یا بینوا ہو — ہے ایک در پیش ہے ہر کسی کو

لقابں کے خیال سے ویسی باتوں کا انتخاب بہت موزوں ہوا ہے۔ زبان صاف اور طرز ہے۔ پوری نظم میں ایک ہی رنگ ہے۔
نے منظوم ترجمے بھی کئے ہیں جنہیں انہیں خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے سال ترجمہ ٹیگور کی گیتانجلی کی چند نظموں کے ترجمے ہدیہ ناظرین ہیں۔

عروس مرگ

جب روز موت آن کے در کھٹکھٹائے گی
کیا پیشکش وہ گھر سے ترے لیکے جائے گی؟

دراجل کروں گا متاع حیات میں — جانے نہ دوں گا اسکو کبھی خالی ہاتھ میں
وہ جہاں میں جو مری عمر رواں کا ہے — حاصل جو میری کشت بہار و خزاں کا ہے
اخیر سامنے اسکے دھروں گا میں — سب کچھ عروس مرگ پہ صدقے کروں گا میں
ہاتھ جب اپنے مجھے لگاتا ہے — خوشی سے دل مرا پھولا نہیں سماتا ہے
آتا ہے وہ ساز جوش ہستی میں — ہر نغمہ جو نہاں ہے ساز ہستی میں
سے چمکے گا ستارا میرا — تیرگی رات کی جب نور سے شرمائے گی
بھی یہ مثل شعاع خورشید — سات پردوں سے ضیا بنکے نکل آئے گی

اشعار بالا کی لطافت پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، کیونکہ اصلی نظمیں تو اس شاعر اعظم کی ہیں جس کی آج کل دنیائے شاعری تقلید کر رہی ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ برق نے بڑی سادگی سے کام لیتے ہوئے شاعر کے اصلی خیالات کو اس طرح واضح کر دیا ہے جس سے ترجمہ میں دلکشی اور کچھ اوریجنلٹی بھی آگئی ہے اور یہی ترجمہ کی کامیابی ہے۔

برق صاحب کا کلام وقتی سیاسیات سے قطعی مبرا ہے۔ اگرچہ واقعی

نیر اقبال چمکے گا ہمارا ایکدن　　　　اوج پر اس دیس کا ہوگا ستارا ایکدن

لکھنے والے کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کا قلب حب الوطنی سے خالی تھا مگر ناموافق حالات سے مجبوری ہو جاتی ہے۔

آخر میں برق کی غزلوں کے بھی کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں:-

ہم نہ کہتے تھے مریض غم کا حال اچھا نہیں　　　　دیکھتے ہی غش تجھے اے چارہ ساز آ ہی گیا
عشق جب صادق ہوا تو بڑھ گیا عجز و نیاز　　　　حسن جب کامل ہوا تو بجز و ناز آ ہی گیا

کتنے عمدہ اور معنی خیز اشعار ہیں۔ پہلے شعر میں مریض کو دیکھتے ہی چارہ ساز کا بیہوش ہو جانا مریض کی انتہائی نازک حالت کا مظہر ہے۔ شاعر کا طرز بیاں بھی ابتدا ہی سے کتنا زوردار ہے کہ آخر میں چارہ ساز کی غشی پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا۔ دوسرے شعر میں ایک امر واقعہ کا شاعرانہ ذکر ہے۔

کعبہ و بتخانہ کیوں مسجود ہونا چاہیئے　　　　لاتعین کس لئے محدود ہونا چاہیئے؟
جوش ہمت کا تقاضا ہے یہ اک اک گام پر　　　　صرف راہ منزل مقصود ہونا چاہیئے

پہلے شعر میں ایک فلسفیانہ سچائی کو شعر کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ واقعی جب خدا ہر جگہ ہے تو ہمیں کیا حق ہے کہ خود غرضانہ طور پر اُسے محدود کریں؟ دوسرے شعر میں اُسی سچی ہمت مردانہ کا ذکر ہے جو انسان کو منزل مقصود کی طرف برابر بڑھائے لئے جاتی ہے اور کبھی قدم پیچھے نہیں ہٹنے دیتی۔

مجھ سے سہواً بھی خطا ہو تو لرز جاتا ہوں　　　　خون انصاف جو کرتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں
حسن اور حسن میں قایم ہے مراتب کا لحاظ　　　　وہ جفا کرتے ہیں ہم شکر جفا کرتے ہیں

پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ مجھ سے تو انجان میں بھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو کانپ جاتا ہوں، پھر پتہ نہیں کہ جان بوجھ کر انصاف کا خون کرنیوالے جیسے بُرے خطاکار دل کی کیا

حالت ہوتی ہے یا وہ کیسے اتنی زیادہ جرأت کرسکتے ہیں۔ دوسرا شعر غزل اور حسن تخیل کا ایک نادر نمونہ ہے۔ معشوق کا شیوہ ظلم کرنا اور عاشق کا فرض اُسے بخوشی برداشت کرتے ہوئے شکر گذار رہنا ہے۔

داغ الفت سے اُجالا خانۂ دل میں رہے — روشنی اس شمع کی تاریک منزل میں رہے
برق حُسن یار اتنی کس لئے ہے بیقرار — یہ مری آنکھوں میں ٹھہرے یہ مرے دل میں رہے

دوسرا شعر بڑے معرکہ کا ہے۔ بجلی کی تڑپ مشہور ہی ہے جسے منانے کے لئے شاعر اُسے آنکھوں اور دل میں آکر ٹھہر جانے کی دعوت دیتا ہے۔ اُسے خود جل جانے کا ذرا بھی اندیشہ نہیں اسے انتہائی عشق کی دلیل سمجھئے۔ دونوں شعروں میں معرفت کی چاشنی ہے۔

دم زدن میں ہوا طے عالم فانی کا سفر — کھل گیا راز کہ ہستی سے عدم دُور نہیں
اُسکے پرتو سے ہی جذبات کی دُنیا آباد — آنکھ سے دُور ہے وہ دل سے مگر دُور نہیں

پہلے شعر میں شاعر کس اختصار کیساتھ ہستی سے عدم کا دور نہونا ثابت کرتا ہے اور ثبوت میں دو اتنا ہی کہدینا کافی سمجھتا ہے کہ ایسی طول و عرض والی دنیائے ناپائدار کا سفر جسمیں بہت زیادہ وقت لگنا چاہئے تھا، آن واحد میں طے ہوگیا۔ دوسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ چاہے خدا آنکھ سے اوجھل ہو مگر دل سے دور نہیں، کیونکہ دلی جذبات کی دنیا صرف اُسی کے دم سے آباد ہے ورنہ وہ اُجاڑ ہی ہوتی۔ ثبوت بیّن ہے "جذبات کی دنیا آباد" بہترین بندش ہے جسمیں روحانیت کا شائبہ ہے۔

ہم دکھلا چکے کہ برق دہلوی کی شاعری کتنی بلند پایہ ہے، اگرچہ فی الجملہ ہم اُن کی نظموں کو غزلوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

آپ کی عوام میں تو قدر تھی ہی، راج درباروں میں بھی کافی عزت ہوئی تھی۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں دہلی کے شاہی دربار والے قصیدہ پر آپ کو پنجاب گورنمنٹ کی جانب سے نقرئی تمغہ اور اعزازی سارٹیفکٹ ملا تھا۔ اور ۱۹۲۰ء میں والی ریاست نرسنگھ گڑھ نے بھی انعام اکرام دیا تھا۔ آپ پٹیالہ دربار سے بھی دو مرتبہ مدعو ہوئے تھے۔

یوں تو بڑے سے بڑے شاعر کا کلام اسقام سے پاک نہیں ہوتا اور نہ برق ہی کے کلام میں وہ بات ہے۔ "مگر غلطی اقتضائے بشریت ہے" اس خیال سے اسقام کا ذکر کیا جاتا ہے۔

رہروِ ہستی

(از جناب محمود اسرائیلی صاحب)

حُسنِ گل و لالہ زار　　رقص کناں جوئبار
شوخیٔ بادِ بہار　　دل کشیٔ کوہسار
یاس سے تکتا ہوا اِک قدم آگے بڑھا

بزم کی زیبائیاں　　حُسن کی رعنائیاں
عشق کی رُسوائیاں　　اور جبیں سائیاں
یاس سے تکتا ہوا اِک قدم آگے بڑھا

خانۂ خُمّار کو　　ساغرِ سرشار کو
بادۂ گلنار کو　　رندِ قدح خوار کو
یاس سے تکتا ہوا اِک قدم آگے بڑھا

بیکس و غم خوار کو　　بے زر و زر دار کو
رہزنِ عیّار کو　　جاں کے طلب گار کو
یاس سے تکتا ہوا اِک قدم آگے بڑھا

وعظ میں واعظ کا رنگ　　وسعتِ تخئیل تنگ
جملہ مذاہب سے جنگ　　طُرفہ کمانے کے ڈھنگ
یاس سے تکتا ہوا اِک قدم آگے بڑھا

مسلکِ صوفی کے راز　　نکتۂ عرفاں نواز
قول، حقیقت طراز　　فعل میں رنگِ مجاز
یاس سے تکتا ہوا اِک قدم آگے بڑھا

بسملِ ناکام کو　　قاتلِ بدنام کو

خنجر و صمصام کو   قتل کے انجام کو
یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

تاجِ شہِ باوقار   تختِ زمرد نگار
قلعۂ آتش نگار   عسکرِ ہمت شعار
یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

مجمعِ حیرت فروغ   لاشۂ بیکس بدوش
بے خبرِ عقل و ہوش   چشم تر و لب خموش
یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

مرقدِ بوسیدہ کو   سبزۂ روئیدہ کو
میتِ خوابیدہ کو   بیکس و غم دیدہ کو
یاس سے تکتا ہوا اک قدم آگے بڑھا

غزل

(از محمد شہاب الدین صاحب صدیقی بھوپال)

وہ مے فروش لئے ساغرِ شراب اٹھا   کہ آفتاب کو لے کر اک آفتاب اٹھا
نشاط خیز کوئی نغمۂ شباب اٹھا   اٹھا مغنیِ رنگیں نوا رباب اٹھا
فضا میں چھا گئی موجِ شراب کی مستی   کچھ اس ادا سے وہ مستِ مئے شباب اٹھا
ہوائے رنگِ جہاں ہے خمارِ تشنہ لبی   نگاہِ شوق سے یہ پردۂ سراب اٹھا
دلیلِ پستیِ ہمت ہے زورِ بیتابی   قیاسِ غم سے گذر لطفِ اضطراب اٹھا
اٹھاؤں نیم نگاہی کی کشمکش کب تک   ستم ظریف نگاہوں کو بے حجاب اٹھا
نگاہدار قدم جستجوئے منزل میں   سمجھ سمجھ کے اٹھا اور کامیاب اٹھا
جب آہِ سرد بھری دل سے ابرِ غم چھایا   ہوا جو مست چلی جھوم کر سحاب اٹھا
حریمِ ناز کجا سجدۂ نیاز کجا
جبینِ بے ادب لے واقفِ خراب اٹھا

انشا کا کلام

(سید محمد محسن رضوی بی اے)

شائقین اردو نے انشا کے کلام کو اس نظر سے نہیں دیکھا جس کا وہ مستحق ہے اور نہ انشا کو ادبی دنیا میں کما حقہ شہرت حاصل ہوئی جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اُن کے کلام میں جواہر پاروں کیساتھ بہت سے خزف ریزے بھی ہیں جنھوں نے اصلی جواہر کی آب و تاب کو ماند کر دیا ہے حالانکہ اُن کا ظریفانہ کلام وقت نظر اور موقع محل کی مناسبت سے دیکھا جائے تو خراج تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انشا کا کلام بادشاہ کو خوش کرنا تھا جسمیں مذاق کے ادنیٰ یا اعلیٰ معیار کو کوئی دخل نہ تھا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ کی شاعری کا معیار بہت پست ہوگیا تھا انشا کو اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ بادشاہ کے افتاد طبیعت کے موافق اشعار کہہ کے اپنی معاش کا سامان بہم پہونچائیں اس مقصد میں وہ یقیناً کامیاب ہوئے۔ اس لحاظ سے اُن کے ظریفانہ کلام کو دیکھا جائے تو اُسکی وقعت بڑھ جاتی ہے اگر وقت و زمانہ کا خیال نہ کیا جائے تو قدما شعرا میں کوئی شاعر ایسا نہ ملے گا جس نے اپنی زبان مبتذل اور فحش مضامین نظم کرنے میں آلودہ نہ کی ہو خود میر کے دیوان میں اس قسم کے بیشمار اشعار موجود ہیں لیکن اس سے اُنکی حقیقی قدر و منزلت میں کمی نہیں ہوتی۔ کیونکہ محاسن کا پلہ معائب سے بھاری ہے یہی حال انشا کی شاعری کا بھی ہے۔ دربارداری کی ضروریات اور اس کے نتائج کے لحاظ سے اُن کے کلام پر نظر ڈالنا چاہیے۔

انشا کے دیوان میں اعلیٰ اور پست درجہ کی غزلیں ملی جلی ہیں۔ جب کئی اعلیٰ غزلوں کے بعد ایک پست غزل پر نظر پڑتی ہے تو اُن کے کمال شاعری کا جو نقش ہمارے دل پر پہلے جمتا ہے ہلکا ہو جاتا ہے اور اس طرح اُنکی حقیقی قدر و منزلت پردے ہی میں رہ جاتی ہے اسلئے اُنکی شاعری کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی ہے۔

اُردو داں طبقہ میں انشا کے نام سے کون آگاہ نہیں لیکن حقیقی انشا ایک بڑی حد تک عوام کی نظروں سے اسوقت تک پوشیدہ ہے۔ انشا کے پُرزور اور شاندار قصائد کا کوئی نام بھی نہیں لیتا اور سودا کے قصائد کا ہر شخص دم بھرتا ہے حالانکہ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انشا کے قصائد بھی ایک خاص اور ممتاز درجہ کے مستحق ہیں میدان غزل گوئی میں بھی

اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ درحقیقت غزل کا دائرہ حُسن و عشق کی داستان تک ہی محدود نہیں بلکہ اُسکی وسعت کہیں زیادہ ہے اسمیں ہر قسم اور ہر صنف کے مضامین نظم ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ غزل کو صرف حُسن و عشق کی داستان تک محدود سمجھتے ہیں وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ غالب کے زورِ تخیل نے بھی اس نکتہ کو بخوبی سمجھ لیا تھا کہ غزل کا دائرہ صرف عاشقانہ مضامین پر ختم نہیں ہو جاتا ہے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل کچھ اور چاہیئے وُسعت مرے بیاں کیلئے

انشا نے بھی غزل کو حُسن و عشق کی داستانوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اُسمیں ہر قسم کے مضامین نظم کئے۔ مزاحیہ غزلیات سے قطع نظر جب ہم اُنکی سنجیدہ غزلوں کو دیکھتے ہیں تو اُن میں اُردو شاعری کی اعلیٰ ترین مثالیں ملتی ہیں اور ایسے اشعار نظر آتے ہیں جنہیں حقیقی شاعری کی رُوح بھری ہوئی ہے۔ مثالاً اُنکی وہ غزل ملاحظہ ہو جس کا مطلع ہے

کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

اس غزل کے تمام اشعار انتخاب ہیں۔ اس مطلع کا مضمون اگرچہ نیا نہیں دنیا و ما فیہا کی ناپائیداری کا ذکر پہلے شعرا بھی دل کھول کر نظم کر چکے تھے لیکن انشا کے طرز بیان نے اسے سب سے الگ کر دیا ہے اور قبولیت عام نے اس شعر کو حیاتِ جاودانی کا خلعت عطا کر دیا ہے جس طرح گریبان کے مضمون پر میر کا یہ شعر

آ کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے تار اور گریبان کے تار میں

لاثانی اور آپ ہی اپنا جواب ہے اُسی طرح انشا کا یہ مطلع بھی بے مثل و بے نظیر ہے۔ اس غزل کا دوسرا شعر بھی عجب تیور رکھتا ہے

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

طرز ادا نے اس شعر کے حُسن کو بھی دوبالا کر دیا ہے۔ اور اسکی بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعر کو اپنے مافی الضمیر کے من و عن بیان کرنے میں مناسب الفاظ مل گئے ہیں۔ شعر کو رُک رُک کر پڑھنے سے اسکی خوبی کا پورا اندازہ ہوتا ہے اور پڑھنے والے کے دل پر وہی جذبہ طاری ہو جاتا ہے جو انشا کے دل پر تھا۔ بادِ بہاری سے جس طرح خطاب کیا گیا ہے اس سے بہتر کوئی انداز

ممکن نہ تھا۔ ایک مایوس، و شکستہ دل سے ان کے علاوہ دوسرے الفاظ نکل ہی نہیں سکتے تھے۔ "نہ چھیڑ" "راہ لگ اپنی" "تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں" ان الفاظ نے شعر میں جان ڈالدی ہے اور بیزاری، غم کے جذبہ کا پورا پورا اظہار ہوگیا ہے زبان اور محاورہ کی خوبی نے شعر کی آب تاب کو اور بھی چمکا دیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ دنیا میں "حالت ہجر بلا ہوتی ہے"، جسمیں عاشق کو "دمبدم آرزوئے مرگ سوا ہوتی ہے" اور جو باتیں جو سکونِ دل اور راحتِ قلب کا سامان ہوتی ہیں وہ اور بھی زیادہ تکلیف دہ بن جاتی ہیں یہانتک کہ ٹھنڈی ہوا سے دل جلنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں سوداؔ کو بھی ایکبار بادِ بہاری کی چھیڑ ناگوار گذری تھی ؎

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں ہوں نکہتِ گل　　پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

مرزا غالب کو بھی غمِ فراق میں تنہا اور خاموش بیٹھنا پسند آیا تھا ؎

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو　　مجھے دماغ نہیں خندہائے بے جا کا

انسان گو کتنا ہی بذلہ سنج کیوں نہ ہو لیکن فراق میں اُس کے لب پر مُہر خموشی لگ جاتی ہے۔ غالبؔ نے ذیل کے شعر میں اسی حالت کا اظہار کیا ہے ؎

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

اس غزل کا تیسرا شعر ہے ؎

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر　　غرض کچھ اور دُھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

شاعر نے اس شعر میں اپنے شوق میخواری کی انتہا کا اظہار کیا ہے۔ لیکن غالبؔ کے شوق میخواری سے اُس کا شوق کمتر ہے اس مضمون پر غالبؔ کے ذیل کے شعر سے بڑھ کر کوئی شعر اب تک نہیں کہا گیا ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے　　رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مگر انشاؔ کا شعر دردؔ کے مندرجہ ذیل شعر سے بلاشبہ بڑھ گیا ہے ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

لیکن انشاؔ کے شعر میں صرف بادہ نوشی ہی کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم بڑے غضب کے پینے والے ہیں جب دیکھا کہ ساقی کے آگے دست سوال دراز کرنے سے کام نہیں چلتا تو حالتِ اضطراب میں اس کے

پاؤں پر سر رکھ دیا کہ اب تو اُسے پلانے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ لیکن پھر یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں جلد باز اور حقیقت ناآشنا حضرات ہیں بے غیرت دحقیر نہ سمجھ لیں اس غلط فہمی کے سدِّباب کے لئے شاعر نے پیشتر ہی سے کہہ دیا کہ اس حالت میں بھی "تصور عرش پر ہے" اس ٹکڑے سے ساقی کی قدر و منزلت کا بھی اظہار ہوگیا۔ کیونکہ جب "پائے ساقی پر" سر رکھنے سے یہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے کہ دماغ عرش پر پہونچ جاتا ہے تو پھر اُس ساقی کی قدر و منزلت کیا ہوگی۔ اس غزل کے تمام اشعار ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ سب میں یکساں جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آتش نے جوش اور گرم بیانی انشا ہی سے سیکھی۔ اس کے بعد کا شعر بھی اُردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتا ؎

بسانِ نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں　　　نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

کمزوری اور ناطاقتی کا اس سے بڑھ کر اور کیا اظہار ہو سکتا ہے اور پھر اس قید کے ساتھ کہ اُسمیں شانِ تغزل بھی پائی جائے۔ نقش پا کی اُفتادگی سے ناطاقتی کی تشبیہ کتنی مکمل ہے۔

شاعر نے ذیل کے شعر میں بھی اپنی ناطاقتی کا اظہار کیا ہے ؎

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے ان دنوں پہروں　　　نظر آیا جہاں پر سایہ دیوار بیٹھے ہیں

پھر کہا ہے ؎

کہیں ہیں صبر کسکو۔ آہ ننگ و نام کیا شے ہے　　　غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم اکبار بیٹھے ہیں

اس شعر کا مضمون کسقدر حقیقت نفس الامری کے مطابق ہے۔ عشق میں بشرطیکہ عشق صادق و کامل ہو انسان کو نہ تو بے غرتی کا خیال رہتا ہے نہ موت کا خطرہ بلکہ جان نثار کردینا ایک کھیل سا ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد شاعر ضمنی طور پر کچھ زمانہ کی ناقدردانی کا حال بیان کرتا ہے ؎

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو　　　جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

اس شعر میں زمانہ کی شکایت ہے لیکن شکایت عام نہیں ہے بلکہ صرف نجیبوں کی زبانی ہے۔ زمانہ کا دستور ہے کہ اہل علم و فضل کی قدر کم کرتا ہے اور تکلیف و آزار زیادہ پہونچاتا ہے۔ شریفوں کو چین نہیں دیتا۔ انشا کا شمار بھی اسی زمرہ میں ہے۔ اور علم و فضل تو اس درجہ تھا کہ کسی اور اُردو شاعروں کو نصیب نہ ہوا۔ لیکن زمانہ نے ایسے باکمال شخص کی بھی قدر نہ کی۔

اس شعر میں شاعر اپنی بیکاری کا اظہار کرتے ہوئے اظہار تاسف کرتا ہے۔

مطلع بھی خوب کہا ہے ؎

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا   غنیمت ہے جو ہم صحبت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

اس شعر میں شاعر نے غنیمت شمر صحبت دوستاں کا سبق دیا ہے۔ گردش فلک کی شکایت بھی بر سبیل تذکرہ ہے۔

غرض پوری غزل مرصع ہے اور اس کا دائرہ صرف حسن و عشق کی داستان تک محدود نہیں ہے۔ کسی شعر میں دنیا کی ناپائیداری کا ذکر ہے تو کسی میں بے ناطاقتی کا اظہار۔ کسی میں گردش فلک کی شکایت ہے تو کسی میں غم ہجر کا تذکرہ۔ کسی میں انتہائے شوق و خواری کا بیان ہے تو کسی میں درس زندگی موجود ہے گویا پوری غزل مختلف مضامین کے پھولوں کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ ایسے باکمال شاعر کو صنف غزل گوئی میں بہت اعلیٰ درجہ ملنا چاہیئے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ جب لوگوں کی نظریں وسیع ہونگی تو انشا کی خوبیاں انھیں اپنی طرف متوجہ کرلینگی اور اسوقت اُن کی اعلیٰ شاعری کو کما حقہ شہرت حاصل ہوگی لیکن اس کے لئے ایک زمانہ چاہیئے کیونکہ ابھی۔

ع :- داماںِ نگہ تنگ و گلِ حُسنِ تو بسیار

گُناہ

(رُباعیات حضرت سیماب اکبرآبادی)

پندار سے دل تباہ ہوجاتا ہے   انسان یونہی روسیاہ ہوجاتا ہے
نیکی کے فرشتے تجھے معلوم بھی ہے   ہر سانس میں اِک گناہ ہوجاتا ہے

عشرت کو گناہ زندگی سمجھا ہے   تسکین طبیعت کو بدی سمجھا ہے
ہوجائیگا چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خفا   کیا تو نے خدا کو آدمی سمجھا ہے

میخانوں میں بہر مےکشی جاتا ہوں   سرگشتہ کیف بےخودی جاتا ہوں
جس آگ سے روز مانگتا ہے تو پناہ   بھر کر میں اُسے جام میں پی جاتا ہوں

ہندوستان کے نئے وائسرائے

خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے نئے وائسرائے ہز اکسلنسی لارڈ لنلتھگو نے سرزمین ہند پر قدم رکھتے ہی اپنی ہوشمندی، سیاست دانی اور نیک نفسی کا سکہ ہندوستانیوں کے دل پر جما نا شروع کر دیا ہے۔

ہز اکسلنسی نے ہندوستان کی عنان حکومت اسوقت اپنے ہاتھوں میں لی ہے جبکہ آئین حکومت کا ایک نئے باب کا افتتاح ہونے والا ہے۔ اور صوبجات کو اندرونی خودمختاری حاصل ہونیوالی ہے۔ اور جب گورنر جنرل اور گورنران صوبجات کو بے پایاں اختیارات خصوصی ملنے والے ہیں جن کے ذریعہ سے ہمارے حکام ہندوستان کی سیاسی کشتی کو غرق بھی کر سکتے ہیں اور ساحل مراد پر بھی پہنچا سکتے ہیں لارڈ لنلتھگو خاندانی رئیس اور بڑے دولتمند زمیندار ہیں۔ عجب حسن اتفاق ہے کہ آج سے چھتیس سال پہلے جب آسٹریلیا میں فیڈرل گورنمنٹ قائم ہوئی تھی تو آپ کے والد ماجد جدید دستور کے تحت آسٹریلیا کے سب سے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے تھے اور جبکہ ہندوستان میں فیڈرل گورنمنٹ قائم ہونیوالی ہے تو آپ اس کے سب سے پہلے حاکم اعلیٰ مقرر ہو کر تشریف لائے ہیں۔ انگریزی میں ایک ضرب المثل ہے کہ ابتدا جسکی بھلی اس کا مآل اچھا ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی آپکی تقریروں نے ہندوستانیوں کے دلوں میں آپکی ذات سے نئی امیدیں پیدا کر دی ہیں۔

ہز اکسلنسی لارڈ لنلتھگو آج سے دس سال پہلے بھی ہندوستان کے حالات سے واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ شاہی زراعتی کمیشن کے صدر کی حیثیت سے تمام ملک کا دورہ کر کے ہندوستانیوں کے حالات بچشم خود ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ دو سال کی محنت شاقہ کے بعد اپنی رپورٹ کمیشن کے پیش کی تھی اسوقت کسی کو کیا معلوم تھا کہ آج جو شخص ہندوستان کے دیہاتیوں سے معلوم کرتا پھرتا ہے وہی ایکدن کشور ہندوستان کا گورنر جنرل اور وائسرائے بنکر آئیگا۔ یہ خصوصیت آپ سے قبل ہندوستان کے کسی وائسرائے کو حاصل نہیں ہوئی تھی لارڈ ارون بھی وائسرائے ہونے سے پہلے مدت مدید تک مدراس و بمبئی کے گورنر رہ چکے تھے۔ وائسرائے ہند کے لئے اس بات کو خوبی میں داخل نہیں سمجھتے ہیں کہ تمام ضروری

مسائل کے متعلق اس کی رائیں پہلے ہی سے قائم ہو چکی ہوں۔ آپ نے زراعتی کمیشن کے صدر کی حیثیت سے نو سو صفحات کی جو ضخیم رپورٹ پیش کی تھی اس کے ہر صفحہ سے ہمدردی ٹپکی پڑتی ہے۔ اس رپورٹ میں آپ نے صاف بتا دیا ہے کہ ہندوستان کے زراعت پیشہ طبقے کے افلاس ناداری کا اصلی سبب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کی آب و ہوا ناموافق اور زمین خراب ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ یہاں نئے طریقے رائج نہیں ہیں اور ہمارے کسان ہر طرف سے رسم و رواج کی زنجیروں میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔

ہز ایکسلینسی ۱۹۳۳ء میں جدید اصلاحات کے متعلق جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کے پریسیڈنٹ بھی رہ چکے ہیں چنانچہ آئین جدید کے متعلق آپ کو ہندوستانی لیڈروں کے خیالات سے پوری پوری آگاہی حاصل ہے۔ اس وقت تو آپ سنتے خوب مگر بولتے بہت کم تھے۔ شاید ہی کبھی دل کی بات یک لخت زبان پر آنے دی ہو۔

دولت و ریاست کے باوجود لارڈ لنلتھگو بڑے بیدار مغز جفاکش مدبر ہیں۔ تن آسانی و راحت طلبی آپ کے پاس نہیں پھٹکی۔ چنانچہ آپ ہمیشہ کوئی نہ کوئی پبلک خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں آپ نے ایک فوجی افسر کی حیثیت سے چار سال تک میدان جنگ میں اہم خدمات انجام دیں۔ حتیٰ کہ مسلح کاروں کی ڈرائیوری کرتے رہے۔ بعد ازاں آپ نے صیغہ امیر البحری کے سول لارڈ اور یونینسٹ جماعت کے ڈپٹی چیرمین کی حیثیت سے کام کیا اور اس طرح انتظامی اور سیاسی مشین کے تمام کل پرزوں سے آپکو واقفیت حاصل کرنیکا موقع مل چکا ہے۔ ہندوستان کے زراعتی کمیشن سے فارغ ہونے کے بعد آپ انگلستان کے زراعتی کمیشن کے بھی چیرمین منتخب کئے گئے۔ اور جب کبھی ایک عہدہ سے دوسرے عہدہ تک پہونچنے میں کچھ وقفہ ہوا تو آپ بنکوں، بیمہ اور صنعتی کمپنیوں کے ڈائرکٹری کی ذمہ داریاں اپنے سر لئے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ نیوی لیگ، میڈیکل ریسرچ کونسل اور امپیریل کالج آف سائنس کی صدارت کے فرائض بھی آپ انجام دے چکے ہیں۔

لارڈ لنلتھگو بالطبع کم سخن واقع ہوئے ہیں، لیکن آپ کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی مشہور ہے۔ عرصہ کی بات ہے کہ جب آپکو اپنے والد کی جائداد میراث میں ملی تو ایک بے تکلف مگر بدصورت شخص نے آپ سے پوچھا کہ "میاں یہ لہلہاتی ہوئی جائداد تمہیں کہاں سے ملی؟" آپ نے فوراً جواب دیا "کہ جہاں سے تم کو یہ بھونڈی صورت ملی ہے۔"

لارڈ لنلتھگو کے بزرگوں میں جج، سپاہی، سوداگر، قانون داں سبھی قسم کے لوگ گذرے ہیں شاید اسی وجہ سے آپکی ذات میں یہ تمام قابلیتیں موجود ہیں۔ لارڈ بالفور آنجہانی نے جو اعلیٰ درجہ کے مردم شناس مدبر تھے۔ لارڈ لنلتھگو کے والد بزرگوار کو اپنے علاقے میں چین سے بیٹھنے نہیں دیا تھا بلکہ پبلک خدمات انجام دینے کا چسکا لگا دیا تھا، اسی طرح انہوں نے اپنے دوست کے فرزند رشید یعنی موجودہ لارڈ لنلتھگو کو بھی پبلک خدمات کے میدان میں آگے بڑھایا۔ لارڈ ہالیفکس، (لارڈ اروِن وائسرائے ہند) اور دیگر مدبرین بھی آپ کی قدردانی و حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔

ہز ایکسلنسی لارڈ لنلتھگو محض مدبر اور سیاست داں ہی نہیں بلکہ آپکو اسپورٹ سے بھی بہت شوق ہے جب کبھی آپ کو اپنے عہدوں کی ذمہ داریوں اور اپنی جائداد کے انتظامات سے فرصت ملتی ہے تو آپ اپنی جاگیر میں کبھی کتوں کیساتھ شکار کھیلتے ہیں، کبھی ہاتھ میں مچھلی کی ڈگن لئے کسی خوبصورت چشمہ کے کنارہ مچھلی کے شکار میں مصروف نظر آتے ہیں۔ آپکو گولف سے بھی خاص دلچسپی ہے مگر آپ فیشن ایبل سوسائٹی سے ذرا دور ہی رہتے ہیں اور سوسائٹی کے مقابلہ پر اپنے بال بچوں کیساتھ سادہ مگر خوش و خورم زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اسی لئے لندن والے آپ سے زیادہ آشنا نہیں ہیں اور نہ آپ ہی لندن کی گلی کوچوں سے چنداں واقف ہیں جب کبھی آپ کا اپنے وطن ہوپٹن میں دیہاتی زندگی بسر کرتے کرتے دل اکتا جاتا ہے تو آپ لندن کے بجائے اڈنبرا میں چلے جاتے ہیں۔

برطانیہ کی سیاسی زندگی میں بھی آپ نے کوئی خاص پوزیشن حاصل نہیں کی کیونکہ آپ کبھی دارالعوام کے ممبر منتخب نہیں ہوئے البتہ اب لارڈ ہونیکی حیثیت سے آپ دارالامراء کے رکن ہیں لیکن دارالامراء میں آپ نے بہت کم تقریریں کی ہیں کہ سیاسی دنیا میں آپ کا کوئی خاص نقش ثبت نہیں ہوا ہے۔

لارڈ لنلتھگو غیر معمولی طور پر کشیدہ قامت، کشادہ پیشانی اور طاقتور کلے جبڑے کے آدمی ہیں جو آپ کی دماغی قوت اور ذہانت کی دلیل ہے۔ آپ بہت مستقل مزاج اور اولوالعزم واقع ہوئے ہیں، جو کام کرتے ہیں سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور اچھی طرح کرتے ہیں۔ شرافت، مروت اور دریادلی سخاوت آپ کی خاندانی خصوصیات میں داخل ہیں۔ اس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ وائسرائلٹی کا چارج لیتے ہی اپنی شادی خانہ آبادی کی سلور جوبلی کی تقریب میں آپنے دہلی کے سات ہزار غربا و مساکین کو پُر تکلف دعوت دی، اور اس خصوصیت کیساتھ کہ ہندوؤں کو پوری کچوری

مسلمانوں کو قورمہ پلاؤ، اور عیسائیوں کو انگریزی طرز کا کھانا کھلایا۔ ہم کو کامل یقین ہے کہ ان غریب ہندوستانیوں کی بھوکی آتماؤں سے جو دعائے خیر نکلی ہوگی وہ ہز اکسلنسی کے حق میں کسی دن ضرور اثر دکھائے گی۔

لارڈ موصوف اسکاٹلینڈ کے امیر ہیں اور فی زمانہ اسکاٹلینڈ کا نیّر اقبال عروج پر ہے۔ کیونکہ اس وقت کناڈا میں لارڈ ٹوئیڈ میر، آسٹریلیا میں لارڈ گوری، فلسطین میں لارڈ واچوپ اور ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ لنلتھگو یہ سبھی حکام اعلیٰ اسکاٹلینڈ کے رہنے والے ہیں۔

ہم ہز اکسلنسی وائسرائے اور لیڈی لنلتھگو کا اُمیدوں بھرے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور اسی کیساتھ یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ اب پُرانا زمانہ بدل گیا ہے۔ اب ہندوستان مطلق العنانہ حکومت کا خوگر نہیں رہا۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ لارڈ کرزن فرمان جاری کیا کرتے تھے۔ مگر اب زمانہ کا مقتضا یہ ہے کہ لارڈ لنلتھگو صرف صلاح و مشورہ پر اکتفا کریں گے۔ ایک زمانہ تھا کہ لارڈ کرزن فہمائش کیا کرتے تھے مگر اب لارڈ انلتھگو کو صرف اظہار افسوس کرکے خاموش رہ جانا چاہیئے۔ اب سے چوتھائی صدی پہلے ہندوستان میں وائسرائے کی شخصیت اور اس کے سیاسی خیالات سے خاص دلچسپی لیجاتی تھی۔ لیکن اس عرصہ میں ہندوستان کے مدبر مایوسیوں کے اسقدر شکار ہوچکے ہیں کہ اب وہ کسی نئے وائسرائے یا گورنر کی شخصیت، سابقہ کارگذاریوں یا مدبرانہ قابلیتوں سے چنداں متاثر نہیں ہوتے۔ بات یہ ہے کہ جب لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوکر آئے تو انکی قابلیت اور سیاست دانی کا ہندوستان بھر میں ڈنکا بجگیا۔ لیکن ان کے زمانہ کے واقعات اسقدر دل شکن اور یاس انگیز ہوئے کہ پہلے کبھی نہ ہوئے تھے، لارڈ کرزن کے بعد لارڈ منٹو اور لارڈ ہارڈنگ تشریف لائے، جو دونوں کنسرویٹو تھے، لیکن ان دونوں کا عہد حکومت لارڈ کرزن سے زیادہ کامیاب رہا۔ لارڈ چیمسفورڈ کی نسبت شروع شروع میں کوئی توقعات قائم نہیں کی گئی تھیں، لیکن آخر میں آکر وہ اجتماع الضدین نکلے، یعنی ایکطرف تو انہوں نے مانٹیگیو چیمسفورڈ اسکیم نافذ کرائی اور دوسری طرف انہوں نے پنجاب میں سر مائیکل اوڈوائر کو مطلق العنان بنادیا۔ لارڈ ریڈنگ جیسے تجربہ کار اور قانون داں کے عہد حکومت میں ہندوستانیوں کو آئینی ترقی کی غیر معمولی اُمید تھی لیکن بدنصیبی سے کچھ ایسے ناخوشگوار واقعات پیش آئے کہ ہندوستان جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ لارڈ اروِن نے البتہ ہندوستان کے جذبات کا احترام کیا۔ گو وہ کنسرویٹو جماعت سے تعلق رکھتے تھے لیکن ۱۹۲۹ء میں انہوں نے وہ

پالیسی برتی کہ ان کا نام آجتک ہندوستان میں احترام کیساتھ لیا جاتا ہے۔ لارڈ ویلنگڈن کا عہد حکومت گو ذاتی طور پر ایک کارنامۂ عظیم تھا لیکن پبلک حیثیت سے اہل ہند کے لئے نہایت مایوس کن ثابت ہوا۔ خدا کرے ہز ایکسلنسی لارڈ لنلتھگو کا زمانہ ملک کے حق میں مبارک ثابت ہو۔ آپ کی تقریروں سے یہ توقع ضرور قایم ہوگئی ہے کہ آپ اہل ملک کی شکایات کو رفع کرنیکی کوشش کریں گے۔

لارڈ لنلتھگو کا اصلی نام "HOPE" یعنی (اُمید) ہے اسلئے اُمید ہے کہ ہز ایکسلینسی کا دور حکومت ہندوستان کے لئے مبارک ثابت ہوگا۔ ع

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

رسالہ کلیم دہلی

یہ ماہنامہ ملک کے نامور ادیب اور شاعر انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی ادارت میں پوری آب و تاب کیساتھ جنوری ۱۹۳۶ء سے بمقام دہلی شائع ہونا شروع ہوا ہے اسوقت تک اس کے تین پرچے ہماری نظر سے گذرے ہیں جو مضامین نظم و نثر کے اعتبار سے بہت گرانمایہ ہیں۔ اس رسالہ کے اغراض و مقاصد میں ہندوستانی زبان، ہندوستانی تہذیب، ہندوستانی معاشرت، ہندوستانی علم و ادب بالفاظ دیگر ہندوستانی روح کی صحیح رہنمائی اور انقلاب پیدا کرنا داخل ہے۔ خود حضرت جوشؔ کی شاعری ہر قسم کی تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ آپکے غیر مطبوعہ اور تازہ کلام کے علاوہ دیگر مشاہیر شعرائے ہند کے شاہکار بھی اسمیں نظر آتے ہیں۔ حضرت جوشؔ کی نثر اگرچہ خطیبانہ شان رکھتی ہے البتہ نتیجہ کسیقدر دور جاکر نکلتا ہے۔ رسالہ کے مضمون نگاروں میں ملک کے مشاہیر شعرا و ادیب داخل ہیں مثلاً منشی پریم چند، ملک حبیب احمد بی اے، حضرت سیماب اکبرآبادی، مسٹر لطیف احمد اکبرآبادی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی، نواب جعفر علی خاں اثر، حضرت فانی جائسی، ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری، سید فرید جعفری، آغا شاعر قزلباش دہلوی، احسان بن دانش، ملا رموزی، خواجہ غلام السیدین پانی پتی، مولانا ظفر علیخاں، مجنوں گورکھپوری، مرزا محمد عسکری بی اے لکھنوی وغیرہ وغیرہ الغرض یہ ماہنامہ ہر طرح تعریف کے قابل ہے۔ رسالہ کی قیمت چھ روپیہ سالانہ ہے، ہر پرچہ میں متعدد رنگین و سادہ تصاویر بھی ہوتی ہیں۔ ہم اس ماہنامہ کی ترقی و بقا کے لئے دعا گو ہیں۔

جواہر لال نہروؔ[1]

(از جناب پنڈت آنند نراین ملّا صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی ایڈوکیٹ لکھنؤ)

وطن میں کون سردارِ وطن پھر بن کے آتا ہے چمن کی سمت ارمانِ چمن پھر بن کے آتا ہے
رخِ غم پر تبسم کی کرن پھر بن کے آتا ہے سوئے یعقوب بوئے پیرہن پھر بن کے آتا ہے
حکومت نے کیا تھا قید جسکو، سرگراں ہوکر
وہی یوسف پھر آتا ہے امیرِ کارواں ہوکر

یہ جس کیاری کا گل ہے اسکی پہچانی ہوئی بو ہے مہک پھیلی ہوئی اس کی چمن بھر میں ہر اک سو ہے
خزاں کے دورِ حاضر میں یہی تسکیں کا پہلو ہے یہی جانِ گلستاں ہے اسی کا نام "نہروؔ" ہے
دلوں پر نقش ہے اس کا زبانوں پر وظیفہ ہے
یہی وہ نام ہے جس کے سہارے قوم زندہ ہے

تری فرقت میں رنجیدہ تھے، یارانِ کہن سارے ترانے بھولتے جاتے تھے مرغانِ چمن سارے
لگے تھے جھلملانے سے، چراغِ انجمن سارے تری آواز کے تھے منتظر سازِ وطن سارے
ترا محفل میں آنا تھا کہ پھر منہ میں زباں آئی
رگوں میں پھر لہو دوڑا، تنِ بیجاں میں جاں آئی

ترے دل میں تڑپ ہے، ایک سوزِ غیر فانی کی نظر میں اک تجلی ہے، شعاعِ زندگانی کی
ہنسی ہلکی سی ہونٹوں پر، امیدِ کامرانی کی قسم کھاتا ہے فردائے وطن تیری جوانی کی
انھیں ہاتھوں کھلے گا اک نہ اک دن بابِ آزادی
تری صورت میں دیکھا ہے وطن نے خوابِ آزادی

نہیں رکھنے کا تو، بارِ جفا بر فرقِ حریت ستمگاری کے بیڑوں کو کیا ہے غرقِ حریت
ترے خوں میں سرایت کر گئی ہے برقِ حریت بنا دیگا وطن کو تو کسی دن، شرقِ حریت

---

[1] یہ بے مثل نظم ۱۲۔ اپریل سنہ ۳۶ء کے اجلاس جیل وہنم انڈین نیشنل کانگریس لکھنؤ میں پڑھی گئی تھی۔ اب ہمارے محب مکرم ملّا صاحب کی عنایت سے "زمانہ" میں شائع ہو رہی ہے۔ اس نظم میں پنڈت صاحب نے اہل ملک کے دلی جذبات کی ترجمانی کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ (ایڈیٹر)



پنڈت جواہرلال نہرو
پریسیڈنٹ انڈین نیشنل کانگریس لکھنو
سنہ ۱۹۳۶ء

تو ہی اِس دورِ طوفاں میں ہے اپنا نوحِ آزادی
ترے قالب میں کھنچکر آگئی ہے رُوحِ آزادی

قریب اختتام آنے لگا ہے دَورِ بربادی　　مرے کانوں میں آتی ہے صدائے نغمۂ شادی
کہیں روکے سے رُک سکتی ہے اب تعمیرِ آزادی　　ہر اک زنداں میں رکھ آیا ہے تو اِک سنگِ بنیادی

ترے نقشِ قدم ہیں رزم گہ کے چپّے چپّے پر
ترے ایثار کی مہریں لگی ہیں ذرّے ذرّے پر

جواہر لال نہرو کی قربانیاں

کچھ عرصہ ہوا ہمارے ایک غائبانہ عنایت فرمانے جو ہندوستان کے مشہور شاعر ہیں پنڈت جواہر لال نہرو کی شان میں یہ قطعہ لکھکر بھیجا تھا۔ پنڈت صاحب ممدوح کانگریس کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم یہ قطعہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

محبت کو، مسرّت کو، سرورِ شادمانی کو
تنعّم کو، تموّل کو، تعیّش کو، جوانی کو
وجاہت کو، امارت کو، وقارِ خاندانی کو
تن آسانی کی خواہش کو، نشاطِ زندگانی کو
وطن پہ کردیا قرباں، جواہر لال نہرو نے

پنڈت[ل] جواہر لال نہرو

(از ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ)

پنڈت جواہر لال نہرو نومبر ۱۸۸۹ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ قوم کے نامور رہنما پنڈت موتی لال نہرو کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ پنڈت صاحب نے جواہر لال جی کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اُن کی صحت کا بہت خیال رکھتے تھے اور اسی غرض سے ان کو اکثر سیر و سفر و تبدیل آب و ہوا کے لئے کشمیر لیجایا کرتے تھے

۱۹۰۵ء میں جب جواہر لال کی عمر سولہ سال کی ہوئی تو اُن کو حصول تعلیم کی غرض سے انگلستان بھیجا گیا، جہاں وہ پہلے برطانیہ کے مشہور و معروف درسگاہ ہیرو اسکول میں داخل ہوئے اور بعد ازاں کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج میں تکمیل تعلیم کے لئے گئے۔ ۱۹۱۲ء میں لندن سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی، مگر آپ کا رجحان طبع ہمیشہ سائینس کی تعلیم کی طرف رہا جس کا اندازہ آپ کی مشہور تصنیف "باپ کے خطوط بیٹی کے نام" میں بخوبی ملتا ہے، یہ مفید و دلچسپ کتاب ۱۹۲۹ء میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہے۔ اور کتابستان الہ آباد کی توجہ سے اُردو میں بھی دستیاب ہو سکتی ہے۔

پنڈت جواہر لال انگلستان میں قیام کرنے کے وقت ہی سے ہندوستان کے سیاسی مسائل میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ چنانچہ جب ۱۹۰۷ء میں فخر قوم لالہ لاجپت رائے کی جلا وطنی ہوئی تو وہ لندن ہی میں بیٹھے ہوئے اس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ اُن دنوں لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک شریمت بپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے کی سیاسی پالیسی سے لوگوں کو بڑی دلچسپی تھی۔ چنانچہ گرم دل کے ان ملکی رہنماؤں کی تقریروں و تحریروں کا پنڈت جواہر لال پر بہت بڑا اثر پڑا۔

۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۰ء تک آپ نے الہ آباد ہائیکورٹ میں پریکٹس کی، مگر دل کا رجحان وکالت کی طرف نہ تھا اس لئے اس پیشہ میں کامیابی حاصل کرنے کی نہ انھوں نے کوئی کوشش کی اور نہ کامیابی حاصل ہوئی۔

ل اس مضمون کے لکھنے میں ہندوستان ریویو کے ایڈیٹر یل مضمون سے جو رسالہ کے مارچ نمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

۱۹۲۰ء میں جب تحریک سول نافرمانی شروع ہوئی تو آپ نے وکالت کو ترک کر دیا اور اب آئندہ آپ کے اس طرف رخ کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں ہے۔ اس لئے اسی سال کو آپ کی وکالت کے خاتمے کا سال سمجھنا چاہیئے۔

ہندوستان آنے کے تھوڑے ہی دن بعد نہرو جی پٹنہ کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں گوکھلے فنڈ کے لئے انھوں نے چالیس ہزار روپیہ اکٹھا کیا۔

۱۹۱۷ء میں جب ڈاکٹر مسز بیسنٹ صاحبہ کی تحریک "ہوم رول" شروع ہوئی تو آپ نے اس میں بھی دل کھول کر حصہ لیا، اور اپنی لیاقت اور سرگرمی کی وجہ سے انجمن ہوم رول کے سکرٹری منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ہی پنجاب مارشل لا کے واقعات رونما ہوئے، اور کانگریس نے ان کے متعلق ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تو آپ نے بھی اس تحقیقات میں سرگرم حصہ لیا۔

اسی سال آپ کو اودھ کے کسانوں کی تحریک میں بھی حصہ لینے کا موقع ملا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسانوں کے موافق قانون میں ترمیم کی گئی۔

۱۹۲۰ء میں فخر قوم لالہ لاجپت رائے صاحب کے زیر صدارت کانگریس کا خاص اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا اور اس میں تحریک عدم تعاون کے موافق فیصلہ ہوا تو پنڈت جواہر لال صاحب بھی سرگرمی کے ساتھ کانگریس کی تحریک عدم تعاون میں حصہ لینے لگے جس کی وجہ سے دسمبر ۱۹۲۱ء میں آپ اول مرتبہ چھ ماہ کے لئے جیل بھیجے گئے، لیکن چند ہی دنوں بعد رہا کر دیئے گئے۔ اس کے بعد دو سال کے عرصہ میں آپ متعدد بار گرفتار اور رہا کئے گئے۔ ۱۹۲۳ء کی آخری ششماہی میں آپ نابھا اسٹیٹ میں سکھوں کے اکالی دل کے ساتھ تشددات کو بچشم خود ملاحظہ کرنے تشریف لے گئے، اور جب ریاست نے آپ کے خلاف اخراج کا حکم جاری کیا تو آپ نے اس کی خلاف ورزی کی جس کی پاداش میں آپ کو چھ ماہ قید کی سزا ہوئی، اور اس کے ساتھ ہی آپ پر سازش کرنے کا الزام بھی لگایا گیا اور اسکی علت میں دو سال مزید کی سزا ملی لیکن دونوں سزائیں علی حیثیت سے معاف کر دی گئیں اور آپ کو فوری طور پر رہا کر دیا گیا۔

اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں کلکتہ پریسیڈنسی مجسٹریٹ نے باغیانہ تقریر کرنے کے الزام میں آپ کو دو سال کی سزا دی۔ لیکن آپ کی اہلیہ محترمہ کملا نہرو صاحبہ کی خطرناک علالت کے خیال سے گورنمنٹ نے آپ کو قبل از میعاد رہا کر دیا اور آپ فوراً یورپ روانہ ہو گئے، جہاں آپ کی رفیقۂ حیات زیر علاج تھیں مگر نہرو جی کی تمام کوششیں بے سود ہوئیں اور فروری گذشتہ میں انکا انتقال ہو گیا۔

پنڈت جواہر لال ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔ اس وقت سے وہ اس قومی تحریک میں غیر معمولی سرگرمی کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں۔ کانگریس کے نوجوان طبقے میں آپ کو علی العموم ہر دلعزیزی حاصل ہے، آپ کی صداقت شعاری، نیک نفسی اور ایثار نے عوام ملک کے دلوں میں آپ کے لئے ایک خاص جگہ کر لی ہے، چنانچہ اسی ہر دلعزیزی کا نتیجہ تھا کہ آپ ۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ کانگریس کی تاریخ میں آپ پہلے پریسیڈنٹ ہیں جو کانگریس کے وجود میں آنے کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔

۱۹۲۶-۲۷ء کا بیشتر حصہ آپ نے یورپ ہی میں بسر کیا، مگر اس اثنا میں بھی آپ کو جب کبھی موقعہ ملا تحریر و تقریر کے ذریعہ کانگریس کے اغراض و مقاصد کو تقویت پہونچاتے رہے۔ نومبر ۲۷ء میں سویٹ روس کی دسویں سالگرہ کے موقعہ پر آپ ماسکو میں موجود تھے۔ ۱۹۲۸ء میں آپ نے سویٹ روس کے حالات قلمبند کر کے کتابی صورت میں شائع کئے۔ یہ تصنیف اس وقت کے سیاسی اور اقتصادی حالات کی ایک بہترین یادداشت ہے۔ اسی دورے میں آپ انقلاب روس اور اس کے موجودہ حالات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اب تک آپ کی تحریر و تقریر میں اس کی پوری جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بہر نوع مکمل آزادی کا خیال غالباً روس ہی کے حالات ملاحظہ کرنے کے بعد آپ کے دل میں پیدا ہوا۔ خیر کچھ ہو آپ نے سب سے پہلے مدراس کانگریس میں اس کے متعلق ریزولیوشن پیش کیا لیکن اس وقت یہ تجویز منظور نہیں ہوئی، لیکن اس کے بعد لاہور کانگریس میں یہ ریزولیوشن آپ ہی کی صدارت میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ پاس ہو گیا۔

۱۹۱۶ء میں آپ کی شادی ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ لڑکی سے ہوئی جس نے مرتے دم تک ملک اور قوم کی بھلائی کے لئے اپنے ذاتی آرام اور آسایش کو بخوشی قربان کر کے اپنے نامور شوہر کا ساتھ دیا۔ کملا نہرو کو چھوٹے بڑے ہر کام میں آپ کے خیالات و جذبات کے ساتھ پوری ہمدردی تھی دیش کی بھلائی کے لئے جیسی ان تھک محنت اور جانفشانی انھوں نے آپ کی رہنمائی میں کی اسکو دیکھکر یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ ان کی بے وقت موت سے ہندوستان کی سیاسی تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔

ذاتی حیثیت سے پنڈت جواہر لال کا شمار دنیا کی ان چند قابل قدر اور مایۂ ناز ہستیوں میں ہے جو اپنے دشمنوں سے بھی خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔ انگلستان کے اہل الرائے حضرات اس قدر اختلاف رائے رکھنے کے باوجود بھی ہمیشہ آپ کی ذہانت اور وطن پرستی کے معترف رہے ہیں۔

پروفیسر ہیرلڈ لاسکی (Harold J. Laski) نے جو موجودہ زمانہ کے ایک بہترین ماہر سیاسیات ہیں آپ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :-

"نہرو جی کی رگوں میں خون کی جگہ سوراج گردش کرتا ہے، اُن کے والد ماجد آزادی کے میدان میں بے خوف ہو کر لڑنے والے سپاہی تھے لیکن وہ خود اُن سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ وہ ہندوستان میں صرف سیاسی انقلاب کے آرزو مند نہیں ہیں بلکہ معاشرتی انقلاب کے بھی بجد کوشاں ہیں اور رسم و رواج کی تمام قیود کو جنھوں نے یہاں کے نظام تمدن کو بُری طرح جکڑ رکھا ہے یکسر نخت توڑ دینا چاہتے ہیں :

پنڈت جواہر لال اعلیٰ درجے کے انگریزی داں ہیں۔ سیاست کے ہر شعبہ سے انھیں گہری دلچسپی اور واقفیت ہے۔ اُن کی زندگی پر اُن بزرگوں کی صحبت کا بہت بڑا اثر پڑا ہے جن سے آپ کو وقتاً فوقتاً ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔

آپ کا دماغ مغربی تہذیب و خیالات کا مخزن ہے لیکن دل بدستور ہندوستانی ہے آپ مشرقی شائستگی کے قائل ہیں، اور اپنی کلچر تہذیب و کلچر تمدن قائم رکھنے کے زبردست حامی ہیں سائنس کی روزافزوں ترقی سے آپ کو بڑی گہری دلچسپی ہے، اور آپ ہندوستانی موسیقی اور مصوری اور دیگر فنون لطیفہ کے بھی بہت بڑے قدرداں ہیں۔ انگریزی لکھنے میں آپ کو جو کمال اور مہارت حاصل ہے اس پر انگلستان کے بڑے بڑے ادیب بھی آپ پر عش عش کرتے ہیں۔

آپ کے خاندان نے ملک کی خاطر جو قربانیاں کی ہیں وہ ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر ہیں اس لئے آپ کے خلوص نیت، حب الوطنی اور ایثار سے انکار کرنا کفر ہے۔ اب آپ اس سال پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ اگرچہ ہر شخص کا آپ کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے لیکن اگر آپ کی صدارت میں نوجوان طبقہ اور ملک کے آزمودہ رہنماؤں کے مابین کوئی متفقہ دستور العمل طے ہو جائے اور عوام کی فلاح و بہبود کیلئے سب لوگ آپ کی رہنمائی میں بیش از بیش اتفاق رائے سے کام کرسکیں تو یہ بجائے خود بہت بڑا کام ہوگا۔ ملکی اتفاق و اتحاد کی خاطر اگر آپ نے اپنے خیالات کے عمل درآمد میں ایثار نفس سے کام لیا اور آپ سے اسکی پوری توقع کیجا سکتی ہے تو کانگریس کا کھویا ہوا وقار پھر حاصل ہو سکتا ہے۔ بہرحال نوجوان طبقہ کی بیجا کشمکش اور کانگریس کے اندرونی نفاق کا علاج اگر ہو سکتا ہے تو آپ ہی کی کوشش اور رہنمائی سے ہو سکتا ہے۔

جذباتِ اثر

(از خان بہادر مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر بی۔ اے)

ملتی نہیں ہے دیر سے اپنی خبر کہیں　　ہم ہیں کہیں، خیال کہیں ہے، نظر کہیں

قطعہ

وہ جانِ آرزو ہو بہشتِ نظر کہیں　　اتنی نمود پر نہیں جس کا اثر کہیں
رنگینیٔ بہار ہے، رعنائیٔ شباب　　سرمستیٔ شراب ہے، کیفِ نظر کہیں
پھولوں کا حسن بن کے چمن میں سنور گیا　　شبنم کے آئنے میں ہوا جلوہ گر کہیں
کیفیتیں ہیں اس کی ہی طرزِ نگاہ کی　　نغمہ کہیں، نشاط کہیں، شعرِ تر کہیں
دل گرمیاں اسی کی، اسی کی ہیں چشمکیں　　شعلہ کہیں، شرر کہیں، داغِ جگر کہیں
بس بس گئی ہیں چال پر اس کی قیامتیں　　آ آ گئے ہیں وجد میں دیوار و در کہیں
شوریدگیٔ عشق بھی ہے، نازِ حسن بھی　　ہے خلوتیٔ راز کہیں، پردہ در کہیں
ہنگامے سب اسی کے اٹھائے ہوئے تو ہیں　　دار و رسن کہیں ہو کہ ہو خیر و شر کہیں
جلوے نئے نئے ہیں، ادائیں نئی نئی　　پیغامِ شب کہیں ہے، دلیلِ سحر کہیں
موجوں کا اضطراب ہے، گوہر کی آب و تاب　　توبہ! اقرار لیتا ہے اک رنگ پر کہیں
برسا رہے ہیں پھول ستارے جو راہ میں　　آمادہ سجود میں شمس و قمر کہیں
ہنگامِ صبح غازۂ رخسارِ گل بنا　　ٹوٹے ہوئے دلوں میں رہا رات بھر کہیں
پردے میں یہ بناؤ ہے، ایسا نکھار ہے　　کیا ہو، نقاب رخ سے الٹ دے اگر کہیں

صیاد! قید سے مجھے کرتا تو ہے رہا　　لا دے، جو مستعار ملیں بال و پر کہیں

گل محوِ انتظار ہے، بلبل ہے نالہ کش
باتیں چمن میں کس کی صبا نے اثر کہیں

پُن

از۔ ر۔ ج۔ صاحبہ

صبح ہی صبح میں گھر سے نکلا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور غضب کی سردی تھی۔ گو سورج ابھی نکلا نہیں تھا۔ لیکن اُسکے طلوع ہونیکی علامتیں مشرق پر چھائی ہوئی تھیں۔

میں اسٹیشن کی طرف چلا۔ کیونکہ جب میرے بڑے بھائی اِدھر آتے ہیں تو اسی صبح والی میل سے، اور اگر میں خود انھیں ریل پر لینے نہ جاؤں تو بگڑ جاتے ہیں۔ جب کبھی اُنکا اِدھر آنا ہوتا ہے اماں اس خیال سے نہیں سوتیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں نہ اُٹھوں، اور بھائی صاحب بُرا مان جائیں۔ ہزار آرام لگا کر سوؤں اور صبح اُٹھنے کا وعدہ کروں مگر اُنھیں چین ہی نہیں آتا۔ بڑا لڑکا وطن آرہا تھا، اور اماں حسب عادت رات بھر انگیٹھی لئے بیٹھی رہیں۔ حتیٰ کہ مجھے وقت سے پہلے جگا دیا!

میں مشکل سے تیار ہوکر گراج میں پہونچا، وہاں موٹر جو پہلے ہی سے کچھ خراب تھی اس سردی میں اور اکڑ گئی، ہزار کوشش کی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ کمبخت نے چلنے سے بالکل ہی انکار کر دیا اور مجھے بھائی کی خاطر پیدل ہی چلنا پڑا۔

صبح گرم گرم بستر میں سے اُٹھنا سخت ناگوار گذرتا ہے۔ میری عادت صبح نو بجے تک سونے کی ہے۔ نو بجے سوکر اُٹھتا ہوں دس بجے تک دفتر چلا جاتا ہوں۔ صبح اور اُسکی خوش نمائیاں میں نے شاید کبھی بچپن یا طالبعلمی کے زمانے میں دیکھی ہوں لیکن اب اُنکی یاد بھی باقی نہیں ہے۔ اسوقت تو میں اپنی موٹر کو کوستا ہوا اور سردی میں سکڑتا ہوا اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔

اس جاڑے میں ایک فقیر کمبل میں لپٹا ہوا، درخت سے لگا، سڑک کے کنارے سو رہا تھا۔ اسکے پاس ہی ایک کتا بھی پڑا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سے کتے نے چونک کر گردن اُٹھائی اور آہستہ سے بھونکا۔ فقیر نے بھی آنکھیں کھولیں اور صدا لگائی۔ قریب پہونچکر دیکھتا ہوں تو اس کے چاروں طرف کی زمین رات کی بوندوں سے گیلی تھی، جو ضرور اسکے اُوپر بھی پڑی ہونگی! اپنا پلنگ، اُس کے موٹے موٹے گدے، کمبل اور پروں کا لحاف یاد آگیا۔ میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا! فقیر نے پھر

سوال کیا۔ میں نے بٹوہ کھول کر اسکے پھیلے ہوئے ہاتھ پر روپیہ پھینک دیا۔ فقیر کی آنکھیں پھٹ گئیں! دعائیں دینی بھول گیا۔ میں اپنی سخاوت پر کچھ جھینپتا اور کھسیاتا ہوا جلدی سے آگے بڑھا۔

عورتیں بڑی بوڑھیاں، وہ جوان، کچھ لہنگے اور زیادہ تر رنگین ساڑیاں لپیٹے جلد جلد مندر کیطرف جا رہی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ انہیں دیویوں کی بدولت دھرم، پریم، اور سیوا قائم ہے! ہمارا ہندوستان کیا خوش قسمت ملک ہے کہ یہاں کی عورتیں ایسی ستیائیں ہیں، اتنی صبح پوجا کی خاطر مندر آتی ہیں، اس سردی میں اٹھکر اشنان اور پوجا کرتی ہیں اور ایک میں ہوں کہ اپنے پلنگ پر پڑا سستی کی نیند سو رہا ہوں! اپنا روپیہ جو فقیر کو دیا تھا ان دیویوں کی عقیدت اور نیکی کے سامنے حقیر معلوم ہونے لگا۔ میرا دل انکی عزت سے اتنا بھر گیا تھا کہ میں ہر اس عورت کے جو مندر کی طرف جا رہی تھی، پاؤں چھونے کے قابل بھی اپنے کو نہیں سمجھتا تھا۔

میرا رستہ بھی وہی تھا۔ عورتیں اپنی پوجا کی دھن میں آگے بڑھی جا رہی تھیں۔ ان دیویوں کا ایک سمندر تھا کہ امنڈا چلا آ رہا تھا گو میلے کا دن بھی نہیں تھا پھر بھی انکی عقیدت کا یہ حال تھا! انکے ہاتھوں میں پھول، اور رومالوں میں لپٹی ہوئی کچھ چیزیں تھیں۔ چند ہی عورتیں خالی ہاتھ ہونگی، کسی کسی کی نھی نھی میں میں نے پیسے بھی دیکھے۔ پیسے دینے والیاں تھوڑی تھیں اور مانگنے والے بہت زیادہ۔ وہ ان دیویوں پر ٹوٹ پڑے۔ ہاتھ بڑھا بڑھا کر بھیک مانگنے لگے۔ بھک منگوں کے ہجوم کو اس طرح اپنے قریب دیکھ کر وہ زور سے چیخ اٹھیں "ارے دور ہٹ"، "دیکھ کیا کرتا ہے، کہیں چھو نہ لینا!"

دس پندرہ کے گروہ میں ایک پیسہ گرتا اور وہ سب کے سب اسے لوٹنے کیلئے زمین کی طرف لپکتے۔ ایک پیسہ پر گالی گلوچ، ہاتھا پائی اور دنگا بازی تک ہو جاتی، وہ پُن کی دیویاں ایک انداز برتری سے پیسے پھینکتیں، اپنے کپڑے بچا کر نکل جاتیں اور مڑ کر بھی نہ دیکھتیں کہ انکی نیکی کا کیا نتیجہ ہوا۔

مندر کے باہر کے صحن میں چند پیسوں کیلئے انسانوں میں یہ ہڑ بونگ، یہ آفت مچی ہوئی تھی اور یہ سیوا کی پتلیاں خوش ہو ہو کر گایوں کو روٹیاں کھلا رہی تھیں!

یہ منظر دیکھ کر مجھے متلی ہونے لگی۔ کیا یہی وہ دیویاں ہیں جنکو دیکھکر میرا دل عزت سے بھر گیا تھا؟ کیا وہ یہی عورتیں ہیں جنکے پاؤں چھونے کی مجھے آرزو تھی؟ یہ جو چند پیسوں کے لیے بھوکوں کو آپس میں لڑا دیتی ہیں، انسانوں کی خوراک چھین کر گایوں کے منہ میں ٹھونس دیتی ہیں اور گن

وقت دیکھا، گاڑی آنیوالی تھی۔ میں اس باپ کے سماں کو چھوڑ کر آگے بڑھا۔ راستہ میدان میں سے ہوکر گذرتا تھا پگڈنڈی سے ذرا فاصلہ پر ایک گدھا ادھر اُدھر پڑا تھا۔ موٹر سے میں نے اُسکو دو تین دن پہلے بھی یہیں پڑے ہوئے دم توڑتے دیکھا تھا، لیکن ہندوستان یہ منظر روز ہی نظر آتے ہیں اور کون ٹھہر کر دیکھتا ہے! آج میں اُسکے پاس سے ہوکر گذرا۔ اسکی پیٹھ پر بڑا سا زخم تھا، کھیاں آنی شروع ہوگئی تھیں، ہر طرف سے پیپ بہ رہی تھی اور زخم کے اندر سے ہڈیاں تک دکھائی دے رہی تھیں اسکے نیچے بھی کافی پیپ اور خون جمع تھا جس سے ظاہر تھا کہ جس کروٹ وہ پڑا ہے وہ بھی زخمی ہے۔ گدھے کی آنکھیں آدھی کھلی ہوئی تھیں اور سفیدی نظر آرہی تھی۔ گدھا قریب المرگ تھا۔ اُس سے کچھ فاصلے پر گدھ بیٹھے ہوئے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے گدھے کی موت کے انتظار میں یہیں میدان میں رات گذار دی تھی۔ میں نے گدھے کو چمکارا۔ اور اُس نے ذرا سا ٹک ٹک جھپکا کر آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ اُسوقت اُسکی آنکھوں میں شکایت تھی!

میں آگے بڑھا۔ مندر کے ایک پنڈت "سیتارام" "سیتارام" جپتے، مالا ہاتھ میں لئے ہوئے مندر کیطرف جاتے تھے۔ میں نے انہیں روکا۔ "پنڈت جی، اتنے دن سے یہ گدھا مندر کے سامنے پڑا دم توڑ رہا ہے، اسکا کچھ بندوبست نہیں کیا گیا؟"

"گدھا کوئی ہمارا ہے؟ جس کا ہوگا بندوبست آپ کریگا"

"یہ تو بڑا ظلم ہے۔ اس غریب کے گولی ہی ماردینی چاہئے کہ اس ..... " میں نے آہستہ سے کہا

"رام!.... رام! ..... رام! یہ تو بڑی ہتیا ہے ..... جان لینا بڑی ہتیا ہے."

"اور یہ چار روز سے جو دھیرے دھیرے ہتیا ہو رہی ہے؟" "ایشور کی مرضی" "سیتارام سیتارام" کہتے ہوئے وہ چلے گئے۔ میں بھی آگے بڑھا۔ اب نہ گاڑی یاد تھی اور نہ بھائی کا خیال تھا۔ گلی کوچوں سے پھرتا ہوا میں باہر آیا۔ سورج نکل چکا تھا۔ اسکی دھوپ پھٹے ہوئے بادلوں میں سے نکلکر درختوں اور عمارتوں کی بلندیوں سے اُترتی ہوئی نیچے پھیل رہی تھی۔ فاصلہ پر کچھ لوگ نظر آئے جو کوؤں کو کھیلیں ڈال رہے تھے کئی موٹے موٹے مہاجن پیدل اور تانگوں پر بیٹھے اس پُن میں مشغول تھے۔ میں قریب آیا اُن کوؤں کے درمیان کئی غریب، بھوکے اور ننگے بچے، انھیں کوؤں کیطرح انھیں کیساتھ کھیلیں چن چن کر جلدی جلدی منہ میں بھر رہے تھے۔ لالہ صاحبان اُن بچوں سے بہت ناراض تھے، اور برا بھلا کہہ کر بھگا رہے تھے!

نہ معلوم میں کب گھر پہونچا۔ وہاں بھائی صاحب منہ پھلائے ایکطرف بیٹھے تھے اور اماں انکو سمجھا رہی تھیں کہ "نہ معلوم کیا ہوا؟ کہاں گیا؟ بہانے تو سویرے ہی چلا گیا تھا"

تنقید کتب

نسیمِ عرفان[لہ]

نسیم عرفاں کے نام سے منشی اشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی (خلف حضرت اُفقؔ مرحوم) نے دماغ سوزی اور جگر کاوی سے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ شگفتہ اور مستند ہندوستانی زبان میں کیا ہے شروع کے دو صفحات میں ڈاکٹر بھگوانداس صاحب کا "پیش نامہ" ہے جس کے بعد جناب کیفیؔ دہلوی کی تقریظ ہے۔ بعد ازاں حضرت برقؔ مرحوم کی ایک مختصر نظم اور "تعارف" کے عنوان سے منشی گورسرن لال ادیب لکھنوی نے قابل مترجم کے سوانحی حالات قلمبند کرکے آپکے کلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے مترجم صاحب نے بھی اپنے ترجمہ کے متعلق چند سطور تحریر کیے ہیں۔ مسز سروجنی نائیڈو نے بھی ایک مختصر تقریظ لکھی ہے۔ اس کتاب میں کئی تصویریں بھی ہیں۔ مصنف صاحب ، اُن کے والد گرامی و اُنکے اُستاد منشی بونت رائے صاحب نظرؔ لکھنوی اور کرشن و ارجن کی رنگین تصاویر سے اسکی دلچسپی میں خاصہ اضافہ ہوگیا ہے۔

اصل گیتا کی نسبت جو ہندی فلسفۂ الٰہیات کی رُوحِ رواں ہے کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ البتہ ترجمہ کی نسبت کچھ عرض کرنے کی جرأت کی جاتی ہے۔

فاضل مترجم نے ترجمہ کے لئے پنڈت دیاشنکر نسیمؔ کی مشہور و معروف مثنوی "گلزار نسیم" کی بحر پسند کی ہے۔ اسلئے ترجمہ کا نام "نسیم عرفاں" رکھا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو طبع زاد تصنیف و تالیف کا گمان ہوتا ہے۔ جب میدان جنگ میں ارجن کے دل پر اپنے بھائیوں کی محبت غالب آتی ہے۔ اور وہ اندرونی جذبات سے متاثر ہو کر جنگ و جدل سے انکار کرتا ہے تو کرشن جی فرماتے ہیں ؎

ارجن ! ارجن !! عزیز ارجن — سب تم کو کہیں گے ہیز ارجن

لہ ملنے کا پتہ:- (۱) زمانہ بک ایجنسی کانپور قیمت عہ ، دو روپیہ
(۲) رگھوبیر پرشاد سکینہ مطبع خانہ۔ دہلی
(۳) مسرز سنت سنگھ اینڈ سنز سوداگران کتب لاہور۔

کیوں حسرت دیاس سے ہو منقلب　　یہ طرز عمل ہے سخت معیوب
ہمت، جرأت، یہ چھوڑنا کیا　　منہ جنگ سے اب یہ موڑنا کیا
کر دیگا تمہیں یہ فعل مذموم　　فردوس کی راحتوں سے محروم
تم مرد ہو، مردمی سے لو کام　　نامردی کا زبون ہے انجام
یہ رخصت عقل و آگہی کیا،　　دانا ہو کر یہ گمرہی کیا؟

اس ترجمے میں ترکیبوں کی چستی، الفاظ کی روانی اور برجستگی اور مصرعوں کا ترنم بہت قابل قدر ہے کہیں کوئی گرا ہوا لفظ نہیں ہے اور نہ کوئی جملہ ایسا ہے کہ ثقات لکھنؤ کی زبان پر جاری نہ ہو۔ اور متانت وسنجیدگی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

فلسفہ الہیات بازیچۂ اطفال نہیں۔ اسکو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بہت بڑی قابلیت کی ضرورت ہے۔ اکثر لوگ اصطلاحات ہی میں اس طرح پھنس کر رہ جاتے ہیں کہ صحیح مفہوم بھی ادا نہیں ہو سکتا ہے۔ اور اکثر لوگ روانی طبع کے زور میں ساحل مقصود سے دور نکل جاتے ہیں۔ دیکھئے وحدت وجود و شہود کو منور صاحب نے کن آسان الفاظ اور کیسی، خوبصورت ترکیبوں میں سمجھایا ہے کہ منھ سے بیساختہ مرحبا اور سبحان اللہ نکل جاتا ہے ؎

جلوہ جس کا ہے سائر کل　　ہستی جس کی ہے دائر کل
حاصل اس کو ہمیشگی ہے　　وہ عین حیات سرمدی ہے
کوئی اس کو مٹائے گا کیا　　نقش باطل بنائے گا کیا
کس طرح ہو آدمی کے بس کی　　یہ بات نہیں کسی کے بس کی
ہے نقش دوام جسکی ہستی　　قایم ہے مدام جسکی ہستی
فرضی شے ہے زوال جس کا　　اندازہ بھی ہے محال جس کا
ہیں ان اجسام میں وہ موجود　　ہونا ہے جنھیں ضرور نابود
جب یہ سچ ہے تو ہوش میں آؤ　　ارجن! مصروف جنگ ہو جاؤ

مندرجہ ذیل اشعار میں "روح یا جیو" کے صفات کیسی برجستہ ترکیبوں اور پاکیزہ جملوں میں بیان کئے گئے ہیں ؎

پیدایش و مرگ سے ہے آزاد　　ہوتی نہیں زیست اس کی برباد
اب تک وہ نہیں ہوا ہے پیدا　　ہے اپنی قدامتوں سے پیدا

اس کی کہیں ابتدا نہیں ہے اس کی کہیں انتہا نہیں ہے
جب تن کو پہونچتا ہے ضرر کچھ اس پر پڑتا نہیں اثر کچھ
تخلیق کی قید سے ہے آزاد ہوتا ہی نہیں کبھی وہ برباد
اسکو کسی طور سے بھی ہتھیار ہو ہی سکتے نہیں کچھ آزار
ممکن ہی نہیں بزور افلاک آگ اس کو جلا کے کر سکے خاک
کچھ بھی اس پر اثر نہ ہوگا پانی سے ذرا یہ تر نہ ہوگا
ممکن نہیں خشک ہو ہوا سے محفوظ ہے یہ ہر اک بلا سے
کٹنا اس کا محال تر ہے گھٹنا اس کا محال تر ہے
جلنا اس کا نہیں ہے ممکن گلنا اس کا نہیں ہے ممکن
خشکی کے اثر سے ہے یہ آزاد برنگ دگر سے ہے یہ آزاد
ساکن ہمہ اوست جاودانی لاجنبش و قدیم، غیر فانی

مسئلہ تناسخ کو چار شعروں میں بیان کرکے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے ؎

انسان جس طرح، دوست جانی پوشاک اتار کر پرانی
کرتا ہے بشوق دلفریبی اک خلعت نو سے جامہ زیبی
یہ ساکن پیکر عناصر یہ حاصل دفتر عناصر
ہوکر ملک عدم کا راہرو کرتا ہے قبول قالب نو

عارف کامل کی شناخت ملاحظہ ہو:- ؎

ناظر ہے نگاہ دور رس سے جس کو نہیں لوث کچھ ہوس سے
تمکین دوام ذات میں محو رہتا ہے قیام ذات میں محو
آلام کی کلفتوں سے بے لوث آرام کی لذتوں سے بے لوث
پابندی نفس دوں سے آزاد جذب زشت و زبوں سے آزاد
آلائش بیم سے مبرا رکھتا نہیں چشم قہر اصلا
ایسا انسان ہے مرد کامل اسکو کہتے لوگ عاقل

الغرض منور صاحب کے اس ترجمہ کو جس معیار پر بھی جانچا جائے پورا اترتا ہے۔ اسوقت تک بھی بھگوت گیتا کے جتنے ترجمے اردو زبان خصوصاً اردو نظم میں ہوئے ہیں، ہم بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ منور صاحب کی نسیم عرفاں ان سب میں ایک شان امتیاز رکھتی ہے۔ اسکی لکھائی چھپائی بھی بہت روشن تر اور عمدہ ہے۔ [illegible]

قاموس اعلام[1] (جزو اول)

حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب ملک کے مشہور ادیب، مورخ اور محقق ہیں جن کی ذات گرامی پر اردو زبان کو فخر ہو سکتا ہے۔ آپ کی تمام عمر علم و ادب کی خدمت میں گذری ہے اور آپ کے گرانمایہ مضامین وقتاً فوقتاً رسالہ زمانہ میں ہدیۂ ناظرین ہو چکے ہیں، اس لئے ہم کو آپ کے متعلق کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی یہ جدید تالیف ایک عظیم الشان ادبی کارنامہ کا جزو اوّل ہے۔ پوری کتاب نہ معلوم کتنے اجزا میں تکمیل کو پہونچے گی۔ اس عظیم الشان کتاب میں مشرق و مغرب کے ایسے مشاہیر، سلاطین، علما، فقہا، حکما، اطبا، مشائخ، مصنفین وغیرہ کے مختصر سوانح حیات اور تمام اقوام و قبائل کے حالات معہ سنین و شجرات اور تمام ملکوں، ولایتوں، شہروں، قصبوں کے جغرافیائی حالات درج ہونگے جن کے نام اردو کی علمی، ادبی، مذہبی، تاریخی تصانیف میں بار بار آتے ہیں مستند و معتبر حالات کے ساتھ کتابوں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ پوری کتاب کی تقسیم دو حصوں (۱) تاریخی و (۲) جغرافی میں ہوگی۔ پہلے تاریخی بعد میں دوسرا حصہ شائع کیا جائیگا۔ اس کتاب کے سلسلہ کا ہر جزو ہر دوسرے مہینے میں شائع ہونگے جس کام کا بیڑا حکیم صاحب کی ہمت عالی نے اٹھایا ہے اگر یہ پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا تو اردو لٹریچر پر ایک احسان عظیم ہوگا کیونکہ کوئی ضروری تلمیح اس انسائیکلوپیڈیا سے باہر نہ ہوگی۔ تقطیع بڑی اور لکھائی چھپائی، کاغذ سب اعلیٰ درجہ کی ہے۔ ضخامت ۶۰ صفحات۔

داستان زوال[2]

یہ کتاب بنی اسرائیل یعنی یہودیوں کے عروج و زوال کی تاریخ ہے، جسے مشہور اور کہنہ مشق مصنف امیر احمد صاحب علوی کاکوروی ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر نے توریت۔ زبور۔ انجیل۔ تالمود۔ تاریخ جوزیفس اور دیگر مستند کتب یہود سے اخذ کرکے بہت ہی دلچسپ پیرایہ میں لکھا ہے۔ کتاب کو ختم کئے بغیر چھوڑنا مشکل ہے۔ یہودیوں کا شمار دنیا کی قدیم ترین اقوام میں ہوتا ہے جنھیں حضرت موسیٰ کی سرکردگی میں مصر سے خروج کے بعد سرزمین فلسطین میں جسے یہودیوں کی اصطلاح میں "ارض موعود" کہا جاتا ہے بہت کافی عروج حاصل ہوا تھا۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان جن کی روایات دنیا میں بہت مشہور ہیں

---

[1] قیمت دو روپیہ ملنے کا پتہ: دفتر رسالہ تاریخ حیدر آباد دکن۔

[2] لکھائی چھپائی عمدہ کاغذ سفید قیمتی سائز ۲۶×۲۰ ضخامت ۳۰۶ صفحات قیمت ڈیڑھ روپیہ ملنے کا پتہ محمد ذکی احمد اسٹریٹ لائبریری امیر محل لائبریری نصیر باغ کاکوری ضلع لکھنؤ۔

اسی قوم کے مشہور تاجدار تھے۔ یہ بھی واضح رہے کہ حبش کے بادشاہ، جہاں آجکل اٹلی کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے، حضرت سلیمان اور بلقیس ملکۂ سبا کی اولاد ہونے کے دعویدار ہیں، اور ملک فلسطین کا دارالحکومت یروشلم جو یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں میں قبلہ سمجھا جاتا ہے، اسی قوم یہود کا آباد کردہ اور اس کا پایۂ تخت تھا۔ توریت اور قرآن شریف میں اس قوم کے لئے "خیر الامم" "اہل الکتاب" اور "بنی اسرائیل" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مذہبی لحاظ سے یہ قوم بہت بڑی موحد تسلیم کی جاتی ہے لیکن تاریخی لحاظ سے اس سے زیادہ نافرمان، سرکش، فتنہ پرداز اور قدامت پرست شاید دنیا میں کوئی قوم نہ ہوگی۔ چنانچہ اجتماعی غلامی کا طوق لعنت سب سے پہلے اسی نافرمان قوم کی گردن کا ہار ہوا۔ شاہ بابل بخت نصر نے تمام ملک یہود کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور وہ تمام قوم یہود کو پابزنجیر کر کے آشوریہ میں لے گیا تھا۔ یہ عہد اسیری شہنشاہ ایران کیخسرو کے زمانہ میں ختم ہوا جس نے تمام آشوریہ کو فتح کر کے یہودیوں کو آزادی کا پروانہ عطا فرما دیا تھا (۵۳۶ق۔م) انھوں نے اپنے وطن واپس آکر پھر اپنی سلطنت قائم کی لیکن سرکشی اور خانہ جنگیوں کی بدولت بالآخر رومیوں کے ہاتھ تباہ ہوئے۔ اب اگرچہ وہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور دنیا میں سب سے زیادہ مالدار ہیں۔ لیکن نہ اُن کی کہیں حکومت ہے اور نہ کہیں وطن۔ اب جب سے ملک فلسطین انگریزوں کے قبضہ میں آیا ہے بالفور اسکیم کے بموجب فلسطین کو "وطن الیہود" بنایا جا رہا ہے۔ اور دنیا بھر سے یہودیوں کو لا کر فلسطین میں آباد کرایا جا رہا ہے۔

اس کتاب میں فاضل مؤلف نے نہ صرف قوم یہود کے عروج و زوال سے بحث کی ہے بلکہ حواشی اور مختلف ابواب کے ذریعہ سے مصر، اسیریہ، بابل، ایران، روم و یونان کی بھی معاصرانہ تاریخ پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں ایک جدید باب میں یہودیوں کے طرز معاشرت تہذیب و تمدن اور رسم و رواج پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے غرض یہ کتاب بہت مفید اور دلچسپ ہے

نیشنل پریس الہ آباد اُردو لٹریچر سیریز

مرحوم لالہ رام نراین بُک سیلر الہ آباد نے اُردو اساتذہ کے کلام، تنقیدی، و تحقیقی تصانیف اور علمی و ادبی کُتب کو عمدہ اور چھوٹے سائز پر طبع کرا کے اُردو پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ چنانچہ نیشنل پریس الہ آباد سے اردو لٹریچر سیریز کے نام سے تقریباً پچیس مفید و مستند اُردو کتابوں کا ایک قابل قدر سلسلہ شایع ہو چکا ہے۔ یہ سب کتابیں عموماً $\frac{20\times30}{16}$ کے چھوٹے سائز پر عمدہ لکھائی چھپائی اور کاغذ کے

ساتھ شائع ہوتی ہیں، اور اکثر مجلد ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے اس سیریز کی حسب ذیل کتابیں ہیں۔

۱۔ معیار البلاغت۔ مصنفہ منشی دیبی پرشاد صاحب سحر بدایونی۔ فن معنی و بیان، بدیع، عروض قوافی اور اقسام نظم و نثر پر ایک سبق آموز اور مفید کتاب ہے۔ ذیلی حواشی نے کتاب کی افادی حیثیت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ طلبا اور شعرا کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ضخامت ۲۳۶ صفحات قیمت آٹھ آنہ ۸؍

۲۔ دیوان ذوق۔ جسے حضرت طالب الہ آبادی نے مرتب فرمایا ہے۔ موصوف نے ایک طولانی مقدمہ میں ذوق کی سوانحعمری درج کرنے کے علاوہ اُن کی خصوصیاتِ کلام پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ ضخامت ڈیڑھ سو صفحات سے زیادہ۔ قیمت آٹھ آنہ ۸؍

۳۔ دیوان داغ۔ جو گلزار داغ کا خلاصہ ہے۔ ضخامت ۱۴۰ صفحات قیمت دس آنہ

۴۔ موازنہ انیس و دبیر۔ مولانا شبلی نعمانی کی مشہور و معروف کتاب ہے جو محتاج تفصیل نہیں ضخامت ۳۴۳ صفحات مجلد قیمت ڈھائی روپیہ

۵۔ تذکرہ نیرنگِ سودا۔ مؤلفہ منشی عبدالرفیع صاحب علوی آثر کاکوروی۔ اس کتاب میں فاضل مؤلف نے شروع سے ابتک مرزا رفیع سودا پر جتنی تنقیدیں ہوئی ہیں اُن سب کو نمبروار درج کرکے پھر اپنے قلم سے سب پر تنقید کی ہے، گویا یہ کتاب تنقید بر تنقید ہے۔ اس میں میر و سودا کے کلام کا موازنہ بھی کیا گیا ہے، کتاب قابل قدر اور اس لائق ہے کہ اسکول کی لائبریریوں میں رکھی جائے۔ شروع میں حضرت وصل بلگرامی کا تعارف بھی درج ہے، جو اُردو شاعری کے موضوع پر پڑھنے کے قابل چیز ہے۔ ضخامت ۱۵۸ صفحات، مجلد بوضع انگریزی۔ قیمت بارہ آنہ۔

۶۔ گل بکاؤلی۔ مشہور قصہ ہے۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات۔ مجلد۔ قیمت آٹھ آنہ ۸؍

یہ سب کتابیں لالہ رام نراین لال بک سیلر الہ آباد کی دوکان سے مل سکتی ہیں۔

مصری افسانے

سید مصطفےٰ لطفی، جنوبی مصر کے شہر منفلوط کے رہنے والے مصر کے ممتاز اہل قلم میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ مجموعہ آپ ہی کے پانچ دلچسپ عربی افسانوں کا ترجمہ ہے جسے "ادبی دنیا" کے سابق اڈیٹر قاضی زین العابدین سجاد نے اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ سجاد صاحب اُردو زبان کے دیباچہ نگار

اور عربی زبان پر بھی اچھی قدرت رکھتے ہیں، تاہم کہیں کہیں ترجمہ نظر ثانی کا محتاج ہے اور بعض جگہ غیر مانوس الفاظ استعمال ہوگئے ہیں، مثلاً تسارع عصری، گھپ گھاپ، بیچل، حوادثات وغیرہ مجموعی حیثیت سے یہ افسانے اخلاقی نقطۂ خیال سے پاکیزہ اور سبق آموز اور اس قابل ہیں کہ مسلم اسکولوں کے نصاب میں داخل کئے جائیں۔ لکھائی چھپائی، کاغذ رسمی، ٹائیٹل رنگین و دیدہ زیب ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۱۱۲ صفحات قیمت آٹھ آنہ ملنے کا پتہ منیجر سلطیہ مجتبائی قاضی منزل میرٹھ۔

نیم شب[1]

یہ چھوٹا سا دلچسپ ڈرامہ دنیا کی دو متضاد طاقتوں یعنی استبداد اور اشتراکیت میں جنگ و جدال کی ایک موثر تصویر ہے جس میں کائنات کی سب سے بڑی طاقت حسن و عشق کی آمیزش سے ایک لطف پیدا ہوگیا ہے۔ آخر میں نتیجہ انقلاب کے موافق نکالا گیا ہے۔ البتہ فریقین کے خیالات و جذبات کو ایمانداری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈرامہ کی زبان پیاری اور سلیس ہے اور ڈرامہ پڑھنے کے قابل ضرور ہے لیکن ہم اسے اسٹیج کے لئے مناسب نہیں سمجھتے۔ بہرحال مولانا اشتیاق حسین صاحب قریشی پروفیسر سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی نے چھوٹے سائز کے ساڑھے چار جزو کا یہ ڈرامہ بہت خوب لکھا ہے۔ اس سے پہلے بھی آپ مختلف سبق آموز دلچسپ ڈرامے لکھ چکے ہیں

فلم و ڈرامہ[2]

اس کتاب میں مسٹر ادریس احمد ادیب صاحب نے سینما کی مختصر تاریخ، ہندوستان میں فلم کا آغاز اور ترقی، ایکٹروں اور ایکٹریسوں کے مختصر حالات مع سن پیدائش۔ ڈائرکٹروں اور فلم تقسیم کرنے والوں کے نام اور پتے اور بہت سے ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی تصویریں بھی دی ہیں لائق مؤلف خود لکھتے ہیں کہ "اس کتاب کی عمدگی ایک بڑی حد تک ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی امداد پر منحصر تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ معدودے چند کے سوا اکثریت نے اس بارہ میں نہایت ہی مایوس کن بے نیازی سے کام لیا جس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ انھوں نے سوانح حیات بھیجنا درکنار خطوط کے جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔"

بایںہمہ فاضل مصنف نے مختلف ذرائع سے اس کتاب کو فلم اسٹاروں کے لئے اچھی خاصی "پروپگنڈا بک"

---

[1] لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی۔
[2] مجلد۔ قیمت سوا روپیہ ملنے کا پتہ: (۱) ادریس احمد ادیب مادھوگنج کٹرہ روڈ۔ الہ آباد (۲) ماڈرن بک ڈپو بیوٹ روڈ۔ الہ آباد (۳) نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ۔ (۴) زمانہ بک ایجنسی کانپور

بنا دیا ہے۔ اس کا نقش ثانی نقش اول سے بہتر ہوگا۔ یہ کتاب بھی کسی حد تک دلچسپ معلومات سے پُر ہے، لیکن معلوم نہیں فاضل مؤلف نے ایکٹریسوں کی پیدائش کی تاریخیں درج کر کے ان پر کیوں ظلم کیا ہے، کیونکہ اس دنیا کے لوگوں کی عمریں خواہ کتنی دراز کیوں نہ ہوں مگر "حسن" ہمیشہ کم ہی رہتا ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ معمولی۔ حجم بڑی تقطیع کے ۱۳۸ صفحات

حبش و اطالیہ

اب دنیا کی سلطنتوں کے جھگڑوں کی جڑ "زرخیز ملک۔ معدنیات اور سستی مزدوری" ہے۔ اور یہی وجہ اٹلی اور حبش کے نزاع کی ہے، کیونکہ انھیں تینوں باتوں کے لئے اٹلی بھی حبش سے برسر جنگ ہے۔ یورپ کے بعض علمبرداران تہذیب و آزادی نے غلامی کا ایک اور جدید نظریہ قائم کیا ہے۔ اُن کے نزدیک انفرادی غلامی تو جرم ہے لیکن اجتماعی غلامی جائز اور مباح سمجھی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر کسی قوم کو غلام بنا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اختر حسین صاحب رائے پوری بی۔ اے۔ نے اس کتاب میں مختلف عنوانوں پر مختلف اہل قلم کے مضامین جمع کر کے حبش کے جغرافیائی تاریخی اور تمدنی حالات پر بہت کافی روشنی ڈال دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اٹلی و حبش کی جنگ کے اسباب بھی بیان کر دئیے ہیں۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے شہنشاہ حبش، مسولینی، جنرل ورجین، جنرل وہیب پاشا کی تصویروں کے علاوہ ملک حبش کا نقشہ بھی اس میں دیا گیا ہے جس میں گو موجودہ مقامات جنگ کے نام نہیں ملتے پھر بھی غنیمت ہے۔
لکھائی چھپائی معمولی۔ کاغذ عمدہ۔ ضخامت ۱۸۸ صفحات۔ ٹائیٹل باتصویر قیمت سوا روپیہ
ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔

MORNING SHADOWS.

اپریل ۱۹۳۳ء کے تیسرے ہفتہ میں ایک روز صبح کے وقت ایک چوبیس سالہ کشمیری نوجوان کی لاش وکٹوریہ میموریل کلکتہ کے پاس میدان میں پائی گئی۔ لاش کے قریب پانچ فیر کا ایک ریوالور، ایک کارتوس خالی اور چار بھرے ہوئے ملے۔ یہ لڑکا ایم۔ اے میں پڑھتا تھا۔ بیحد ذہین۔ طباع اور شاعرانہ ذہنیت کا تھا۔ وہ رات دن رباعیات عمر خیام کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ یہ لڑکا جس کا نام پنڈت سورج کشن تھا رائے صاحب پنڈت سری کشن صاحب کا لخت جگر تھا۔ یہی جوانمرگ شخص اس کتاب کا مصنف ہے۔ کتاب زیر نظر مرحوم کی انگریزی نظموں اور ایک انگریزی فسانہ کا مجموعہ ہے مصنف کے شاعرانہ خیالات کی رفعت اور زبان کی شستگی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مرحوم کے دل شکستہ [illegible]

رفتارِ زمانہ

نئے وائسرائے کی تقریر

ہزایکسلنسی لارڈ لنلتھگو نے عنان حکومت سنبھالتے ہی دہلی سے ایک تقریر براڈکاسٹ کی جو ملک کے اخبارات میں شایع ہو چکی ہے۔ ہزایکسلینسی کی یہ تقریر رسمی فصاحت و بلاغت کا نمونہ نہیں ہے بلکہ اسمیں دل سے نکلی ہوئی باتیں ہیں جنکو دلوں میں ہی اُتر جانا چاہیئے۔ اسمیں ملک کے ہر طبقے اور ہر جماعت کو مجموعی حیثیت سے مخاطب کر کے اپنے عہد حکومت کے اصول جہانبانی کا جو خاکہ لارڈ ممدوح نے صاف سیدھے سچے لفظوں میں پیش کیا ہے۔ اس پر اگر آیندہ پانچ سال تک عمل کیا گیا تو حکام اور رعایا کے درمیان ملک میں عرصہ سے جو کشمکش اور بددلی پھیلی ہوئی ہے وہ بہت بڑی حد تک دور ہو جائے گی۔

ہزایکسلنسی لارڈ لنلتھگو ہندوستان کے لئے نئے نہیں ہیں۔ آپ اس سے پہلے بھی شاہی زراعتی کمیشن کے پریسیڈنٹ کی حیثیت سے ہندوستان کے حالات سے براہ راست واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہاں کے سیاسی مسائل سے بھی آپ بخوبی آگاہ ہیں۔ کیونکہ انگلستان میں آپ جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ملک کے اہل الرائے اصحاب سے تبادلہ خیالات کر چکے ہیں۔ اسلئے جو کچھ آپ نے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا ہے وہ سنی سنائی باتوں پر نہیں بلکہ ذاتی تجربہ اور آنکھوں کی دیکھی باتوں پر مبنی ہے۔

ہزایکسلنسی نے شروع میں تحفظ امن و قانون کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اس بارہ میں اپنا فرض بلا رورعایت ادا کرنے کا قصد رکھتے ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے جس سے کسی شخص کو انکار نہ ہوگا کہ ملک کی سب سے بڑی ضرورت امن و امان کا قیام ہے جس کے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس مقصد کے لئے بعض اوقات جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں وہ مسلمہ اصولوں سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ہزایکسلنسی کے عہد حکومت میں ان طریقوں کے اختیار کرنے کی نوبت نہ آئے گی۔ اور جو قابل اعتراض آرڈیننس لارڈ ویلنگڈن کے وقت میں پاس ہو گئے ہیں وہ رفتہ رفتہ منسوخ کر دئے جائیں گے۔ درحقیقت ملک کا معمولی قانون ہر قسم کی بے عنوانیوں کے تدارک کے لئے کافی ہے۔

ہزایکسلنسی انگلستان کے ان بڑے زمینداروں میں ہیں جنھیں اپنے کاشتکاروں سے

خاص ہمدردی ہے زراعتی کمیشن کے سلسلہ میں آپکو ہندوستان کے زراعت پیشہ طبقہ کی حالت سے بھی پوری واقفیت حاصل ہو چکی ہے۔ چنانچہ کسانوں کے فلاح و بہبود کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ نے حکام ضلع سے فرمایا ہے کہ اپنے اپنے اضلاع میں وہ ملک معظم کے نمایندوں کی حیثیت سے گورنمنٹ اور دیہاتی آبادی کے درمیان ایک اہم کڑی کا کام دیتے ہیں۔ ہندوستان کا کسان اُن سے رہنمائی امداد اور دلجوئی کی توقع رکھتا ہے۔ اسلیئے انہیں دیہاتوں کا خوب دورہ کرنا چاہیئے اور گانوٗں والوں سے براہ راست ملکر ان کے اصلی حالات معلوم کرکے ان کی دادرسی کرنی چاہیئے لارڈ ممدوح کا خیال صحیح ہے کہ دورے کا خیمہ دفتر کے قلم سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔

اس ارشاد کی صداقت سے انکار ممکن نہیں ہے ہندوستان کی آبادی کا نوّے فیصدی دیہات میں آباد ہے۔ اسلیئے ملک کی اصلی ضروریات دیہاتوں ہی میں معلوم ہو سکتی ہیں، اس وقت ہندوستان کے تقریبًا ساڑھے سات لاکھ دیہاتوں میں ہر طرف مفلسی و ناداری کا دورہ دورہ ہے اور فصلوں کی تباہی اور زراعتی پیداوار کی کساد بازاری نے دیہات کی آبادی کو جو ملک کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اقتصادی تباہی کی آخری حد تک پہونچا دیا ہے۔ اگر حکام ضلع نے ہز اکسلنسی کی نصیحت پر عمل کیا اور دیگر محکموں نے بھی وایسرائے کے منشاء کے بموجب اہل دیہات کے فلاح و بہبود کے لئے ضروری اسکیمیں جاری کیں تو ملک کی بہت کچھ حالت بدل سکتی ہے۔

ہز اکسلنسی کی تقریر کا اہم ترین حصہ وہ ہے جس میں آپ نے اقوام ہند کیساتھ اپنی کامل غیر جانبداری کا اعلان فرمایا ہے۔ کچھ عرصہ سے اس کے متعلق دلوں میں خاص بدگمانیاں پیدا ہوگئی ہیں اور ہندوستان کی اکثر جماعتوں میں اس بارے میں بددلی سی پھیلی ہوئی ہے۔ نئے آئین نے بھی اکثر جماعتوں کے ساتھ خاص زیادتیاں روا رکھی ہیں۔ ملازمتوں میں بھی فرقہ وارانہ نیابت کے خیال نے قابلیت کے معیار کو پس پشت ڈالدیا ہے اور روزمرہ بھی کثیر تعداد والی جماعت کو ہر موقعہ پر جا و بیجا دبایا جاتا ہے۔ ایسے وقت میں نئے وایسرائے نے سب کے ساتھ بے رورعایت عدل و انصاف اور غیر جانبداری کا برتاؤ کرنے کا جو اعلان کیا ہی وہ خاص طور پر اہم ہے۔ دوسرا بڑا اعلان یہ ہے کہ لارڈ لنلتھگو ملک کی مختلف سیاسی پارٹیوں کے ساتھ کھلے دل سے ملاقات کے لیے

ہر وقت تیار رہیں گے اور اس بارے میں انگلستان کی بہترین روایات کے مطابق عمل کریں گے۔ لارڈ ولنگڈن نے اس بارے میں جو پالیسی برتی وہ بیحد افسوسناک تھی چنانچہ بہت سے اہل الرائے اصحاب کا خیال ہے کہ اُنہوں نے مہاتما گاندھی کی ملاقات سے انکار کرکے بہت بڑی غلطی کی۔ خوشی کی بات ہے کہ نئے وایسرائے کا ایسا خیال نہیں ہے اور وہ مختلف سیاسی جماعتوں کے نقطۂ خیال کو یکساں ہمدردی کیساتھ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ انتخابات میں بھی انھوں نے اپنی گورنمنٹ کی غیر جانبداری کا اعلان کیا ہے یہ بہت بڑا اعلان ہے جس کے بعد بہت سی مشکلات کا خودبخود خاتمہ ہو جانا چاہیئے مگر اس اعلان پر عمل کرانے کے لئے لارڈ ممدوح کو خاص کوشش کرنا ہوگی۔ بہرحال خوشی کی بات ہے کہ آپ نے آتے ہی آتے کسانوں کے فلاح و بہبود میں خاص دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔ چنانچہ آپ نے شریف نوازی کے ساتھ ہر جگہ کاشتکاروں سے ملاقات کی اور مضافات دہلی کے بیلوں کی نسل میں ترقی دینے کے خیال سے اپنی طرف سے دو سانڈ خریدے ہیں۔ جو آپ کے ذاتی صرفہ پر دیہاتوں میں گشت کرائے جائیں گے۔

آپ کو غریبوں کا بھی خیال ہے۔ تعلیم یافتہ بیکاروں سے بھی ہمدردی ہے۔ غریبوں کو تو آپ نے اپنی شادی کی پچیس سالہ جوبلی کے موقعہ پر جس اتفاق سے آپ کے دہلی پہونچنے کے دوسرے ہی دن ہوئی، یاد فرمایا اور اپنے صرف سے سات ہزار ہندو مسلمان، سکھ و عیسائی غریبوں کی پُرتکلف دعوت کی۔ غرض نئے وایسرائے کے عہد جلوس کا آغاز تو بہت ہی دل خوش کن ہوا ہے خدا کرے انجام بھی ایسا ہی بابرکت ہو۔

پنڈت جواہرلال نہرو اور کانگریس

اس سال آل انڈیا نیشنل کانگرس کا اجلاس جس دھوم دھام کیساتھ لکھنؤ میں ہوا اُس سے یہ حقیقت ایک دفعہ پھر ظاہر ہوگئی کہ ابھی تک کانگرس کا لوگوں کے دلوں پر سکہ بیٹھا ہوا ہے لیڈروں کی کمزوریوں اور ان کے باہمی تنازعوں کے باوجود عوام میں کانگرس کی ہردلعزیزی میں زیادہ فرق نہیں آیا ہے اور اُسوقت تک نہ آوے گا جبتک غیر ملکی حکومت کی طرف سے دلوں پر منافرت باقی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ اثر خود پنڈت جواہرلال صاحب نہرو صدر کانگرس کے

دل پر چھایا ہوا ہے۔ پنڈت جی کا دل ہندوستانی مگر دماغ انگریزی ہے۔ ان کی تربیت و تعلیم سب بہترین انگریزی طریقے کے مطابق ہوئی ہے۔ وہ خود ناز و نعم میں پالے ہوئے ہیں اور دماغی نشو و نما کے اعتبار سے بہترین انگریز کے برابر ہیں مگر ان کا دل ایک سچے ہندوستانی کا دل ہے۔ انھیں اپنے ملک کی محکومیت، اپنے وطن کی بے بسی، اپنے ملک کے افلاس کا اتنا ہی صدمہ اتنا ہی رنج ہے جتنا کہ انگلستان کے بہترین محب وطن کو اپنے مادر ملک کی تکلیف اور ذلت کا ہوگا۔ وہ سچے دل سے محکومیت کی زنجیروں کو جلد سے جلد توڑ ڈالنا چاہتے ہیں۔ مگر ہمارا ملک سیاسی پستی کے علاوہ صدیوں کی تمدنی خرابیوں، باہمی رقابتوں اور صدہا دوسری کمزوریوں میں مبتلا ہے۔ اس لئے جو علاج ترقی یافتہ مغربی ممالک کے لئے کارگر ہو وہ ضروری نہیں کہ ہمارے پسماندہ ملک کے لئے بھی موزوں ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں کا طریقہ زمینداری اصلاح و ترقی کا محتاج ہے مگر ابھی جائداد کا انعدام کر دینے کی تجویز کسی طرح سے عملی تدبیر نہیں ہے۔ افلاس کے ہاتھوں اہل ملک کی حالت بیشک زار و نزار ہے لیکن سرمایہ داروں کو مٹا کر غریبوں کی حالت درست کرنے کا خیال جنون سے کم نہیں ہے۔ غیر کی محکومیت اور دست نگری ہر حیثیت سے تباہ کن ہوتی ہے۔ لیکن جن ملک کے باشندوں میں ذرا ذرا سی باتوں میں اسقدر نزاع باہمی ہو جیسی کہ ہمارے بدقسمت ملک میں روزمرہ دیکھنے میں آتی ہے۔ وہاں موجودہ حکومت کے اٹھا دینے کے بعد امن چین سے بیٹھنے کا خیال صریحاً غلط ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جاپان کا برتاؤ انگلستان سے بہتر نہ ہوگا۔ اور خدانخواستہ آج انقلاب سلطنت ہو تو ہمارا حال ویسا ہی نازک ہو جائیگا جیسا اس وقت چین کا ہے۔ غرض مرض کی صحیح تشخیص اور مریض کے تکالیف و مصائب کے سچے احساس کے باوجود بھی پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنی صدارتی تقریر کانگرس میں جو علاج تجویز کیا ہے اس میں بعض غیر معمولی مشکلات اور کمزور حالات کو قطعی مدنظر نہیں رکھا گیا ہے۔ پنڈت جی نے اپنی تقریر میں دنیا کے سیاسی حالات پر صحیح تبصرہ کرکے موجودہ زمانہ کی پولٹیکل تحریکوں کا صحیح نقشہ کھینچا ہے لیکن سیاسی غلامی، معاشرتی بیکسی اور تمدنی بے بسی کا علاج جو وہ تجویز کر رہے ہیں اس مریض کی قوت کا مطلقاً کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی حکیم حاذق کسی سل دق کے مریض کو جو ایک جیلخانہ کی تنگ و تاریک کوٹھری میں مقفل پڑا ہو سوئٹزرلینڈ کے بلند پہاڑوں کی سیر تجویز کر دے۔ یا نان شبینہ کے محتاج شخص کے لئے کوئی بیحد قیمتی دوا کا نسخہ لکھ دے یا کسی از حد کمزور مریض کو اس کی قوت ہاضمہ سے کہیں زیادہ مقوی غذا استعمال کرنے کی صلاح

دے۔ یہی وجہ ہے کہ خلوص و سچائی کے باوجود صدر کانگرس کے مشورے زیادہ ناقابل عمل ہیں اور خود کانگرس کے زیادہ تجربہ کار لیڈروں نے پنڈت جی کے صلاح و مشورہ پر کاربند ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ چنانچہ ایک جزدی تجویز کے علاوہ ورکنگ کمیٹی اور کانگرس کے کھلے اجلاس نے شروع سے آخر تک سوشلسٹ پروگرام اور تجاویز کو رد کر دیا۔ اسلئے ہمارا خیال ہے کہ اس سال بھی کانگرس مہاتما گاندھی۔ بابو راجیندر پرشاد اور مسٹر پٹیل ہی کی رہنمائی میں رہے گی۔ اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے لیڈر مسٹر بھولا بھائی دیسائی کی پوزیشن پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گئی ہے۔ اور غالباً مستقبل قریب میں کانگرس کے نئے صدر کی پالیسی کا کوئی خاص اثر نمایاں نہ ہوگا البتہ عوام کی بہتری کے لئے جو پروگرام تجویز ہوا ہے اس سے ممکن ہے کوئی مفید نتیجہ نکل آئے۔ لیکن یہ بھی اسی صورت میں ممکن ہوگا جب خلوص و صداقت کے علاوہ اعتدال اور حسن تدبیر سے بھی کام لیا جائے اور خواہ مخواہ ملک کے مختلف طبقوں سے جنگ و جدل کا اعلان نہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ایک قابل ذکر بات ہے کہ پنڈت جواہر لال نے ورکنگ کمیٹی کے انتخاب میں انتہائی حق پرستی اور حب الوطنی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اپنے صدارتی ایڈریس میں اس امر کا اطمینان دلایا ہے کہ وہ کانگرس کی عام رائے کا پورا احترام کریں گے۔ اور ہر ممکن طریقے سے باہمی اتفاق و اتحاد کو قایم رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس وعدہ کو انھوں نے پورے طور پر نباہنے کی کوشش کی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ ورکنگ کمیٹی کی موجودہ ساخت کہانتک متفقہ عملدرآمد کی معین و معاون ہوگی؟ اگر سب ٹکڑوں نے اسی ایثار و حق پرستی سے کام لیا جس سے پنڈت جواہر لال نہرو ظاہر و باطن دونوں میں متاثر ہیں تو یقیناً کوئی قباحت نہ ہوگی اور حب الوطنی کے علاوہ لیڈری کا بھی سودا دماغوں میں سمایا تو واقعی سخت مشکلات کا سامنا ہوگا اور شکست اور جگت ہنسائی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگے گا۔ لیکن اگر تنظیم اور ایثار سے کام لیا گیا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ سیاسی خدمت کا سلسلہ ترقی کیساتھ قایم نہ رہے۔

آئندہ سال کا سب سے بڑا واقعہ نئے آئین کے ماتحت کونسلوں کے انتخابات ہیں۔ اگر اس موقع پر کانگرس کوئی قابل عمل پروگرام ووٹروں کے سامنے پیش کر سکی۔ اور جمہور ملک کو اپنے پیغام اور دستور العمل سے کچھ مزید سیاسی حقوق حاصل کرنیکے لئے اپنی طرف کھینچ سکی تو وہ ملک کی بہت بڑی خدمت انجام دیگی۔ عہدوں کا لینا یا وزارتوں کو قبول کرنا ابھی دور ہے۔ وقت مناسب پر اس کا خود بخود حل ہو جائے گا۔ اور ضروری نہیں کہ ایک ہی حل تمام صوبوں

کے لئے کافی ہو۔ آئین میں ایسے روڑے اٹکا دینے کی تجویز جس سے نیا دستور اساسی معطل و منسوخ ہو جائے بظاہر کتنی ہی دل خوش کن کیوں نہ ہو۔ لیکن واقعی حیثیت سے یہ نسخہ کئی بار ناکامیاب ہو چکا ہے اور آیندہ کے لئے اسکے متعلق مزید انتظامات کرلئے گئے ہیں۔ اسلئے موجودہ حالات میں اس کی کوشش کرنا پتھر کی دیوار پر سر دے مارنے کے برابر ہے۔ لیکن متفقہ و مشترکہ کوششوں سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے اور اس عجیب الخلقت آئین سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے کم سے کم دنیا پر ملک کی اہلیت ضرور ثابت کر سکتے ہیں۔ اس وقت پولیٹیکل حالات میں جس تیزی سے تبدیلیاں ہو رہی ہیں انکو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ برٹش گورنمنٹ بھی ہمارے سیاسی اتفاق۔ ملکی تنظیم اور مشترکہ جدوجہد سے دیر تک بے اثر رہ سکے گی۔ دنیا کی سیاسی تحریکات کا شائد ہی کسی ہندوستانی نے پنڈت جواہر لال نہرو سے زیادہ گہرا مطالعہ کیا ہو۔ خدا کرے وہ ملک کی بنیادی کمزوریوں اور ہماری موجودہ مشکلوں کو بھی سمجھ بوجھ کر کام کریں۔ تاکہ مشترکہ مقصد حاصل ہونے میں کم سے کم وقت اور قوت ضائع ہو۔

جذبات محشر

(از حضرت محشر لکھنوی)

صبح سے یکے صبح تک میں ہونے خیال ہیں ایسی حیات کے فدا گذرے جو ایک حال میں

یہ مانا ہجر میں روتے ہی روتے دم نکلتا ہے مگر آنسو جسے کہئے وہ آنسو کم نکلتا ہے

نام دنیا میں دوستی کا نہیں کوئی ہمدرد اب کسی کا نہیں

گلی میں دوست کی سرتا قدم تمنا ہوں کوئی کسیکو پکارے میں بول اٹھتا ہوں

لذت رہی خوشی میں نہ ایذا ملال میں دیوانہ ہو رہا ہوں کسیکے خیال میں

جو گذرتی ہے محشر اسکو سہو چپ رہو چپ کسی سے کچھ نہ کہو

لطفِ سخن

(از منشی جگیشر ناتھ ورما بیتاب)

شامل حال زباں لطف ستمگر ہوتا | اپنے قابو میں جو اپنا دلِ مضطر ہوتا
خوگرِ عدل اگر داورِ محشر ہوتا | زندہ شاہ و گدا ایک برابر ہوتا
آج اپنی بھی فرشتوں پہ حکومت ہوتی | دولتِ علم نہ ملتی تو تونگر ہوتا
چاہ میں ڈال کے چل دیتے ہوس کے بندے | کب وفا کرتے جو یوسف سا برادر ہوتا
لاکھ سر مارا بتوں نے نہ پسیجے پتھر | ان سے بہتر تو درِ یار کا پتھر ہوتا
دو گھڑی چین سے دنیا میں بسر ہو نہ سکی | میں نہ ہوتا تو بھی اس حال سے بہتر ہوتا
ہاتھ گل ہوتے حسینوں کے گلے کیونکر | منحصر وصل حسیناں جو نہ زر پر ہوتا

آئینہ دیکھنے والے نہ کسی کے ہوتے
اپنی قسمت کا لوئی لاکھ سکندر ہوتا

(از مہاشے جیمنی سرشار خیر پور سادات)

کونسا ظلم نہیں کون سی بیداد نہیں | پھر بھی لب پر مرے نالہ نہیں فریاد نہیں
غیر پر لطف کہ مجھ پر تری بیداد نہیں | تو کسی بات میں بھی کم ستم ایجاد نہیں
قوتِ ذوقِ عمل کو جو زیادہ کر دے | زینہ ہے بامِ ترقی کا وہ افتاد نہیں
خوب جی بھر کے ستم توڑ لے گلچیں مجھ پر | "میں وہ بلبل ہوں جسے آہ و فغاں یاد نہیں"
موت ہی مانگ خدا سے کہ جہاں میں جز مرگ | دردِ فرقت کا علاج اے دلِ ناشاد نہیں
آنکھ کیا آنکھ ہے جس آنکھ نے دیکھا نہ تجھے | دل وہ کیا دل ہے کہ جس دل میں تری یاد نہیں
فکرِ عقبیٰ ہے نہ دنیا کی ہوس کچھ اس کو | تیرے پابند سے بڑھ کر کوئی آزاد نہیں
دل کو دل جس نے بنایا ہے یہی چیز تو ہے | دل ہی وہ کیا جو غمِ عشق سے آباد نہیں
حسن مغرور کسی بات کا پابند نہیں | عشق مجبور کسی کام میں آزاد نہیں

دین و ایمان و دل و جان و جگر ہوش و حواس
کون سرشار رہِ عشق میں برباد نہیں



ڈاکٹر ربندرناتھ ٹیگور

زمانہ

جلد ۶۶ — مئی ۱۹۳۶ء — نمبر ۵

اُردو یا ہندی

از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی۔ اے ایل ایل بی،

جس طرح پیدائشِ عالم کی ساعت سے دنیا بے خبر ہے اُسی طرح کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ سب سے پہلے کب اور کونسی زبان عرصۂ ظہور میں آئی لیکن فطرت کے بعض اصولوں کا جائزہ لیکر دیکھنے سے اس سوال کا تسکین بخش جواب مل سکتا ہے، مثال کیلئے پرندوں کی دنیا میں سے کوّے ہی کو لے لیجئے۔ کالے یا سفید ۲؎ کوّے آپ کو دنیا کے ہر حصہ میں بکثرت ملیں گے۔ لیکن جہانتک انکی بولی کا تعلق ہے، تقریباً ہر خطہ کے کوّے بلا امتیاز رنگ و نسل، اگر انکی بولی کو ایک بے نام و نشان زبان سے تعبیر کیا جائے تو ایک ہی زبان کا استعمال کرتے سُنائی دیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ تفریق آب و ہوا کے لحاظ سے ان کے لب و لہجہ میں نمایاں فرق نظر آئے گا، ٹھیک یہی بات انسان کی قدیم ترین زبان کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، نقص و نارسائی کے باوجود عقل انسان یہی فیصلہ کرتی ہے کہ ابتدائً دنیا کی ایک ہی زبان تھی، اور اگر ڈارون کے نظریہ میں کچھ بھی حقیقت ہو تو یہ ثابت ہے کہ لب و لہجہ کی تفریق سے قطع نظر حضرت آدمؑ کی زبان بھی وہی ہوگی جو اس وقت دیگر حیوانات کی بول چال تھی۔ جون کیٹس کی ایک طویل نظم "لامیہ" سے بھی جو غالباً کسی یونانی قصہ سے ماخوذ ہے اسی نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ خود فطرت کی یکسانیت دیگر بھی شاہد ہے کہ اولین نسل انسانی صرف ایک ہی مشترکہ زبان کی مالک تھی، جس میں رفتہ رفتہ مقامی تبدیلیوں اور طبعی اثرات کے باعث سیکڑوں رنگ آگئے۔ اور ایک ہی دریا کی ان بیشمار شاخوں میں مختلف راستے اختیار کر لینے کے بعد اتنا بُعد ہو گیا کہ ان کی صورت ہی بدل گئی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ بنی آدم کی اولین زبان کیا تھی اور اس میں کس طرح اتنی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ دنیا کی قدیم ترین زبان کے بارے میں محققین کی رائے میں شدید اختلاف ہے۔ کوئی سنسکرت

۱؎ سنسکرت کے بعض اشلوکوں کی مدد سے آج بھی لوگ کوّے کی بولی سمجھ لیتے ہیں۔ بنارس کی طرف کوّے کی بولی سے شگون بچارنے کا رواج عام ہے۔ (چندر کانتا مصنفہ دیوکی نندن) ۲؎ جدید تحقیقات نے سفید کوّوں کی نسل کا بھی پتہ لگایا ہے۔

کو دنیا کی قدیم زبان بتاتا ہے۔ کوئی "پراکرت" کو اس فخر کا مستحق بتاتا ہے۔ کوئی ماگدھی کا دم بھرتا ہے اور کوئی پالی کا راگ گاتا ہے۔

ویدوں کو دنیا کی اوّلین تصنیف مانا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ویدوں کی زبان کو جو قدامت او قدیمیت حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ خود ویدوں کی زبان میں بھی اختلاف موجود ہے۔ شکشا نامی ویدانگ کے پانچویں باب میں لکھا ہے کہ ویدوں کی اصلی زبان سنسکرت نہیں ہے۔ بلکہ جب ویدک بھاشا آرش (आर्ष) پراکرت کے رنگ میں رنگی جا رہی تھی۔ اُس وقت اُسے سنسکرت کے روپ میں ڈھالا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ سنسکرت اور پراکرت دونوں ویدک زبان کی بدلی ہوئی دو مختلف صورتیں ہیں۔ اسی ویدک زبان کو ہم آدی آریہ بھاشا आदि आर्य کہہ سکتے ہیں۔ ہندی بھاشا کی اُتپتی (उत्पत्ति) کے مصنف نے تسلیم کیا ہے کہ آریوں کی قدیمی زبان کے چند نمونے رگ وید میں موجود ہیں۔ یہی آریہ بھاشا کتنی ہی پراکرتوں کا سرچشمہ ہے۔ سنسکرت حقیقت میں کسی پرانی پراکرت ہی سے ماخوذ ہے۔ بنگلہ وشوکوش (बंगला विश्व कोश) کے مصنف نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ سنسکرت اور پراکرت ویدک (वैदिक) بھاشا ہی کی توام بیٹیاں ہیں۔ پراکرت کے سنسکرت سے آزاد زبان ہونیکا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ ویاکرن ہیم چندر (वैयाकरण हेम चन्द्र) پراکرت چندریکا کار (प्राकृत चन्द्रिका कार) اور پراکرت سنجیونی کار (प्राकृत संजीवनी कार) نے بھی پراکرت کو سنسکرت سے بے تعلق اور ایک علحدہ زبان تسلیم کیا ہے۔ بعض اہل الرائے پنڈت بدری نارائن کی طرح پراکرت کو سنسکرت ہی کا ایک دوسرا نام تصوّر کرتے ہیں۔

"شکشا" نامی ویدانگ کے مطابق پراکرت ہی پہلی انسانی زبان قرار پاتی ہے۔ لیکن "پالی پرکاش" کا بنگالی مصنف رقمطراز ہے کہ آریوں اور غیر آریوں کے میل جول سے جو زبان بنی وہی پراکرت کہلائی میکڈانل نے اپنی مشہور تصنیف "علم الحق" میں لکھا ہے کہ ژند اور سنسکرت میں جتنا تفاوت ہے اصلی ویدک زبان اور سنسکرت میں اس سے کہیں زیادہ اختلاف موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وید مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر ایک سے زائد زبانوں میں لکھے گئے۔

سنسکرت زبان کی یہ دو قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ (۱) ویدک سنسکرت یا وہ زبان جس میں وید لکھے گئے اور (۲) لوکک (लौकिक) سنسکرت جو پانی نی (पाणिनी) اور اس کے بعد مروّج تھی۔ لیکن یہ تقسیم صحیح نہیں مانی جا سکتی جبکہ خود ویدوں کی زبان میں اختلاف موجود ہے۔

پالی زبان کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ پراکرت زبانوں میں قدامت کے اعتبار سے اولیت کا سہرا پالی ہی کے سر ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں نکالا جاسکتا کہ پالی ہی دنیا کی پہلی زبان ہے جبکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ویدک بھاشا ہی سے پراکرت اور سنسکرت کا ظہور ہوا۔ اور اس کے بعد مختلف پراکرت زبانیں معرض وجود میں آئیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پالی بھی ماگدھی کی طرح آرش پراکرت کی مترادف ہے۔ لیکن یہ دعویٰ ہنوز محتاج ثبوت ہے۔

پراکرت لکشن کے مصنف چنڈ نے پراکرت کی یہ چار قسمیں گنائی ہیں:۔ (प्राकृत लक्षण)

(۱) سے پراکرت (है) (۲) آپ بھرنشں (अपभ्रंश) (۳) پےشاچی (पैशाची) اور (۴) ماگدھی، لیکن بعض بقیہ متذکرہ تقسیم میں سنسکرت اور (शौरसेनी) شورسینی کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ ورروچی (वररुचि) کی رائے میں مہاراشٹری، پےشاچی، شورسینی، اور ماگدھی ہی پراکرت کے ذیل میں آتی ہیں۔ ہیم چندر کے نزدیک بول پراکرت، شورسینی، ماگدھی، پےشاچی، چولیکا (चूलिका) اور آپ بھرنشں مختلف زبانیں کہی جانے کے باوجود پراکرت نژاد ہیں۔ متذکرہ مختلف بیانات کی موجودگی میں بھی کہنے والے کہتے ہیں کہ ماگدھی سنسکرت اور پراکرت کی طرح ایک آزاد اور قدیمی زبان ہے۔ کاتیاین (कात्यायन) کی پریوگ شدھی میں درج ہے کہ دنیا میں ماگدھی کا قدیم سے بول بالا ہے۔ پانِنی (पाणिनी) نے تسلیم کیا ہے کہ ویدک زبان کے علاوہ ماگدھی بھی عوام میں مستعمل تھی، جینیوں کا دعویٰ ہے کہ اردھ ماگدھی، (अर्द्ध) ہی دنیا کی پہلی زبان ہے :۔

जैनेरा अर्द्ध मागधी भाषा केई आदि भाषा वलिया मने करेन ।

غرض جسے دیکھئے وہ کسی ایک یا دوسری زبان کو انسان کی اولین زبان ثابت کرنے کی دھن میں (ہنگامہ و شور و کوشش) دیوانہ ہو رہا ہے۔ لیکن ان ساری زبانوں میں جو ہمرنگی پائی جاتی ہے۔ وہ زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ سب کی سب ایک ہی چشمہ کی مختلف شاخیں ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ چشمہ کیا اور کہاں ہے؟

جہاں تک زبان کی اولیت کا تعلق ہے وید خود بتا رہے ہیں کہ یہ فخر سنسکرت کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ غالباً پراکرت ہی وہ زبان ہے جو فطرت نے پہلے پہل آغوش مادر میں انسان کے کان میں پھونکی۔ اس کے بعد ماحول کے اثرات سے لوگوں کے لب ولہجہ میں تبدیلی واقع ہو گئی جس سے مختلف زبانوں کی نشو و نما ہوئی۔ اور پھر ان کا باہمی اختلاط و اشتراک نئی نئی زبانوں کی پیدائش کا

باعث ہوا اس کا ثبوت حسب ذیل ہے:۔

مسٹر وآسے اور بیرن کوویر کا بیان ہے کہ کسی زمانہ میں سنسکرت ہی تمام دنیا میں مستعمل تھی، مشہور جرمن ادیب ریڈ گیبر رطب اللسان ہے کہ سنسکرت دنیا کی سو سے زیادہ زبانوں کی ماں ہے، ان میں بارہ ہندوستانی، سات میڈین پارسی، دو البانین، سات یونانی، اٹھارہ اطالوی، چودہ اسکلیوانین اور چھ گیلک کیلٹک زبانیں شامل ہیں۔ (ہندو سُپیریارٹی)

مسٹر ہمیر اور سر ولیم جونس ژند اور فارسی زبانوں کو سنسکرت ہی کا بدلا ہوا روپ بتاتے ہیں۔ ہال ہیڈ کی نگاہ میں عربی سنسکرت ہی کا اترا ہوا عکس ہے، اور آیڈلنگ صاحب کے نزدیک انڈو چین اور اس کے گرد و نواح کے دیگر ممالک کی تمام زبانیں سنسکرت ہی کی بگڑی ہوئی صورت ہیں۔ اگر اس عالمگیر تبدیلی کے اسباب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی لب و لہجہ کا فرق ہی ایک بڑی حد تک اختلافِ زبان کا ذمہ دار ہے۔ ذیل میں مختلف زبانوں کے بعض ہم معنی الفاظ نقل کئے جاتے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ یہی الفاظ صرف تلفظ کی برائے نام تبدیلی کے باعث مختلف زبانوں کا سرمایۂ حیات ہیں:۔

۱/

سنسکرت	میڈی	یونانی	اطالوی	انگریزی	فارسی
पितृ پتر	पतर پتَر	पाटेर پاٹیر	पेटर پیٹر	فادر	پدر
मातृ ماتر	मतर متَر	माटेर ماٹیر	मेटर مٹیر	مدر	مادر
نام	نام	اونوما	نامین	نیم	نام

۲/

سنسکرت	آرش پراکرت	پالی	پراکرت
اگنی	आगग اگّی	आगग اگی	आगगी اگی
بُدھی	بُدھی	بُدھی	बुद्धी بُدھی

۳/

سنسکرت	پالی	ماگدھی
شَش	سَتیسا	سو
अश्व اشو	अस्स آسّس	سانگا
व्याघ्र ویاگھر	व्यग्घो ویگھو	वी وی

اسی نوع کی ایک اور مثال پیش کی جاتی ہے۔ ڈیکوریشن (سجاوٹ) فیشن اور لینٹرن انگریزی زبان کے مشہور الفاظ ہیں۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ متذکرہ الفاظ علی الترتیب "دیکھو رے شان" "پے شان" اور "لال ٹین" سے مشتق ہیں۔ ممکن ہے کہ اس بارے میں کچھ اختلاف رائے ہو، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لب و لہجہ کی تبدیلیوں کے ساتھ زبان کو بھی کینچلی بدلنا پڑتی ہے۔ عربوں، ایرانیوں، پنجابیوں، پوربیوں اور دکھنیوں کو سنئے اُن میں سے ہر ایک ایک ہی لفظ اپنے مخصوص انداز میں ادا کرے گا اور ان کے تلفظ میں زمین و آسمان کا فرق پایا جائیگا۔ ہماری روزمرہ کی بول چال ہمیشہ سے عوام کی سہولت کی رہین ہے، اور مختلف مقامات کے لوگ اپنی اپنی آسانی کے لحاظ سے ایک ہی لفظ کو مختلف انداز سے ادا کرتے چلے آتے ہیں۔ یہی مخصوص انداز تبدیلی زبان کا ذمہ دار ہے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ کسی وقت میں ہندوستان میں صرف دو زبانیں سنسکرت اور پراکرت رائج تھیں۔ لیکن وہ دن بھی آیا کہ لوگ سنسکرت کے رعب میں آکر پراکرت کو بھول گئے۔ اس کے بعد سنسکرت کو بھی یہی دن دیکھنا نصیب ہوا۔ چنانچہ جب وہ زوال و ادبار کے چکر میں آئی تو ایکبار پھر پراکرت زبانوں کا نیر اقبال بلند ہوا۔ پروفیسر لاسین کے قول کے مطابق پراکرت زبانوں میں شورسینی اور ماگدھی کو جو فروغ نصیب ہوا۔ اسکی مثال ملنی مشکل ہے۔ مسٹر ستیش چندر اپنی پالی زبان کی قواعد کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ چلکر ماگدھی میں بھی اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اور اس سے بنگلہ، مرہٹی، ہندی اور آڑیا وغیرہ کئی نئی زبانیں نکل کھڑی ہوئیں۔ لیکن جیسا کہ آگے آئیگا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کم ازکم ہندی کی پیدایش تو ماگدھی کے اثرات سے مستثنیٰ ہے۔

پیشتر کہا جا چکا ہے کہ لب و لہجہ یا تلفظ کی تبدیلی کیساتھ ساتھ مختلف زبانوں کا اختلاط بھی ایک نئی زبان کی پیدایش کا باعث ہو سکتا ہے۔ چنانچہ عصر جدید کی فارسی زبان اس دعویٰ کا زندہ ثبوت ہے۔ فارسی، فرانسیسی اور روسی زبانوں کے زیر اثر بسرعت تبدیل ہیئت کرنے میں مصروف ہے۔ اور شاید وہ دن بھی دور نہیں ہے جبکہ ایرانی زبان فارسی کے بجائے کسی دوسرے نام سے پکاری جانے لگے۔

آریوں کے متعلق اب یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ خطۂ کشمیر اور اسکے گرد و نواح کا علاقہ ہی کا زاد بوم ہے۔ یہیں سے آریہ قبائل شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی جانب پھیلتے گئے۔ رگ وید کے دسویں منڈل کے پچھترویں سوکت میں सूक्त جن دریاؤں کا نام آیا ہے۔ وہ سب

ہندوستان ہی کے مشہور دریا ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ ویدوں کے زمانہ میں آریہ لوگ ہندوستان ہی میں آباد تھے۔ اور اسی لئے یہ مقدس سرزمین آریہ ورت کہلائی۔ روشن ہے کہ جب آریہ قبائل اس خطہ سے آگے بڑھے ہونگے تو مفتوحہ علاقوں کے قدیم باشندوں کے میل جول کے باعث ہر دو قوم کی زبانوں نے ایک دوسرے کے اثرات بلاتکلف قبول کئے ہونگے۔ بعض اہل الرائے اصحاب کا خیال ہے کہ اسی اشتراک و ارتباط کے باعث ایک نئی زبان آرش پراکرت معرض وجود میں آئی۔ اسی طرح ماگدھی، اردھ ماگدھی، شورسینی، مہاراشٹری اور اونتی وغیرہ زبانیں بنتی چلی گئیں۔ ان سب میں ماگدھی کو جسقدر عروج ہوا وہ کسی دوسری زبان کو نصیب نہ ہوسکا۔ گوتم بدھ کے زمانے سے لیکر پریہ درشی ورخیلا و تیہ کے عہد تک ماگدھی ہی کا دور دورہ رہا۔ چنانچہ اشوک نے جتنے کتبے نصب کرائے انکی زبان یہی ماگدھی تھی۔ اسکے بعد شورسینی کا شور ہوا۔ لیکن بناؤ کی فکر میں جلد ہی اس نے اپنی صورت بگاڑلی۔ اور اپ بھرنش بنکر رہ گئی۔ جو خود انقلاب روزگار کے پھیر میں پڑکر ہندی کے روپ میں ڈھل گئی۔ ڈاکٹر ویبر اور ینگسمولر جیسے فاضل اجل عالموں کا خیال ہے کہ آرش پراکرت میں بھی وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ لیکن اس کا اصلی روپ پرانے قصّوں میں ہنوز محفوظ ہے۔

آن بان کے لحاظ سے شورسینی آرش پراکرت یا ماگدھی کا مقابلہ نہ کرسکی تاہم غیر معمولی سادگی و شیرینی کے باعث گیارھویں صدی عیسوی کے اواخر تک اسکی دھوم مچی رہی۔ اس کے بعد وہ ہندی سے بدلنے لگی۔ یہانتک کہ کچھ ہی دنوں میں لوگوں نے اُسے ہمیشہ کے لئے فراموش کردیا۔ ہندی کی ابتدائے سخن چند وردائی مصنف پرتھوی راج راسو ہی سے مانی جاتی ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی بہت سے ہندی لکھنے والے ہوگذرے ہیں۔ انہیں سے قطب علی کھمان

[illegible] اکرم فیض سائن دان چرنتر दान चरण پشپ کوی पुष्प कवि

پنچولی جانکی داس اور ہنرمنرائے خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن ہندی ادب کے مورخین جانکی داس ہنرمنرائے کو چھوڑکر باقی اصحاب کو ہندی کا ادیب تسلیم نہیں کرتے۔

بعض مبصرین نے چند کو ہندی ادب میں چاسر کا مرتبہ دینے کی کوشش کی ہے لیکن ہم اُسے مشکل ہندی کا مصنف کہہ سکتے ہیں۔

اوّل یہ کہ راسو کا بیشتر حصّہ یا تو اپ بھرنش یا ہندی کے آغاز سے پہلے اپ بھرنش کی جو صورت تھی اسی میں تصنیف ہوا ہے۔ مثلاً سے

जन सब्ब सरखी कृत विद्य महम
पुर मोद प्रमुद्दनि पूरि रहम ।

۵ جن سب سکھی کرت ودیہ ہم پرسود پرتدنی پوری رہم،

چند کے اس شعر کو آرش پراکرت کے حسب ذیل شعر کے پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھئے آپ کو دونوں کی زبان میں برائے نام فرق نظر آئیگا۔ ۵

गिरि नद्य समन लघु शीघ्र जवम् ।

कृजतायु जगे यथ विद्यु नमे ॥

گ ی ندیہ سم لگھو شیگھر جوم ورجتایو جگے یتھ ودیو نمے

पूरन सकल विलास रस सरस पुत्र फलदान।

अंत होई सह गामिनी नेह नारि को मान ॥

دوسرے یہ کہ راسو کے بارے میں بھی ایسی ہی کہاوتیں مشہور ہیں جیسی کہ شیکسپیر کی تمام تصانیف، ہومر کی ایڈوا اوڈیسی یوریپڈز کے ناٹکوں، نیبنے چوڑا اور تکن سوامی کی تلگو مہابھارت کے متعلق زبان زد خلائق ہیں۔ کم از کم اتنا تو مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ راسو کی تکمیل میں چند کے لڑکے جلہن (जल्हम) کا بھی ہاتھ ہے۔ لیکن ہندی کی فراخدلی کا یہ عالم ہے کہ وہ ڈِنگل کی عبارت کو بھی ہندی ہی تسلیم کرتی ہے:۔

थारी राज में ओषद थारी लेवेगा । ओषद ऊपेर मालकी थाकी है ॥

ترجمہ:۔ "اس راج میں تمہاری دوائیں گے۔ اور دواخانہ کی نگہداشت تمہارے سپرد ہوگی"

یہ راسو سے پہلے کی زبان ہے۔ اور اگر ہم اُسے ہندی مان لیں تو راسو کو بھی ہندی کی تصنیف ٹھہرانا پڑیگا۔ ورنہ راسو کی زبان کے اختلاف کا یہ عالم ہے کہ بنگلہ، مرہٹی اور دیگر زبانیں بڑے فخر کیساتھ اُسے اپنی اولین ادبی تصنیف تسلیم کرتے ہیں۔

چند کے بعد چودھویں صدی کے وسط میں ہندی زبان کا جو رنگ تھا وہ ودیاپتی ٹھاکر اور میر خسرو کے کلام سے ظاہر ہے۔ ٹھاکر سنسکرت اور برج بھاشا کا دلدادہ تھا اور خسرو عربی و فارسی کا والہ شیدا۔ چنانچہ ان دونوں کی ادبی کاوشوں میں بھی یہی فرق نمایاں ہے ۵

ललित लवंग लता परिशीलन कोमल मलय समीरे

मधुकर निकर करम्बित कोकिल कोजित कुञ्ज कुटीरो

للت لونگ لتا پرشیلن کومل ملے سمیرے مدھوکر نکر کرمبت کوکل کوجت کنج کٹیرے

(ٹھاکر)

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم بہ برد تسکیں کسے پڑی ہے جو جا سُناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
(خسرو)

خسرو نے اپنے کلام کے متعلق خود کہا ہے ع "عربی ہندی فارسی تینوں کرو خیال" ٹھاکر او خسرو کے کلام میں جو فرق ہے اس سے آگے چلکر اردو اور ہندی میں جو اختلاف ہوتا گیا ہے اسکے سمجھنے میں بہت آسانی ہوگی۔ لیکن اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ خسرو برج بھاشا سے بے نیاز تھا۔ بلکہ برج بھاشا میں خسرو نے اپنے کمال کے وہ وہ جوہر دکھائے ہیں کہ بے اختیار داد دینا پڑتی ہے ؎

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ تن میرو من پیو کو بھیو دوؤ وی یک رنگ
یا ؎ گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چہوں دیس

برج بھاشا کے علاوہ خسرو نے ایک ایسی زبان میں شعر کہے ہیں جو بعد میں کھڑی بولی ہائی اور اردو کا سنگ بنیاد بنی ؎

ایک تھال موتی سے بھرا سب کے سر پر اوندھا دھرا چاروں اور وہ تھالی پھرے موتی اس سے ایک نہ گرے

دراصل یہی ہماری ہندی یا اُردو زبان ہے۔ جسے ہم ہندوستانی یا ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان کہہ سکتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے آئیندہ نسلیں خسرو کے معیار زبان کی اس شان کو قائم و برقرار نہ رکھ سکیں اور اردو ہندی ایک دوسری سے مختلف ہوتی گئیں۔ کہیں سنسکرت کی پٹ دیگئی اور کہیں فارسی کا رنگ و روغن چڑھایا گیا۔ اور ان گمراہ کن مساعی کے انہماک میں برج بھاشا کی اس عالمگیر لطافت کو بھلا دیا گیا۔ جس نے علی حزیں جیسے ادیب و شاعر سے برسوں برج کی گلیوں کی خاک چھنوائی تھی۔ اب ذرا اس بھاشا کی شیرینی سے بھی لطف اندوز ہو لیجئے۔

ایک دوشیزہ ننگے پاؤں اپنی ماں کیساتھ برج کی گلیوں میں سے گذر رہی ہے۔ راستہ کی کنکریاں اسکے نرم و نازک پیروں میں چبھ رہی ہیں۔ اس تکلیف سے بیچین ہوکر وہ اپنی ماں سے مخاطب ہوتی ہے اور بیساختہ اسکے منھ سے یہ مصرعہ نکل جاتا ہے ع

"مائے رے مائے مہی سانکری گلی میں پگ کانکری گڑتو ہے"

خسرو کی دوربینی و رواداری نے اب سے بہت پہلے ایک ایسی زبان کی ضرورت محسوس کرکے جسے ہندو اور مسلمان دونوں بلاتکلف اپنا سکیں فارسی کی آن بان اور برج بھاشا کی حلاوت کو باہم شیر و شکر کردیا تھا ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں کہ تاب ہجراں ندارم اے جان لیہو کاہے لگائے چھتیاں

لیکن افسوس کہ ان تمام مساعیِ جمیلہ پر یک قلم پانی پھرادیا گیا۔ اور تعصب بیجا کی تاریکی میں اختلاف وافتراق کی خلیج دن بدن وسیع ہوتی گئی۔

کھڑی بولی یا اُردو کی ابتداء

کھڑی بولی ہندوستانیوں کی تبدیل معاشرت کی امین ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب مسلمان ہندوستان میں آباد ہوئے تو عام طور پر ایک ایسی کاروباری زبان کی ضرورت محسوس ہوئی جو دونوں اقوام کے لب ولہجہ کی تفریق کے باوجود ادائے مطلب کا آسان ذریعہ بن سکنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ خودبخود ایک ایسی زبان کی بنیاد پڑنے لگی جسے ہندومسلمانوں کی مشترکہ زبان کہا جاسکتا ہے۔ یہی نہ کھڑی بولی یا اُردو زبان ہے۔ جو برج بھاشا اور فارسی کے میل ملاپ سے تبدیل ہیئت کرکے لشکر و بازار میں آکھڑی ہوئی۔ اور ہندو مسلمان دونوں نے اُسی گلے لگایا۔

ہر چند کھڑی بولی کی شاعری کی ابتداء امیر خسرو کے کلام سے ہوتی ہے لیکن ابھی اُردو کی گرم بازاری نہ تھی۔ خسرو کی طرح مابعد کے مسلمان شعراء بھی ہندی خصوصاً برج بھاشا میں دادِسخن دینا باعث فخر سمجھتے تھے۔ کھڑی بولی یا اُردو کی جائے پیدائش کے متعلق مختلف رائیں ہیں۔ لیکن امرواقعہ ہے کہ اسکی جنم بھومی دتی ہی ہے۔ حالانکہ اب کوئی دکن کو کوئی پنجاب کو اردو کی پیدائش گاہ بتاتا ہے۔ لیکن یہ تمام دعوے بے بنیاد ہیں۔ اُردو شاہی حرم میں برسوں برج بھاشا کا جس کا آبائی وطن متھرا ہے۔ دودھ پی پی کر پروان چڑھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اُردو قطب شاہ والی گولکنڈہ سے تقریباً دوسو برس پیشتر بھی حدود ہند میں رائج تھی۔ لیکن اسوقت تک اُسے زیادہ تر مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی ہونے کے باعث کوئی ادبی اہمیت حاصل نہوئی تھی۔ قطب شاہ ہی پہلا شاعر ہے جسنے اُردو میں ادبی شان لئے ہوئے شعروشاعری کی داغ بیل ڈالی یہ سولہویں صدی عیسوی کے آخری دور کی بات ہے اسطرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تقریباً تیرھویں صدی کے اختتام تک اُردو کے خودرو کلے میں کونپل پھوٹنے لگی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ برج بھاشا کا نیر اقبال عروج واوج کے نصف النہار پر درخشاں تھا۔ اور امیر خسرو جیسے شیریں بیان اور قادرالکلام شاعر نے برج بھاشا اور فارسی کے امتزاج سے چمنستان ادب میں نئے نئے گل کھلانے شروع کردئے تھے مثلاً:۔

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف وروزِ وصلت چو عمر کوتہ سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

आदि कटे से सब को पाले — मध्य कटे से सब को घाले
अंत कटे से सब को मीठा — सो ख़ुसरो में आँखों दीठा

خسرو کے متذکرہ کلام سے ظاہر ہے کہ تیرھویں صدی کے علمار بالعموم برج بھاشا یا فارسی کے مفتون تھے۔ بعض اہلِ قلم کا رجحان کھڑی بولی کیطرف ہو چلا تھا۔ پھر بھی کھڑی بولی ہنوز بول چال ہی تک محدود تھی۔ کھل کر اسمیں لکھنا پڑھنا کسرِ شان سمجھا جاتا تھا۔ یہی کھڑی بولی جو بعد میں اُردو یا ہندی کہلائی۔ دہلی سے نکل کر محض کاروباری زبان کی حیثیت سے دیگر اقطاعِ ہند میں پہونچی۔ لیکن چونکہ جُہلاء بھی جذباتِ لطیف کے مالک ہوتے ہیں اسپر اسلامی معاشرتِ ایران کی عربیہ زندگی ؎

"خوش باش دمے کہ زندگانی این است"

کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اسلئے شعروسخن کا بیدائیشی مذاق رکھنے والی طبعیتیں ملک کی ادبی بازوں سے بہرہ ہونے کے باعث اسی بول چال کی زبان میں "تُک بندی" کرنے لگیں۔ مگر دہلی اور اس کے گرد و نواح میں جہاں برج بھاشا چھائی ہوئی تھی ان "تُک بندوں" کا چراغ نہ جل سکا۔ ہاں ملک کے دور دراز علاقوں میں عام جہالت کے باعث انھیں کچھ نہ کچھ فروغ ضرور نصیب ہوا۔ چنانچہ اُردو کی ابتدائی شاعری اسی نوع کی ہے۔

اگر ادبِ اُردو کی ابتدائی کائنات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اُردو کا آغاز شعرگوئی سے ہوتا ہے۔ جو صریحاً خلافِ فطرت ہے۔ علاوہ ازیں پنجاب اور دکن کی اکثر بولیوں میں یہ صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ کھڑی بولی یا اُردو جیسی برج بھاشا کے دودھ سے دُھلی ہوئی زبان کی پرورش کر سکتیں۔ اُردو کے سب سے پہلے دکنی شاعر قطب شاہ کے کلام ہی کو دیکھ لیجئے ؎

آسماں جُھلس جالا ہوا سورج اگن والا ہوا — چندر سوجل کالا ہوا ہے دُکھا پاری ہائے ہائے

متذکرہ شعر کا ایک ایک لفظ زبانِ حال سے پکار رہا ہے کہ اسکے مصنف نے برج بھاشا کا مُنہ چڑایا ہے۔ اگر یہی اُردو زبان ہے تو ظاہر ہے کہ نہ تو کھڑی بولی اور اُردو دو مختلف چیزیں ہیں اور نہ ہی انکے متحد المخرج ہونے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش ہے۔ پھر بھی اگر کسی طرح یہ ثابت ہو سکے کہ برج بھاشا برج بن کے بجائے دکن ہی میں پیدا ہوئی تو ممکن ہے کہ سرزمینِ دکن کو اُردو کی جنم بھومی ہونیکا فخر حاصل ہو جائے۔ لیکن پنجاب کو اُردو کی پیدائش گاہ ہونیکا دعویٰ کرنا جتنا آسان ہے برج بھاشا کو دکنی نژاد ثابت کر دکھانا اسیقدر مشکل ہوگا۔ پنجاب ہمیشہ سے دہلی کا دست نگر رہا ہے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان بادشاہوں کا جو اثر و اقتدار پنجاب میں محسوس ہوتا رہا ہے۔ دکن میں کبھی اسکا

شائبہ بھی نظر نہ آیا۔ علاوہ ازیں آندا، جاندا، اور آدے جھے میں وہ حلاوت کہاں سے آتی جو ہے، ہوں اور ہُوا کا حصّہ ہے۔

ضرورتِ وقت کے لحاظ سے زبان ہمیشہ اپنا رنگ بدلتی رہتی ہے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ اُردو ہی کی مثال لے لیجئے غدر کے ایام سے لیکر آجتک اُردو کے کتنے مستند الفاظ ٹکسال باہر ہوکر متروکات کی فہرست میں داخل ہو چکے ہیں اور انکی جگہ نئے اور غیر مانوس لفظوں نے لے لی ہے؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو کے ابتدائی شعراء نے اولاً اصنافِ شاعری فارسی مستعار لیکر ملک کی بگڑی ہوئی زبان میں اظہارِ خیال کیا۔ اسکے بعد زمانہ کی تبدیلی کیساتھ ساتھ آہستہ آہستہ کھڑی بولی پر فارسی کا رنگ غالب آنے لگا۔ اور اب اُس نے جو صورت نکالی وہ یہ تھی ؎

ہم جنگل میں اب بستے ہیں بستی اب جی گھبراتا ہے   مانس گندھ نہ بھاتی ہے مرگ مرکٹ سنگ سہاتا ہے

(للت کشور)

اسکے بعد فارسی کا رنگ چوکھا ہوتا گیا ؎

ہر چند جگ کے بخت سیاہوں میں ہیں ولے   کاجل ہو جا بسے ہیں سجن کے نین میں ہم

یا ؎ طالب نہیں وہ ماہ و مشتری کا   دیوانہ ہوا جو تجھ پری کا (ولی)

حتیٰ کہ مرزا غالب نے تو فارسی ہی کو اُردو بنا کر رکھ دیا ؎

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشہ باختن   چشم وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

غالباً فارسی الفاظ کی کثرتِ استعمال ہی کے باعث ولی کو خدائے سخن مانا گیا ہے۔ فارسی بحور و اوزان اور فارسی الفاظ کے اُردو میں بلا تکلف داخل کئے جانیکے بعد اہلِ قلم کی توجہ اسطرف مبذول ہوئی۔ اور اب چونکہ عامیانہ رنگِ زبان رخصت ہو چکا تھا لہذا ریختہ گوئی بھی معیوب نہ رہی۔ اسکا ثبوت یہ ہے کہ غالب کی مشکل پسندی ہی در اصل اسکی غیر معمولی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ ہے ورنہ مضامین کے لحاظ سے میر کو غالب پر فوقیت حاصل ہے لیکن بقول داغ مرحوم ؎

کہتے ہیں اُسے زبان اُردو   جسمیں نہ ہو رنگ فارسی کا

ولی کے عہد میں اُردو اور کھڑی بولی میں گہرا اختلاف ہو جانے کے باوجود بھی ملک کی ادبی زبان در اصل برج بھاشا ہی سمجھی جاتی رہی۔ اور لوگ کھڑی بولی کیطرح اس نئی اُردو یا کھڑی زبان کو بھی حقارت ہی کی نظر سے دیکھتے رہے۔ چنانچہ اُردو کے بعض وہ اہلِ قلم جنھیں باکمال شعراء کی صفِ اولیں میں ممتاز جگہ دیجاتی ہے اعلیٰ طبقہ سے متعلق نہ تھے۔ بھانڈ، مسخرے، خوجے،

درباری بگوئے۔ اور اسی نوع کے دیگر افراد برسوں اُردو کے گلستانِ ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ جاآن اور چرکین جیسوں سے قطع نظر بعض بڑے بڑے استاد واہلِ زبان بھی اس الزام سے بری نہیں کئے جاسکتے۔ آتش نے آتشِ رقابت سے آگ ہوکر جہاں ناسخ پر اشارۃً چوٹ کی ہے۔ لہ وہاں نفسانیت کا شکار ہوکر ببانگِ دہل اپنی پست اخلاقی کا بھی اعلان کردیا ہے "میرا قاتل ہے اک لڑکا"

دوراولیں کے بیشتر اُردو شعراء کا کلام اس قسم کی گندگیوں سے لبریز ہے۔ حالانکہ اب ایسے قابلِ اعتراض اشعار میں معانی ومطالب تلاش کرنیکی بے سود کوششیں ہونے لگی ہیں۔ لیکن ادبِ اُردو کے دامن پر یہ ایک ایسا بدنما داغ ہے جسے کسی طرح مٹایا نہیں جاسکتا۔ اُس عہد کے کتنے ہی باکمال شعرا، آپکو ایسے ملیں گے جو خواجہ صاحب کی طرح سر گھٹائے لٹھ لئے گلیوں کی خاک چھانا کرتے تھے۔ انشا صاحب کے متعلق تو آجتک مشہور ہے کہ بہروپ بھرنے اور نقالی کے جوہر دکھانے میں ان سے کبھی کوئی سبقت نہ لیجا سکا۔ سید صاحب کا ایک شعر ہے ؎

ایسی گرمی میں نہ رکھ اے مری پیاری روزہ	ہندی رکھ لیگی ترے بدلے ہزاری روزہ

اس شعر سے متعلق جو حکایت ہے وہ ہر خاص و عام کی زبان پر ہے۔ اور بھی ایسے کتنے ہی بزرگ ہوئے ہیں جنھوں نے مومن کیطرح کسی شاہد بازاری سے محض اظہارِ عشق ہی کیلئے مشق شعر گوئی کی ہے اور اُردو کا دامن حشو و زوائد سے بھر دیا ہے حشر مرحوم کے ایک شعر سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے ؎

حالِ دل اس کو سنانا ہے زبانِ شعر سے	حشر لکھی ہے غزل اظہارِ الفت کیلئے

شاید یہی وہ حقیقت ہے جس نے مرزا جیسے سنجیدہ مزاج شاعر سے اپنے اُردو کلام کو "بے رنگِ من است" کہلوایا تھا۔

ہندی ادب کے بعض مورخین شاہد ہیں کہ جب مسلمان فاتح وارالسلطنت ہند میں داخل ہوئے اسوقت دہلی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کا رواج عام تھا۔ مسلمانوں کے ربط وضبط سے کھڑی بولی میں صدہا عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ الفاظ داخل ہو گئے۔ اسی ملاوٹ کے باعث ہندی اُردو کہلانے لگی۔ ڈاکٹر گل کرائیسٹ اور ڈاکٹر راجیندر لال مترکی رائے ہے کہ اُردو و ہندی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اُردو، ہندی، ریختہ یا ہندوستانی ایک ہی زبان کے مختلف نام ہیں۔ مسٹر بمیس [illegible] رقمطراز ہیں "وَلی اور سودا جیسے محسنانِ اُردو کی زبان اور ہندی کے ملک الشعراء گوسوامی تلسی داس اور بہاری لال کی زبان ایک ہی ہے اُردو و ہندی کو دو مختلف زبانیں سمجھنا غلطی ہے۔ ذیل میں اُردو اور ہندی

[illegible]

دونوں کے گنجینۂ ادب سے چند ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ جو سرتاپا ہندی ہونے کے باوجود اُردو کا سرمایۂ حیات ہیں یا جو سراسر اُردو ہوتے ہوئے بھی ہندی کے لئے باعثِ فخر ہیں۔

ملاحظہ کیجئے ؎

(۱) چھیل اتنا پڑا ہے کیوں تو یاں — یارا گلے کئے کہاں ٹک سوچ (میرؔ)
(۲) نہ سنو گر بُرا کہے کوئی — نہ کہو گر بُرا کرے کوئی (غالبؔ)
(۳) تم میرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومنؔ)
(۴) اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے (ذوقؔ)
(۵) کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا — چندر مان سا بالک تجھ سے ہوئیگا (میر حسنؔ)
(۶) ہمکو چھیڑو گے تو پچھتاؤ گے — ہنسنے والوں سے ہنسا کرتے ہیں (داغؔ)
(۷) چاہنا ہمکو تو اس کا چاہئے — وہ ہمیں چاہے تو پھر کیا چاہئے
(۸) دو بیلے ہوئے تھے پریم محبت کے جور میں — خود پریم کے ساگر بھی ہوئے پریم کے بس میں (برقؔ)
(۹) پاس رکھتے تھے پاس رکھتے تھے — دور رہتے ہیں دور رہتے ہیں،

یا ع "ایسی بجائی کرشن کنہیا نے بانسری" (نظیرؔ)

اب ذرا ہندی کے بھی کچھ نمونے دیکھ لیجئے ؎

पजनेस तस हूक ताबिसमिल जुल्फ़े फ़ुरकत नकबूल कसे
महबूब चुनामद मस्त सनम अज़ दस्त अलावल लुत्फ बसे।

(पजनेस)

जेहि मग दौरत निरदई तेरे नैन कज़ाक़ - तेहि मग फिरत सनेहिया कियेगरीबां चाक

(रसनिधि)

योतिय गोल कपोल पर परी छुटिलट साफ़+खुशनसीब मुंशी मदन लिख्यो कांच पर क़ाफ़
(श्रृंगार सरोज)

تاج نامی ایک شاعر کا کلام ہے ؎

سنو دل جانی میرے دل کی کہانی ۔ تم دست ہی بکانی —— بدنامی بھی کہونگی میں!
دیو پوجا ٹھانی میں نواج ہوں بھلانی تجے کلمہ قرآن ساڈے گُنن گہونگی میں!
سانولا سلونا سرتاج کلّے دئے تیرے نیہ داگ میں نِداگ ہو د ہونگی میں!

نند کے کمار قربان تاثری صورت پے تاثر نال پیارے ہندوانی ہونگی میں !"

آپ نے دیکھا اُردو میں ہندی الفاظ کی اور ہندی میں عربی، فارسی اور پنجابی وغیرہ مختلف زبانوں کے الفاظ کی اسقدر کثرت و زیادتی کے باوجود متذکرہ اشعار اُردو یا ہندی ہی کی جان ہیں۔ یہ اُردو ہندی کے دراصل ایک ہی چیز ہونیکا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ بدقسمتی سے اُردو پر عربی فارسی کے اور ہندی پر سنسکرت کے غالب آجانیکے باعث ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آنے لگا ہے۔ لیکن اگر ہندی سے سنسکرت اور اُردو سے عربی و فارسی الفاظ کو خارج کر دیا جائے۔ تو جو کچھ باقی رہے گا وہ ایک ہی چیز ہوگی اور ہم اُسے اُردو ہندی کی بجائے خالص ہندوستانی کہنے میں حق بجانب ہونگے۔ لیکن اسپر یہ اعتراض ہوگا کہ یہ تو ہماری بول چال کی زبان ہوگی۔ جو ادبی لطافتوں اور علمی باریکیوں کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ الزام قابلِ قبول نہیں ہے۔ اگر تعصب و جانبداری کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زبان جسقدر تصنع سے عاری ہوگی طرزِ بیان اتنا ہی زیادہ موثر اور دلکش ہوگا۔ اور خیال کی لطافت و رفعت کو بھی کوئی آنچ نہ آنے پائیگی۔ مثلاً ؎

"ایسی بجائی کرشن کنہیا نے بانسری" !

نہ ہم دوسرے ہیں نہ تم دوسرے ہو — زمانہ مگر دوسرا آگیا ہے
اے جنون کچھ دھجیاں تیرے گلے میں ڈالدے — جسمیں کونپل پھوٹتی ہے وہ مہینہ آگیا

شہزادی زیب النساء کے متعلق مشہور ہے کہ ایکروز اتفاقاً اسکی ایک کنیز سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ خطاوار خادمہ شہزادی کو اس واقعہ سے مطلع کرنیکے لئے ایک ایسا پہلو ڈھونڈھنے کی فکر میں تھی جو اُسے شہزادی کے غیض وغضب سے بچا سکتا کہ اس کے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔ ع ؎ "از قضا آئینہ چینی شکست" شہزادی پھڑک اٹھی اور اس نے فی البدیہ اسپر دوسرا مصرعہ چسپاں کر دیا۔ ع ؎ "خوب شد سامان خود بینی شکست" اس شعر کی زبان وہی روزمرہ ہے اور دونوں مصرعوں کی شانِ نزول کا یہ عالم ہے کہ بالکل آمد ہی آمد ہے آورد کا ذکر ہی کیا؟ تاہم یہ سادہ و صریح شعر جن شاعرانہ لطافتوں کا حامل ہے وہ تصنع کی دسترس سے باہر ہے۔

اسی نوع کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔ دیہات کی ایک لڑکی گنگا اشنان کر کے اپنی سہیلیوں کے ہمراہ خوش خوش میلے میں سے گذر رہی ہے۔ رستہ میں کسی طرح اسکے شوہر کی سوغات

اونی چٹیلا اور دوسرے چٹیلے جو اس نے خود خرید کئے تھے کہیں گر جاتے ہیں۔ اس نقصان کے غم و افسوس میں ایک حیادار دوشیزہ کی بے لوث محبت کے جذبات بھی پنہاں ہیں۔ چنانچہ وہ جن لفظوں میں اپنی سہیلیوں سے خطاب کرتی ہے وہ اسکے فن شعر اور علم و عروض سے قطعاً بے بہرہ ہونے اور ٹھیٹ دیہاتی زبان کے استعمال کے باوجود اسقدر رموز وں اور درد واثر سے لبریز ہیں کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ ع:-

"ہائے رے میرو اونی چٹیلا کہوں گر گیو۔"

اسی خیال کو غالبًا اس سے بہتر زبان و انداز میں ادا کیا جاسکتا تھا۔ لیکن کیا وہ دل کی بات ہوتی؟ اور جو کیفیت کہ ان لفظوں کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کس طرح حاصل ہوسکتی تھی؟
ہندی کا ایک تک بند بڑھاپے سے خطاب کرتے ہوئے لکھتا ہے ؎

हाय बुढ़ापा तेरे मारे अब तो हम नक न्याय गये ।
करत धरत कुछ बनते नाहीं कहांज और कैस करन।

اگر یہ سچے جذبات ہیں اور شاعر کے دل سے نکلکر بول چال کی عام زبان میں صحت و صفائی کیساتھ ادا ہوئے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہماری بول چال کی زبان میں جو یقینًا سنسکرت یا فارسی آمیز اُردو یا ہندی نہیں بلکہ سیدھی سادی ہندوستانی ہے خوبصورتی کیساتھ خیالات کی بندش نہیں ہوسکتی؟ اُردو میں ایسے کامیاب شاعر بکثرت موجود ہیں جنھوں نے روزمرہ لکھنے میں واقعی قلم توڑ دیا ہے۔ اور لطیف سے لطیف خیال بالکل سیدھے سادے الفاظ میں بڑے حسن و کمال کیساتھ نظم کر دکھایا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ طرز بیان کے لحاظ سے انہیں مرزا غالب سے کہیں زیادہ کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ مثلاً ؎

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں — کہنا نہیں مانتے کسی کا (داغ)

اور ؎ لئے ہاتھ میں بیلچے مالنیں — چمن کو لگیں دیکھنے بھالنیں (میرحسن)

غرض اپنی صورت سے تاروں کو توڑ — زمیں کو فلک کا بنایا تھا جوڑ (")

کالے ڈسیں بال اگر چھوٹے ہوں — چھالے پڑیں گال اگر چھوئے ہوں (نسیم)

یہ تصویر سا منہ اتر کیوں رہا ہے — کھنچے کس سے ہو کیا ہی نقشہ تمہارا (")

جسے تو سینگ سمجھے ہے یہ ہیں خار — لگے ہیں پاؤں میں نکلے ہیں سر سے (نصیر)

آم سر تور بن گیا سب کا — تو نہ کا تور باندھ کر سر پہ

با کر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا　　　سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا　(اکبر)

بخوفِ طوالت صرف انہیں چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

رسم الخط، زبان اور مذہب

بعض سادہ لوح ہندوؤں کا خیال ہے کہ اُردو سراسر مذہبِ اسلام کے رنگ میں رنگی ہوئی ہونیکے باعث مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ ہندو اُسے کسطرح اپنا کہہ سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ خود مذہب بھی زبان کی طرح براہ راست انسانی معاشرت کے تابع ہے۔ اور اقوامِ عالم کا معاشرتی اختلاف ہی تفریق مذاہب کا ذمہ دار ہے۔ قوموں کی جداگانہ طرزِ معاشرت کی سب سے بڑی وجہ ماحول کے اثرات اور بعض وہ فطری اصول ہیں۔ جنکا مختلف اقطاعِ عالم کے طبعی حالات سے گہرا تعلق ہے۔ جو مختلف مقامات پر مختلف صورتوں میں نسلِ انسانی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ زبان کا لگاؤ بھی دراصل ہماری معاشرت ہی سے ہے۔ اور مذہب کی اختراع بھی طرزِ معاشرت ہی کی رہین ہے۔ انہیں معاشرتی اختلافات کی بنا پر کبھی کبھی خالص اسلامی تخئیل ہندوؤں کے لئے عجیب غریب اور ناقابلِ قبول نظر آ سکتا ہے۔ لیکن اس سے زبان کا بالواسطہ کوئی علاقہ نہیں ہے۔ زبان تو محض اظہارِ خیال کا ایک پیرایہ ہے۔ خیالات پر ممکن ہے کہ کسی مذہب کا رنگ چڑھا ہوا ہو۔ مگر زبان اس الزام سے بری الذمہ ہے، چنانچہ مسلمانوں کی طرح بعض ہندو شعراء نے بھی ہندوؤں کے مذہبی خیالات و عقائد کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی کیساتھ نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ برق، محروم، چکبست، سرور، اُفق، نظر، شعلہ، فدا، وفا، اور سحر وغیرہ ہندو سخنورانِ کامل کا بیش بہا کلام اسکا زندہ ثبوت ہے۔ کبھی کبھی اُردو رسم الخط پر بھی لوگوں کو اعتراض کرتے سُنا گیا ہے۔ لیکن اُردو رسم الخط ہندو مسلمانوں کی جس سچی محبت و یگانگت کا علمبردار ہے بدقسمتی سے اب وہ اسپرٹ معدوم ہے۔ ورنہ اسلاف نے دو مختلف قوموں کو متحد کرنے اور حُب الوطنی کا سبق پڑھانیکے لئے ہندوستانی الفاظ کو ایرانی جامہ پہنا کر اردو کی صورت دی تھی۔ لیکن ہماری سیاسی غلامی نے ہماری ذہنیت کو اسقدر پست اور غلامانہ بنا دیا ہے کہ ہم اپنے عزیز وطن کی ہر چیز کو نفرت و حقارت سے ٹھکرانے لگے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اپنے ان بزرگوں سے جنہوں نے قیودِ مذہب سے بے نیاز ہو کر خالص ہندی خیالات کو ملک کی ادبی زبان میں نظم کر کے اپنی حُب الوطنی کا ثبوت دیا تھا۔ کھلم کھلا بغاوت کرنے ہی میں اپنی بہتری و بہبودی دیکھی اور انہیں افعالِ قبیحہ کو باعثِ فخر جانا۔ اور ملکی زبان و الفاظ تو درکنار خیالات بھی غیر ممالک سے مستعار لینا شروع کر دیئے۔

آزاد جیسی دردمند ہستیاں ہمارے شعراء کی اس گمراہی پر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہیں مگر ہم نے کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی انکی بات پر کان دھرنا گوارا نہ کیا۔ دراصل کسی قوم کیلئے بھی یہ غلامانہ ذہنیت اسکی سیاسی غلامی سے کہیں زیادہ مہلک اور تباہ کن ہے۔

ادب قومی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے اس آئینہ پر اجنبیت اور تعصب و تنگ نظری کی زنگ چڑھی ہوئی ہے۔ اور اسمیں سچی قومی زندگی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ ہم تصنیف کی خوبیوں کو دیکھنے کے بجائے مصنف کی قومیت کی ٹٹول کرنا مقدم سمجھتے ہیں۔ جبتک ہماری یہ ذہنیت تبدیل نہو گی۔ ہماری قومی زندگی اور ہمارے قومی ادب کی صحیح طور پر نشو و نما نہیں ہوسکتی۔ اگر مردہ قوم کی اس ذہنیت کو تبدیل کرنیکے لئے کسی بڑی سے بڑی قربانی کی بھی ضرورت پڑے تو ہمیں دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ دنیا نے قومی زندگی کی بقا و حفاظت کیلئے ہنستے ہنستے قوموں کو قربان کر دیا ہے تو کیا ہم اتنا بھی نہیں کرسکتے کہ اپنی ملکی زبان کو اجنبیت کے غیر ضروری عناصر سے پاک و صاف کر کے ایک مشترکہ قومی زبان کی تعمیر میں کوشاں ہوں؟ اور رسم الخط کے قضیہ کو برضامندی باہمی ہمیشہ کیلئے خیرباد کہدیں؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب ہی کے ذریعہ سے ملک میں قومی زندگی کی روح پھونکی جاسکتی ہے۔ اسلئے اگر ہم اپنی زبان کو اسدرجہ عام فہم نہ بنائیں گے کہ ہمارا ادب بلاتخصیص و تکلف ہر کس و ناکس پر اثر انداز ہوسکے تو ظاہر ہے کہ ہمارے ناظرین کا دائرہ نہایت محدود اور تنگ رہ جائیگا اور ملک ہمیشہ اس عام بیداری کیلئے ترستا رہیگا جسکی قوم کو سخت ضرورت ہے۔ ہمارے شاندار ماضی کی داستان پارینہ بتا رہی ہے کہ برہمنوں نے علوم و معارف کے دروازے عوام پر بند کر کے ملک کو عام جہالت کی تاریکی میں غفلت کی نیند سُلا دیا تھا۔ یہی خود بینی و خود غرضی ملک کیلئے غلامی کی شکست نادیدہ زنجیروں میں بدل گئی۔ پس قوم کا مستقبل بنانے کیلئے سب سے بڑی ضرورت اسبات کی ہے کہ ہم پہلے ایک ایسی زبان کی تعمیر کی طرف متوجہ ہوں جو ملک کے طول و عرض میں بلا قید رنگ و مذہب ہر کس و ناکس کے لئے قابل قبول و فہم ہو۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں کی یہ مشترکہ زبان بیسویں صدی کی اردو یا ہندی ہرگز نہیں ہوسکتی بلکہ ہم اسے کل کی "ہندوستانی" زبان کہہ سکتے ہیں۔

پرانی دلّی

(از مسٹر رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم اے)

بارہا بستی رہی لیکن اُجڑنے کے لئے
مدتوں بنتی رہی لیکن بگڑنے کے لئے

ہستنا پور میں چمکتا بھارتوں کا تاج تھا
ایک دن وہ تھا کہ سورج بنسیوں کا راج تھا

خانداں تومار کا تجھ میں کبھی تھا حکمراں
تھے کبھی چوہان بھی اس سرزمیں کے پاسباں

راجدھانی تھی ترے دامن میں پرتھی راج کی
جلوہ گہ تھی تو علاء الدیں کے تخت و تاج کی

مخبر شانِ غلاماں اک فقط مینار ہے
خلجیوں کی یاد اک ٹوٹی ہوئی دیوار ہے

سیّدوں کا حکم بھی دو چار دن چلتا رہا
تغلقوں کا بھی چراغ اس بزم میں جلتا رہا

کر دیا تیمور کو دیوانہ تیری چاہ نے
ولولے دل کے نکالے آکے نادر شاہ نے

شوکتِ چغتائی کا اُجڑا ہوا مسکن ہے تو
خاک ڈالی لودھیوں پر جن کے وہ مدفن ہے تو

تجھ میں رونق تھی کبھی افغانیہ دربار کی
تھی کبھی تجھ میں حکومت تغلقی سرکار کی

اب کہاں باقی وہ شان شاہجہاں آباد ہے
جو چمن پھولا پھلا تھا آج وہ برباد ہے

تاجدارانِ جہاں قبروں میں ہیں سوئے ہوئے
لعل و گوہر ہیں بہت اس خاک میں کھوئے ہوئے

پادشاہانِ سلف کی ہیں یہی بربادیاں
چند شاہی مقبروں تک ختم ہیں آبادیاں

درج ویرانوں میں ہے عہدِ کہن کی داستاں
دشت کے کانٹے سناتے ہیں چمن کی داستاں

جن سروں پر تاج تھے وہ خاک میں غلطاں ہیں آج
جلوہ افگن کل جو تھے دنیا میں وہ پنہاں ہیں آج

تیرے ہر ٹوٹے ہوئے پتھر میں ہے شانِ قدیم
سوکھے تنکوں میں بسی ہے اُجڑے گلشن کی شمیم

یہ زمیں مٹ جائیگی یہ آسماں مٹ جائے گا
ایک دن ناشاد تیرا بھی نشاں مٹ جائے گا

ایرانی ادبیات

جناب طالب الہ آبادی ایم اے

اسلام سے پہلے کی ادبیات ایران میں سب سے بڑی اور متبرک کتابیں اوستائی زبان میں ہیں جن کی قدر زردشتیوں میں اتنی ہی ہے جتنی ویدوں کی ہندوؤں میں۔ اوستائی زبان سنسکرت سے ملتی جلتی بھی ہے۔

ان مقدس کتابوں کی تفسیریں اور شرحیں ایران کے قرون وسطےٰ میں ہوئیں جنکی زبان پہلوی ہے۔ اُن کے علاوہ غیر مذہبی ادب کا بھی گنجینہ ہیں جنمیں تاریخ، افسانے اور سنسکرت کے تراجم کثرت سے ملتے ہیں جہاں کہیں اصل نہیں ہے اُن کا عربی ترجمہ موجود ہے۔

جدید ادبیات ایران کی پہلی منزل وہی سمجھی جاسکتی ہے جب ایرانیوں نے عربی زبان میں نظم کا ترجمہ نظم میں اور نثر کا ترجمہ نثر میں کرنا شروع کیا۔ یہ تغیر، عربوں کی فتوحات کے دوش بدوش ہوا۔ غزالی فیلسوف اور سعدی شیرازی نے دونوں زبانوں میں کتابیں لکھیں آج تک الٰہیات کی کتابیں عربی میں تصنیف ہوتی ہیں عمر خیام ، کے اکثر رسالے بھی عربی میں ہیں۔

ڈھائی سو سال سے زیادہ ایران اور عرب شیر و شکر رہے۔ اس اثناء میں ہوشمند اور با فراست ایرانیوں نے عربی زبان کے نکات اور دقایق پر عبور کامل حاصل کر لیا۔

ساسانیوں کے وقت تک فارسی کا رسم الخط پہلوی تھا جو نہایت پیچیدہ، اور مشکل ہے۔ عربی کے صحیح اور مکمل حروف ہجا ایرانیوں کے کیسے جاذب و جالب ثابت ہوئے جسکی وجہ سے انہوں نے اپنی شانِ خط اور رسم تحریر بدل کر عربی کر لی جو آج تک باقی ہے۔ پہلوی زبان کے اصلی خط کے پڑھنے والے لوگ اب انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ایرانیوں نے بھی دل کھول کر عربی زبان کی خدمت کی، پروفیسر براؤن نے تاریخ ادبیات ایران میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ اگر عربی ادب سے اہل ایران کی تصانیف خارج کر دی جائیں تو بہت کم سرمایہ باقی رہ جائے گا۔

فارسی زبان کی طرف جب دوبارہ توجہ ہوئی تو عربی لغات اور اصطلاحات کی بھرمار تھی۔ مگر عربی لغات بغیر کسی تحریف کے فارسی میں داخل ہو گئے تھے حالانکہ خود عرب دوسری زبانوں سے جو الفاظ

لیتے ہیں اُسکو معرّب کر لیتے ہیں، انگریزی نے بھی فرانسیسی زبان سے بہت کچھ سرمایہ لیا ہے مگر اس میں ایسی کانٹ چھانٹ کردی ہے کہ بعض وقت اُنکی اصل پہچاننے میں دقت ہوتی ہے۔

جدید فارسی کے شعر گوئی کی معراج نویں صدی عیسوی میں تھی - خوشنویسی اور کیلیگرافی ہارون رشید کے دور میں اپنے شباب پر تھے۔

غرض تمام ممالکت ایران میں سوریہ اور مصر اور مغربی نقاط میں ولایتی اور محلی زبانوں کی جگہ عربی بدالوا چکی تھی۔ بقول ایک معصر کے فارسی زبان کا سیکھنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا پولیس کے لئے عام معلومات کا حاصل کرنا"۔

پہلا زبردست شاعر جس نے فارسی کو ادبی زبان کی حیثیت سے استعمال کر کے ترقی دی رودکی تھا۔ افسوس ہے کہ اس بلند مرتبت شاعر کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا ہے جسمیں حکیم بیدپا کی کہانیاں اور کلیلہ دمنہ کی بعض منظوم حکایات بھی شامل تھیں۔

رودکی کے ہر لفظ میں جادو اور ہر حرف میں اثر تھا۔ نصر بن احمد سامانی نے اپنا وطن بخارا چھوڑ کر ہرات میں طولانی قیام کیا تھا اسکے سب خیرخواہ مصاحب، وزرا اور عمال پریشان تھے، ہزاروں وسیلے اختیار کئے گئے مگر سب بے سود ثابت ہوئے، آخر رودکی نے وطن کی تعریف میں ایسا سریع الاثر اور جادو بھرا قطعہ لکھا کہ اسکے سنتے ہی نصر پر حُب الوطنی کا جذبہ چھا گیا اور وہ مجبور ہو کر گھوڑے پر بیٹھا اور بخارا کی طرف روانہ ہو گیا پھر کیا تھا سارا خیمہ و خرگاہ پیچھے پیچھے پہونچ گیا۔

دسویں صدی سے سولھویں صدی تک سب سے اچھے اور سب سے زیادہ مشہور شعرا رودکی، فردوسی، انوری، قطران، عمر خیام، نظامی، خاقانی، رومی، حافظ، اور جامی گذرے ہیں۔ یوں تو ہر صنف سخن میں طبع آزمائیاں کی گئی ہیں مگر انکی رباعی، غزل، قصیدے اور مثنویاں اپنا جواب نہیں رکھتیں فارسی شاعری بھی ایرانی نقاشی کی طرح چند زمینوں اور بحروں تک محدود ہے۔ غزل اور رباعیات کے قانون اور قاعدے اسلوب بیان اور طرز سب مشابہ ہیں۔ عمدہ شعر اگر ایک خوش تراش ہیرا ہے تو عمدہ رباعی ایک بیش بہا گوہر زبان ایسی وسیع اور اتنی پیاری ہے کہ ایک ہی خیال کے ادا کرنے کیلئے سیکڑوں لفظ موجود ہیں اور لچک اتنی ہے کہ نازک سے نازک عواطف اور احساسات چٹکیوں میں ادا ہو جاتے ہیں۔

فارسی میں ادبی نثر بہت کم ہے - فن نطق اور خطابت پر بہت کم کتابیں ہیں۔ گلستان سعدی نثر فارسی کی سب سے مشہور کتاب ہے اسمیں بھی آدھے سے زیادہ اشعار ہیں شاید اسلئے کہ اخلاقی

داغ کے اشعار پڑھنے والے کے ذہن میں بہت جلد نقش ہو جاتے ہیں۔

فارسی میں نثر مسجع کا جس کے پڑھنے سے سر چکرا جاتا ہے، بہت رواج تھا، یہانتک کہ تاریخوں میں بھی، طولانی، و صنایع سے بھری ہوئی عبارتیں موجود ہیں۔ وصاف کی تاریخ مغول پیچیدہ، معترضات اور تعقیدات سے ایسی بھری ہوئی ہے کہ مطلب کا سرشتہ بار بار ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور معنی کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔

نظامی عروضی کا چہار مقالہ البتہ قدیم نثر کی کتابوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے یہ ۵۵۰ھ ہجری کی تالیف ہے، یعنی آج سے تقریباً دو سو برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اسکی زبان صاف ستھری اور اسکا طرز بیان نہایت سبک ہے۔ نظام الملک کا سیاست نامہ بھی اساس تاریخی اور تجربیات کا گنجینہ اور ادبی حیثیت سے قابل قدر ہے۔

فارسی شعر کی ترجمانی اتنی ہی دشوار ہے جتنا اس کا ترجمہ مشکل ہے۔ تاہم فیٹز جیرلڈ کا ترجمہ عمر خیام اور گرٹرڈ بل کا ترجمہ حافظ بہت قابل قدر ہے۔

اس مختصر مضمون میں جدید ادبیات کے تذکرے کی گنجایش نہیں ہے۔ اسلئے صرف بعض عمدہ نسخوں کے مختصر تذکرے پر اکتفا کیجاتی ہے۔ یہ تمام نسخے مرتب اور مرصع ہیں۔

(۱) شاہنامہ فردوسی میں قدیم سلاطین کی داستانیں اور باستانی پہلوانوں کی حکایتیں ہیں، دنیا کی تاریخ، ادب تمدن اور تہذیب پر فردوسی نے جو احسان کیا ہے وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نقاش اور مینیاتوری، حجار اور مورخ، سب کے لئے شاہنامہ سرچشمۂ فیض ہے۔ رزمیہ شاعری میں بھی یہ مثنوی بےمثل ہے۔

(۲) نظامی کے چار منظوم افسانے ہیں ایک خسرو و شیریں جس کا ہیرو فرہاد ہے دوسرا لیلیٰ و مجنوں جسمیں دکھایا گیا ہے کہ عاشق و معشوق ہمیشہ صرف اس لئے ہجراں نصیب رہے کہ دونوں کے خاندانوں میں خصومت تھی۔ تیسرا ہفت پیکر جسمیں بہرام گور کی کہانیاں ہیں اور آزادہ کنیزک کے قصے بھی ہیں جو ہمیشہ شکار میں اپنے آقا کے ساتھ رہتی تھی۔ ساسانیوں کے دور میں شکارگاہ نقاشی کا بہترین موضوع سمجھا جاتا تھا۔ چوتھا سکندرنامہ جسمیں اسکندر اعظم کے تمام کارنامے افسانوی حیثیت سے دکھائے گئے ہیں۔

ان افسانوں کے علاوہ نظامی نے اپنا دیوان پانچ جلدوں میں چھوڑا ہے، جسمیں الف سے ئے تک اخلاقی لہریں دوڑی ہوئی ہیں۔ اس مجموعہ کا نام خمسہ ہے۔ نظامی نے تیرھویں صدی

کے اوائل میں وفات پائی ہے۔ رومانی اشعار میں نظامی کا جواب مشکل سے ملیگا۔

جامی نے پندھویں صدی میں اہم سخن پر حکمرانی کی تیموریوں کے دور میں جامی سے زیادہ اور کسی کی تصنیفات قابل ذکر نہیں ہیں۔ جامی نے نظامی کے طرز پر سات مثنویاں لکھی ہیں قصیدے اور غزلوں کے کئی دیوان ہیں جامی کی "یوسف زلیخا" بہت مقبول اور مشہور ہے، ظریف کار نقاش اور مشاق مینا توریوں نے اسوقت کا سماں اکثر تصویر اور نقوش میں دکھایا ہے۔ جب زلیخا نے ہم نشینوں کے طعن سے پریشان ہوکر نوجوان پری جمالوں کو اکٹھا کیا اور سب کے ہاتھ میں ایک چاقو اور ایک لیموں دیکر یوسف کو پردے سے نکالا کہ اس مجلس سے گزر جائیں، جیسے ہی عورتوں نے یوسف کو دیکھا ایسی مدہوش ہوئیں کہ لیموں کے بجائے انگلیاں کاٹ ڈالیں۔

مغلوں کے غلبہ کے بعد نثر کی کتابوں کی شروعات ہوئی۔ جامع التواریخ ۱۳۱۰ء میں مشہور مورخ حکیم رشید الدین وزیر نے لکھی۔ اور امیر تیمور کی تاریخ ظفر نامہ بھی مرتب اور مصور کیا گیا۔ کلیلہ دمنہ کی بید پائی کہانیاں مینا توریوں اور مصوروں کے مدنظر رہی ہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا جلال الدین رومی کی عرفانی مثنوی (تیرھویں صدی) کا ذکر بھی ضروری ہے یہ قابل قدر مثنوی چھ جلدوں میں ہے اور اسکی مختصر سی تعریف یہ ہے کہ

مثنوی مولوی معنوی   ہست قرآں در زبانِ پہلوی

صوفیوں اور اشراقیوں کے حلقے میں اسکی بڑی قدر ہے۔ حکایات تلخ وشیریں دلکش اور تفریحی ہیں مگر ہر جگہ حقیقت اخلاقی اور عرفانی کی تلقین مقصود ہے۔

صوفیوں کا اعتقاد ہے کہ خدا اور جہان ایک چیز ہے۔ عالم نشئہ ذات الٰہی ہے۔ خدا کے ماسوا کوئی چیز نہیں ہے آدمی کی روح "روح کلی کی ایک جزو ہے اور موت کے بعد اپنی اصل سے ملجاتی ہے۔ جیسے قطرہ سمندر میں دوبارہ پہونچکر جذب ہوجاتا ہے۔

صوفیوں نے عاشقانہ اشعار کے استعارات اور مجازات سے فائدہ اٹھاکر اپنے عقائد کی اشاعت کا کام لیا ہے۔ ہجر، اشتیاق، آرزو اور وصل کے تمام مراتب عشقیہ ہیں۔ اس گنجینہ کا لعل شب چراغ یہ مضمون ہے کہ خدا ایک پوشیدہ گنج تھا اس نے چاہا کہ پہچانا جائے تو بشر کو پیدا کیا تاکہ سب پہچان لیں۔

انیسویں صدی میں تین شعراء، ایران کیلئے باعثِ زینت ہوئے، یعنی قاآنی شیرازی یغمائی، خراسانی اور مرزا سروش اصفہانی۔ ان کے یہاں سلاستِ گفتار، حُسن انتخاب الفاظ

برجستگی اور جوش حافظ وسعدی سے کم نہیں ہے۔

قاآنی طلاقت لسانی میں اُستاد، نغمہ پردازی میں مشاق آہنگ سازی میں چست اظہار جذبات اور لطف بیان میں بیمثال ہے۔

یوں تو ہر ایرانی کم وبیش شاعر واقع ہوا ہے۔ استعداد اور سخن فہمی کا مادّہ سب میں موجود ہے۔ فارسی کی شیرینی اور روانی اشعار ارتجالی کی کان ہے، اکثر ایسی عورتوں اور مردوں نے جنکو ساری عمر شعر گوئی کا شوق نہ تھا مرتے وقت اسے بڑے قابل قدر اشعار رباعیاں اور غزلیں کہی ہیں۔

خود فتح علی شاہ غضب کے شاعر تھے۔ خاقان تخلص تھا۔ ۱۸۶۱ء میں دیوان چھپا تھا اب بہت کمیاب ہے اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ شاہ کثیر الاولاد تھے اور اُن کے دسوں لڑکوں کو شاعری کا دعویٰ تھا۔

موجودہ زمانہ میں تاثیر اور بلندی خیال نے تصنّع اور سادگی کی جگہ لے لی ہے۔ نفقازی اور فرانسوی عناصر زیادہ ہیں۔ ایرانیوں کو ہر زمانہ میں ادبیات سے عشق رہا ہے۔ عمدہ اشعار صحرائی، قبائل، قاطرچی، کوچوان اور گڈریوں کے نوک زبان رہے ہیں۔

آجکل پور داؤد، سعید نفیسی، خلیلی اور بوبخت کا دور دورہ ہے۔ تاریخ میں حسن پرنیا اور مثنوی میں بوبخت کا جواب نہیں۔ بوبخت نے فردوسی کی زمین اور زبان میں شاہنامہ پہلوی لکھا ہے جسکو فردوسی کا تتمہ کہنا چاہیئے۔ جہاں سے پہلا شاہنامہ ختم ہوتا ہے وہیں سے یہ پہلوی نامہ شروع ہوتا ہے اور رضا شاہی دور تک آتا ہے ۱۹۳۱ء تک کے حالات ہیں۔

کتابوں کے ترجمے کثرت سے شائع ہو رہے ہیں، علوم، فنون ادبیات اور تاریخ اقتصادیات، مالیات اور سیاسیات، جغرافیہ اور ریاضیات پر کثرت سے کتابیں لکھی جارہی ہیں۔

خطاطی کا ذوق بھی ابتک باقی ہے۔ یاقوت مستعصی اور سلطان علی مشہدی کے کتبے۔ دیواروں کی زینت ہیں۔ انشا، اور اخبار نویسی بھی ترقی پر ہے۔

ایرانی طالبعلم روز افزوں تعداد میں ہر سال یورپ جاکر اعلیٰ تعلیم اور تجربات حاصل کرتے ہیں۔ مرزا محمد خاں قزوینی، مرزا حسن تقی زادہ اور عبدالکریم قسمی ایسے عالم متبحر اور مجتہد بے بدل بھی نو۔ بخش اور فیض رساں ہیں۔

ابھی میں سویا نہیں ہوں

از جناب فطرت واسطی

بہارِ حسن کی رنگینیٔ بہار ہے تو
کہ میرے عشق و محبت کی یادگار ہے تو
اگر نگاہ کی روٹھی ہوئی بہار ہے تو
تو میرے حسنِ تصور کا افتخار ہے تو
ابھی میں سویا نہیں ہوں خیال میں تیرے

ابھر رہی ہیں محبت کی گرم آہیں ابھی
نظر نواز ہیں مستی کی بارگاہیں ابھی
ترے خیال میں سرگرم ہیں نگاہیں ابھی
کھلی ہوئی ہیں محبت کی درسگاہیں ابھی
ابھی میں سویا نہیں ہوں خیال میں تیرے

قیامِ عیش کی نظروں کو آس ہے اب تک
سمجھ رہا ہوں کہ تو میرے پاس ہے اب تک
یقین ہے کہ تو فطرت شناس ہے اب تک
مری نظر کو محبت کا پاس ہے اب تک
ابھی میں سویا نہیں ہوں خیال میں تیرے

اگر یہ جھوٹ کہ تو ہے نظر پہ چھایا ہوا
اگر یہ سچ ہے کہ میں ہوں فریب کھایا ہوا
تو آ! کہ آج بھی احساس ہے ستایا ہوا
تو محوِ ناز ہوا اور حسن ہو لجایا ہوا
ابھی میں سویا نہیں ہوں خیال میں تیرے

موازنہ

(از مسٹر سلیم جعفر)

موازنہ کیا ہے اس کے لغوی معنی سے قطع نظر کیجئے اور اس کے کام کی طرف توجہ فرمائیے۔ درحقیقت یہ نام ہے ہمارے معاون انتخاب کا۔ اور ایسی کارآمد چیز ہے کہ اس کے بغیر دنیا میں کسی کا کام نہیں چلتا۔ ہم اس عالم میں ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں لیکن ہمارے اُن کاموں کو چھوڑ کر جو ہمیں انسان ہونے کی وجہ سے کرنے پڑتے ہیں اور ہمارے اختیار سے باہر ہیں، اُن سب کاموں میں اسے دخل ہے جن کے کرنے کے لئے ہم بوجہ تقاضائے بشریت مجبور نہیں۔ مثلاً اولاد کی تعلیم و تربیت ہی کو لیجئے، ایک شخص علم کو اچھا سمجھتا ہے، اس لئے اس کے بچے نے ہوش سنبھالا نہیں کہ اُس نے اُسے مولوی صاحب کے حوالے کیا نہیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ شخص لکیر کا فقیر ہے، چونکہ اس کے خاندان میں لوگ کئی پشتوں سے پڑھتے لکھتے چلے آئے ہیں اس لئے وہ آنکھ بند کرکے اپنی اولاد کو بھی اسی ڈگر پر چلانے لگا۔ میں اسے صحیح نہیں سمجھتا اور غور کریں گے تو شاید آپ بھی میرے ہم خیال ہو جائیں۔ یہ قطعی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس شخص نے اپنی عمر میں کبھی عالم اور جاہل کی حالتوں کا مقابلہ نہیں کیا اور بے سمجھے بوجھے اپنی اولاد کو ایک غلط راہ پر ڈال دیا۔ علم سے جو فائدے ہوتے اور جہالت سے جو نقصان اُٹھانے پڑتے ہیں، اُن سے وہ بخوبی واقف ہے، اور ذاتی تجربہ کی بنا پر وہ علم کو جہالت پر فضیلت دیتا اور اپنی اولاد کو اس فضیلت سے آراستہ و پیراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ اپنی اولاد کو وہ جہالت کے نقصانوں سے بچانا چاہتا ہے۔ اس کا یہ فعل نفع اور نقصان کے موازنہ پر مبنی ہے، اور نفع کے انتخاب کا باعث محض موازنہ ہے۔ اب ایک اور مثال پر بھی غور کیجئے۔ جاہلوں کی اولاد اکثر کیوں جاہل رہ جاتی ہے حالانکہ وہ سنتے اور دیکھتے ہیں کہ علم سے بڑے بڑے فائدے ہوتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ خود اُن کی ردّی حالت کا سبب اُن کی جہالت ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہ لوگ موازنہ و مقابلہ سے کام ہی نہیں لیتے، لیتے اور ضرور لیتے ہیں۔ لیکن علم و جہل کا موازنہ کرتے

اور اس فیصلہ کے بعد کہ علم کو فوقیت حاصل ہے اور اس لئے اولاد کو پڑھانا لکھانا چاہیئے انھیں ایک اور موازنہ سے سابقہ پڑتا ہے یعنی وسائل تعلیم۔ یہ اُن کے بس کے نہیں ہوتے اس لئے انھیں سوچنا پڑتا ہے کہ آیا اُن قربانیوں کا پلہ جو تعلیم اولاد کے لئے کرنی پڑتی ہیں ان قربانیوں کے پلے سے بھاری ہے یا نہیں جو اولاد کو تعلیم نہ دلانے کی صورت میں نہ کرنی پڑیں گی۔ اور چونکہ اکثر وہ قربانی کا نہ کرنا اپنے لئے سودمند سمجھتے ہیں اس لئے تعلیم اولاد کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ میں فراخی و تنگی وسائل کا قائل نہیں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ ایک شخص جس کی آمدنی کل اٹھارہ روپے ماہوار تھی اور کنبہ بھی تھا اُس نے اپنے ایک عزیز کو سول سرجن بنا دیا۔ اس کے لئے اُسے کیا کیا قربانیاں کرنی پڑیں اس کا ذکر فضول ہے۔

لیکن انتخاب میں ہر فرد کی طبیعت کو بہت بڑا دخل ہے اور موازنہ و انتخاب سے بھی پہلے یہ ایک معیار مقرر کر دیتی ہے جو موازنہ پر اپنا اتنا اثر ڈالتا ہے کہ اس کی ہدایت کے بغیر ایک قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ درحقیقت انتخاب ایک مظہر ہے جس کا ہیولا معیار اور موازنہ سے مرکب ہے۔ معیار سے موازنہ اور موازنہ سے انتخاب پیدا ہوتا ہے۔ اس انتخاب سے انتخاب کرنے والے کی طبیعت کا پتہ لگتا ہے اور جب کوئی دو چیزوں میں سے ایک کو پسند کرتا ہے تو اُس کی پسند میں اس کی طبیعت کا رنگ جھلکتا ہے۔ اب چونکہ طبائع انسانی الگ الگ ہیں اس لئے ہر شخص کی پسند و انتخاب بھی الگ الگ ہیں کسی کی پسند و انتخاب ثبوت ہیں اس کا بھی کہ وہ اپنی پسندیدہ و منتخبہ شے کی نسبت جو رائے رکھتا ہے اس کے مقابلہ میں اوروں کی رائے کی وقعت نہیں کرتا۔ یہاں ان لوگوں سے بحث نہیں جو بزرگ ہستیوں کے رعب میں آکر اپنی پسند و انتخاب کی پرواہ نہیں کرتے اور اسے ان بزرگ ہستیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں یا ان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتے تو ان کے ہم نوا ہو جاتے ہیں۔ بہ صورت ہم نوائی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے اپنی قوت انتخاب سے کام نہیں لیا۔ اس کے صرف یہ معنی ہوتے ہیں کہ ان کے اور ان بزرگ ہستیوں کے موجبات انتخاب ایک ہی ہیں۔

لیکن موازنہ میں اکثر مغالطہ ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ جس طرح منطق میں قیاس کے دونوں مقدموں میں حد اوسط کا مکرر ہونا انتاج کے لئے شرط اعظم ہے اور مغالطہ سے بچنے کو یہ ضروری ہے کہ حد اوسط کے جملہ قیود و اعتبارات جو ایک مقدمہ قیاس میں ملحوظ ہیں وہی اس کے

دوسرے مقدمہ میں ہوں" اسی طرح موازنہ میں بھی یہ لازمی ہے کہ دونوں موضوع یا محمول موازنہ جملہ قیود واعتبارات کے لحاظ سے یکساں ہوں ورنہ موازنہ سے جو نتیجہ نکالا جائیگا وہ صحیح نہ ہوگا موازنہ میں مغالطہ معمولونکے عامل معیار میں ہوا کرتا ہے۔ تاوقتیکہ عامل معیار ہو ہو ایک سے نہ ہوں معیار میں فرق ہوگا اس سے موازنہ پر اثر پڑے گا اور موازنہ کی مدد سے جو نتیجہ نکالا جائے یا انتخاب کیا جائے گا وہ غلط ہوگا۔

موازنہ میں مغالطہ صاف صاف اس وقت نظر آتا ہے جب دو مصنفوں کا مقابلہ کرکے یہ فیصلہ صادر کیا جاتا ہے کہ کس کا کلام کس سے بڑھا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر اس فیصلہ کو لیجیئے کہ ذوق کا سہرا جو انھوں نے شہزادۂ جواں بخت کی شادی کے موقع پر بادشاہ غالب کے سہرے کے جواب میں کہا تھا۔ غالب کے سہرے سے بڑھا ہوا ہے۔ اس فیصلہ میں میرے نزدیک مغالطہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ دونوں کی طبیعت یا عامل معیار موازنہ کا فرق نظر انداز کرکے موازنہ ان مفروضات سے شروع کیا جاتا ہے کہ دونوں شاعر ہیں، دونوں قصیدہ کہہ سکتے ہیں اور انھوں نے کہا ہے، دونوں کا علم وفضل برابر ہے اس لئے جب دونوں نے ایک ہی قسم کا کام کیا تو دونوں کے فعل کا نتیجہ ایک ہی سا ہونا چاہیئے۔ اور اگر فرق ہے تو صاحب موازنہ نے موازنہ کے لئے جو معیار مقرر کیا ہے اس پر جو پورا اترتا ہے وہ کامل اور جو نہیں اترتا وہ ناقص ہے۔ درحقیقت ان مفروضات سے ابتدا ہی نہ کرنی تھی بلکہ دونوں کی طبیعت شاعرانہ کا اندازہ لگانے کے بعد یہ سوچنا تھا کہ باوجود اختلاف یہ دونوں صحیح صحیح معنی میں موضوع یا محمول موازنہ ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر یہ رائے قرار پاتی کہ دونوں کی طبیعت میں اختلاف ہے اور وہ صحیح صحیح معنی میں موضوع موازنہ نہیں ہو سکتے تو موازنہ سے دستکشی بہتر تھی۔

اگر شاعر کا کلام اس کی طبیعت کا آئینہ ہو سکتا ہے تو اس سے ان دونوں کی طبیعت کا اندازہ لگانا چاہیئے۔ پروفیسر آزاد نے جو ان دونوں کی طبیعت کا اندازہ لگایا ہے وہ مرحوم ہی کے الفاظ میں یہ ہے:۔

ذوق کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

"غزلوں کے دیوان کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہر اُن کے کلام کا تازگیٔ مضمون، صفائی کلام چستی ترکیب، خوبیٔ محاورہ اور عام فہمی ہے۔ (صہ ۴۶۹۔ آبحیات مطبوعہ رفاہ عام پریس ۱۹۱۳ء)

"اصلی میلان ان کی طبیعت کا سودا کے انداز پر تھا۔ نظم اُردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف نے قصیدہ پر دست کاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بعد شیخ مرحوم کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اُٹھایا اور انھوں نے مرقع کو ایسی محراب پر سجایا جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا (صفحہ ۴۷۲ ایضاً)

غالبؔ کی نسبت لکھتے ہیں :-

" دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں، اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اس لئے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں" (صفحہ ۵۱۵ ۔ ایضاً)

اقتباسات بالا سے ذوقؔ کے اصلی میلان طبیعت کا پتا نہیں لگتا اس لئے ہمیں سوداؔ کے انداز طبیعت کا پتا لگانا چاہیئے۔ سوداؔ کے ذکر میں میر تقی میرؔ سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے پروفیسر آزادؔ لکھتے ہیں :-

" اصل حقیقت یہ ہے کہ قصیدہ ۔ غزل ۔ مثنوی وغیرہ اقسام شعر میں ہر کوچہ کی راہ جدا جدا ہے جس طرح قصیدہ کے لئے شکوہ الفاظ ۔ بلندی مضامین چستی ترکیب لوازمات ہیں، اسی طرح غزل کے لئے عاشق و معشوق کے خیالات عشقیہ ۔ ذکر وصل .... گویا وہی دونوں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں ۔ اس کے ادائے مضامین کے لئے الفاظ بھی اور ہیں ... بیشک ان کی غزلوں کے بھی اکثر شعر چستی اور درستی میں قصیدہ کا رنگ دکھلاتے ہیں" (صفحہ ۱۹۲ ۔ ایضاً)

اس اقتباس سے صاف صاف ظاہر ہے کہ سوداؔ پر قصیدہ کا رنگ غالب تھا اور یہی رنگ خاص ذوقؔ کی طبیعت کا رنگ ہے ۔ لیکن قصیدہ کا خاص رنگ بہ لحاظ حقیقت نفس مضمون کیا ہے؟ یعنی اس کو سچ سے کتنا لگاؤ ہے، اور کوئی لگاؤ نہیں تو اس کی خوبی کا مدار کس چیز پر ہے؟ ایک نہیں جتنے قصیدے آج تک لکھے گئے ہیں سب کے سب اُٹھا کر دیکھ لیجئے، سچ اور حقیقت کو ان سے کوئی واسطہ نہیں ۔ سب کی خصوصیت یہ نظر آئیگی کہ شاعر نے زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں، اور مبالغہ کو حدِ غلو تک پہنچانے میں کمال دکھایا ہے ۔ چونکہ ذوقؔ کی طبیعت کا اصلی میلان سوداؔ کے انداز پر زیادہ تھا اور سوداؔ کی طبیعت میں غلو تھا اس لئے ذوقؔ کی طبیعت میں بھی غلو ماننا پڑے گا ۔ مزید ثبوت کے لئے ذوقؔ کی دو غزلوں کے چند شعر پیش کرتا ہوں :-

دودِ دل سے ہے یہ تاریکی مرے غم خانہ میں
شمع ہے اک سوزنِ گم گشتہ اس کاشانہ میں

میں وہ کیفی ہوں کہ پانی ہو تو بن جائے شراب
جوش کیفیت سے میرے خاک کے پیمانہ میں

عشق کو نشو و نما منظور کب ہے ورنہ سبز
تخم اشکِ شمع ہو خاکسترِ پروانہ میں
کس نزاکت سے ہے دیکھو اتحادِ حسن و عشق
زلف واں شانہ نے کھینچی درد ہو یاں شانہ میں

مے ملا کر ساقیانِ سامری فن آب میں
کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں
زلف افعی وش کو دھووے گر وہ پرفن آب میں
ہوں بجائے موج پیدا مارِ رہزن آب میں
میں وہ ہوں تصفیۂ دل کر جائے اک دریا کو جذب
گر پڑے گر ذرہ میری خاک مدفن آب میں
سایۂ سرو چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے
اژدہا بن بن کے شب اے رشکِ گلشن آب میں

غزل جتنی زیادہ زور دار ہوگی اس میں اتنے ہی زیادہ مبالغہ غلو کے اشعار نظر آئیں گے۔ مثلاً اس غزل کو ملاحظہ کیجئے جس کے مطلع کا پہلا مصرع ہے

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اس میں زلفِ سرکش ہو

اب دیوان غالب اٹھا کر ملاحظہ کیجئے، غزل کی بیشتر بیتوں میں مبالغہ نظر نہ آئے گا۔ جہاں مبالغہ ہے۔ وہاں زیادہ تر تبلیغ و اغراق سے کام لیا ہے۔ غلو شاذ و نادر ہی ہے۔

چونکہ طبائع میں اس قدر اختلاف تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب جب سہرا کہنے بیٹھے تو ذوق کا سا نہ کہہ سکے، کیونکہ سہرا بھی درحقیقت ایک قسم کا قصیدہ ہی تھا اور ذوق کو قصیدہ میں مقابلۃً فوقیت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ ایک کا طرۂ امتیاز صفائی کلام تھا اور دوسرے کا معنی آفرینی۔

لیکن اس واقعہ سے دونوں کا موازنہ کرنا اور اس سے ذوق کی فوقیت کا نتیجہ نکالنا میرے نزدیک اصول موازنہ کے خلاف ہے۔ درحقیقت موازنہ بہت متعذر شے ہے اور اس سے حذر النسب و اولیٰ کیونکہ معمول موازنہ کا ہر لحاظ سے یکساں ہونا ناممکن ہے، کسی نہ کسی اعتبار سے ان میں ضرور فرق ہوگا اور یہ فرق موازنہ کے نتیجہ یا انتخاب یا اس کی مدد سے جو حکم لگایا جائیگا اس کی قدر و قیمت کو ساقط العیار کردے گا۔

دوزخ کی آگ

(از مسٹر جگدیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی اے ایل ایل بی)

تزئینِ بزمِ صبح کا قصہ ہوا تمام — پیشِ نظر ہے گلشنِ عالم کا اہتمام
پھیلی شعاعِ نور بڑھی گرمیِ خرام — بوسہ جبینِ کوہ نے دے کر کیا سلام
نورِ شعاعِ مہر سے روشن اُفق ہوا
پیالۂ غمِ فراق میں رنگِ شفق ہوا

طوفان موجِ نور کا منظر تھا لاجواب — پھر پھر گئی ہیں بدلیاں کھا کھا کے پیچ و تاب
ہنگامۂ شباب سے ہو ہو کے بے حجاب — لپٹی کرن سحاب سے اللہ رے اضطراب
لینے چلی خزاں کو چمن سے بہارِ صبح
پھولوں نے سر جھکائے کیا زر نثارِ صبح

دم میں بساطِ گردشِ گردوں اُلٹ گئی — گرمی سے آفتاب کی کایا پلٹ گئی
دیکھا جو روئے مہرِ منور تو کٹ گئی — شرما کے خشکیِ لبِ دریا سمٹ گئی
ناری رُکی نہ نور کے لشکر کے سامنے
بزدل ٹھہر سکے ہیں دلاور کے سامنے؟

کشتِ شعاعِ مہر جو شاداب ہو گئی — چشمِ حباب خیر سے غرقاب ہو گئی
بڑھتے ہی دھوپ موج تو بیتاب ہو گئی — اُتری ندی کچھ ایسی کہ پایاب ہو گئی
سردی کا آنکھ مارتے دم سرد ہو گیا
ایسا چڑھا بخار کہ منھ زرد ہو گیا

گرمی کا تھا وہ زور، وہ عالم کہ الاماں — جلتی تھی کائنات جھلستا تھا آسماں
چشمہ کا تھا اُبال کہ آتش فشاں رواں — کانٹا بنی تھی سوکھ کے منہ میں دبی زباں
بیتاب مثلِ ماہیِ بے آب تھی زمیں
دریائے نورِ مہر سے سیراب تھی زمیں

لرزاں تھا آفتاب درآغوشِ آبشار　　ساحل ہوا تھا خاک بس وصل جوئبار
ذرّے زمیں پہ لوٹ رہے تھے بے قرار　　دم لینے میں بھی موجِ رواں کو مگر تھی عار
غرقاب تھے حباب تو پانی کی چاہ میں
چھالے پڑے تھے موج کے پائے نگاہ میں

کالا تھا رنگ دھوپ سے روزِ سیاہ کا　　آنکھوں سے چھوٹتا تھا سہارا نگاہ کا
مُنہ تک رہے تھے کوہ کھڑے برگِ کاہ کا　　ملتا تھا دو جہاں میں نہ گوشہ پناہ کا
پھرتا تھا آفتاب کہ مغرب میں جا چھپے
سایہ کو تھی تلاش کہیں زیرِ پا چھپے

چھاتی زمین کی شق تھی فلک کا جگر کباب　　ساحل سے اُٹھ رہی تھی صدا العطش بیاب
بولی تڑپ کے موجِ رواں اند کے شتاب　　سُنتے ہی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے حباب
پانی پہ کی نگاہ عجب اضطراب سے
آنسو ٹپک کے رہ گئے چشمِ حباب سے

سینوں میں دم تھا آہ کی صورت گھٹا ہوا　　اُڑتا تھا دُود کی طرح پانی رُکا ہوا
ابرِ تنک اُٹھا بھی تو فوراً ہَوا ہُوا　　حیراں ہے عقل رحمتِ باری کو کیا ہوا
کہنے کو خشت و خاک پہ بارش ہے نور کی
بجلی کو برقِ طور سے نسبت ہے دُور کی

اقوالِ زرّیں

غصہ کا بہترین علاج خاموشی ہے۔

ایک ہی غلطی عمر بھر کے لئے افسوس کا سامان پیدا کر سکتی ہے۔

غریب آدمی چند چیزوں کا محتاج ہے لیکن لالچی ہر چیز کا۔

وقت کی قدر کرو۔ تمھاری قدر ضرور ہوگی۔

اگر آرام کی زندگی چاہتے ہو تو ہر چیز نقد دام دیکر خریدو

دانا دوسروں کے تجربات سے سیکھتے ہیں اور بیوقوف اپنے تجربات سے

آباد لکھنوی

کیا آباد لکھنوی نے ہر بحر میں ایک دیوان مرتب کیا تھا؟

(از خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، بی، اے کلکٹر و ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مینوئنڈ)

"مرزا مہدی حسن خاں آباد سے میری خاندانی قرابت تھی۔ میں نے اپنے صغر سن میں انکی بیوہ کو دیکھا تھا اور چھوٹی ننا" کہتا تھا۔ دراصل وہ میرے والد کی چھوٹی ننا" (یعنی میری دادی صاحبہ کی والدہ کی چھوٹی بہن) تھیں۔ ہم لوگوں میں دستور ہے کہ بزرگوں کے بزرگوں کو بچے بھی وہی کہتے ہیں جو ہمارے بزرگ انکو کہتے ہیں۔ چنانچہ یہی طریقہ ابتک جاری ہے۔ میرے بچوں کی طرح انکے بچے بھی مجھے بتا کہتے ہیں۔ اصطلاح محبت کی سنہری زنجیر میں کڑیاں اضافہ ہوتی رہتی ہیں اور سلسلہ منقطع ہونے کے بجائے مضبوط ہوتا جاتا ہی۔

یہ آباد اسقدر فنا فی الشعر تھے کہ پاگل سمجھے جاتے تھے اور انکی بنا پر میری دادی صاحبہ کا عقیدہ تھا (انکو ہم لوگ باجی اماں کہتے تھے) کہ شاعر دیوانے ہوتے ہیں اور انکو لڑکی دینا اُسکی زندگی برباد کرنا ہے۔ سوءِ اتفاق سے یہ بات اُنکی ایک پوتی کے کان میں پڑ گئی اور یہ ایسا زبردست حربہ ہے جو وقت ضرورت نہایت کامیابی سے استعمال کیا جاتا ہے۔

میں بہک کر کہاں سے کہاں پہونچ گیا! مؤلف تذکرۂ خمخانۂ جاوید تحریر فرماتے ہیں۔ کہ:-

آباد۔ مرزا مہدی حسن خاں خلف مرزا غلام جعفر خاں لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔" شیخ ناسخ کے نامی شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۱۲۲۸؁ ہجری میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ لکھنؤ کے عمائدین میں سمجھے جاتے تھے۔ نواب فرخ آباد کے قریبی رشتہ دار تھے۔ تمام عمر لکھنؤ میں رہے اور اپنی عمر فراغبالی سے بسر کی۔" اگلے لوگوں کی طرح وضعداری کے پابند اور مجالس مشاعرہ کے ازبس دلدادہ تھے۔" وضعداری جو پرانے لوگوں کا عام شیوہ تھا انکا خاص شعار تھا۔ چنانچہ اُجتک مشہور ہے کہ آپ مشاعروں میں نہایت پابندی سے شریک ہوتے۔ اور حتی الامکان کوئی جلسہ غزلخوانی سے ناغہ نہ ہونے دیتے تھے۔ انکی پُرگوئی بھی شہرت رکھتی ہے۔" چنانچہ ایک تذکرہ نویس[ع] نے تو یہانتک غلو فرمایا ہے کہ عروض کی ہر ایک

ع اشارہ ہے عبدالغفور خاں نساخ کے تذکرۂ سخن کی طرف۔ اثر

بحر میں انکا ایک ایک دیوان ہے، بہرحال دو اور بقول بعض دو سے زیادہ دیوان اور ایک مثنوی۔ تپ و اسوخت انکی یادگار ہیں جنمیں سے ایک دیوان موسوم "نگارستان عشق" ۱۲۷۷ھ میں لکھنؤ کے مرتضوی مطبع میں شائع ہوا تھا۔ اب یہ بھی کمیاب ہے۔ مگر انکی مستقل یادگار "بہارستان سخن" سے قائم ہوئی جسمیں ناسخ و آتش کے بالمقابل ہم طرح غزلیں درج ہیں۔ یہ مجموعہ بمشکل ملتا ہے۔ حق یہ ہے کہ گو انکا کلام ان دونوں استادوں کے پایہ کو نہیں پہونچا مگر تاہم بجائے خود قادر الکلامی کا پتہ دیتا ہے ......"

میرے چچا اور خسر حکیم مرزا عابد حسین خاں مرحوم کا کتبخانہ اردو، فارسی اور عربی کے قلمی نسخوں کا ایک نادر ذخیرہ تھا۔ چند وجوہ سے جن کے بیان کی ضرورت نہیں بیشتر کتابیں آنکے انتقال کے بعد بری طرح تلف ہوئیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ برسات کے بعد ایک بڑا صندوق ایسی کتابوں سے بھرا ہوا جو پانی میں بھیگ بھیگ کے گوندا ہوگئی تھیں یا جنکو دیمک چاٹ گئی تھی محلے کے اندارے میں خالی کیا گیا۔ دو تین برس ہوئے کہ اس اجڑے کتابستان میں ایک بستہ میری نظر سے گزرا جسمیں مختلف کتابوں کے بعض اوراق، بعض قلمی مرثیئے، بعض بوسیدہ بیاضیں تھیں۔ اسمیں چند ورق آباد کے ایک قلمی دیوان کے ملے۔ کرم اور دیمک نے اس میں کیا کیا گلکاریاں کی ہیں اسکا اندازہ دیکھے بغیر نہیں ہو سکتا۔ صاد سے لیکر نون تک ردیف وار غزلیں ہیں، اوّل و آخر کی دونوں ردیفیں نا مکمل ہیں، لہذا انہیں کہا جا سکتا کہ ان ردیفوں میں خصوصاً نون کے ذیل میں جسمیں غزلوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے اور کتنی غزلیں ہونگی یا مکمل دیوان کا حجم کیا تھا۔ یہ تمام اوراق دیوان صرف ایک بحر (خفیف مسدس مقطوع - فاعلاتن مفاعلن فعلن) میں ہیں انکے دستیاب ہونے سے نساخ کے اس قول کی گونہ تصدیق ہوتی ہے کہ آباد نے ہر بحر میں ایک دیوان مرتب کیا تھا، گو اسقدر ترمیم کی پھر بھی ضرورت رہتی ہے کہ دیوان صرف متداولہ بحروں میں مرتب کئے تھے۔ یوں تو عروض میں نہ معلوم کتنی بحریں ہیں اور ظاہر ہے کہ ہر ایک میں ایک دیوان مرتب کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔

اب میں ان اوراق سے منتخب اشعار قارئین زمانہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ مذاق شاعری میں آباد کے وقت سے زبردست انقلاب ہوگیا ہے اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان شعروں کو پڑھیئے۔ یہ پورا کلام شاید ابتک طبع نہیں ہوا کیونکہ بعض غزلوں میں مقطع درج نہیں ہے اور جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔

ق

خط ہمارا وہ پڑھ کے کہتا ہے
اس میں مضموں ہیں سر بسر ناقص

دُرِ دندان یار کے آگے
نظر آئے ہمیں گہر ناقص

تیرگی دور کی نہ آنکھوں کی
تھا یہاں سرمۂ بصر ناقص

لائق سر نہیں سمجھتا یار
ہے یہ خورشید کا چنور ناقص

خانۂ دل میں کیا رہے وہ ماہ
داغ نے کر دیا یہ گھر ناقص

عشق کو بد جو کہتے ہیں آباد
عقل رکھتے ہیں وہ بشر ناقص

ط

اُس صنم کا کبھی نہ آیا خط
قاصدوں سے نہ ہمنے پایا خط

حال سوز فراق جب لکھا
بخت نے آگ میں جلایا خط

ہمکو ہے سرنوشت سے یہ گلہ
ایک اُس کا کبھی نہ آیا خط

میرے قاصد سے وہ یہ کہتا ہے
کیا کروں لیکے میں پرایا خط

ظ

چپ ہو تقریر اب نہ کر واعظ
ہمکو ہوتا ہے دردِ سر واعظ

تیرے دم سے ہے شور و شر واعظ
تو قیامت ہے فتنہ گر واعظ

کوئے بت ہی کو خُلد کہتے ہیں
کیوں بہکتا ہے اسقدر واعظ

عشق کو بد جو کہہ رہا ہے تو
دھیان تیرا گیا کدھر واعظ

تجھ سے تقریر کیا کرے آباد
تو نہ سمجھے گا عمر بھر واعظ

ع

نہ اٹھانے دیا قدم مجھکو
ضعف ہر گام پر ہوا مانع

تیرے غل کے لئے ہوئی اے قیس
میری زنجیر کی صدا مانع

تھا زبان سے گلہ نکلنے پر
اپنے دل کی ہوئی حیا مانع

ف

زہر چھوٹا ہے، بد بلا ہے زُلف
سانپ سے بھی کہیں سوا ہی زلف

جی بکھرتا ہے دیکھکر میرا
آپ کی ایسی خوش نما ہی زلف

زیب دیتی ہے تیرے چہرے پر
اے صنم قدرتِ خدا ہے زلف

کیوں سراپا نہ ہو قیامت وہ ۔ آفت جاں ہے قد، بلا ہے زلف

قہر ہے، فتنہ ہے، بلا ہے عشق — کیا کہیں ہم بھلا کہ کیا ہے عشق
صبح سے شام تک جو روتے ہیں — زلف و رخسار کا ہوا ہے عشق
دل عاشق جلا کے خاک کیا — ق — برق ہے، شعلہ ہے، بلا ہے عشق
رنج پاؤ گے، دیکھنا آباد — تم نے اسکا عبث کیا ہے عشق

کس سے اٹھیں گے صدمہائے فراق — قسمہ ہے جان کو جفائے فراق
اس کے غم سے کبھی نہ ہونگا تنگ — جس طرح چاہے آزمائے فراق
روز گرد دل ہے میرے درپئے غم — سوچتا ہے نئی بنائے فراق
صورت وصل سے ہیں بیگانہ — ق — دل ہمارا ہے آشنائے فراق
ابتدا ہی میں جان دی ہمنے — نہ جئے نا انتہائے فراق
سرد بازار ہجر ہے آباد — ایسے جلتے ہیں داغہائے فراق
آنکھ جس روز سے کھلی آباد — نظر آیا نہ کچھ سوائے فراق

کیا ہیں وحشت میں پیرہن سے تنگ — ہجر میں جان ہے بدن سے تنگ
کون نازک مزاج ہے اُن سا — گ — وہ ہوئے بند پیرہن سے تنگ
باغ سے گھر کو جب پھرے گا وہ — ہوں گے مرغ چمن، چمن سے تنگ
سیر غربت کریں گے اے آباد — کچھ ہے دل آج کل وطن سے تنگ

ہیں پسندیدہ تیرے سارے ڈھنگ — تو بھی پیارا ہے پیارے پیارے ڈھنگ
اے صنم ہیں جدا ہزار طرح — رنگ میں پھولوں سے تمہارے ڈھنگ
گاہ روتے ہیں، گاہ ہنستے ہیں — گ — عشق میں ہیں عجب ہمارے ڈھنگ
سبب سے بندش جدا ہے اے آباد — اس غزل کے نئے ہیں سارے ڈھنگ

حال دل کا بیان مشکل ہے — نہیں عشاق کی کہانی سہل
شب فرقت کے قہر ہیں صدمے — نہیں اس سے نجات پانی سہل

کون کہتا ہے مہ لقا ہو تم — اے تو قدرت خدا ہو تم
مثل خورشید ہے رخ تاباں — چاند سے حسن میں سوا ہو تم
دل دیا ہے نہ دینگے ہم تمکو — جانتے ہیں کہ بے وفا ہو تم
دل یہ کہتا ہے ہم سے اے آباد — جسقدر ہو اُسی کو چاہو تم

دیکھنے کو عدم سے ہستی میں — چہرہ رشک حور آئے ہم
بدو انجام کار پر روئے — جب قریب قبور آئے ہم
بوستش حیرت سے مثل آئینہ — روبروئے حضور آئے ہم
رہنما شوق دل ہوا اپنا — قرب قصر حضور آئے ہم
جلوہ کہتا ہے حسن جاناں کا — آنکھ میں مثل نور آئے ہم
اپنے قرب مکاں جگہ بخشو — دور سے ہیں حضور آئے ہم
پاس پہونچے نہ جب تو اے آباد — دور سے اُن کو گھور آئے ہم

ساتھ والوں سے اب جدا ہیں ہم — نالہ زن صورت درا ہیں ہم
یہ حسینوں سے قول ہے اپنا — بے وفا تم ہو باوفا ہیں ہم
وہ جو ہم سے ہوئے ہیں آزردہ — اپنے جینے سے اب خفا ہیں ہم
بیخودی ہجر ہیں یہ ہم کو ہوئی — نہیں معلوم ہے کہ کیا ہیں ہم
اُسکے کوچے میں خاک اب لے چل — منتظر کب سے اے صبا ہیں ہم
ساتھ اُس آفتاب صورت کے — سایہ کی طرح جابجا ہیں ہم
موج کی طرح کیوں نہ ہوں بیتاب — بحر الفت کے آشنا ہیں ہم
وصل اُس سے کہاں ہوا آباد — درد فرقت میں مبتلا ہیں ہم

نہیں اپنی خبر کہاں ہیں ہم / ملک ہستی میں بے نشاں ہیں ہم
جل رہے ہیں مزاج سے اپنے / گرمیٔ آتش نہاں ہیں ہم
دانہ پانی قفس میں پاتے ہیں / گھر میں دشمن کے میہماں ہیں ہم
بوئے گل آکے رہبری تو کر / کب سے گم کردہ آشیاں ہیں ہم
گردشوں میں بسر نہ ہو کیوں کر / پایۂ تخت آسماں ہیں ہم
حشر تک بھی نہ حشر میں پہونچیں / بار عصیاں سے یہ گراں ہیں ہم
اُس بسنتی لباس پر آباد / زرد مانند زعفراں ہیں ہم

تم

اُسکے پُر نور ہیں مقام تمام / ہیں سوا آسمان سے بام تمام
مثل یوسف عزیز ہر دل ہے / تیرے عاشق ہیں خاص و عام تمام
تیری تیغ نگہ نے او قاتل / عاشقوں کا کیا ہے کام تمام
بزم میں عکس روئے تاباں سے / بن گئے آفتاب بام تمام
کسکے گیسو کی بو صبا لائی / کہ معطر ہوا مشام تمام
کعبہ و دیر چشم و خانۂ دل / اُس صنم کے یہ ہیں مقام تمام
کیا خبر تھی مقیم ہے دل میں / اُسکے ڈھونڈے عبث مقام تمام
باغ میں کون آئے گا ساقی / گل چمن میں ہیں مثل جام تمام
شہروں شہروں ہے شہرۂ آباد / سب میں مشہور ہے کلام تمام

تم

اب نہ اے زلف یار ایذا دے / تیرے مہماں سب کے شب ہیں ہم
زلف سے آنکھ کا اشارہ ہے / تو جو آفت ہے تو غضب ہیں ہم

تم

روؤں جو یاد روئے خنداں میں / اشک بن جائیں پھول داماں میں
اشک شعلے ہیں چشم گریاں میں / ہجر نے آگ دی ہے طوفاں میں
محو ہوں یاد روئے خنداں میں / پھول پھولے نگہ کے داماں میں
دامن دید جل گیا دم دید / کیا حرارت ہے روئے تاباں میں

تن

جسم میں ڈھونڈھتی ہیں کیا آنکھیں   دل سدھارا ہے کوئے جاناں میں
دوست تو دوست کوئی دشمن بھی   نہ پھنسے رنج و دردِ ہجراں میں
شعلے ہیں پھول ہجر میں اُسکے   جاؤں کیا خاک میں گلستاں میں
چار دیوار تن سے ایذا ہے   ق   رُوح گویا پھنسی ہے زنداں میں
یاد آئی مجھے جو نوکِ مژہ   لاکھ نشتر سے چبھے رگِ جاں میں
نہ ہوئے شاد وصل سے آباد   کٹ گئی زیست ہجرِ جاناں میں

صدمۂ ہجر سے گزر جاؤں   موت آتی نہیں کہ مر جاؤں
ناتوانی کمال ہے مجھکو   اب تصوّر میں اُسکے گھر جاؤں
دل ہے بیتاب اُسکی فرقت میں   ق   اُسکو لیکر بھلا کدھر جاؤں
تاک میں ہیں کہ لوں کسی کا دل   مال یہ مار کر کُدھر جاؤں
اس بہانے سے اُسکو دیکھ آؤں   آپ میں سے نکلے نامہ بر جاؤں

حُسنِ رخسار کا جواب نہیں   شعلۂ طور ہے نقاب نہیں
آنکھ کو دیکھنے کی تاب نہیں   کس طرح چہرہ آفتاب نہیں
اشک ہیں ہجر میں شراب نہیں   دل تفسیدہ ہے کباب نہیں
عطشِ شوق جس سے بجھ جائے   تیغِ قاتل میں ایسی آب نہیں
جسکو اُس چشمِ مست کا ہے عشق   ق   مائلِ ساغرِ شراب نہیں
مے پیوں کیوں نہ اُسکے کوچے میں   خُلد میں حُرمتِ شراب نہیں
دہن لاجواب کے آگے   منہ میں غنچے کے بھی جواب نہیں
پیاس جس سے بجھے شہیدوں کی   تیغِ قاتل میں ایسی آب نہیں
شوقِ وصلِ صنم میں لے آباد   دل کو کس وقت اضطراب نہیں

خواب میں بھی کبھی جو آتے ہیں   ق   منہ کو بالوں سے وہ چھپاتے ہیں
تیرے قامت کے دھیان میں اکثر   سرو کو ہم گلے لگاتے ہیں

سوز فرقت سے شمع رو ہر شب　　دل آباد کو جلاتے ہیں

جب سے دلبر نہیں ہے پہلو میں　　دل ہے بیتابیوں کے قابو میں
بَل پہ اُسکا مزاج ہے جتنا　　اسقدر بَل کہاں ہیں گیسو میں
مہر جلتا ہے رشک کے مارے　　ہے وہ تعویذ اُس کے بازو میں
ہے دماغ آج چرخ چارم پر　ق　مہر میرا ہے میرے پہلو میں
یاد دنداں رُلا رہی ہے مجھے　　صاف آب گہر ہے آنسو میں
اپنے گل کو گلے لگایا ہے　　ہوں مُعطّر میں آج خوشبو میں
دونوں عالم کو ہے بہا دیتا　　توڑا ایسا ہے ایک آنسو میں

یاد رخسار ہے بہم دل میں　　چاند سورج ہیں ایک منزل میں
اب دھڑک بھی ہے ضعف سے موقوف　　کسی صورت سے حس نہیں دل میں
رحم کر اب تو اے غم جاناں　　تاب باقی نہیں رہی دل میں
آ جلوت میں، ہو چکی خلوت　　سب ہیں مشتاق کب سے محفل میں
جستجو اُس دہن کی ناحق ہے　ق　کیوں پھروں دشت وہم باطل میں
کچھ تو پاس محبتِ عاشق　　یار انصاف کر ذرا دل میں
عشق میں ہم نے نام اس دل کا　　لکھ دیا ہے گواہ عادل میں
دوستو سرو بالِ دوش ہوا　　لے چلا مجکو کوئے قاتل میں
اُنس ہے مجکو اپنے ساقی سے　　مے اُلفت ہے شیشۂ دل میں
دشمنوں کا بھی دوست ہوں آباد　　صاف ہوں، کب غبار ہے دل میں

راز کھلتا ہے آج میں، کل میں　　اب نہیں دیر امر فیصل میں
عمر یوں تیز رو صبا سے ہے　ق　فرق جیسے سوار و پیدل میں
آخری دور کی خبر کسکو　　ہم تو بیخود ہیں جام اوّل میں

کب ہے روئے حضور پردے میں | ہے نہاں برق طور پردے میں
راز اُس نکتہ فہم سے کہدے | اے دل باشعور پردے میں
تو ہے وہ خوش جمال ای پیارے | تجھسے چھپتی ہے حور پردے میں
چہرے پر فائدہ نقاب سے کیا | کوئی چھپتا ہے نور پردے میں
نہیں نزدیک اُسکے جا سکتے | ہے نہاں ہم سے دور پردے میں
محتسب سے چھپائے شیشۂ مے | رکھے جام بلور پردے میں

گو کہ جاؤں کہیں خدائی میں | چین مجکو نہیں جدائی میں
گرے آنکھوں سے لخت دل باہم | کھو گیا کیا نگیں جدائی میں
بن گئی بحر غم میں صورت موج | چشم پر آستیں جدائی میں
کوہ غم کو اُٹھا لیا اے دل | تو نے صد آفریں جدائی میں
اُٹھ گیا جسم سے ہمارا دل | بے مکاں ہو مکیں جدائی میں
نظر آتے نہیں ہیں اے آباد | آسمان و زمیں جدائی میں

سب زمانہ ہے تار آنکھوں میں | چھائی ہے زلف یار آنکھوں میں
راہ دیکھی یہ تیرے آنے کی | آ گئی جان زار آنکھوں میں
شوق چشم صنم میں رہتی ہیں | پتلیاں بے قرار آنکھوں میں
نرگسی چشم کا فراق جو ہے | ہے خزاں سب بہار آنکھوں میں
حسن نے کوٹ کوٹ کر موتی | بھر دیئے اے نگار آنکھوں میں
توتیا ہے غبار راہ ترا | سرمۂ انتظار آنکھوں میں
جسم سے آ گئی سمٹ کر جان | اے شب انتظار، آنکھوں میں
نشہ اُس کا اُڑا کے اے آباد | لے گئے بادہ خوار آنکھوں میں

خوش جمالوں سے مجکو کام نہیں | کسی یوسف کا میں غلام نہیں
یار تیرا ہی ذکر رہتا ہے | اور ورد زباں کلام نہیں

در پہ اُسکے جھکا دے سرِ اے دل
پاؤں رکھنے کا یہ مقام نہیں

غیر بھر بھر کے لے گئے خُم سے
اپنی قسمت میں ایک جام نہیں

ملکِ ہستی، سرا سے کچھ نہیں کم
کوچ درپیش ہے مقام نہیں

وہ اندھیرا ہے ہجر کی شب کا
روشنی کا نظر میں نام نہیں

ق
جسقدر پی سکیں پئیں احباب
مئے اُلفت کبھی حرام نہیں

وہ نہیں ہے تو ہم بدن میں نہیں
یہی کب روح کا پیام نہیں

کر دیا شاہِ عشق نے برباد
کشورِ دل میں انتظام نہیں

خلوتِ یار ہے اب اے آباد
غیر کا پاس اپنے کام نہیں

تھی لگاوٹ کی گھات آنکھوں میں
لے گئے دل کو رات آنکھوں میں

ہے جہاں بے ثبات آنکھوں میں
ٹھہرے کیا کائنات آنکھوں میں

نور کے بدلے چھا گیا تیرا
نورِ ذات و صفات آنکھوں میں

ہمکو اصلا نظر نہیں آتا
زندگی کا ثبات آنکھوں میں

ق
مائل جور چشم ہے اُن کی
وہ نہیں التفات آنکھوں میں

آؤ تمکو نہ کوئی دیکھے گا
پردوں کی ہے قنات آنکھوں میں

اے خیال حبیب تیری قسم
خواب آیا نہ رات آنکھوں میں

ہر اشارے سے راز دل ہے عیاں
اُن سے ہوتی ہے بات آنکھوں میں

ہے وہ رُخ زلف میں نہاں آباد
دن ہے مدت سے رات آنکھوں میں

سُنکے خوش خاص عام ہوتے ہیں
تم سے کب خوش کلام ہوتے ہیں

آتے ہیں جو عدم سے دنیا میں
رنج ان کو مدام ہوتے ہیں

نہ ستایا کرو کسی کا دل
شہرہ ور نیک نام ہوتے ہیں

ق
زخم تیغ فراق اے قاتل
قابل التیام ہوتے ہیں؟

تو چمن میں کبھی جو جاتا ہے
شیفتہ گل تمام ہوتے ہیں

تیرے بسمل تڑپتے ہیں اے یار
لطف کیا زیر دام ہوتے ہیں

یہی تسکین دل کو دیتا ہوں — مہربان صبح و شام ہوتے ہیں
نخلِ اُمید سے نہ رکھ اُمید — سب ثمر اس میں خام ہوتے ہیں
آہ کرتے ہیں، روتے ہیں دن رات — ق — یہی دو ہم سے کام ہوتے ہیں
قسم اے شادیٔ وصالِ حبیب — ہجر میں ہم تمام ہوتے ہیں
توسنِ عمر کی صدا یہ ہے — ہم سے کب تیز گام ہوتے ہیں

ہجر میں بے حواس رہتا ہوں — زندگی سے اُداس رہتا ہوں
دور گو ہوں، مگر تصور سے — رات دن اُنکے پاس رہتا ہوں
ناطقہ جب سے میں نے پایا ہے — ق — محوِ شکر و سپاس رہتا ہوں
بنکے تیرے خیال میں خود بیں — شکلِ اُمید و یاس رہتا ہوں
پوچھ حالت نہ ہجر کی آباد — بیخود و بے حواس رہتا ہوں

دم سے وعدوں کو ٹال دیتے ہیں — بات میری اچھال دیتے ہیں
پھیر لیتے ہیں ہم سے منہ اپنا — چاند سے جو مثال دیتے ہیں
تو ہے وہ خوش جمال اے دلبر — ق — جان صاحب جمال دیتے ہیں
پھاڑ کر پھینکتے ہیں جائے جواب — ہم جو لکھکر سوال دیتے ہیں
کیا ثمر عشق کا ہمیں، دیکھیں — اب کسے یہ نونہال دیتے ہیں
چاند سا منہ دکھا کے وہ آباد — داغ دل کو کمال دیتے ہیں

داغِ دل کے سوا رفیق نہیں — کوئی جز رنج و غم شفیق نہیں
جسقدر بحرِ عشق ہے تہ دار — ق — قلزم ایسا کوئی عمیق نہیں
بدمزاج اُسکو کون کہتا ہے — کوئی آباد سا خلیق نہیں

ہجر کا اس جگر میں داغ کہاں — ق — گھر میں مفلس کے اب چراغ کہاں
ناز بے جا اُٹھائیں جو ناحق — ہم کو اتنا دل و دماغ کہاں

رُخِ رنگیں کو دیکھ لینے دو — پھر یہ لطفِ بہار باغ کہاں
شادیِ وصل کب ہی قسمت میں — غمِ فرقت سے ہے فراغ کہاں
واقف ہی نہیں، سبو کی قسم — ساقیو! ہم کہاں ایاغ کہاں
دیکھتے ہیں بہار داغ آباد — ہم کہاں اور سیرِ باغ کہاں

تجھ میں جو ہے پری میں شان نہیں — حور میں بھی یہ آن بان نہیں
جنکے آگے چلے نشان بردار — خاک میں نام کو نشان نہیں
سب مکانوں میں تو ہے جلوہ نما — پر مقرر کوئی مکان نہیں
علم کا تیرے ہے جدا عالم — اور کچھ قدر کا بیان نہیں
اُس کے کوچے میں گر کے اُٹھ نہ سکے — کوئی بھی ہم سا ناتوان نہیں
جسم سوزِ فراق سے یہ گھُلا — شمع کی طرح استخوان نہیں
تو جو کرتا ہے خوب کرتا ہے — تیری خوبی کا کچھ بیان نہیں
جان دینے کو ہم تو حاضر ہیں — تمھیں منظور امتحان نہیں
کون مرتا ہے، کون جیتا ہے — حیف اتنا بھی اُنکو دھیان نہیں

آدمی کا کچھ اختیار نہیں — عمرِ فانی کو کچھ قرار نہیں
میرے پہلو میں جو وہ یار نہیں — کسی کروٹ مجھے قرار نہیں
رات دن جوش پر ہے بحرِ فنا — کون ہے جو حباب وار نہیں
جس کو کہتے ہیں دم، ہوا ہے وہ — خاک ہے، قصرِ جسم زار نہیں
آج گو اختیار ہے تیرا — کل تجھے خاک اختیار نہیں
سلسلہ زیست کا ہو کیا مضبوط — رشتۂ عمر پائدار نہیں
دل میں جمتی نہیں ہے گردِ ملال — اپنے آئینے پر غبار نہیں
مست رہتے ہیں چشمِ مست کے مست — نشۂ عشق کا اُتار نہیں
رُخِ رنگیں کے عشق میں آباد — کب گُلِ داغ کی بہار نہیں

صفتِ شعلہ بے قرار ہوں میں — شمع کی طرح اشکبار ہوں میں
اُٹھے تعظیم کو بگولے سب — وحشیوں میں وہ خاکسار ہوں میں
حُسن ہے تجھ میں اور تپش مجھ میں — نور تو ہے اگر، تو نار ہوں میں
پاس میرے وہ بحرِ خوبی ہے — آج دریا سے ہمکنار ہوں میں
گلِ خورشید گل ہیں تربت پر — کشتۂ حُسنِ روئے یار ہوں میں
دوست میرا جدا ہوا مجھ سے — دل کے ماتم میں اشکبار ہوں میں
ناامیدی ہے میری قسمت میں ق وصل کا کیا اُمیدوار ہوں میں
مجھ میں تجھ میں ہے فرق اتنا ہی — سروِ گلشن ہے تو، چنار ہوں میں
سرِ شوریدہ کی تمنا ہے — کوئے جاناں میں سنگسار ہوں میں
مجکو طوفِ حرم سے کیا مطلب — رات دن گرد کوئے یار ہوں میں

ہجر میں اُلٹی سانسیں بھرتے ہیں — اے مسیحا خبر لے، مرتے ہیں
تم کو آنا جو ہے تو آجاؤ — ہم تو دنیا سے اب گزرتے ہیں
ماہ و خورشید رات دن تم پر ق چاندی سونا نثار کرتے ہیں
تو وہ یوسف ہے یکرہ دل ہوش — سامنے تیرے پانی بھرتے ہیں
ہیں جواں مرد وہ کہ جو آباد — نام پر آبرو کے مرتے ہیں

دُور سے بھی اگر اشارے ہوں — میرے جینے کے کچھ سہارے ہوں
جبکہ وارفتہ ہم تمھارے ہوں — ہوش کیونکر بجا ہمارے ہوں
سامری کا چلے نہ سحر اُن پر — جو تری انکھڑیوں کے مارے ہوں
یہ بھی قسمت کی ایک خوبی ہے ق اُلٹے مُنہ پر گلے ہمارے ہوں
منہ سے کلمہ نہ مرتے دم نکلے — در پر آ کے جو ہم پکارے ہوں
چشمِ بے نور اپنی روشن ہو — اپنے یوسف کے گر نظارے ہوں
صورت آباد کے ہو جینے کی — اُس قمر کے اگر نظارے ہوں

تم کو افسوس میری چاہ نہیں — مجھ پہ الفت کی وہ نگاہ نہیں
اُس نے عالم کو یہ ستایا ہے — کون دنیا میں داد خواہ نہیں
صرصرِ غم سے بحرِ الفت میں — ق — کشتیٔ عمر کب تباہ نہیں
کام اعلیٰ کو کیا ہے زینت سے — سر خورشید پہ کلاہ نہیں
سامنا اُس سے ایک دن ہوگا — جس سے آبادؔ رسم و راہ نہیں

محو تیرے خیال میں ہم ہیں — ق — تو ہی آئے نظر جدھر دیکھیں
یہی تحریر تھا مقدر میں — پھروں ہم راہ نامہ بر دیکھیں

جسم پُر کب بہار باغ نہیں — پھول یہ کھل رہے ہیں داغ نہیں
فکر ساغر عبث ہے اے ساقی — بھر دے چلو، اگر ایاغ نہیں
رہ کے گلشن میں ہم نشیں نالے — ق — بلبلو یہ ہمیں دماغ نہیں
ہجر گلرو میں پھول اخگر ہیں — کم جہنم سے مجھکو باغ نہیں
نہیں کہتے ہیں وہ مہ کامل — دل میں کس وقت اب یہ داغ نہیں

دُرِ دنداں کے غم میں روتے ہیں — آب گوہر سے منہ کو دھوتے ہیں
پاؤں رکھتے ہیں بحر الفت میں — ق — اپنے جینے سے ہاتھ دھوتے ہیں
نہیں آرام اپنی قسمت میں — چشم بیدار، بخت سوتے ہیں
کہیں دنیا میں اے پری پیکر — آرزو مند ہم سے ہوتے ہیں ؟

رباعی

(حضرت سیمابؔ اکبر آبادی)

گھیرے ہوئے ہر طرف سے فطرت ہے مجھے — جو کام ہے، فطرت کی ودیعت ہے مجھے
ڈر کر نہیں کرتا میں کبھی کوئی گناہ — کر کے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے مجھے

ملک الشعرائے ایشیا سے خطاب[۱]

(نتیجۂ فکر پنڈت وتستہ پرشاد صاحب قدا بی۔اے)

اے کہ ہے شرمندۂ احساں ترا ذوقِ سلیم　　طبعِ موزوں میں تری موجود ہے رنگ
سازِ دل رہتا ہے تیرا حسنِ فطرت سے کلیم　　تجھ سے کرتی ہے عجب انداز سے یا

سحرِ بنگالہ ترے نغمات سے بیدار ہے
ایک عالم اس مئے جذبات سے سرشار ہے

حسنِ فطرت جلوہ گر رہتا ہے تیرے سامنے　　شانِ صبح و شام پائی تجھ سے صبح و ش
کی حدیثِ عشقِ گل سے جب ترے اوہام نے　　بلبلیں فوراً لگیں اپنے جگر کو تھا

فکر تیرا عارضِ گل کا ہوا ہے آئینہ
رازِ الفت اہلِ دل پر کر رہا ہے آئینہ

نت نیا پیغام دیتی ہے تجھے فصلِ بہار　　دم دلاسے سے ترے بلبل کا دل ہے
تیرے نغموں میں ملی آکر پپیہے کی پکار　　رازِ سربستہ کئے فطرت کے تو نے آ

ندیوں نے گائے سو سو گیت تیرے روبرو
سازِ دل سے جو ادا تو نے کئے ہیں ہو بہو

اے جہانِ رنگ و بو کی روح اے جانِ چمن　　اے کہ عالم میں بڑھا تجھ سے وقار
اے کہ نازاں ہے تری الفت پہ فطرت کی دلہن　　تھی ترے دیدار کی مدت سے آنکھوں

کم ہے جتنا بھی کریں اپنے مقدر پر غرور
شربتِ دیدار سے حاصل ہوا ہے اب سرور

فکر ہے یارب نہ ہو عالم یہ کوئی خواب کا　　یا نہ ہو کوئی کرشمہ ہی دلِ بیتا
اوج پر پہونچا ستارہ صوبۂ پنجاب کا　　پر لگا ہے آج اسکے بخت میں سرخا

جلوہ فرما کشورِ پنجاب میں ٹیگور ہیں
رونق افزا محفلِ پنجاب میں ٹیگور ہیں

شانِ ایزد جلوۂ ٹیگور ہیں آئی نظر　　آنکھ میں فرطِ مسرت سے ابل آ
نور شیں کرنے لگے افکارِ دل پر اس قدر　　جوش سے مائل تکلم پر ہوئے دیوا

[۱] اس ماہ ڈاکٹر ٹیگور کی ستّرویں سالگرہ منائی گئی۔ اسی کے اعزاز میں یہ دونوں نظمیں ہدیۂ ناظرین ہے۔ ایڈیٹر

ٹیگور

(از جناب اندرجیت شرما چھرہ)

بزمِ دنیا کے جھمیلوں سے ترا دل دور ہے — پاک ہستی سے تری افسونِ باطل دور ہے
تیرا پیکر ہے بیاں اور فکر کامل دور ہے — سرحدِ ادراک سے بھی تری منزل دور ہے
تیرے اک اک لفظ سے ہے حسنِ فطرت آشکار
تیری ہستی ہے خدا کے راز کی آئینہ دار

جب مکمل ہو چکا روزِ ازل ایوانِ حسن — دلبر بارنگینیوں سے بھر گیا دامانِ حسن
ہو گئی ایک ایک ذرہ سے نمایاں شانِ حسن — قلبِ فطرت میں مگر اک رہ گیا ارمانِ حسن
کر دیا تخلیق نے تیری وہ پورا کر دیا
ساغرِ دل بادۂ کیف آفریں سے بھر دیا

رنگِ مستقبل نظر آتا ہے تیرے حال میں — کھینچ دی کونین کی تصویر استدلال میں
فرشِ رہ آنکھیں ہوئی جاتی ہیں استقبال میں — چھپ کے بیٹھا ہے کہیں تو جادوئے بنگال میں
زندگی کا حل ہوا عقدہ تیری تحریر سے
جگمگا اٹھا جہاں اک روئے پُرتنویر سے

تیرے نغموں کے ترنم سے فضا معمور ہے — نکہتِ مہرِ محبت سے ہوا معمور ہے
مستیوں سے مبتدا کیا منتہا معمور ہے — بادۂ عرفاں سے ذروں کی بقا معمور ہے
تیرا افسانہ بھلا دیتا ہے فکرِ دو جہاں
تیرے نغمے میں تڑپ اٹھتی ہے روحِ جاوداں

یوں تو لاکھوں ہو گئے ہیں شاعرانِ خوشنوا — مادرِ گیتی نہ پیدا کر سکی ثانی ترا
عشق کو تیری بدولت درسِ خودداری ملا — حسن نے پائے عقیدت پر ترے سر رکھ دیا
ہو مقابل کون تیرا تو ہے فخرِ روزگار
نقش پر تیرے تصدق مانیٔ لیل و نہار

ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم

ہندوستان میں یوں ہی قحط الرجال ہے۔ لیکن ادبِ وطن کے چند سچے جاں نثار ضرور ایسے ہیں جو وطن کی خدمت کے لئے اپنا جان و مال قربان کر دینا اپنا فرض سمجھے ہوئے ہیں۔ افسوس اب وہ ایک ایک کر کے ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دیتے جا رہے ہیں۔ لاجپت رائے، اجمل خاں، سی آر داس، سین گپتا، مولانا محمد علی، پنڈت موتی لال نہرو کے بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب کا دم غنیمت تھا مگر افسوس صد افسوس کہ ۹، ۱۰ مئی کی درمیانی شب میں وہ بھی قلب کی حرکت یکایک بند ہو جانے سے ہم کو ہمیشہ کے لئے دلفگار چھوڑ گئے۔ آپ ایک روز کے لئے نواب صاحب رامپور کی طلبی پر منصوری گئے تھے دوسرے روز شب کے وقت دہلی واپس آرہے تھے کہ راستہ میں ہی ٹرین میں آپ کو تکلیف محسوس ہوئی اور دم کی دم میں صرف ۵۶ سال کی عمر میں رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے۔

مرحوم کی ذات میں نہ معلوم کتنے اوصاف جمع ہو گئے تھے۔ ایک چابکدست جرّاح اور ماہر فن ڈاکٹر ہونے کے علاوہ وہ انسانی اخلاق اور نیک نفسی کے مجسمہ تھے۔ ملک بھر میں وہ سب طبقوں میں یکساں ہر دلعزیز تھے۔ وہ فدائے وطن اور جاں نثار قوم۔ مخلص دوست۔ نیک نہاد انسان خاص طبع اور مستقل مزاج لیڈر تھے جنھوں نے اپنے قوم کی کھری و کھوٹی سُنی مگر جادۂ خلوص و رواداری سے تمام عمر کبھی، ایک قدم بھی نہ ڈگمگائے۔

"ڈاکٹر انصاری کی زندگی کا چراغ گل ہونے سے نہ صرف انھیں کے گھر میں اندھیرا ہو گیا بلکہ تمام اہل ملک کے خانۂ دل میں اندھیاری چھا گئی ہے، آپ کی ذات والاصفات اپنے اور پرائے سب کے لئے ایک چشمۂ فیض تھی۔ وقت پڑنے پر وہ سب کے کام آتے تھے۔ اور انکے یہاں ہر دُکھی کو پناہ ملتی تھی۔ وہ اپنے ہم وطنوں کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے غم کو اپنا غم سمجھتے تھے۔ وہ پھولوں میں گلاب کا پھول، جواہرات میں ہیرا اور انسانوں میں فرشتہ تھے۔ وہ عوام میں بھی ہر دلعزیز تھے۔ اور والیان ریاست اور رؤسائے ملک بھی اُنکی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے حکومت کے اعلیٰ عہدیدار بھی ان کے ساتھ بڑی عزت و احترام کیساتھ



ڈاکٹر مختار احمد انصاری

پیدائش سنہ ۱۸۸۰ع وفات سنہ ۱۹۳۶ع

پیش آتے تھے۔

آپ صوبہ متحدہ میں موضع یوسف پور ضلع غازی پور کے ایک معزز متمول خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام حاجی عبدالرحمن انصاری تھا۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن ہی میں پائی۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں بنارس گئے جہاں سے انٹرینس پاس کرکے الہ آباد میور سنٹرل کالج سے ایف۔ اے پاس کیا اس کے بعد آپ حیدرآباد چلے گئے۔ اور نظام کالج حیدرآباد میں پڑھ کر سنہ ۱۹۰۰ء میں مدراس یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری لی اور ریاست سے وظیفہ حاصل کرکے سنہ ۱۹۰۱ء میں ولایت چلے گئے جہاں اڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف میڈیسن اور ماسٹر آف سرجری کے ڈپلومے حاصل کئے۔ اپنی ذہانت اور محنت کی بدولت سنہ ۱۸۸۶ء سے لیکر زمانہ تعلیم کے آخر تک آپ ہمیشہ تعلیمی وظیفے حاصل کرتے رہے اور ان سے آپ اپنے بعض عزیزوں اور دوستوں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔

ڈاکٹری کے امتحانات پاس کرنے کے بعد آپ چارنگ کراس ہاسپٹل لندن کے ہاؤس سرجن مقرر ہوگئے اور یہ اعزاز آپ سے پہلے کسی ہندوستانی کو حاصل نہ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کو لندن کے اور کئی اسپتالوں میں بھی کام کرنیکا موقعہ ملا۔ اس طرح دس سال تک یورپ میں کام کرنے کے بعد آپ سنہ ۱۹۱۰ء میں ہندوستان واپس آئے اور دہلی میں پریکٹس شروع کی۔ مگر چھ مہینے بھی نہ گذرے تھے کہ جنگ بلقان چھڑ گئی اور ترکوں پر مانٹی نیگرو، یونان، سرویا اور بلغاریہ وغیرہ نے دول یورپ سے شہ پاکر چاروں طرف سے نرغہ کرلیا۔ ہزاروں ترک میدان جنگ سے زخمی ہو ہوکر اسپتالوں میں بھر گئے۔ یہ واقعات سُنکر ہندوستان کے مسلمانوں میں جوش پھیل گیا۔ مولانا محمد علی وغیرہ نے چندہ کرکے ٹرکش میڈیکل مشن مرتب کیا اور اُس کی رہنمائی ڈاکٹر انصاری کے سپرد ہوگئی چنانچہ آپ نے فوراً پریکٹس چھوڑ دی گھر کا سارا اسباب بیچ ڈالا اور فوراً زخمی ترکوں کی مرہم پٹی کرنے کے لئے روانہ ہوگئے اور دو سال تک ترکوں کی بہترین طبی خدمت انجام دی جس کی وجہ سے آپ کو ہندوستان بھر میں قابلِ رشک شہرت حاصل ہوگئی یہی شہرت آپکی غیر معمولی کامیابی اور لیڈری کا پہلا زینہ تھا۔

آپ کے پرائیویٹ سکریٹری کا بیان ہی کہ آپ اوسطاً چودہ مریض روزانہ دیکھتے تھے دو مریضوں کو صبح دو کو شام کے وقت اُن کے گھروں پر جاکر ایک ایک گھنٹہ دیکھتے تھے

اور دس مریضوں کو اپنے مطب میں آدھ آدھ گھنٹہ دیتے تھے۔اس طرح گویا آپ مریضوں کی دیکھ بھال میں اوسطاً نو گھنٹہ روزانہ صرف کرتے تھے۔آپ کی مصروفیت کا یہ حال تھا کہ بعض اوقات دیر سے آئے ہوئے مریضوں کو آٹھ آٹھ دن تک ملاقات کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ مگر جب دیکھنے کا نمبر آتا تھا تو ڈاکٹر صاحب استقدر تفصیل کے ساتھ معائنہ کرتے تھے کہ باتوں باتوں میں بیمار کا آدھا مرض کافور ہوجاتا تھا۔ واقعی ڈاکٹر صاحب کی تشخیص بہت صحیح اور انکا طریقۂ علاج نہایت مکمل ہوتا تھا۔آپ کے ہاتھ میں شفا بھی اتنی تھی کہ نوے فیصدی مریض شفایاب ہوکر جاتے تھے۔اسی وجہ سے مریضوں کو ڈاکٹر صاحب سے بہت عقیدت ہوجاتی تھی۔

ڈاکٹر انصاری سرجری میں بھی بےمثل دیکتا تھے۔ وہ اسقدر سبکدست واقع ہوئے تھے کہ بڑے سے بڑے آپریشن میں بھی انکو کم سے کم دیر لگتی تھی۔ بعض اوقات انھوں نے ایسے معرکے کے اپریشن کئے ہیں جو طبی دنیا کے معجزات میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو روپیہ کا مطلق لالچ نہ تھا۔ رات دن ہُن برستا تھا مگر وہ دولت کو ٹھکراتے رہتے تھے، بقول "اسٹیٹسمین" دولتمند مریضوں کا اسقدر وسیع حلقہ کسی ڈاکٹر کو نصیب نہیں ہوا جیسا کہ ڈاکٹر انصاری کو غرض ڈاکٹر انصاری ہندوستان کی طبی دنیا کے بھی لیڈر تھے اور یونانی طب میں جو مرتبہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کو حاصل تھا۔ وہی ڈاکٹری میں آپکو حاصل تھا۔

آپ بڑے وضعدار اور پابند اوقات تھے۔ہمیشہ صبح کو چھ بجے بیدار ہوکر ضروریات سے فارغ ہوکر کپڑے بدلتے تھے۔غسل روزانہ کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے چہرہ پر سب سے نمایاں چیز اُن کی گنجان اور خوبصورت مونچھیں تھیں، جن کا آپکو ہمیشہ خاص خیال رہتا تھا۔ بہر حال معمولات سے فارغ ہوکر ناشتہ کرتے اور اسکے بعد کپڑے پہن کر تیار ہوجاتے۔ لیکن اس دوران میں بھی باہر کے آئے ہوئے تار سنکر انکے متعلق ہدایات دیتے اور مریضوں کے نمبر مقرر کرتے تھے۔تاروں اور خطوں کے جوابات خود لکھواتے تھے اسی درمیان میں سیاسی مسایل پر بھی گفتگو کرتے تھے۔ وہ سب کام سہولت اور اطمینان کے ساتھ کرتے تھے۔اسلئے مطب میں آتے آتے انکو دو گھنٹے لگ جاتے تھے چنانچہ وہ آٹھ بجے مریضوں کو دیکھنے نکلتے اور دس بجے کے بعد واپس آکر مطب میں کام کرتے ایک بجے کے قریب کھانا کھاتے۔ پانچ بجے چائے پیکر پھر مریضوں کو دیکھنے چلے جاتے اور آٹھ بجے شب کو واپس تشریف لاتے تھے تو خطوط کے جوابات لکھواتے اور پلنگ پر لیٹ کر رات کو بارہ بجے تک اخبارات پڑھتے۔ اس طرح چوبیس گھنٹے میں وہ مسلسل اٹھارہ گھنٹے مصروف رہتے تھے۔

اوپر بیان ہوچکا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی سیاسی زندگی کی ابتدا جنگ بلقان کے زمانہ میں ہوئی تھی جب وہ ٹرکش میڈیکل مشن لیکر ٹرکی گئے تھے۔ ہندوستان واپس آکر وہ قومی تحریکوں میں باقاعدہ طور پر حصہ لینے لگے۔ چنانچہ جب ہوم رول لیگ قائم ہوئی تو آپ اس میں شریک ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں جب کانگرس اور مسلم لیگ کا دہلی میں اجلاس ہوا تو آپ ہی مسلم لیگ کی مجلس استقبالیہ کے چیرمین منتخب کئے گئے۔ اسکے بعد آپ کانگرس کے سکریٹری منتخب کئے گئے اور کانگرس کے پریسیڈنٹ منتخب ہونے تک اس عہدہ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اسی دوران میں آپ کے سیاسی خیالات میں حیرت انگیز تغیرات ہوئے۔ چنانچہ جب مسٹر سی آر داس اور پنڈت موتی لال نہرو نے قانونی کونسلوں میں داخلے کا سوال اُٹھایا تو ڈاکٹر صاحب اسکے خلاف تھے۔ اور سول نافرمانی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے آپنے مجالس قانون ساز کے داخلہ کے خلاف رائے دی تھی۔ لیکن دفعتاً حالات کچھ ایسے تبدیل ہوئے کہ خود ڈاکٹر صاحب ہی مجالس قانون ساز میں داخلہ کے علمبردار بنکر اُٹھے اور فتح وظفر نے آپ کا ساتھ دیا۔

تحریک خلافت میں آپ نے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کردیا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۹۲۰ء میں آپ اپنا موٹر فروخت کرکے خلافت ڈیپوٹیشن لیکر انگلستان گئے تھے۔ جب واپس آئے تو ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگی ہوئی تھی مگر کوئی خدمت ایسی نہ تھی جس کے انجام دینے میں آپ نے دریغ کیا ہو۔ ہندو مسلم اتحاد کے آپ زبردست حامی تھے اور مادرِ وطن کے دونوں فرزندوں میں پریم اور محبت کا رشتہ مستحکم کرنے کے لئے آپ نے کبھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

ملکی سیاسیات میں آپ ہمیشہ مہاتما گاندھی کے ساتھ رہے۔ مولانا محمد علی کی گرفتاری کے بعد نظربندوں کی امداد و اعانت کے متعلق جو کمیٹی بنی ہوئی تھی اسکے صدر بھی آپ ہی منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں دہلی کے اسپشل اجلاس کانگرس کی مجلس استقبالیہ کے صدر بھی آپ ہی تھے۔ اسی سال آپ نے لالہ لاجپت رائے کیساتھ "لاجپت انصاری پیکٹ" کیا اور ایک آل انڈیا مسلم نیشنلسٹ پارٹی قایم کی۔ ۱۹۲۸ء میں آپ نیشنل کانگرس کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ اور کانگرس کی تقویت و استحکام کے لئے ہندوستان بھر میں مارے مارے پھرے۔ اور تنگ دل احباب کی بُری بھلی سنتے رہے۔ لیکن جس راہِ صداقت پر آپ نے قدم رکھا اس سے کبھی ایک انچ بھی نہ ڈگمگائے۔

۱۹۲۸ء کی آل پارٹیز کانفرنس محض آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ آپ نے اسکی تحریک اپنی صدارتی تقریر میں کی تھی بہرحال اس کا پہلا جلسہ آپ ہی کی کوٹھی میں منعقد ہوا اور وہیں پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی بنی جس نے نہرو رپورٹ کو مرتب کیا۔ اسمیں خود ڈاکٹر انصاری نے پنڈت جی کی امداد اعانت کی۔ انھیں نے مسلم لیگ کے ممبروں کو اس شرکت پر آمادہ کیا۔ مگر جب کلکتہ کے اجلاس میں یہ رپورٹ نظرانداز ہوگئی تو آپ کو قدرتاً اس کا بیحد صدمہ ہوا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسوقت آپکی آنکھیں پرنم ہوگئی تھیں۔ غالباً آپکی عمر میں یہ پہلا موقعہ تھا جب آپکو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ تاہم انکی ہمت مردانہ ہار ماننا نہیں جانتی تھی اور وہ اس واقعہ کے بعد آخر دم تک ہندوستان کے مختلف اقوام میں اتحاد پیدا کرنیکی کوششوں میں مصروف رہے۔

۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی کی، تحریک سول نافرمانی میں بھی آپنے نمایاں حصہ لیا اور اس سلسلہ میں آپ کو بھی جیلخانہ جانا پڑا۔ رہائی کے بعد آپکی کوٹھی ہندوستان کی سیاسی تحریک کا مرکز بنگئی۔ آپ مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور قومی اسپرٹ پیدا کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے اور نیشلسٹ مسلم پارٹی کے زیراہتمام ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں جاکر مسلمانوں کے اندر متحدہ قومیت کے جذبات ابھارے۔ فریدپور میں بنگال نیشنلسٹ مسلم کانفرنس کی صدارت کیلئے بھی آپ ہی منتخب ہوئے۔

دوسری گول میز کانفرنس کے بعد مہاتما گاندھی کی واپسی پر جب ستیہ گرہ کی تحریک دوبارہ جاری ہوئی تو آپ بھی گرفتار کرکے نظربند کردئے گئے تھے۔ مگر اس دفعہ جیلخانہ کی زندگی کا آپکی صحت پر بہت خراب اثر پڑا چنانچہ آپ بحالی صحت کیلئے یوروپ تشریف لے گئے مگر یہاں بھی قوم و وطن کو نہ بھولے اور ملک کے آزادی کی برابر کوشش کرتے رہے۔ لیکن اب آپ کی صحت خراب ہوچکی تھی چنانچہ یوروپ سے واپسی پر آپ عملی سیاسیات سے کنارہ کش ہوگئے اور کانگرس کی مجلس عاملہ سے بھی استعفاء دیدیا۔ تاہم جب کبھی آپ کے امداد کی ضرورت ہوتی تھی یا مہاتماجی کوئی برت رکھتے تھے یا انھیں کوئی تکلیف ہوتی تھی تو ڈاکٹر صاحب فوراً اُن کے پاس پہونچ کر تیمارداری وعلاج میں مصروف ہوجاتے تھے۔ پچھلے لکھنؤ کانگرس میں بھی آپنے صلاح ومشورہ سے ہروقت امداد دی اور خیال ہے کہ یہیں سے آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔

ڈاکٹر صاحبنے ملک کی دماغی تربیت میں بھی بہت بڑا حصہ لیا۔ اوائل عمر میں بھی وہ اپنے تعلیمی وظائف سے کچھ نہ کچھ بچاکر نادار طلباء کی مدد کرتے رہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد قائم کرنے

میں مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں کے علاوہ آپ نے سب سے بڑا حصہ لیا تھا۔ حکیم اجمل خاں کے بعد اس کی تنظیم و ترقی آپ ہی کے ذمہ رہی۔ چنانچہ آپ نے اسکے استحکام کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور سچ پوچھئے تو جو کام سرسید احمد خاں نے علی گڑھ کالج کے لئے کیا تھا وہی خدمت جامعہ ملیہ کے لئے آپ نے انجام دی۔ دراصل جامعہ ملیہ سے آپ کو بے انتہا محبت تھی۔ اور وہ اس کے اخراجات پورا کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ چنانچہ اس کے لئے انھیں بعض اوقات بہت کچھ تردد کرنا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے عزیزوں میں ایک بچہ جامعہ میں پڑھتا تھا۔ ایک روز چھٹی کے دن ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا تو باتوں باتوں میں اس نے یہ واقعہ بیان کیا کہ اس کے ایک استاد کی بیوی کو صرف نمک مرچ کے سہارے سوکھی روٹی نصیب ہوتی ہے۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔ آواز بھرا گئی اور اضطراری حالت میں چیخ چیخ کر فرمانے لگے کہ "میرے بچے بھوکے مر رہے ہیں اور مجھے خبر تک نہیں۔ تف ہے میرے کھانے پینے پر۔ اب میں جب تک روپیہ فراہم نہ کرلونگا چین سے نہ بیٹھونگا"۔ اسی دن شام کو آپ باہر روانہ ہو گئے۔ اور ایک ہفتہ کے بعد واپس آئے تو چہرہ پر رونق تھی۔ کیونکہ وہ جامعہ ملیہ کے لئے پچیس ہزار روپیہ کی رقم لیکر آئے تھے۔ افسوس اب جامعہ ملیہ کا اتنا خیال کون رکھیگا۔ ڈاکٹر صاحب کو جامعہ ملیہ سے اسقدر محبت تھی کہ مرنے کے بعد بھی ان کی مٹی نے جامعہ سے دوری گوارا نہ کی اور وہ جامعہ ملیہ کی ہی زمین میں دفن ہوئے۔ خدا آپکو غریق رحمت فرمائے۔ اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ ع

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنیوالے میں"

قوم کے ہوتے ہیں سرتاج پرستار وطن　　جو ہوں خدام وطن ہیں وہی سردار وطن

قوم کی جان ہوا کرتے ہیں انصار وطن　　محسن خلق خدا ہوتے ہیں احرار وطن

تھی وہ توفیق عمل ڈاکٹر انصاری میں

پھونکدی جان نئی جس نے وطن داری میں

(ماخوذ)

NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY DELHI

ماتھے کی بندیا

(از مسٹر بتاب بریلوی)

تتمہ

لکشمی تو قسمت سے بھی مہربان ہو جاتی ہیں۔ لیکن سرسوتی کو رجھانا بہت مشکل ہے۔ سرسوتی جی اپنے ان سیوکوں سے بھی جو دین و دنیا سے بے نیاز ہو جاتے ہیں شاذونادر ہی خوش ہوا کرتی ہیں۔ انل کو عیش و آرام، دھن دولت، عزت حشمت، دوست احباب سبھی کچھ آسانی سے میسّر آگیا تھا۔ ان کے لئے اُسے دوڑ دھوپ تو کیا کبھی ایک لمحہ کے لئے خواہش بھی نکرنا پڑی تھی۔ جب پیسہ پاس ہوتا ہے تو عزیز و اقارب اور شہرت و قسمت کی تلاش میں کچھ دور نہیں جانا پڑتا۔

غرض اپنی خوش نصیبی یا بزرگوں کی دور اندیشی سے انل کو روپیہ پیسہ بہت کچھ مل گیا تھا۔ اگر کوئی کمی تھی تو یہی کہ علم کی دولت سے اس کا دامن بالکل خالی تھا یہ بھی شاید مقدر ہی کی بات تھی ورنہ اُس نے حتی المقدور کوشش کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی مگر ساری محنت رائگاں جاتی دیکھکر کون مایوس نہیں ہوتا؟ انل بھی اپنی صبر آزما مساعی کی ناکامی سے ہمّت ہار بیٹھا۔ مگر اس کمی کے لئے اسکو اپنے ضمیر کی ندامت برداشت کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس کی روزمرہ زندگی بڑے عیش سے گذر رہی تھی۔ گھر میں ایک بیوی تھی اور اس کا بھائی کئی نوکر تھے اُسکی بہن کی شادی ہو چکی تھی۔

انل اپنے سالے شیتل کی بڑی خاطر کرتا تھا۔ اس کی ایک وجہ بھی تھی۔ قدرت نے اُسے فارغ البالی کیساتھ ساتھ رنگیلی طبیعت بھی عطا کی تھی۔ اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سالے کو مٹھی میں کئے بغیر ناچ تماشے کا رنگ جمانا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ لین دین کا حساب کتاب بھی شیتل ہی کے ہاتھ میں تھا۔

شام کے وقت جب آفتاب اپنی سُرخ و سنہری شعاعوں سے کنارۂ اُفق کو رنگ کر آہستہ آہستہ روپوش ہو جاتا اور پرند شفق کے حسین مناظر کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے نغمہ سرائی کرتے کرتے تھک کر خاموش ہو جاتے تو انل کی نشست گاہ بے تکلّف دوستوں اور ہمنشینوں کے نمائشی قہقہوں سے گونجنے لگتی۔ کبھی دور چلتا کبھی راگ و نغمہ کی بارش ہوتی۔

پھاگن کے دن تھے۔ بہار کا شباب پورے ابھار پر تھا۔ انل کا سکون ناآشنا دل آم کے پھولے ہوئے بور کی نشیلی مہک کی مانند اُمنگ کی تند و تیز ترنگوں میں جھول رہا تھا۔ جیسے نئی نویلی دلہن کا سنگار کیا جاتا ہے اسی شان سے اس کی کوٹھی سجائی جا رہی تھی۔ یہ کام بھی شیتل ہی کے سر تھا۔ دونوں کے مزاجوں کی یکسانیت نے بیوی کی مخالفت اور تمام دیگر اندیشوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا تھا۔ پھر کیا تھا؟ ہولی کے جلسہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

زمانہ کی نیرنگیاں بھی کتنی عجیب ہیں؟ دنیا کو اپنی دھن میں کسی کے عیش و الم کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ نیک ساعت جس کے انتظار میں آنکھیں بچھی ہوئی تھیں وہ خوبصورت گھڑی جس کی پیشوائی کے لئے اتنا درد سر مول لیا گیا تھا۔ ابھی دور ہی تھی کہ ناشدنی نے اچانک انل کے چمنستانِ آرزو کو برقِ بلا کی طرح جلا کر خاک کر ڈالا۔

٭ ٭ ٭

بن مالی پٹنہ کے مشہور بیرسٹر تھے۔ انل کی ہمشیرہ پرمدا کا انھیں سے بیاہ ہوا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ رشتہ تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ ناپائدار نکلا۔ بن مالی نئی روشنی کے ناز پرورده نوجوان تھے۔ کھانے پینے میں کسی طرح کا پرہیز نہ کرتے تھے۔ بلکہ اکثر اعتدال سے تجاوز کر جاتے تھے۔ پرمدا کی شادی کو ابھی دوسرا ہی سال تھا کہ ان کی صحت جواب دے گئی۔ بڑی دوڑ دھوپ کی گئی مگر بیماری نے ایسی جڑ جمالی کہ کسی طرح صحت نہ ہوئی اور ایکدن بیٹھے ہی بیٹھے ان کے دل کی حرکت بند ہوگئی۔ اس صدمۂ جانکاہ سے پرمدا کی پُرشباب زندگی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تاریک و ویران ہوگئی۔

انل پرمدا پر جان دیتا تھا۔ اُس نے اسے بچوں کی طرح پالا تھا۔ اس ناقابلِ برداشت چوٹ سے اس کا نازک دل ٹھیس کھائے ہوئے شیشہ کی طرح چور چور ہوگیا۔ کسی طرح سینہ پر پتھر رکھ کر بہن کا غم غلط کرنے چلا۔ گھر سے نکلا تو تن بدن کا ہوش نہ تھا آنسو دلِ آزردہ مسافر کی طرح روکنے کی کوشش کرنے پر بھی نہ تھمتے تھے۔ جلسہ کی بات یونہی اڑ گئی اور سب باتیں بھی ویسی ہی رہ گئیں۔

انل پرمدا کے پاس پہنچ تو گیا۔ لیکن یہ درد اس کے بٹا لینے کا نہ تھا۔ اس کے آنسوؤں کی بوچھار سے پرمدا کی آرزوؤں کی دہکتی ہوئی چنگاریاں اور زور سے بھڑک اٹھیں۔ اتنا بڑا نقصان! جیسے چاپ برداشت کر لینے کی بات نہ تھی۔ انل نے بھی یہی سوچا۔ باہر آ کر دیکھا سنسان ... کہیں سے کوئی تان اڑاتا چلا جا رہا تھا:-

" ایسی ہولی میں آگ لگے۔"

اس درد بھری چھیڑ سے مایوس دل کی بنیا۔ ٹوٹتے ہوئے تار کی طرح جھن جھنا کر رہ گئی کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ سا بھر گیا۔ پرمدا کی حالتِ زار دیکھ کر آنسوؤں کا سمندر پہلے ہی متلاطم ہو رہا تھا۔ ذرا سی جنبش ہی سے تلی ہوئی گھٹا کی طرح برس پڑا۔ جب رونے دھونے سے چھٹی ملی تو انل بن ماں کے بھائی سے پرمدا کے بارے میں صلاح مشورہ کرنے بیٹھا۔ وہ پرمدا کی خصلت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسلئے اس کی خواہش تھی کہ وہ اُسے اپنے ساتھ ہی بنارس لیتا جائے۔ وہیں بابو بڑے منکسر مزاج اور روشن خیال آدمی تھے۔ انہوں نے بڑی ہمدردی کیساتھ جواب دیا:۔ " مجھے تو ویسے کوئی عذر نہیں ہے۔ لیکن اس بارے میں ماں کی رائے لینا ضروری ہے!"

مصیبت کی ماری بڑھیا ماں نے روتے روتے کہا:۔" بیٹا! جب لال ہی کھو بیٹھی تو نصیبوں جلی بہو کو رکھ کر کیا کروں گی تم لوگ جیسا مناسب سمجھو کرو۔"

مغموم ومجبور ماں کی بات کا جواب دینا ہی مناسب سمجھ کر دونوں خاموش ہو رہے۔ دوسرے دن پرمدا کو ساتھ لیکر انل وہاں سے چل دیا۔ پرمدا ایک ایسی مرجھائی ہوئی کلی کیطرح دکھائی دیتی تھی جسے کوئی سنگدل ہاتھوں سے مل کر چھوڑ گیا ہو۔ وہ آج وہاں سے لٹ کر لوٹی تھی جہاں اس کے عزیزوں نے اُسے اپنا سب کچھ کھو دینے کے لئے ہنستے کھیلتے بھیجدیا تھا۔

وقت کے مطابق سب کی بنتی بگڑتی رہتی ہے۔ آہستہ آہستہ پرمدا اپنا رنج وغم بھولتی گئی اور انل بھی پھر انھیں رنگ رلیوں میں کھو گیا۔ راگ رنگ کی اُجڑی ہوئی محفلیں پھر گرم ہونے لگیں

(۲)

وِدُرچوبے کا پچھا ہو جانے پر اُن کی خوش سلیقہ بیوی سوشیلا نے اپنی بال بیوہ کُمدنی کو سینہ سے لگا کر بڑے حُسن انتظام سے ڈوبتے ہوئے گھر کا بار سنبھال لیا تھا۔ چوبے کی یہی اکلوتی بیٹی تھی۔ اسکی فکر میں وہ اپنی بیوگی کی ساری کلفتوں کو بھول گئی تھی۔ کمدنی کے عنفوانِ شباب کے فطری رجحان کو روکنے کی اگر دقیانوسی رسموں میں قدرت ہوتی تو تشویش کی ایسی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ لیکن اس کا حُسن ہلال کی طرح دن بدن نکھرتا ہی جاتا تھا اور اس کی تنہائی شرکت سے محروم شباب اپنی شوخیاں دکھاتا تھا۔

کمدنی کے بچپن ہی سے پرمود اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ ان دونوں کے گھر بھی

ہی پاس تھے۔ پرمود سیدھا سادہ اور بھولا بھالا لڑکا تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے کمدنی کو پڑھانے کھانے اور اس کے ساتھ کھیلنے کودنے میں دلی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ کمدنی بھی بڑے چاؤ کیساتھ پرمود کے انتظار میں گھڑیاں گنا کرتی۔ اور جب وہ آجاتا یہ کنول کی طرح کھل اٹھتی اور گر کبھی وہ کسی بات پر بگڑ جاتا تو گھنٹوں رویا کرتی!

کم نصیب ماں اس کشش کا انجام تو پہلے ہی سے سمجھے ہوئے تھی مگر اس خیال سے کہ ابھی دونوں نو عمر ہیں بڑھ کر آپ ہی آپ سنبھل جائیں گے۔ اس طرف کوئی خاص طور پر توجہ نہیں دیتی تھی۔ وہ کمدنی کے ننھے سے دل کو دکھانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس دن بڑے زور کی بارش ہوئی۔ سوشیلا بہت دیر تک چھت پر مٹی ڈالنے کے لئے بھیگتی رہی۔ رات کو اُسے حرارت ہو گئی۔ مفلس کو مجبور دیکھکر سبھی دبا لیتے ہیں۔ دوا دارو نہ ملنے کی وجہ سے مریض کی حالت دن بدتر ہوتی گئی۔

گرمی جاڑا برسات بہار اور خزاں سبھی وقت سے آتے ہیں لیکن ظالم موت کا وقت کوئی نہیں جانتا۔ بہرحال زندگی سے مایوس ہو کر سوشیلا نے کمدنی اور پرمود دونوں کو اپنے پاس بلایا آنکھوں میں آنسوؤں کا امنڈتا ہوا سمندر، سینہ میں غم و افسوس کی بھڑکتی ہوئی آگ کو دبا کر "بیٹا! تمہیں ایشور کو سونپتی ہوں۔ وہی تمہاری حفاظت کریں گے۔ اب تم دونوں سمجھدار ہو۔ کمدنی کے نصیبوں میں پہلے ہی آگ لگ چکی ہے۔ اب تمہارا اس طرح ملنا جلنا نامناسب ہے۔"

پرمود چپ چاپ کچھ سوچتا ہوا گھر سے باہر نکلا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ اپنے دل سے زیادہ پیاری کوئی چیز کہیں کھو آیا ہے۔ بیکس و مجبور کمدنی کو اس سے پہلے اتنا شعور نہ تھا۔ کچھ آئی تو اسکا دل پرایا ہو چکا تھا۔ دوسرے دن سوشیلا دنیا سے رخصت ہو گئی چوبے کے سے پرانے تعلقات تھے۔ اسلئے ماں کی دائمی مفارقت پر کمدنی انل کے اصرار پر پرمدا کے ...مینداار کے گھر آئی۔

ٌ ٌ ٌ

... دوسرت میں دوسروں کی پسند ہی اپنی خواہش کی بنجاتی ہے۔ اُسدن انل کی کوٹھی پرمدا کی ضد سے کمدنی کو بھی یہ جلسہ دیکھنے جانا پڑا۔ نشہ کی بجیسی نے انل کی آنکھوں ... دی تھی۔ شرافت و شائستگی کا رہا سہا پاس و لحاظ مشتعل جذبات کا طوفان اُڑا ... یا۔ پھر کیا تھا؟ وہ اس خوبصورت بلا پر جس کے حُسن کی رعنائیاں جنس سر بازار بنی اپنے

اپنے بے حجاب جلوؤں کو رقص کی لطافتوں میں چھپائے قدم قدم پر دعوت نگاہ دے رہی تھیں۔ یہ حسین انداز سے نثار ہو رہا تھا وہ شرمیلی آنکھوں کے دیکھنے کی بات نہ تھی۔ کمدنی ایک کونے میں سمٹی سمائی بیٹھی تھی۔ اس کا اس طرف دھیان بھی نہ تھا۔ مگر پرمدا کی آنکھیں اُدھر ہی لگی ہوئی تھیں۔ حسن کی شوخ و شگفتہ عریانیوں اور عشق کی مست و گستاخ بیباکیوں کی لگاوٹ سے پرمدا کی شباب کی لطافتوں سے محروم، نیاز عشق کی بدمستیوں سے ناآشنا معصومیت کے لطیف و پاکیزہ خوابوں کی مسرتوں میں کھوئی ہوئی حسین اور سرشار تمنائیں نادانستہ جاگ اٹھی تھیں۔ اور انل اور اس کے ساتھیوں کا وحشیانہ اشتیاق دیکھ دیکھ کر حسن و جمال کی رنگین اداؤں سے اپنی تاریک دنیا کو منور کرنے کا لالچ جوان بیوہ کو ٹھگ لینے کے لئے سنہرے جال بچھانے لگا۔

شیتل نے پرمدا کو اس سے پہلے بھی دیکھا تھا۔ مگر آج نہ جانے کیوں وہ جنت کی حور سے بھی زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اسکی پیاسی آنکھیں تجلی حسن کی ضیا پاشیوں میں چمنستان شباب میں محو گل چینی تھیں۔ اِدھر پرمدا کی دل کی دنیا میں رنگ و نور کے سینکڑوں طوفان برپا ہو رہے تھے۔ اسلئے اس نے پہلے تو یکٹک شیتل کو دیکھا پھر چوٹ کھائی ہوئی ہرنی کیطرح سنبھل کر بیٹھ گئی۔ لیکن باغی دل ہاتھ سے نکل ہی گیا۔ اور معصوم حیا کی ندامت طلب و تقاضہ کی شوخیوں کے رنگین ریلے میں خاک کے تودہ کی طرح بہہ گئی۔

جلسہ برخاست ہوا اور سب لوگ چل دئے۔ پرمدا بھی گئی۔ لیکن اسمیں اور دوسروں کی حالت میں کتنا فرق اور کتنا تضاد تھا؟ جس سوزش سے اس کے تن بدن، روح اور قلب کے روئیں روئیں میں آگ سلگ رہی تھی۔ کمدنی بھی اس کے ساتھ تھی پھر بھی اُسے اُس کی آنچ تک نہ پہنچی۔ پرمدا شباب کی حسین مگر شعلہ بار مذرتوں۔ اور جنوں آفریں راحتوں سے زبردستی محروم کردی گئی تھی۔ کمدنی کی فطرت ان جھمیلوں سے بیگانہ ہو چکی تھی کیونکہ اُس نے دیدہ دانستہ جوان آرزوؤں کو ترک و ایثار کا زہر دیکر سُلا دیا تھا۔

پرمدا کو اس رات کوشش کرنے پر بھی نیند نہ آئی۔ دن نکلتے ہی وہ باغ میں تالاب پر نہانے چلی گئی۔ پرمدا بھیگی ہوئی ساڑی میں اپنے مست و مسرور۔ سرکش و گستاخ شباب کو چھپائے لوٹی آ رہی تھی۔ اس کی کالی اور لمبی زلفوں کے جال سے ٹپکتی ہوئی پانی کی بوندیں سورج کی نورانی شعاعوں سے منور ہو کر سنہری موتیوں کی طرح جھڑ رہی تھیں۔ شیتل

بھی باغ ہی میں تھا۔ اُس نے پرمدا کو جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ صرف اُسے اپنی موجودگی سے مطلع کرنے کے لئے گانے لگا :۔

"گر گئی رے مورے ماتھے کی بندیا"

شیتل کی کوئل جیسی میٹھی آواز پرمدا کے کانوں میں چلتے ہوئے تیر کی طرح پہنچی۔ اُس نے پھر کر دیکھا اور غضب آلود آنکھوں سے اس کے گناہ گار دلبر جلال حُسن کی چنگاریاں برساتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔ شیتل کی شیریں بیانی نے اس کے دل میں جو چرکہ لگایا تھا اُس سے اس کا جسم اور سارا کمرہ جل رہا تھا اور وہ اسے اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔ جب شیتل سوکھے منھ سے پچھتاوے کا بہانہ لئے اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور لجاجت سے پرمدا کا ہاتھ پکڑ کر رحم و کرم "کی بھیک مانگنے لگا۔ تو بیکس ابلا کا مجبور دل ٹوٹ ٹوٹ ہو کر کے رونے لگا اور اس کی خودداری اس کی دوشیزگی کا ماتم کرنے کے لئے شیطان کے سامنے مغلوب ہو کر جھک گئی۔ اسکی روح کی بغاوت اس کے ضمیر کی ندامت اور اس کے ارادہ کی پاکیزگی سب کی سب شیتل کے عالمگیر تپش سے جھلس کر رہ گئیں۔ اس کے مضمحل جسم کی اُداسی اور آنکھوں کے اُتار چڑھاؤ سے پہلے ہی سے اس کے دل کی کمزوری مترشح تھی۔ اب یکایک موقعہ پاکر نسوانی رحم کا چشمہ پورے زور کیساتھ اُبل پڑا۔ پرمدا ۔ ناقابل بیان شیرینی اور بیان ناممکن التشریح حلاوت گھول کر بولی :۔ "جس بیدردی سے تم نے میرے مجروح دل کو پاش پاش کر دیا ہے۔ اگر اُسے جانتے تو سمجھ سکتے کہ کتنے دنوں کی گھٹا ٹوپ خشک سالی کی آگ میرے دل میں شعلہ زن ہو رہی ہے ......"

عشق و ہوس کی ہوائے سرد کے موافق جھونکوں سے بیخود و بدمست ہو کر شیتل نے ایک دوشیزہ کی فطری شرم و حیا کو جس گرمجوشی سے مسل ڈالا اس کے تپش اضطراب سے تڑپ کر اس کے ضمیر نے موت کے منھ سے بچ نکلنے کی آخری کوشش کی، عورت کی فطرت، اسکی حیا اور معصومیت نے گناہ کی مہیب گرفت سے چھٹکارا پانیکے لئے فیصلہ کن جنگ کی۔ غیرت نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ لیکن مجبور و مسحور دل نے غدّاری کی اور بھاگنے کا موقع ملنے پر بھی پاؤں پکڑ لئے۔ پاکبازی و پارسائی کی محافظ شرافت مرگِ ناگہان کا شکار ہو گئی۔ اور اس کے بعد ؟ ــــ اس کے بعد گناہ کی مسرتوں کا جھوٹا انکار آنسوؤں کی صورت میں نمایاں ہو گیا۔ جب کسی طرح بس نہ چلا تو پرمدا نے بھی تشنہ روح کی پیاس سے بیتاب

ہوکر شرابِ شوق کی حلاوتوں سے لذت آشنا ہونے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ دنیا کی اور سب باتوں کی طرح یہ سلسلہ بھی بہت دنوں تک پوشیدہ نہ رہ سکا۔ یہ کرتوتیں شنیل کی بہن نے بھی دیکھیں اور کمدنی نے بھی لیکن دونوں کے خاموش رہنے کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی ضرور تھی۔

(۳)

اور چاہے جو ہو مگر پرائی روٹیاں کھانا بڑا مشکل کام ہے۔ کمدنی بھی زمیندار کے گھر آکر یہ بات اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اسلئے سارا گھر کا کام کاج اُس نے اپنے سر پر اوڑھ لیا۔ ویسے تو اس کی عمر اس قابل نہ تھی کہ اتنے بڑے گھر کا بار اٹھا سکتی وہ بھی ناز و نعم کی پالی ہوئی تھی! لیکن بُرے دن سب کرا لیتے ہیں۔ کھانا بنانا، کھلانا پلانا، نوکروں کی دیکھ بھال کمدنی سبھی کچھ کرتی۔ اُس دن انل بہت رات گئے لوٹا۔ گھر کے سب لوگ سو چکے تھے۔ اسلئے کمدنی ہی کو تھالی لیکر جانا پڑا۔ انل کی آنکھ نجانے کب سے اُس پر لگ رہی تھی۔ موقع پاکر اُس نے کمدنی کے سامنے اپنا دل کھولکر رکھدیا۔ کمدنی پر انل کی نگاہِ التفات مصیبت کا پہاڑ بنکر ٹوٹ پڑی۔ اس کے غم و غصہ کی انتہا نہ رہی۔ آنکھوں میں خون کا کھولتا ہوا سمندر امنڈ آیا۔ انل کے لئے یہ ایک نئی بات تھی۔ اسے کمدنی کے اس خلافِ توقع برتاؤ پر بڑی حیرت ہوئی۔ ابتک تو کبھی کسی نے ایسی جرأت نہ کی تھی۔ پھر عورت اور حیوانات میں جو فرق ہے وہ انل سمجھ بھی سکتا تھا؟ کمدنی کے آغازِ شباب کی مستیوں نے اُسے پہلے ہی دیوانہ بنادیا تھا یہ خیال کہ ایک محتاج و لاوارث بے دست و پا لڑکی کا یہ حوصلہ! یہ ہمت؟ کمدنی کی ناسپاسی و احسان فراموشی دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہوگیا۔ کتنی سی بات تھی؟ جس کے لئے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر گئی! لیکن یہ بات کمدنی کے لئے کتنی بڑی بات تھی انل اسکو کچھ نہ سمجھ سکا۔ ڈری سہمی ہوئی کمدنی اس سے بچنے کے لئے ہاتھ پیر مارنے لگی۔ لیکن جب انل کی ناشائستگی حد سے سوا ہوتی گئی تو کمدنی بھی ایکبار پاؤں سے دبی ہوئی ناگن کی طرح مچل کر سنبھل گئی! اور اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے زور سے دھکا دے کر پیچھے ہٹ گئی۔ بیخود و متوالا انل لڑکھڑا کر زمین پر آرہا۔ اس کا سر چوکھٹ سے ٹکرا کر لہولہان ہوگیا۔ کمدنی یہ دیکھ کر تنکے کی طرح تھرتھرانے لگی۔ جب ذرا حواس ٹھکانے ہوئے اور تمام باتیں آنکھوں کے سامنے آئیں تو وہ بیکسوں کے مددگار کو شاہد کرکے اپنی جان سے زیادہ عزیز عصمت کی حفاظت کیلئے پرمود کے گھر کیطرف بھاگی

دوسرے دن پتہ چلنے پر انل شیتل وغیرہ کو لیکر پرمود کے گھر آ دھمکا۔ اور اپنی بیحیائی کے لئے اُسے سزاوار سمجھ کر ہدفِ ملامت بنانے لگا۔ لیکن چاندہ میں داغ لگانے کی یہ تمام کوشش فضول گئی۔ پرمود نے اس کی یادہ گوئی پر کان تک نہ دیئے۔ آخر انل بک جھک کر آپ ہی چلا گیا۔ جسوقت انل پرمود پر جھوٹا الزام تھوپ کر نفرین کر رہا تھا۔ کمدنی سمٹی سمائی بیٹھی اپنی پھوٹی قسمت کو رو رہی تھی۔ اور اس کے آنسوؤں کے تار سے نگاہوں سے دور۔ پرطوفان آسمان کی لاانتہا پنہائیوں میں تاریکی گناہ کے دل بادل اُمنڈے چلے جا رہے تھے۔

مدن مراری شرما آجکل کے پنڈتوں کی طرح نہ تھے۔ اُنہوں نے دنیا دیکھی تھی۔ انل کی شرارت، پرمود کی بے گناہی اور کمدنی کی بے بسی انکی دوررس نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہی۔ اُنہوں نے دونوں کو بہت کچھ سمجھایا بجھایا کمدنی اسیوقت کہیں دور چلی جانے کے لئے مُصر تھی۔ لیکن پرمود کسی طرح اسپر راضی نہ ہوتا تھا۔ مدن مراری پرمود اور کمدنی کے دل کا حال بھی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس لئے زبان دبا کر بولے:۔ "بیٹی! سوچو تو سہی۔ کس طرح تمہاری حفاظت ہو سکے گی؟ انل کے ان جھوٹے الزامات کے داغ دھبے دامن سے بچنے کی کیا صورت ہے؟ گندی اور اندھی دنیا کے سامنے تمہاری کون سنے گا؟ کسے تمہاری بے گناہی پر اعتبار آئیگا؟ خود اپنے تجربہ سے سبق لو کیا سماج کے بھوکے شکاری کو اپنی حفاظت کا بار سونپ کر تم کبھی مطمئن رہ سکو گی"؟

کمدنی کو چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی تھی۔ ایک سرد آہ بھر کر اس نے کہا:۔ "کیا اس وسیع دنیا میں صبر و سکون کیساتھ سانس لینے کے لئے ایک مجبور و بیکس بیوہ کو تل بھر جگہ بھی نہیں مل سکتی"؟

پرمود کا نازک و مجروح دل کسی برقی رو کے چھو جانے سے کانپ کر رہ گیا۔ بوڑھے پنڈت نے بھی ملول ہو کر کہا:۔ "ایسی کوئی بات نہ ہونے پر بھی ایک طرح سے تمہارا کہنا ہی ٹھیک ہے۔ اُف! ہمارے سنگدل سماج کے آتشکدے میں نہ جانے کتنی معصوم ابلائیں جل کر خاک ہو چکی ہیں۔ پھر بھی ہمارے گندم نما جو فروش اور شہرت طلب رہنماؤں کی جو حالت ہے ظاہر ہے"۔

کُمدنی آنکھوں میں آئے ہوئے زبردست طوفان کو روکتے ہوئے آہستہ سے بولی:۔ "بھگوان! ہندو عورت اگر آبرو کیساتھ زندہ نہیں رہ سکتی تو اپنی شرم کی حفاظت کے لئے مر تو سکتی ہے؟ میں بھی عورت ذات ہوں۔جان دینا بھی جانتی ہوں۔ اور کچھ نہیں تو اس ظالم سماج کی توقیر و تشفی کے لئے اتنی قربانی ضرور کر سکوں گی ۔۔۔۔"

پنڈت جی کا چہرہ غرور و مسرت کے نشہ سے تمتما اُٹھا۔ سنبھل کر بولے:۔ "یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے حفاظت کہاں ہوئی؟ اگر حفاظت کا یہی مطلب ہے تو ہندو قوم کے مٹ جانے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ پھر جان دے دینا ہی تو ہمت و شجاعت کی آخری منزل نہیں ہے۔ بیٹی! اندھے سماج کی بہتری و بہبودی کے لئے کوشش کرنے ہی سے تمہارا بھلا ہوگا۔ اس کے علاوہ اس زندگی پر تمہارا اختیار ہی کب ہے؟۔ پرائی دی ہوئی چیز کو مٹا دینا کس مذہب میں جائز ہے؟ ایسا خیال کرنے سے بھی گناہ ہوتا ہے۔ صرف ذرا سی ہمت کرو۔ مایوس ہونیکی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہوگا وہ بالکل شاستروں کے مطابق ہے۔ اس میں کہیں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اسبارے میں دنیا کے ٹھوکنے کا بھی اندیشہ نہیں ہے۔ پھر برادری کی رضامندی کا بار میں اپنے سر لیتا ہوں۔"

کمدنی چپ چاپ بیٹھی سوچتی رہی۔ اُسے اپنی ماں کی آخری نصیحت یاد آئی۔ پھر پرمود کی بے لوث محبت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔

مدن مراری نے پھر کہا:۔ "بیٹی! کیا اب بھی کوئی اعتراض ہے؟ ایک بار پرمود کی طرف دیکھ کر بتاؤ کیا اس کی مسرت و شادمانی کی حسرت تمہیں کبھی بے چین نہ کریگی؟ تمہاری کم ہمتی سے اسکی زندگی تباہ اور اسکی دنیا اُجاڑ ہو سکتی ہے۔ میں تم سے پرمود کی مسرت و کامرانی کی بھیک مانگتا ہوں۔"

کمدنی کے عزم و ارادہ میں اسبار ایسا دھکا لگا کہ اس کے صبر و تحمل کے باندھ ٹوٹ کر رہ گئے۔ اور اس کے خیالات کے سمندر میں ایسا خوفناک طوفان آیا کہ اُس نے اپنی بے کیف زندگی کو پرمود کی عشرت و شادمانی کی رنگین موجوں میں گم کر دیا ۔۔۔۔۔ یہی عورت کی فطرت اور عشق کی حقیقی معراج ہے۔!

جسدن کمدنی اور پرمود کے دل دنیا کی نگاہ میں لافانی محبت کے مضبوط رشتہ میں بندھے جارہے تھے۔ اُسی دن پرمدا اور شیتل اپنے گناہ کا بھاری بوجھ لئے بنارس چھوڑ کر نجانے کہاں

چلے جا رہے تھے۔ گھر گھر ان کی بے حیائی کا چرچا ہو رہا تھا۔ لیکن کمدنی کے کانوں میں اس کو اس کی بجائے ایک پرانا گیت رہ رہ کر گونج رہا تھا:-

"مل گئی رے مورے ماتھے کی بندیا!"

قدرت کا انتقام کتنا زبردست ہوتا ہے: اب ان کی آنکھیں اچھی طرح کھل گئیں۔ بیوقوف ہاتھ ملنے کے سوا اور کر کیا سکتا تھا؟ اسکی روح کو جو چوٹ پہنچائی گئی تھی اس کا انتقام لینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ غم ندامت سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ لیکن کمدنی کے معصوم حیا کی گلابی سرخی سے رنگیں و حسین چہرہ پر "ماتھے کی بندیا" نے چار چاند لگا دئے تھے!

نمازِ جمال

از مولوی فضل الدین صاحب اخگر بی۔ اے

ہوتی ہے محویت جو نمازِ جمال میں
سو عرش جھومتے ہیں فضائے خیال میں

ممکن ہے پھر یہ لمحۂ صبر و سکون نہ آئے
رنگِ دوام بھر مری تصویرِ حال میں

دو عمر اے تصور جاناں تری دراز!
انگڑائی لے رہی ہے جوانی خیال میں

یہ چیز اب برتنے کے قابل نہیں رہی
دنیا کو غرق کر مرے جامِ سفال میں

اے آشنائے راز سے خودداریاں فضول!
تم بن بلائے آئے ہو اکثر خیال میں

ظرفِ نظر میں ہمتِ پروانہ چاہیئے
ہم لاکھ بار آئیں گے بزمِ جمال میں

اللہ رے کرم کی معاصی نوازیاں!
موتی پرو دئے نگہ انفعال میں

انکا وجود حاصلِ ایجادِ کائنات
وہم و خیال ہوں تو وہ آئیں خیال میں

موضوع جنکے سامنے بیٹھا ہوا ہو تو،
اور میں غزل پڑھوں تری بزمِ جمال میں

ممکن نہیں مجاز و حقیقت کا امتیاز
تم ہو خیال میں تو جہاں ہے خیال میں

زندہ سا ایک شعر، تڑپتی سی ایک نظم
شاعر جبال میں! ترے شاعر جمال میں!!

کچھ فرق ہو تو ان کو بتاؤں میں اے اثر
بجلی کے اضطراب میں اور دل کے حال میں

لطفِ سخن

از پنڈت آنند نرائن ملا - ایم - اے - ایل ایل بی

عمر کے دریا کے دریا بہ گئے — ہم جہاں ڈوبے وہیں پر رہ گئے
آپ سے آنکھیں ملا کر رہ گئے — چاہتے تھے چپ رہیں اور کہہ گئے
تم نے چھیڑا ہی نہ سازِ التفات — مرے نغمے دل ہی دل میں رہ گئے
خوفِ عقبےٰ اور غمِ دنیا کے بعد — وہ بھی سہہ لیں گے جب اتنا سہہ گئے
میکشوں نے پی کے توڑے جامِ مے — ہائے وہ ساغر جو رکھے رہ گئے
پھول بہتر ہے یہی چن لے کوئی — سوکھ کر ڈالی پہ کتنے رہ گئے

(از جناب جیوا دسیرٹھی)

روانی دیکھ کر تیغ قضا کی — کھنچی ہے تیغ ابرو کس بلا کی!
نہ سنبھلا حالِ دل مرضی خدا کی — ہزاروں منتیں مانیں۔ دعا کی
بہا مقتل میں جب خونِ تمنّا — مہک آنے لگی بوئے حنا کی
اُڑا لاتی ہے سوئے زلفِ پُر خم — ذرا چالاکیاں دیکھو صبا کی
اُلجھ جاتی ہے زلفِ پر شکن سے — ذرا گستاخیاں دیکھو صبا کی

(جذباتِ سروش)

یارب اگر جہاں میں عیش کی جا نہیں نہ ہو — صدمۂ رنج و غم سے دل میرا کبھی حزیں نہ ہو
راہِ وفا میں ہمنشیں دل کی یہی مراد ہے — سنگِ درِ حبیب سے دور میری جبیں نہ ہو
جینا وہ جینا کیا ہی جو موت کے ڈر سے موت ہو — موت وہ موت کیا ہی جو زندگی آفریں نہ ہو
لذتِ وصل کیلئے مضطر ہے اے پتنگ کیا — لذتِ وصل ہی تری دشمنِ جاں کہیں نہ ہو
کوچۂ ذوق و شوق میں اتنا بلند ہو کے چل — مانعِ جادۂ طلب گنبدِ نیلمیں نہ ہو
فکرِ مآلِ کار میں شانِ بشر کا راز ہے — کاش کہ پھوٹ جائے وہ آنکھ جو دور بیں نہ ہو
سخن حق کا نام ہی شاعری اے سروش ہو
شاعر وہ کفر گو ہے جو راہنمائے دین نہ ہو

زمانہ

جلد ۶۶ — جون سنہ ۱۹۳۶ء — نمبر ۶

لکھنؤ سے خطاب

(از حضرت وصل بلگرامی)

(یہ دلآویز و سبق آموز نظم انجمن بہار ادب لکھنؤ کے ادبی جلسہ میں جو عالیجناب سر سیتارام صاحب بہادر بالقابہ پریسیڈنٹ قانونی کونسل صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کی صدارت میں رفاہ عام کلب لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا پڑھکر سنائی گئی تھی اڈیٹر)

اے صدرِ بزم! اے سببِ افتخارِ بزم! اے شمعِ بزم! آئینۂ اقتدارِ بزم!
اے حاضرینِ بزم! شکوہ و وقارِ بزم اے نازشِ بہارِ ادب! اے بہارِ بزم!
اس سے زیادہ آپ کو ذوقِ ادب ملے
جو کچھ ہے کائنات میں وہ سب کا سب ملے

ارشاد ہو، تو اپنا فسانہ سناؤں میں جذبات اپنے نظم کے قالب میں لاؤں میں
پھر منزلِ حیات کے نزدیک آؤں میں جو کچھ ہے رازِ زندگیِ دل، بتاؤں میں
حسنِ خلوص، حرفِ شکایت کے ساتھ ہو
شکوہ بھی ہو اگر، تو محبت کے ساتھ ہو

روئے سخن ہو عام، خطابت بھی عام ہو شہرت سے ہو غرض، نہ نمائش سے کام ہو
کوئی تکلف، اور نہ کوئی اہتمام ہو ہر شعر واقعات کا رنگین جام ہو
کیوں الجھوں ناشناسِ شراب و سبو سے میں کہنا جو ہے، وہ کیوں نہ کہوں لکھنؤ سے میں

اے لکھنؤ بہارِ ادب!! بوستانِ ہند!! — اے لالۂ شگفتہ و روحِ روانِ ہند!
اے تاجِ سدارِ علم! امیرِ زبانِ ہند — خاموش کیوں ہے؟ اے جرسِ کاروانِ ہند!
یادش بخیر، اوجِ سرِ لامکاں تھا تو!
دنیا زمینِ علم تھی، اور آسماں تھا تو!

تو، شہریارِ کشورِ ہندوستاں بھی تھا — جانِ ہنر، ادب کی تو روحِ رواں بھی تھا
اُردو پہ فتحیاب بھی تھا، حکمراں بھی تھا — دلّی کی طرح، مرکزِ اہلِ زباں بھی تھا
تیری زباں میں چشمۂ صد انگبیں بھی تھا
تو حاملِ ترانۂ روح الامیں بھی تھا

کتنے تری نگاہ نے کامل بنائے تھے — کانٹے، چمن کے مدِّ مقابل بنائے تھے
تو نے، درونِ بحر بھی ساحل بنائے تھے — کتنے نئے دماغ، نئے دل بنائے تھے
تھیں علم کی صفیں، ترے ایواں کے سامنے
پریاں ہوں، جیسے تختِ سلیماں کے سامنے

تیرا، وہ دورِ فضل بھی کیا کامیاب تھا — جب زندگی کی بزم میں تو باریاب تھا
جو ذرّہ تھا، وہ اپنی جگہ آفتاب تھا — تو، تو عروسِ علم و ادب کا شباب تھا
تیری ہر اک صدا تھی، ترنّم لیے ہوئے
ہر خار تھا، کلی کا تبسّم لیے ہوئے

خوشبوئیں تیری پھیلی ہوئی تھیں چمن چمن — ڈوبے تھے تیرے رنگ میں، نسرین و نسترن
پاتے تھے پرورش ترے حجروں میں علم و فن — اب تک ہیں یاد، وہ ترے تیور، وہ بانکپن،
پارینہ انجمن[1] کا فسانہ بھی یاد ہے
معیار کے وہ دن، وہ زمانہ بھی یاد ہے

اُس انجمن کا حسن، ابھی تک نظر میں ہے — بیٹھا ہوا وہ تیر، ابھی تک جگر میں ہے
ابتک ضیا اُسی کی، دلِ باخبر میں ہے — ابتک وہ شمع، حلقۂ اہلِ نظر میں ہے
آئی وہ پھر "معینِ ادب"[2] بن کے سامنے
خیرہ تھی ہر نظر، رخِ روشن کے سامنے

---

[1] انجمن معیار الادب سے مراد ہے۔ [2] انجمن معین الادب سے مراد ہے۔

ہر اک طرف سے اُسکی ہوئیں قدردانیاں　　اِس[1] بزم میں بھی آج ہیں اُسکی نشانیاں
اب اُسکی داستانیں ہیں، بھولی کہانیاں　　اب اُس کے تذکرے ہیں، کہ ہیں نوحہ خوانیاں

اِک اور انجمن نظر آئی تھی شان سے
معراج[2] ادب نے پائی تھی کس آن بان سے

ظاہر ہوئی "بہار ادب[3]" کی بہار بھی　　اپنی جِلو میں لے کے گُل و برگ و بار بھی
پُرکیف ہوگیا، دلِ اُمیدوار بھی　　لے لے کے اپنے جام، بڑھے بادہ خوار بھی

کچھ دن تو، خوب دورِ شراب کہن رہا
جوش و خروش نغمۂ چمن در چمن رہا

جلوے نئے دکھاتے رہے انجمن میں جام　　چلتے تھے رنگ رنگ کے، بزمِ سخن میں جام
دیکھا، تو پھول پھول لئے تھا، چمن میں جام　　گردش کناں رہے، نگہِ اہلِ فن میں جام

لیکن یہ انجمن نہ کسی طرح جم سکی
طوفان کے تھپیڑوں میں کشتی نہ تھم سکی

پھر کیا تھا، اک جمود کا عالم تھا ہر طرف　　بیزاریوں کا، پھر وہی ماتم تھا ہر طرف
چھایا ہوا گھٹا کی طرح، غم تھا ہر طرف　　ذکرِ مزاج کاکُل برہم تھا ہر طرف

تدبیر، زندگی کا سہارا نہ ہو سکی
شرکت بھی انجمن کی گوارا نہ ہو سکی

اب پوچھیئے، "بہارِ ادب" کا ہے حال کیا؟　　کہیئے تو، ہونے والا ہے اُس کا مآل کیا؟
سُونی رہے گی خلوتِ حسنِ خیال کیا؟　　مڑ کر بھی اب نہ دیکھیں گے اہلِ کمال کیا؟

کیا، انجمن کا نام، نہ باقی رہے گا اب؟
کیا، کوئی بادہ نوش، نہ ساقی رہے گا اب؟

کیا اب بھی کوئی ہوگی نہ تصنیف انجمن؟　　دیکھیں گے کیا، نہ ایک بھی تالیفِ انجمن؟
گونجا کرے گی کانوں میں تعریفِ انجمن؟　　ہوگی مشاعروں ہی میں توصیفِ انجمن؟

دیگی جواب کیا، نگہِ منتظر کوئی
افسوس لکھنؤ کا لغت تک نہیں کوئی

---

[1] مراد اُس ۱۲ مارچ ۳۶ء کے جلسہ سے ہے جس میں یہ نظم پڑھی گئی۔ [2] انجمن معراج الادب سے مراد ہے۔
[3] موجودہ انجمن بہار ادب لکھنؤ سے مراد ہے۔

اے لکھنؤ! یہ حال ترا ہو گیا ہے کیا؟ سرمایۂ حیات ترا، کھو گیا ہے کیا؟
سینے سے تیرے ذوق، کوئی دھو گیا ہے کیا؟ اب حشر تک کے واسطے تو سو گیا ہے کیا؟
اوجِ اُفق پہ غلغلہ ہے آفتاب کا
بیدار ہو کہ وقت نہیں ہے یہ خواب کا

کیوں اُس اداسے جام میں ڈھلتی نہیں شراب بننا تو کیا، سبو سے نکلتی نہیں شراب
پہلو، صراحیوں میں بدلتی نہیں شراب بوتل بھی کھول دیں، تو اُبلتی نہیں شراب
اب میکدے میں دھوم، نہ جوش و خروش ہے
"اِک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے"

دنیا پہونچ گئی ہے کہاں سے کہاں تک اب اُس کا گزر زمین سے ہے آسماں تک اب
جانے ہی کو فلک سے ہے وہ لامکاں تک اب پرواز کا ملے گا نہ اُس کی نشاں تک اب
تجھ کو سُنا رہا ہوں، یہ سننے کی بات ہے
قبضے میں جدّ و جہد کے، کُل کائنات ہے

ہر دل میں موجزن ہے، ترقی کی آرزو ہر آنکھ کو ہے آج، تجلّی کی آرزو
ہر قلب، ہر نفس کو، تشفّی کی آرزو ہر نَے کو ایک طرفہ مغنّی کی آرزو
جذبات کو ہے حافظِ شیراز کی تلاش
ہر سامعہ کو، غیب کی آواز کی تلاش

اب بھی ہے اس کا کچھ تجھے احساس، یا نہیں؟ باقی ہیں کچھ حیات کے انفاس، یا نہیں؟
پھولوں میں تیرے اب بھی ہے بُوباس، یا نہیں؟ کچھ غیرت و حیا ہے ترے پاس، یا نہیں؟
ہشیار ہو، کہ وقت ہے یہ، پُرخطر ترا
رکھا ہوا ہے موت کے زانو پہ سر ترا

کیا تجھ کو ہو گیا ہے، سنبھلتا نہیں ہے کیوں؟ یہ بے حسی کا رنگ، بدلتا نہیں ہے کیوں؟
فاسد جو خون ہے، وہ نکلتا نہیں ہے کیوں؟ نشترِ رگِ جمود پہ چلتا نہیں ہے کیوں؟
کیوں بزمِ نا و نوش میں آتا نہیں ہے تو؟
یہ وقت، اور ہوش میں آتا نہیں ہے تو؟

اے سونے والے! اُٹھ، رُخِ فتح و ظفر دکھا میدانِ کارزار میں اپنا ہنر دکھا
سیفِ قلم کا جوششِ دل سے اثر دکھا دنیائے علم و فن کو، نئی رہ گزر دکھا
طوفاں ترقیوں کا بپا ہو، وہ کام کر
تو باکمال ہو کے، زمانے میں نام کر

اُستاد تو نہ بن، کبھی ایسی خطا نہ کر شاعر بن، اور اس کا کبھی اِدّعا نہ کر
صرف اِک غزل کے کہنے پہ تو اکتفا نہ کر اس طرح، ذوقِ شعر کو ہرگز فنا نہ کر
ہر صنفِ شاعری میں تو پیدا کمال کر
حاصل متاعِ زندگیٔ لازوال کر

اُستاد بن کے، صاحبِ نخوت نہ بن کبھی اُستاد بن کے، طالبِ شہرت نہ بن کبھی
اُستاد بن کے، بزم کی زینت نہ بن کبھی اُستاد بن کے، رہنِ قدامت نہ بن کبھی
شاگردوں کو، نہ باعثِ شہرت کبھی سمجھ
اِس ننگ کو، نہ موجبِ عزت کبھی سمجھ

مطلب نہیں ہے یہ کہ غزل ہی کہی نہ جائے یعنی، شرابِ عشق و محبت ہی پی نہ جائے
ایسی یہ شے ہے اس پہ توجہ ہی کی نہ جائے یہ راستہ ہی بند ہو، اس پر کوئی نہ جائے
اُستاد کا لغت میں، کہیں لفظ ہی نہیں
یا، ہے لغت میں لفظ، تو معنی کوئی نہیں

حاشا، مری غرض یہ نہیں، مدعا نہیں کیونکر کہوں، غزل کا کوئی مرتبا نہیں
کیونکر کہوں، غزل سے کوئی فائدا نہیں کیونکر کہوں، غزل میں کوئی ارتقا نہیں
کیونکر کہوں، ضرورتِ اُستاد ہی نہیں
تحصیلِ علم کی کوئی بنیاد ہی نہیں

میں مانتا ہوں یہ کہ غزل ہے زبانِ عشق یہ گفتگوئے حُسن ہے، یہ ہے بیانِ عشق
یہ ہے فسانہ حُسن کا، یہ داستانِ عشق یہ ہے تمام حُسن، یہ روحِ روانِ عشق
اُستاد کے بغیر، ہنر آئے، یہ محال
بے روشنی کے، کچھ بھی نظر آئے، یہ محال

لیکن، میں کیا کروں، کہ زمانہ بدل گیا مفروضۂ حُسن و عشق کا کس بل نکل گیا

دورِ جدید آکے، نئی چال چل گیا   اب، وہ قدیم طرز، وہ رنگِ غزل گیا

استاد کا وقار، دلوں میں نہیں رہا

پہلا سا اعتبار، دلوں میں نہیں رہا

اب، وہ غزل میں، ذکرِ جفائے بتاں نہیں   نالے نہیں، وہ آہ نہیں، وہ فغاں نہیں

وہ تیلیے، وہ چمن نہیں، وہ آشیاں نہیں   وہ برق، وہ چمک نہیں، وہ آسماں نہیں

اُستاد کا وہ ناز، وہ پندار اب نہیں

شاگرد کا وہ رنگ، وہ معیار اب نہیں

اب وہ حنا نہیں، وہ ہتھیلی نہیں کہیں   وہ ناگنیں نہیں ہیں، وہ چوٹی نہیں کہیں

وہ بکھرے بال، اور وہ کنگھی نہیں کہیں   وہ یاد، وہ خیال، وہ ہچکی نہیں کہیں

اب وہ رگوں کا کھینچنا، وہ مدفن نہیں رہا

پوشیدہ مال، اور وہ جوبن نہیں رہا

میّت نہیں رہی، وہ جنازا نہیں رہا   تعبیر میں، وہ خواب زلیخا نہیں رہا

موسیٰ کے ذکر میں، ید بیضا نہیں رہا   ایمن میں، بجلیوں کا تماشا نہیں رہا

لیلےٰ کے ساتھ، قیس نہ محمل ہے آجکل

قاتل کوئی رہا ہے، نہ بسمل ہے آجکل

پہلی سی، اب، وہ آگ کہاں، وہ شرر کہاں   وہ طور، وہ کلیم کہاں وہ نظر، کہاں

وہ دل کہاں، وہ قلب کہاں، وہ جگر کہاں   صندل کے ساتھ ساتھ، وہ اب دردِ سر کہاں

معدوم جو ہو، آج وہ نازک کمر نہیں

وہ کوہ قاف، اور وہ پریوں کا گھر نہیں

اب، وہ چھری نہیں ہے، وہ تلوار اب نہیں   معشوق کوئی ظالم و خونخوار اب نہیں

بوسوں کا سائل اور خریدار اب نہیں   عاشق نحیف و لاغر و بیمار اب نہیں

وہ شیخ جی سے چھیڑ، وہ اب پھبتیاں کہاں

مرغ سحر کا شور، صدائے اذاں کہاں

فرضی شباب کی، وہ اب انگڑائیاں نہیں   وہ چلتی پھرتی وہم کی پرچھائیاں نہیں

اب وہ لحد، وہ قبر کی تنہائیاں نہیں   وہ ظاہری خیال کی گہرائیاں نہیں

استاد کا وہ زعم، وہ اصلاح اب کہاں
شاگرد میں وہ قدر، وہ حفظِ ادب کہاں

اب، وہ محاورات کی کثرت نہیں رہی ‎ ‎ امثال کی بیان میں حاجت نہیں رہی
خاموشی، نبضیں، نزع کی حالت نہیں رہی ‎ ‎ اِن چیزوں کی غزل کو ضرورت نہیں رہی

استاد کا تخیّلِ ناسور، اب کہاں
وہ زخم خوردہ عاشقِ مجبور، اب کہاں

وہ قرض کی شراب، وہ ناداریاں کہاں ‎ ‎ تلچھٹ کا وہ سُرور، وہ سرشاریاں کہاں
وہ روسیہ رقیب کی مکّاریاں کہاں ‎ ‎ ہر وقت دلبروں کی دل آزاریاں کہاں

اب، وہ حدیں، وہ گورِ غریباں نہیں کہیں
وہ سازِ مرگ و تارِ رگِ جاں نہیں کہیں

اگلے مشاعروں کی وہ صحبت بھی یاد ہے ‎ ‎ صف بندیوں کا زور، وہ قوت بھی یاد ہے
تحسینِ ناشناس کی رغبت بھی یاد ہے ‎ ‎ "آداب عرض ہے" کی نزاکت بھی یاد ہے

بھولا نہیں ہے خندۂ پنہاں کا، وہ سماں
اب بھی نظر میں ہے رُخِ تاباں کا، وہ سماں

اک ایک شعر پر، وہ تفاخر، وہ نازشیں ‎ ‎ اُن کے سنوارنے میں، وہ محنت، وہ کاوشیں
تعریف کی، ہر ایک طرف سے، وہ بارشیں ‎ ‎ پھر بھی، وہ بار بار ستائش کی خواہشیں

پہلے تو پیش طرح سے، محفل کو خوش کیا
سہ غزلہ کہہ کے طرح میں، پھر دل کو خوش کیا

یہ اگلی صحبتیں تھیں، غزل کا یہ حال تھا ‎ ‎ الفاظ کا بچھا ہوا ہر سمت جال تھا
مختل دماغ، اور پریشاں خیال تھا ‎ ‎ یہ شاعری تھی، اور یہ اُس کا مآل تھا

وہ وقت اور تھا، وہ زمانہ ہی اور تھا
وہ قصہ اور تھا، وہ فسانہ ہی اور تھا

تھی اصل بات یہ، ترا دورِ سخن تھا اور ‎ ‎ ترے عنادل اور تھے، ترا چمن تھا اور
ترا اسیرِ زلف شکن در شکن تھا اور ‎ ‎ ترا سبو و جامِ شرابِ کہن تھا اور
ترا مذاق اور تھا، انداز اور تھے ‎ ‎ نغمے ترے جُدا تھے، ترے ساز اور تھے

مجبور ہو گیا تھا، فضائے زمانہ سے — معذور ہو گیا تھا، ہوائے زمانہ سے
محصور ہو گیا تھا، ادائے زمانہ سے — مسحور ہو گیا تھا، نوائے زمانہ سے
جذبات تیرے دل کے اُبھرنے نہ پاتے تھے
جلوے تری نظر میں ٹھہرنے نہ پاتے تھے

پھر بھی عیاں ہے سب پہ تری فیض گستری — اب بھی ہیں قدرداں ترے جوہر کے جوہری
مانا، کہ اعتراض سے تو بھی نہیں بری — اے مایہ دارِ حسن و جمالِ سخنوری!
"سُن تو سہی، جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا، غائبانہ کیا؟"

تیرے قدیم رنگ پہ چیں بر جبیں ہیں سب — تخئیل ما سبق پہ تری، نکتہ چیں ہیں سب
اگلے مذاقِ شعر سے تیرے، حزیں ہیں سب — خود اہلِ لکھنؤ، ترے قائل نہیں ہیں سب
اُن کو، وہ طرز اور وہ تخئیل نہیں پسند
فرضی فسانۂ گل و بلبل نہیں پسند

کہتے ہیں جس کو شعر، ہے تفسیر زندگی — الفاظ کے لباس میں، تصویر زندگی
اُتری ہوئی دماغ سے، تنویر زندگی — طرزِ بیاں کے دام میں تاثیرِ زندگی
آورد کی، نہ قصۂ باطل کی بات ہے
کہتے ہیں جس کو شعر، فقط دل کی بات ہے

اب تو غزل میں، بادۂ عرفاں ہے موجزن — اب تو غزل میں، شمعِ حقیقت ہے ضوفگن
اب تو غزل ہے، نازشِ اصحابِ علم و فن — اب تو غزل ہے، وجہِ طرب، نغمۂ سخن
جذبات دل کے صاف نمایاں غزل میں ہیں
حسن و تجلیات کے ساماں غزل میں ہیں

کہتے ہیں جس کو عشق و محبت، غزل میں ہے — اب دل کا درد، درد کی لذت غزل میں ہے
اب کیف و انبساط و مسرت، غزل میں ہے — اب تو ہر ایک طرح کی جدت غزل میں ہے
ہے فلسفہ حیات کا مضمر غزل میں آج
پنہاں ہیں طرح طرح کے جوہر غزل میں آج

پھر اس کے ساتھ "نظم" کی جوہر نمائیاں — عالم پہ اس کی چھائی ہوئی خوش ادائیاں
شاعری کی اس چمن میں وہ نغمہ سرائیاں — جن پر فدا زمانے کی شیریں نوائیاں
اِک تازہ روح پھونک رہی ہیں جہاں میں اب
تاثیر آرہی ہے کچھ آہ و فغاں میں اب

اے لکھنؤ! یہ تو نے سب افسانہ سُن لیا — سب حالِ جوشِ ساغر و پیمانہ سُن لیا
سب ماجرائے لغزشِ مستانہ سُن لیا — جو کچھ تھا راز، وہ سرِ میخانہ سُن لیا
رُخ ہے ترقیوں کی طرف کائنات کا
اِس وقت ہے سوال حیات و ممات کا

صد شکر، رنگ تیرا بدلنے لگا ہے اب — تو، اصل شاہراہ پہ چلنے لگا ہے اب
دل تیرا طرزِ نو سے بہلنے لگا ہے اب — قیدِ رسوم سے، تو نکلنے لگا ہے اب
تو نے غزل سے آگے بڑھایا ہے اب قدم
تیرا عمل کی راہ میں آیا ہے اب قدم

نظموں کی ابتدا ہے، مبارک ترے لئے — تخئیل انتہا ہے، مبارک ترے لئے
بیشک، یہ سلسلہ ہے مبارک ترے لئے — یعنی، نئی فضا ہے، مبارک ترے لئے
شاید، کمالِ ذوق کی تجدید تجھ سے ہو
شاید، امیدِ دہر کی تائید تجھ سے ہو

آ، زندگی کی بزم میں، زینت لئے ہوئے — میدان ارتقا میں، شجاعت لئے ہوئے
اقلیم شاعری میں حکومت لئے ہوئے — دنیائے رنگ و بُو میں، محبت لئے ہوئے
ہاں، پھر دکھا دے اپنے کمالات دہر کو
مسحور کرلیں تیرے خیالات دہر کو

ہر صنف شاعری ہے پریشاں، ترے بغیر — بستی ہے علم و فضل کی ویراں ترے بغیر
بزم ادب ہے، بے سر و ساماں، ترے بغیر — جوہر سخنوری کے ہیں پنہاں، ترے بغیر
جلوہ دکھا دے اپنا، مہِ عید کی طرح
پُر نور کر دے دہر کو خورشید کی طرح

استاد کوئی چیز نہیں، ذی کمال بن ‌ ‌ پندار چھوڑ، صاحبِ جاہ و جلال بن
ہاں، اپنے ملک و قوم کا تو ہم خیال بن ‌ ‌ جس کی کوئی مثال نہ ہو وہ مثال بن
ناظم کی طرح، تو نہ تصنّع سے کام لے
استادیوں کے وہم سے اب انتقام لے

استاد و ناظم ایک ہیں، جنکی ادا ہے ایک ‌ ‌ جن کا کلام ایک ہے، ذہن رسا ہے ایک
لَے ایک، ساز ایک ہے، لحن و صدا ہے ایک ‌ ‌ مطلب ہے ایک، ایک غرض، مدعا ہے ایک
اُستاد وہ، کہ فن کا معمّا کہیں جسے
ناظم ہیں وہ، ہنر کا تماشا کہیں جسے

جن کے سخن میں، بادۂ گلفام ہو ضرور ‌ ‌ جن کے سخن میں، میکدہ و جام ہو ضرور
جن کے سخن میں، صحن لبِ بام ہو ضرور ‌ ‌ تشبیہ و استعارہ و ایہام ہو ضرور
کچھ ہو، مگر عروض کی انگڑائیاں بھی ہوں
صنعت کے ساتھ قافیہ پیمائیاں بھی ہوں

شاعر کو اس سے کوئی سروکار ہی نہیں ‌ ‌ شاعر کے گلستاں میں کوئی خار ہی نہیں
نام و نمود کا وہ طلب گار ہی نہیں ‌ ‌ اُس کے دماغ و دل پہ کوئی بار ہی نہیں
اُس کا وجود، چشمۂ حیواں لئے ہوئے
ہر سانس ہے، ہزار گلستاں لئے ہوئے

استادِ فن پہ راز نہیں ہے یہ آشکار ‌ ‌ شاعر، زمیں کا ناز ہے گردوں کا افتخار
باغِ جہاں میں، اِک ابدی موسمِ بہار ‌ ‌ الفاظ کا رسول، معانی کا کردگار
ناظم، فقط ہے، حسنِ لسانی لئے ہوئے
شاعر، ہے اِک جہانِ معانی لئے ہوئے

شاعر ہے زلفِ دل کو پریشاں کئے ہوئے ‌ ‌ اُستادِ فن ہے اپنا گریباں سیئے ہوئے
شاعر، شرابِ دردِ محبت پیئے ہوئے ‌ ‌ اُستاد، قافیوں کے کھلونے لئے ہوئے
شاعر، کا دل ہے آئینہ سازی کے واسطے
اُستاد، صرف شعبدہ بازی کے واسطے

اے لکھنؤ! خدا کے لئے، ہوشیار ہو
سلطانِ علم و شاعرِ فطرت شکار ہو
اے مہرِ آسمانِ ادب، آشکار ہو
اے گلشنِ بہار، سراپا بہار ہو
آفاق میں نوائے کیانی، بلند کر
آوازۂ فروغ معانی، بلند کر
معانی
نشانی

ہاں، دیکھ، چشمِ مہر سے، اے ناخدا! اسے
کشتی ادب کی ڈوب رہی ہے، بچا اسے
لگنے نہ پائے، تُند بھنور کی ہوا، اسے
اب، قوتِ خیال سے، ساحل پہ لا اسے
تیری حدود میں، موت کا فرمان کچھ نہیں
واللہ تیرے سامنے، طوفان کچھ نہیں

اے لکھنؤ! بنی ہے زباں، تیرے واسطے
ہے حسنِ نو عروسِ بیاں، تیرے واسطے
دل، سوز و ساز کا ہے تپاں تیرے واسطے
پُرخوں ہے چشمِ کون و مکاں، تیرے واسطے
فیضِ نگاہِ لطف سے، خاروں کو پھول کر
اے لکھنؤ! یہ وصل کا تحفہ قبول کر

چراغِ عظمت

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

تھا سکوں جب کار فرما عالمِ اسباب میں
میں نے دیکھا ہمنشیں! پچھلے پہر یہ خواب میں
رہ گزر میں بادِ صرصر کے بصد شانِ فراغ
جل رہا ہے طاقِ زریں ایک شہری کا چراغ
خندہ زن ہے صبح پر جس کی درخشانی سے رات
نور سے جس کے فروزاں ہے جبینِ کائنات
تند و بے پروا ہوائیں جس کو پا سکتی نہیں
چل رہی ہیں آندھیاں لیکن بجھا سکتی نہیں
دل میں یہ تھا یا مری محفل میں جل سکتا یہ کاش
پاس جانا تھا کہ اک آواز آئی دُور باش
ہے یہ تیرا ہی چراغ اے شاعرِ رنگیں صفات
لیکن اس سے فیض اٹھا سکتی نہیں تیری حیات
اس کو پا سکتا نہیں تو بزمِ عشرت کے لئے
یہ تو ہے نادان تیری لوحِ تربت کے لئے
ہو گی تیری تیرہ قسمت زندگی جب خواب میں
جگمگائے گا یہ تیری موت کے محراب میں

(ماخوذ)

سلاطین اسلام کا نظام عدالت

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بی اے۔ ایل ایل بی)

مسلمان اپنا نظام حکومت ضابطۂ قانون اور مجموعۂ تعزیرات اپنے ساتھ لیکر حدود ہند میں داخل ہوئے۔ ظاہر ہے کہ فاتحین کو زیردست اور ہزیمت خوردہ اقوام سے کوئی ہمدردی نہیں ہوسکتی۔ اسلیئے اُس جدال وقتال کے عہد میں جو کم وبیش محمد بن قاسم کے اوّلین جارحانہ اقدام سے لیکر غوری کے آخری حملہ تک حاوی ہے مسلمان اگر اہل ہند کے تحفظ حقوق سے بے نیاز ہوکر انکی پامالی حقوق کے درپے رہے اور اگر مفتوح ہندوستانی عدل وانصاف کی نعمت عظمیٰ سے بہرہ مند ہونے کے بجائے فاتحین کے بے پناہ جبر وتشدد کا شکار رہے تو مسلمانوں کو بدیں وجہ قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ ان دنوں صرف مشرق ہی نہیں بلکہ دنیائے مغرب بھی شیطان کی حلقہ بگوش تھی اور اسکے اشاروں پر حمایت مذہب کی آڑ میں بنی نوع انسان کے کشت وخون کا بازار گرم کیئے رہتی تھی۔

اس دوران میں بھی بعض مسلم تاجدار ایسے ہیں جنھوں نے اپنی شرع کے مطابق داد جہانبانی دی اور عمّال حکومت کو مطلق العنانہ کارروائیاں کرنے سے باز رکھا۔ لیکن شریعت اسلام کی پابندی سے بھی غیر مسلم اقوام کیساتھ انصاف کی بجائے ظلم ہی ہوا۔ بات یہ تھی کہ شرع محمدی ایک ایسی سرزمین میں خاص حالات کے تحت معرض وجود میں آئی تھی جسکی فضا آتش رقابت وجہالت کی امن سوز چنگاریوں سے لبریز تھی۔ لیکن اسکے برخلاف ہندوستان ان ایام میں تہذیب وتمدن کے انتہائی مدارج طے کرکے روحانیت کا گہوارہ بن چکا تھا۔ اسلئے ریگستان عرب کے قوانین کی ہوا اہل ہند کو راس نہ آنا قدرتی بات تھی۔

اگر کسی ملک کے قوانین کی ساخت وپرداخت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مختلف النسل اقوام اپنے اپنے معیار اخلاق ومذاق کو پیش نظر رکھ کر ضروریات وقت کے مطابق وضع قوانین کی فکر میں سرگرم کار رہا کرتی ہیں۔ لیکن مسلمان فاتحین کے جہل وبربریت سے اس باریکی کو ذہن نشین کرسکنے کی توقع کرنا حماقت کے مرادف ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہندو محمود غزنوی جیسے لٹیرے کی معدلت گستری کی قایل تھے۔ چنانچہ اسکی انصاف پسندی کی صدہا حکائتیں ہنوز زبان زد خلایق ہیں۔ لیکن اسکے عارضی قیام کے باعث

مسلمانوں کے نظامِ عدالت پر اسکا مستقل طور پر کوئی اثر نہ ہوسکا۔ مسلمان حکمرانوں میں ایسے کتنے ہی نومسلم ملیں گے جو کسی نہ کسی وجہ سے قبولِ اسلام کرنے کیلئے معذور ہوئے ہوں انھوں نے ہندو شاستروں کا تھوڑا بہت علم ہونیکے باعث وقتاً فوقتاً اسپر عمل درآمد کرنیکی کوشش کی۔ اسکا بھی جدید نظامِ عدالت پر گہرا اثر پڑا اور نہ مغلوں تک نے وہ بات نہ سوچی جو انگریزوں کو ابتدا ہی سے سوجھ گئی۔ اسلامی حکومت کے زوال و ادبار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمانوں نے دیگر اقوام کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی فاش غلطی کی۔

ڈاکٹر فرمنگر (FIRMINGER) کا خیال ہے کہ مغلوں کے نظامِ عدالت کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس بارے میں اہل الرائے کے بیانات متضاد ہیں۔ یہ مشکل اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے جب ہم مسلمانوں کی آمد کے وقت کی کیفیت کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان" INDIA UNDER MOHOMEDAN RULE" کے مصنف مسٹر روئی (RUI) کا قول ہے کہ اس معاملہ کی تحقیق کیلئے کافی مواد دستیاب نہیں ہوتا تاہم جسقدر ذرائع اب تک محفوظ رہ سکے ہیں۔ وہ یہ ہیں:-

(۱) ترک اور شاہان اسلام کے خود نوشت سوانح مثلاً تیمور، بابر اور جہانگیر کی تصنیفات یا اُنکے ملازمین واقارب کے بیانات مثلاً آئینِ اکبری اور گلبدن بیگم و جوہر وغیرہ کی تصیفات

(۲) ہمعصر مورخین کی تصانیف جو بالعموم غیر ملکی حضرات تھے۔ یہ تمام تر کتب عربی اور فارسی زبانوں میں تصنیف ہوئیں اور انمیں سے بعض کے تراجم الیٹ اور داؤسن نے انگریزی بانوں میں کئے ہیں

(۳) ڈچ، اطالوی، فرانسیسی، انگریز اور عرب سیاحوں کے بیانات مثلاً مینوسی MANNUCI سرطامس رو اور فرانسسکو پلزیریٹ FRANCISCOPELSARET وغیرہ کی تحریریں۔

(۴) شاہی فرمان، فتوے، قوانین، احکام اور مہریں وغیرہ

لیکن یہ تمامتر بیانات اسوقت تک ہرگز قابل قبول نہیں ہیں جبتک کہ تحقیق وتدقیق کی شعاعوں میں انکی تصدیق نہ ہوجائے۔ انمیں سے بعض کتب میں حقایق و وقائع کا صحیح اندراج ہونیکی بجائے محض اور لغو بیانات موجود ہیں۔ ہولڈن نے اپنی مشہور کتاب "ہندوستان کے مغل شہنشاہ" میں تیمور کی توزک کو "مجموعۂ خرافات" لکھا ہے۔

الیٹ اور ڈاؤسن کے نزدیک ہندوستانی تواریخوں میں برائے نام حقیقت ہے۔ مینوسی کی نوشتہ کو تو اہل الرائے لغو اور واہیات قصص وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر اس عہد کا قانون

باضابطہ ضبط تحریر میں آجاتا تو شاید یہ مرحلہ آسان ہوجاتا۔ لیکن مقامی حکومتوں کے نظام میں یکسانیت نہ ہونے کے باعث شاید کوئی مستقل مجموعۂ قوانین مرتب نہ کیا جا سکا جیسا کہ سرٹامس رو کے بیان سے ظاہر ہے۔ " یہ لوگ کوئی تحریری قانون نہیں رکھتے۔ بادشاہ کا حکم ہی بمنزلۂ قانون ہے۔ اسکا فیصلہ قطعی اور ناطق ہوتا ہے۔ بالعموم نہایت صبر و استقلال کیساتھ معاملات پر غور کرکے فیصلہ سنایا جاتا ہے۔ معاملات کی نوعیت کے اعتبار سے سزا و جزا تجویز کی جاتی ہے عام اسکے کہ مقدمہ فوجداری کا ہو یا دیوانی کا۔ کبھی کبھی ملزموں کو ہاتھیوں سے روند واکر مروا دیا جاتا ہے۔ خونخوار ہاتھیوں کو خون میں لت پت دیکھ کر بادشاہ وغیرہ نہایت خوش ہوتے ہیں۔ گورنر شاہی فرمان کے مطابق صوبجات پر حکمران ہوتے ہیں۔ اور اپنی مرضی کے مطابق رعایا کے جان و مال پر ہاتھ صاف کرتے رہتے ہیں۔"

آگرہ کے دربار میں قاضیوں کو قانون کی کتابیں استعمال کرتے دیکھ کر فرانسسکو پلزیرٹ اپنی جہانگیر نامی مشہور کتاب میں رقمطراز ہے کہ "قوانین پر شاذ و نادر ہی عملدرآمد ہوتا ہے۔ حکومت قطعاً مطلق العنان اور قانون و ضابطہ کی پابندی سے مبرّا ہے۔ لیکن قاضیوں کے پاس قانون کی کچھ کتابیں محفوظ ضرور ہیں۔ یہ کتابیں ظاہر ہے کہ قرآن حنفی، شافعی، مالکی حنبلی اور دوسرے مسلّم مجتہدوں کی تفاسیر وغیرہ کے علاوہ دوسری نہیں ہوسکتیں۔ اسکا مزید ثبوت پلزیرٹ کا بیان ہے جو محولہ کتابوں کی فہرست سے متعلق ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ قوانین ہر بات کا ترکی بترکی جواب تھے۔ ان سے عدل و انصاف کی بجائے جذبۂ انتقام کی بو آتی ہے۔ اس کے نزدیک یہ اس امر کی شہادت ہے کہ شاہان اسلام نے ملک کے طول و عرض میں "شرع" کے احکامات ہی کا نفاذ کر رکھا تھا۔

دراصل فتاوائے عالمگیری ہی صرف ایسی کتاب ہے جسے مستند ضابطۂ قانون کہا جا سکے۔ "مغل نظام حکومت" کے مصنف مسٹر سرکار کے خیال کے مطابق اورنگ زیب کے ایما سے مسلمانوں کی جمعیت العلماء نے مرتب کی تھی۔ اور اسکی ترتیب و تکمیل پر شاہی خزانہ سے دو لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ لیکن فتاوائے عالمگیری اُس قانون کا مجموعہ نہیں ہے جو مغلوں کے عہد میں فی الواقعی رائج و نافذ تھا۔ بلکہ ان تجاویز کا مجموعہ ہے جن پر اورنگ زیب کے نقطۂ نگاہ سے ہر مسلمان بادشاہ کو عمل پیرا ہونا چاہیئے تھا۔

نظام سلطنت کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگانے میں جو دقتیں حائل ہیں۔ اسکی ایک وجہ یہ

بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمانی عہد سلطنت میں قانون پیشہ اور وکلا نہیں ہوتے تھے جو قانونی ادبیات کی تحقیق و تدقیق اور مقدمات کی باقاعدہ پیروی کیا کرتے۔ مسلمان بادشاہوں نے اس نوع کی یونیورسٹیاں نہیں بنائیں جیسی کہ ہند قدیم میں عام تھیں یا جیسی کہ خود انھیں کے دورِ حکومت میں بغداد اور دمشق میں قایم ہوئیں۔ نہ ہی ایسے اداروں کے قیام کا بندوبست کیا جنمیں ابوحنیفہؒ الغزالیؒ، شافعیؒ، مالکؒ، اور دیگر علماء دین کا اجتماع ہوتا۔ اور علمی و قانونی مباحث پر بحث و تمحیص ہوا کرتی۔ اکبر نے اپنے اواخر ایام میں اس قسم کے مباحثوں میں دلچسپی لینا شروع کی۔ چنانچہ جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے کہ :۔ "میرے والد کے عہد میں ادب و قانون کے طلبا، اور وزرا کی دو ہزار سے تین ہزار تک کی تعداد کو خاص خاص شہروں میں حکومت کی جانب سے وظیفہ ملا کرتا تھا۔ جو انکے مصارف کیلئے بخوبی کافی ہوتا تھا۔ ان وظیفہ خواروں میں زیادہ تر لوگ غیر ممالک کے باشندے ہوتے تھے۔ جو طلبِ علم میں اپنی پیاس بجھانے کیلئے ایران، روم، بخارا اور آذر بائیجان وغیرہ دور دراز مقامات سے مور و ملخ کیطرح جوق در جوق اس چشمہ شیریں پر آسنڈے چلے آتے تھے"۔

بینی پرشاد نے اپنی کتاب "جہانگیر" میں وکلا کے فقدان پر اظہار طمانیت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔ "اس عہد میں ایسے لوگ نہ تھے جو نانِ نمک کیلئے اپنا ضمیر اپنا دماغ اور اپنی قابلیت ادھر ادھر فروخت کرتے پھرتے۔ اور جنکا وجود سوسائٹی کیلئے بار گراں ہی نہیں بلکہ مضرت رساں بھی تھا"۔ اس سے مسلمانوں کے نظامِ عدالت پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔

اگر اس زمانہ کی سیاسیات عالم کو پیش نظر رکھکر مسلمانی نظام عدالت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سندھ میں مسلمانوں کے دورِ سلطنت میں جو رواجات عام تھے وہ ہر دو اقوام کے اتحاد و اشتراک باہمی کی پیداوار تھے۔ یہ اختلاط و ارتباط ایسا گہرا تھا کہ اب قومی تفریقات کا امتیاز کرنا بھی محال ہے۔ سرکار نے اس امر حقیقت کی بایں الفاظ تائید کی ہے :۔ "پرانے اور نئے طریقِ معاشرت کچھ اس طرح مخلوط ہو گئے کہ عوام کی روزمرہ زندگی سے اجنبیت کا عنصر یکلخت خارج ہو گیا۔ اور مقامی ضرورتیں بلا تردد و تکلف رفع ہوتی چلی گئیں۔ رفتہ رفتہ عدل و انصاف کے نظریے کی اہم تبدیلیوں کے باعث حسب حال نئے قوانین بھی وضع ہوتے گئے"۔

مسلمانوں کی ابتدائی یورشوں کا منشا حقیقی حکمرانی نہ تھا بلکہ مال غنیمت کی ہوس انھیں کشاں کشاں بلادِ ہند میں لائی۔ غالباً اس سے بھی پیشتر اہل ہند کے تجارتی تعلقات مسلمانوں

سے قایم ہو چکے تھے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ "مسلمان حملہ آوروں کے اسلاف کا مسلک صلح کل" تھا۔ اور وہ ہندوؤں سے محض کاروباری مراسم پیدا کرنے کی نیت سے ہندوستان آئے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ محمدؐ کی پیدائش سے ہزار ہا سال پہلے ہندوستانیوں کے یونانیوں اور عربوں سے تجارتی تعلقات مستحکم ہو چکے تھے (LAWBEFORE MOSES) "موسیٰ سے قبل قانون" کے مصنف کو بھی متذکرہ حقیقت کا اعتراف ہے۔

بوسکیون اپنی مشہور کتاب "THE FIRST OF THE EMPIRES" "دولِ اولین" میں لکھتا ہے کہ ہمیں دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقہ میں ایک ایسی عظیم الشان اور بلند مرتبہ تہذیب کے آثار ملتے ہیں جو چار ہزار سال قبل مسیح کی ہندو تہذیب سے بعینہٖ مشابہ ہیں۔ اسٹین کی تحقیقاتی مہموں کے خوشگوار نتائج سے اس دعویٰ کی تصدیق ہو گئی ہے۔ وادی ژہاب (ZHOB) واقع بلوچستان کی کھدائی کا ذکر کرتے ہوئے اسٹین نے لکھا ہے کہ:۔

"موہنجو دارو (MOHENJODARO) اور ہندوستانی تمدن کی یگانگت دہمرنگی کا ثبوت مٹی کا ایک (TERRA COTTA) بُت ہے جس کے ساتھ ہندی مذاہب کے دیگر مخصوص نشانات بھی موجود ہیں۔ مصور و مجلیٰ ظروف پر جو سینگ وار بھیڑوں کی تصویریں ہیں۔ ان کی وضع قطعاً ایرانی ہے۔ لیکن بتوں کی تراش بالکل ہندوستانی اور ہندو مذہب کی علمبردار ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں نے اپنی عالمگیر تہذیب وشائستگی کے بیج ایران کی سرزمین میں بھی بوئے تھے۔ اسی لئے گوارا نہ تعصب، عدم رواداری کے باوجود مسلمان حملہ آور ہندو تہذیب کے اثرات سے محفوظ و مامون نہ رہ سکے۔

سندھ پر مسلمانوں کے جتنے حملے ہوئے انکی محرک ملک گیری کی ہوس نہ تھی۔ یہ خیال تو بہت بعد میں پیدا ہوا جبکہ محمدؐ نے اسلام کی تلقین واشاعت شروع کی۔ اور لوگوں کو دین اسلام پھیلانے کیلئے مشتعل کیا۔ چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا حملہ محمد بن قاسم نے کیا اور بزور شمشیر اسلام کی نشرواشاعت کے خیال سے کشت وخون کا بازار گرم کیا۔ لیکن جب اسطرح بھی پیش نہ گئی تو اُس نے غیر مسلم رعایا پر جزیہ لگایا۔ اور اُسے رسولؐ کے مجوزہ قوانین پر عامل ہونے کیلئے مجبور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جیسی کہ توقع کیجاتی تھی اُسے اپنی اُن مصروفیات میں نمایاں کامیابی نہ ہوئی۔

الادریسی کے (ALIDRISI.) "نوشتہ الشتاق" میں درج ہے کہ قاسم نے بقائے سلطنت کیلئے مجبور ہو کر یہی قرین مصلحت سمجھا کہ ہندوؤں کا اتحاد واعتماد حاصل کیا جائے۔

چنانچہ اُس نے بہت سے برہمنوں کو بلا کسی ضمانت کے محصل لگان کے عہدہ پر فائز کیا۔ اور اسطرح خود پیش دستی کر کے ہندوؤں کی جانب صُلح کا ہاتھ بڑھایا۔ قاسم کے اس اقدام کو اسکے آقا نے بھی پسند کیا۔ حجاج سے اس کے نام جو پیغام موصول ہوا اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے"۔ ملکی قوانین کے احترام و پابندی کے ضمن میں تم نے عوام کی جو حوصلہ افزائی کی ہے وہ قابل ستائش ہے اس سے اسلامی حکومت کی بنیادیں

اگر مسلمان گورنر قرآن کے احکام کی خلاف ورزی کیا کرتے تو بغداد کے حکمران ان سے باز پرس کرنے کی بجائے اُنکی پیٹھ ٹھونک دیا کرتے تھے۔ اُنھوں اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ ملکی رسوم بہت قدیم ہیں اور اُنھیں کسیطرح مٹایا نہیں جا سکتا۔ محمدؐ یافع "جامع الحکایات" میں رقمطراز ہے کہ نوشیرواں نے اپنے ایک گورنر کو ہدایت کی تھی کہ ہندوستانی رعیت کیلئے مناسب ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے طور و طریق، رسم و رواج اور دیگر قوانین کی پابندی کرے۔ لہذا نئے قوانین ہرگز جاری نہ کئے جائیں چنانچہ سندھ میں پرانے رواج بدستور قائم و برقرار رہے۔ اور دیہات کا قدیمی نظام رد و منسوخ نہ ہو سکا۔ لیکن شہروں میں ملاؤں کے فتووں کی سختیاں برابر محسوس کیجاتی رہیں۔ الیٹ اور ڈاؤسن نے ساری کیفیت یوں بیان کی ہے:۔ "سندھ جیسے ملک میں جہاں کی بیشتر آبادی اپنے آبائی مذہب کی پیرو تھی عدالتیں نہیں تھیں۔ جہاں مظلوم رعایا نسلی قضیوں کی دادخواہی کر سکتی۔ ہر وہ سردار جو ذرا بھی آزاد و مختار تھا موت تک کی سزا دے سکتا تھا۔ امیروں کو بھی یہی حقوق حاصل تھے لیکن وہ لوگ ضابطہ کی کچھ نہ کچھ پابندی ضرور کرتے تھے۔ حالانکہ انکے ہاتھوں انصاف کا خون ہو ایک معمولی بات تھی۔ امیروں کے ہاں قاضی مقرر ہوتے تھے۔ جو قرآن کے احکام کو مشعل ہدایت مان کر مقدمات فیصل کیا کرتے تھے۔ قاضی ذرا سے لالچ میں اپنے ضمیر کو فروخت کر سکتے تھے۔ جس سے ہندوؤں کی سخت حق تلفی ہوتی تھی۔ سیاسی نوعیت کے جرائم کی سزا امیر خود تجویز کرتے تھے۔ لیکن جائداد و املاک اور وراثت وغیرہ کے جھگڑے بکھیڑے ہندو اپنی پنچایتوں میں خود طے کیا کرتے تھے فی الحقیقت ذات برادری سے خارج کئے جانے کا ڈر ہی ایک ایسی چیز تھا جو ہندوؤں کا محافظ تھا۔ ورنہ عام قاضیوں کی عدالتیں تو تبلیغ اسلام کا ہی نہایت موثر ذریعہ تھیں۔ غیر مُسلم ملزمان کو قبولِ اسلام کا پروانہ بڑے سے بڑے جرم کی پاداش سے مخلصی دلا سکنے کو کافی تھا۔ ہندوؤں کا گھوڑے پر چڑھنا قانوناً ممنوع تھا۔ گھوڑے کی سواری کی ہندوؤں کو صرف اسی وقت اجازت تھی جبکہ وہ صاحبِ ریش ہوں اور اسلامی جامہ زیب تن کرنے کو تیار ہوں مسلمانوں کے خیال میں ڈاڑھی لگا لینے ہی سے آدمی مسلمان ہو سکتا تھا۔ ہندوؤں کے جلوس اور مذہبی جلسے خلاف قانون سمجھے جاتے تھے۔ انھیں باجہ تک بجانے کی اجازت نہ تھی۔

متذکرہ کیفیت سے ڈاکٹر بارنس (Barnes.) نے حسب ذیل نتائج اخذ کئے ہیں:۔

(۱) مسلمانوں کے مسطورہ رویّہ کے باعث فاتح اور مفتوح، حاکم اور محکوم میں کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی

(۲) ہندو مسلمانوں سے ہمیشہ خائف و متنفر رہتے تھے۔ انھیں حکام کے انصاف پر اعتماد نہ تھا۔ لیکن بارنس کی مذکورہ بالا رائے ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ اور یہ اسلئے کہ انگریز مغلوں کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اور انھوں نے اس وقت ملک کی جو حالت دیکھی اسی کے مطابق دیگر سلاطین اسلام کے نظام عدالت کے متعلق اپنی رائے قائم کرلی۔ لیکن انھوں نے اس بات پر مطلق غور نہ کیا کہ جو مسلمان سندھ کے راستہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے وہ عربی النسل تھے۔ اور اپنا جداگانہ نظام حکومت ساتھ لائے تھے۔ اُن پر اسوقت تک یونانیوں کا کوئی اثر نہ پڑسکا تھا۔ عربوں کی انصاف پسندی مسلم تھی۔ لیکن مغل اس کے برخلاف عیاش، تنگ دل اور ناخواندہ تھے۔

عربوں کو وقتاً فوقتاً خلیفہ بغداد سے ہدایات موصول ہوتی رہتی تھیں۔ مغل بالکل مطلق العنان تھے۔ خلیفہ کے مشورے بڑے بڑے سیاستدانوں اور علماؤں کی روشن خیالی، دور اندیشی، اور بالغ نظری کا نتیجہ ہوتے تھے۔ اسی لئے مغلوں کی معدلت گستری اور اولین فاتحین اسلام کی عدل پروری میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ اُمّی و ناخواندہ مغل تعصب مذہب کے جس سپاہیانہ جوش سے سرشار تھے ان کے پیشرو حکمران سندھ آتے ہی بہت جلد علم ودانش کی روشنی میں کھو چکے تھے۔ مغل ہندوستان میں آنے سے پہلے کابل اور قندھار میں لڑتے بھڑتے اور دیگر سرحدی قبائل کیطرح لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ لیکن عرب اپنی چڑھائیوں سے پیشتر اپنی خوش معاملگی اور دیانتداری کی ساکھ ہندوستان کے بازاروں میں قائم کرچکے تھے۔ عربوں نے اپنی گمراہی کے ایام میں بھی "تلاش حق" کی مساعی جمیلہ کو خیرباد نہ کہا۔ انھیں ہمیشہ یہی فکر دامنگیر رہی کہ جہانتک ہوسکے کسی فرد واحد پر بلا امتیاز ملّت بیداد نہ ہونے پائے۔ جسطرح ممکن ہو اس کے حقوق کی حفاظت کیجائے۔ محمد قاسم کے بارے میں لکھا ہے کہ اُس نے برہمن آباد کے انتظام والنصرام کیلئے اوورسیر اور دیگر اہلکار مقرر کیئے۔ اور ملک وجائداد کے متعلق تاجروں کے چار اراکین کی مجلس کو کلی اختیارات سونپ دیئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قاسم اور اسکے جانشینوں کے عہد میں سندھ کا جو حال تھا وہ مغلوں کے زمانہ جیسا نہ تھا۔

جب مغلوں نے اپنی حدود سلطنت کو وسعت دی تو حالات بالکل تبدیل ہوگئے۔ اکبر اور جہانگیر نے بھی اوائل حکومت میں علاء الدین کیطرح اسی بوسیدہ نظام کی نشر واشاعت کی۔

مغل شمال و مغرب کی جانب سے جو نظام اپنے ساتھ لائے وہ اتنا بلند و بالا نہ تھا جس کا مظاہرہ سندھ میں ان سے پیشتر ہو چکا تھا۔ انھوں نے ترکوں، ایرانیوں اور عربوں سے جو کچھ سیکھا تھا اسی کے برتے پر حکومت ہند کا بار گراں اپنے سر پر لے لیا تھا۔

مسلمان حملہ آور جو شمال و مغرب کی سمت سے ہندوستان آئے انکا مدعا لوٹ مار، قتل و غارت گری اور بزور شمشیر اسلام کی اشاعت کرنا تھا۔ یہ لوگ ملک میں مستقل طور پر اقامت گزیں ہونے کے بجائے چند روز شر برپا کر کے اپنے اپنے وطن کو واپس ہو جاتے تھے کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے مفتوحہ علاقوں میں اپنے سرداروں کو ماتحت حکمران مقرر کرنا شروع کر دیا تاکہ وہ ایک نئی اسلامی حکومت کی بنیاد رکھ سکیں۔ ان لوگوں کا طریق حکومت بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ وہ اپنے وطن میں دیکھتے چلے آئے تھے اور جس کے وہ عادی ہو چکے تھے۔ سر کار کا مقولہ ہے کہ ہمایسے ترکی فاتح مصر اور عراق کا نظام اپنے ساتھ لائے۔

مغل بادشاہوں نے اپنے دربار میں ہمیشہ ایرانیوں کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ اور سلطنت کا سارا کاروبار انکے سپرد کر دیا خود اورنگ زیب معترف ہے کہ ایرانی ہندوستانی مسلمانوں سے بدرجہا بہتر ذہین اور قابل ہیں"۔ مغلوں کی کامیابی کا راز ہندوؤں کی خانہ جنگی اور شیعہ مسلمانوں کے اتحاد عمل میں مضمر ہے۔ سترھویں صدی میں صفوی شاہوں کا زور اقتدار زوال پذیر ہوا۔ اور ایران کی عنان حکومت انکے ہاتھ سے نکلتی دکھائی دینے لگی۔ سنیوں نے اس موقع کو غنیمت جانکر اورنگ زیب کو شیعوں کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا۔ ان ریشہ دوانیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اورنگ زیب شیعوں کی بیخکنی پر آمادہ ہو گیا۔ اور سلطنت مغلیہ اہل تشیع کی مخلصانہ اعانت سے ہمیشہ کیلئے محروم ہو گئی۔ اورنگ زیب کو شروع ہی سے تخت حاصل کرنے اور اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے مذہب کی پناہ لینا پڑی تھی۔ لیکن اب شیعوں پر جو بے پناہ مظالم کئے گئے اسی کے کفارہ میں اُسے خود کو سنیوں کے رحم و کرم کے سپرد کر دینا پڑا۔ جنھوں نے اس کے کان بھر بھر کر اس کی غیرت اسلامی کو جوش دیوانگی کی حد و دمیں داخل کر دیا۔ اور ایک دن وہ آیا کہ اسی ادھیڑ بن میں سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا

تاریخ شاہد ہے کہ مغل بالعموم نہایت عیاش اور پست اخلاق تھے۔ انھیں کبھی کبھی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کٹر مسلمان بھی بننا پڑتا تھا۔ ان کی عیاشانہ ذہنیت کا انکی یکتائے روزگار یادگاریں جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ واقعات بتا رہے ہیں کہ ان کی لاثانی تعمیرات ان کی

انتہائے حسن پرستی کی غماز ہیں چنانچہ تاج جیسے روضہ کا وجود بھی شاہجہاں کے جذبۂ عشق کا رہین ہے۔ اکثر ہندو خواتین کو حلقۂ اسلام میں منسلک کرنے کے بہانہ سے حرم میں داخل کر لیا جاتا تھا۔

فتاوائے عالمگیری کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو قوانین عہد عالمگیر میں رائج تھے ان سے ہندوؤں پر کیسی کیسی سختیاں ہوتی ہونگی۔ مغلوں کا وتیرہ تھا کہ وہ کرسئی عدالت پر بیٹھ کر ہمیشہ قرآن کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ لیکن وہ قوانین جو ریگستان عرب میں خاص حالات کے تحت اور ایک جداگانہ معیار اخلاق اور طرز معاشرت کے موافق مرتب کئے گئے ہوں۔ وہ اہل ہند کو کس طرح راس آ سکتے تھے اور وہ بھی اسوقت جبکہ ہندو ہزاروں برس سے اپنا قانون اپنے پاس رکھتے تھے۔ لیکن یہاں اس کی پرواہی کسے تھی؟

مسلمان بادشاہوں کی انتہائی کوششوں کے باوجود بھی قرآن کے قوانین ہند میں عام نہ ہو سکے ملیسن (Malleson) اپنی مشہور تصنیف "اکبر" میں بابر کے بارے میں رطب اللسان ہے:۔ بابر جیسا بیدار مغز سپہ سالار بھی ایک لمحہ کیلئے یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ قرآن کے ان قوانین کی پابندی ترک کر دے جن پر اس کے متقدمین افغانی جان دیتے تھے۔ بابر کی وفات کے بعد بیرم خاں نے بھی اسی غلطی کا اعادہ کیا۔" ایشری پرشاد اپنی "ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوستان" نامی کتاب میں لکھتے ہیں کہ فیروز کی نظر میں قانون اور انصاف کا مطلب تعصب اسلام کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ تیمور کی توزک شاہد ہے کہ وہ ہندوؤں سے جبراً قرآن کی تعظیم اور شرح محمدی کے احکام پر عمل کرانا چاہتا تھا۔

ہندوؤں کے قوانین سے مسلمان ہمیشہ نفرت ہی کرتے رہے۔ ذیل کے ایک مستند تاریخی واقعہ سے اس دعوی کی تائید ہوتی ہے۔ سدی مولا اور قاضی جلال الدین بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہوکر فیروز خلجی کے حضور میں پیش ہوئے۔ لیکن جب ان کے خلاف کوئی گواہ نہ ملا تو بادشاہ نے برہان پور کے میدان میں آگ مشتعل کرائی تاکہ ملزم آگ میں سے گذر کر اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کریں۔ واضح رہے کہ یہ وہی اگنی پریکشا ہے جس کا رامائن میں مذکور ہے۔ لنکا سے واپسی پر سیتا جی کیلئے بھی یہی سزا تجویز ہوئی تھی۔ جب شاہی مجرم آگ کی جانب بڑھے تو بادشاہ نے انھیں روک کر قاضیوں سے دریافت کیا کہ آیا یہ سزا خلاف شریعت تو نہیں ہے؟ جواب ملا کہ ہاں کافروں کے یہاں اس کا رواج ہونے کے باعث

یہ تجویز اسلام کے منافی ہے۔ چنانچہ جلال کو بدایوں میں اور مولا کو شاہی محل میں مقید کر دیا گیا
(فرشتہ)

لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ یہ نظام صرف دار السلطنت اور حکومت کے دیگر صدر مقامات ہی میں کامیاب رہ سکا۔ جہاں حکمرانوں کا اثر و اقتدار اور رعب و دبدبہ عام طور پر محسوس کیا جاتا تھا۔ دور دراز کے مقامات اور دیہی رقبہ میں اس کی دال نہ گل سکی۔ اس فقدان د کمزوری کا سبب یہ تھا کہ حکمرانوں کی رہنمائی غیر ممالک سے کی جاتی تھی اور مقامی حکومتوں کا دیہاتوں میں کوئی خاص اثر نہ تھا۔ آمد و رفت کے وسائل قطعاً ناکافی و نامناسب تھے علاوہ ازیں پرانی تہذیب کی دلدادہ اور زیور علم و فضل سے آراستہ ہندو قوم اس نئی طرز معاشرت و تہذیب کے گورکھ دھندے سے فطری طور پر متنفر تھی۔ ملک کا عرض و طول بھی اس نظام کو مستحکم بنانے میں مانع تھا۔ ان تمام دقتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی مسلمان بادشاہ کو گھڑی بھر کیلئے بھی رعایا کی بغاوت کے خطرے سے فرصت نہ ملی۔ اور اسلامی حکومت کے قدم مستقل طور پر نہ جم سکے۔

مسلمان بادشاہ مطلق العنان تھے اور ایک اجنبی و غیر قوم صرف اس لئے ان کے تابع تھی کہ وہ تاب مقاومت نہ لاسکتی تھی۔ ہندوؤں کو نظام حکومت میں منسلک کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ فاتح اجنبی د بیگانہ کی حیثیت سے آئے اور غیروں کی طرح رہتے سہتے چلے گئے۔

بابر اور بعدہٗ اس کے جانشینوں نے محسوس کیا کہ ملک پر شرع اسلام کے ماتحت حکومت کرنا محال ہے۔ انھوں نے اپنے طرز عمل میں بعض ضروری تبدیلیاں کرنے کی سعی بھی کی۔ رواداری سیاسی ضرورت تھی اور حکومت کا وقار قایم رکھنا اسوقت تک مشکل تھا جبتک کہ قوانین اسلام کی پابندی کا خیال ترک نہ کر دیا جاتا۔

"ڈاکٹر ہولڈن نے اس حقیقت کو یوں پرافگندہ نقاب کیا ہے:۔ "اکبر نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ کثیر التعداد ہندوؤں کو قرآن کے زیر اطاعت نہیں رکھا جا سکتا۔ چنانچہ اس نے ایک نیا میدان عمل تلاش کیا" مگر اکبر کی ان مساعی جمیلہ سے سُنی مسلمان برہم ہوگئے۔ اور انھوں نے جہانگیر کو اکبر کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کر کے اس کے دست راست کو قتل کرا دیا۔
اکبر کی رواداری کے متعلق جہانگیر رقمطراز ہے کہ :۔ "انھوں نے بت شکنی کو حکماً بند کر دیا

جب میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو جواب ملا کہ ملک کی پانچ حصہ آبادی ہندوؤں اور غیر مسلموں کی ہے۔ اگر میں ایسا کروں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میں اپنی رعایا کو تہ تیغ کرا دوں۔"

بابر کی آمد پر ارسکن (Erskine) لکھتا ہے کہ شمالی ہند نے اپنے قدیمی نظام کو برابر قایم رکھا اور ان کا کاروبار اسی ڈھرے پر چلا گیا۔ رعایا کو اس کی وفاداری کا نعم البدل یہ ملا کہ حکومت نے قدیم رواج کی پابندی میں اس حد تک کوئی دخل نہ دینا ہی مناسب سمجھا جہاں تک وہ اسلامی قواعد و ضوابط کے منافی نہ ہوں۔ اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ مسلمانی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اب جو برائے نام مسلمان بادشاہ رہ گئے ان کی حکومت محلوں کی چہار دیواری ہی کے اندر مقید رہی۔

"داستانِ خموش"

(برج لال جگی رعنا۔ راولپنڈی)

غنچہ گلشن میں ہے دہانِ خموش
اور سوسن ہے اِک زبانِ خموش

بات دِل کی کہی نگاہوں نے
اُف محبّت کی یہ زبانِ خموش!

داغ دل کا ہے شمع کی تصویر
عہدِ الفت کا اک نشانِ خموش

میری حالت کو دیکھکر بولے
یہ ہے پردہ یہ داستانِ خموش

درد دل میں ہے اشک آنکھوں میں
یہ ہے گونگے کی اک فغانِ خموش

میرے خونِ جگر کا ہے شاہد
رنگ لالہ بھی اک بیانِ خموش

کون رعنا۔ وہی گھر صورت
فکر میں غرق اک جوانِ خموش

موسم گرما اور بازار کا دن

(از شاعر اعظم حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

دوپہر بازار کا دن، گاؤں کی خلقت کا شور — خون کی پیاسی شعاعیں، روح فرسا لُو کا زور
آگ کی رَو کاروبارِ زندگی کا پیچ و تاب — تُند شعلے، سُرخ ذرّے، گرم جھونکے، آفتاب
گاڑیاں، گھوڑے، مویشی، آندھیاں، گرد و غبار — عورتیں، بچے، جواں، بوڑھے قطار اندر قطار
عورتوں کے سر بسر کاندھوں پہ بچے، ملگجے — ہر نظر گردش میں مٹی کے کھلونوں کے لئے
آگ کی ہلچل، دمڑک کی یورشیں، بجلی کی رو — کملیوں پر سرخ چاول ناٹ کے ٹکڑے پہ جَو
بام و در لرزے ہوئے خورشید کے آفات سے — ہر نفس اک آنچ سی اُٹھتی ہوئی ذرّات سے
دل پریشاں، جسم مرجھائے ہوئے، رخ ہیں نڈھال — جھکّڑوں کی چین پیشانی، بگولوں کا جلال
قافلے گردش میں، چیلوں کی صدا سنتے ہوئے — چلچلاتی دھوپ کی رَو میں چنے بھنتے ہوئے

سر پہ کافر دھوپ، جیسے روح پر عکسِ گناہ
تیز کرنیں، جس طرح سے بے مروت کی نگاہ

"انسان"

کوئی جا کر یہ کہدے افسرِ مردم شماری سے — عجب کیا ہے کہ میرا غنچۂ خاطر بھی کھل جائے
کہ از راہِ کرم مجھ نیم جاں کو بھی خبر کر دے — اگر اس کوچہ گردی میں کوئی انساں مل جائے

(جوشؔ ملیح آبادی)

برق مرحوم

(از شیو کماری دیوی صاحبہ دختر حضرت جگر بریلوی)

حضرت رواں کی بے وقت موت سے جو صدمۂ جانکاہ دنیائے ادب کو پہونچا تھا وہ ابھی کم نہ ہونے پایا تھا کہ جناب برق کی دائمی مفارقت سے صدگونہ سوز و گداز کے ساتھ تازہ ہوگیا اسے قوم کی بدبختی کہیے یا ستم روزگار کہ سال بھر کی قلیل مدت میں دو ایسے مایۂ ناز شاعر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ افسوس محفل ادب سے ایک ایسا شخص اٹھ گیا جس کی جگہ پر نہیں ہو سکتی۔

منشی مہاراج بہادر برق کے بزرگوں کا وطن سکیٹ ضلع ایٹہ تھا لیکن کئی پشتوں سے آپ کے بزرگوں نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ کے دادا منشی خوب چند آخری شاہ دہلی کے زمانہ میں شاہی وکیل تھے۔ والد کا نام منشی ہر نراین المتخلص بہ حسرت تھا۔ جناب برق کا سنہ پیدایش ۱۸۸۴ء تھا۔ ذوق شاعری ابتدائے عمر سے تھا مگر جب تک آپ نے انٹرنس نہ پاس کر لیا آپ کے والد بزرگوار نے آپ کو شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھنے سے باز رکھا۔ غالباً اس کا سبب یہ ہوگا کہ اُس زمانہ میں شاعری کا پایہ معیار تہذیب سے گر چکا تھا۔ اور وہ رکیک و گندے مضامین کی جولانگاہ بن گئی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں آپ کے والد ماجد نے رحلت فرمائی اور بار خانہ داری آپ کو اُٹھانا پڑا جس کے باعث تعلیم ناتمام رہ گئی۔ لیکن آپ نے اُمید کا دامن نہ چھوڑا اور ہمت نہ ہاری گھر پر مطالعہ جاری رکھا۔ آخر کار ۱۹۱۸ء میں منشی فاضل کے دوسرے سال ایف۔ اے اور ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی طبعی ذہانت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ تین سال میں تین امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۲۲ء میں سب آرڈینیٹ اکاؤنٹس سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ پوسٹل آڈٹ آفس دہلی میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ ہندوستان کے ممتاز شعرا میں آپ کا شمار تھا اور اکثر اصحاب آپ سے اصلاح سخن لیتے تھے، خودداری جو شاعروں کا خاصہ ہونا چاہیے آپ کی طبیعت میں حد سے زیادہ تھی آپ نے کسی سے تلمذ حاصل کرنے کا احسان نہ اُٹھایا۔ ابتدا میں چند غزلیں جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی

کو دکھائیں، لیکن یہ بھی بار ہوا۔ بقول جناب جگر

نہ کرے ترک پیروی جب تک　　راہرو راہبر نہیں ہوتا

آپ کا مجموعۂ کلام "مطلع انوار" اردو ادب میں ایک نیا اور نادر اضافہ اور طرز جدید کی شاعری کا مخزن ہے تاثیر فصاحت بلاغت۔ نادر تشبیہات۔ روانی۔ زبان کی شستگی و برجستگی آپ کے ہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ نیچرل نظموں میں "کرمک شب تاب" نہایت دلکش نظم ہے، زبان نہایت نفیس و سلیس ہے۔ اس پر نادر اور لطیف تشبیہات نے نظم کی آب و تاب کو دو بالا کر دیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خندۂ جام بلوریں ہے ہما میں پراں　　گرم پرواز ہے یا پر تو شاخ مرجاں

محو پرواز یہ لعل یمنی ہے شاید　　اڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہے شاید

ہیرے کی کنی کس قدر برمحل اور نادر تشبیہ ہے، اسی طرح ذیل کے شعر میں قطرۂ سیماب ہے۔

برق رفتار کا یا جلوۂ مہتاب کہوں　　اس کو اڑتا ہوا اک قطرۂ سیماب کہوں

⁂

تجھ میں اے کرمک شب تاب چمک نور کی ہے　　چشمک برق سے نسبت ہے مگر دور کی ہے

چشمک برق سے دور کی نسبت کس قدر معنی خیز ہے جو تخیل کو منتہائے تنویر تک پہونچا دیتی ہے

جلوۂ حسن تیرا پردے سے مانوس نہیں　　تو ہے وہ شمع کہ شرمندۂ فانوس نہیں

تیرے جلوے سے منور ہوا صحن گلشن　　تو ہے وہ شمع کہ ہے موج ہوا پرروشن

"حسن فطرت" میں جناب برق نے ثابت کیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز حسن سے لبریز ہے، ذرہ سے آفتاب تک اسی ایک ذات حقیقی کا جلوہ پر تو افگن ہے، اگر آنکھیں ہوں تو کوئی شے حسن سے خالی نہیں ؎

اک جلوہ گاہ حسن ہے یہ عالم اسباب　　نظارہ بداماں ہے رخ مہر جہاں تاب

ہے چادر مہتاب کہ اک نور کا سیلاب　　ہر اختر تابندہ ہے رشک در نایاب

ہے وسعت داماں خلا حسن سے لبریز
آنکھیں ہوں تو ہیں ارض و سما حسن سے لبریز

رات میں ماہ کامل کی چاندنی کی چادر کا ساری دنیا پر پھیلا ہونا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نور کے دریا میں سیلاب آگیا ہے جو کل کائنات پر امنڈا تا چلا آتا ہے۔ کیسا منور خیال ہے۔

"ہے چادرِ مہتاب کہ اک نور کا سیلاب"

جھرمٹ میں ستاروں کے ہے کیا شانِ جمالی		کس درجہ ہے دلکش شفقِ شام کی لالی
کانٹے ہوں کہ پھولوں میں لچکتی ہوئی ڈالی		دنیا میں کوئی چیز نہیں حسن سے خالی

بیتابیِ امواج میں بھی حسن نہاں ہے
یہ جنبشِ پیہم کا سماں اور کہاں ہے

اس بند میں لفظ "جھرمٹ" نے ایک ایسا سماں پیدا کر دیا کہ کالی رات میں ستاروں کے جمگھٹ اور اُن کے جھلملانے کا نقشہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے جس کی تکمیل میں "شانِ جمالی" مزید اضافہ کرتی ہے۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ اگر دل میں حسن پرستی کا ذوق ہو تو عالم کی ہر تصویر اور شکل حسن ہے۔ زمین سے آسمان تک نور ہی نور ہے، ہر ذرّہ خاتمِ قدرت کا نگیں ہے ؎

دل میں ہو اگر آرزوئے حسن پرستی		ہے عالمِ تصویر صنم خانۂ ہستی
ہے فرش سے تا عرش یہاں اوج کہ پستی		انوار سے معمور ہے یہ حسن کی بستی

ہر ذرّہ ہے وہ خاتمِ قدرت کا نگیں ہے
جو شکل ہے اس آئینہ خانہ میں حسیں ہے

ذرّہ کو خاتمِ قدرت کا نگیں کہنا کس قدر نازک تخیل ہے۔

"جلوۂ سحر" میں طلوعِ آفتاب کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:-

تاروں کی اب کہاں ہیں وہ جلوہ نمائیاں		گُل ہیں چراغ مہرِ منوّر کے سامنے
چھٹتی ہیں ماہتاب کے رخ پر ہوائیاں		کیا رنگ جم سکے شہِ خاور کے سامنے

ایک ایک لفظ ایسا جامع اور مانع ہے کہ اپنی جگہ سے اُٹھائے نہیں اُٹھ سکتا۔ سورج نکلنے سے چاند کی روشنی نہیں پھیکی پڑ گئی بلکہ آفتاب کی آب و تاب دیکھکر اُس کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور تاروں کی رنگینی بھی غائب ہو گئی

جنابِ برق کے شعر میں معنی کا ایک دریا موجزن ہے جو حالت متذکرۂ بالا شعر میں بیان کی گئی ہے۔ اب دیکھیے اُس کا اثر کائنات کی اشیاء پر کیا پڑتا ہے ؎

زرتار ہو گئیں ہیں پہاڑوں کی چوٹیاں		سیماب پیرہن ہے ہر اک موجِ آبشار
پانی میں کوندتی ہیں شعاعوں سے بجلیاں		غنچے حباب کے ہیں لبِ آبِ زرنگار

⁂ ⁂ ⁂

ہیں نغمہ زن طیورِ سحر خیز باغ میں محو سپاس حق ہیں یہ طاعت گزارِ صبح
شبنم کی ہے شرابِ گلوں کے ایاغ میں کتنی سرور خیز ہے سیرِ بہارِ صبح

* * *

انگڑائی لے کے سبزۂ خوابیدہ جاگ اُٹھا اُترا خمار نرگسِ بدمست خواب کا
سورج مکھی کا اخترِ قسمت چمک گیا کھولی ہے آنکھ دیکھ کے منہ آفتاب کا

ایک ایک لفظ سے طلوعِ آفتاب کا منظر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ نسیم صبح سے پیڑوں کے آہستہ آہستہ جھومنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بدمست خواب کا خمار اُتر رہا ہے اور سبزۂ خوابیدہ انگڑائی لے کے جاگ رہا ہے۔

صبح کے وقت نسیم کا چلنا، پھولوں کا کھلنا، چڑیوں کا چہچہانا یہ سب مناظر دل پر ایسا خوشگوار اثر ڈالتے ہیں کہ رنجیدہ طبیعتیں بھی ایک لمحہ کے لئے اپنا غم بھول کر قدرت کے دلکش مناظر دیکھنے میں محو ہو جاتی ہیں۔ نسیم کا ایک تازگی بخش جھونکا دلوں کو مست کر دیتا ہے۔ اس عالم کی منظر نگاری کا نمونہ "نسیم صبح" ہے۔ نسیم سے خطاب کرتے ہیں:۔

غم غلط کن تو برائے خاطرِ افسردہ ہے
تیرا جھونکا تازگی بخشِ دلِ پژمردہ ہے

اور بند ملاحظہ ہوں:۔

تیری پیاری شوخیاں بھی کیسی دل آویز ہیں گدگدانے سے ترے غنچے تبسم ریز ہیں
موجہائے مشک بو تیری سرور انگیز ہیں وہ شگوفے بھی ہیں خنداں جو ابھی نوخیز ہیں
تو نے چھیڑا نیم وا کلیوں کی باچھیں کھل گئیں
تیرے دم سے اِن کو منہ مانگی مرادیں مل گئیں

تو چمن میں آئی عشقِ گل کا دم بھرتی ہوئی چھاؤں میں تاروں کی گن گن کر قدم دھرتی ہوئی
پہلے آہستہ چلی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی پھر وہی برتیں ادائیں روز کی برتی ہوئی
گل کو چھیڑا طرۂ سنبل پریشاں کر دیا
غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کر دیا

کیسی صحیح منظر نگاری ہے، خصوصاً دوسرا بند تو لاجواب ہے۔ محاکات اسی کو کہتے ہیں۔ لفظ لفظ سے نسیم کی مستانہ اداؤں کا نقشہ کھنچ جاتا ہے: "چھاؤں میں تاروں کی گن گن کر قدم دھرتی ہوئی"

پہلے تو بادِ سحری آہستہ چلی پھر وہی روز کی برتی ہوئی ادائیں برتیں یعنی گلوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کر دیا" موزونی الفاظ اور صحیح منظر نگاری کے علاوہ ہر شعر کے پڑھنے سے موسیقی کا انداز پیدا ہوتا ہے ؎

لطفِ سیرِ بوستاں تجھ سے دوبالا ہو گیا　　تیری شوخی سے نیا رنگِ تماشا ہو گیا
شاخِ گل کو تازیانہ تیرا جھونکا ہو گیا　　اس طرح چٹکی کہ اک انداز پیدا ہو گیا

قطرۂ شبنم رخِ گل سے ڈھلک کر گر پڑے
جیسے ساغر سے مئے احمر چھلک کر گر پڑے

کیا خوب شعر ہے "شاخِ گل کو تازیانہ تیرا جھونکا ہو گیا" "اس طرح چٹکی کہ اک انداز پیدا ہو گیا" بعض اوقات ایسا لفظ کسی شعر یا مصرعہ میں آجاتا ہے جس سے اس حالت کا پورا نقشہ یاد آجاتا ہے جو شاعر نے بیان کی ہو۔ اسی کی ایک مثال لفظ "چٹکی" ہے جس سے شاخِ گل کا جھونکا آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ آخر میں نسیمِ سحری خوابیدہ کائنات کو پیامِ بیداری دیتی ہے ؎

اے چٹکنے والی کلیو! اے گلیسوؤں والو اٹھو!
روز کا تڑکا ہوا، اے شب کے متوالو اٹھو!

بسنت رت پر جناب برقؔ نے چھ نظمیں لکھی ہیں، ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ بیان کرنا طوالت ہے اس لئے ہر نظم کے وہ اشعار جو دلکش، لطف انگیز اور قابلِ تحسین ہیں پیش کئے جائیں گے۔

بسنت کا زمانہ وہ ہوتا ہے جب خزاں ختم ہو جاتی ہے اور بہار کی آمد شروع ہو جاتی ہے، نئی نئی کونپلیں نکلتی ہیں۔ چاروں طرف سرسوں کے کھیت لہلہاتے نظر آتے ہیں، آموں پر بور آجاتا ہے۔ طرح طرح کے پھول کھلتے ہیں، بن کی بھینی بھینی خوشبو چاروں طرف پھیل کر دماغ معطر کرتی ہے۔ ٹیسو الگ جنگلوں میں آگ لگاتا ہے۔ جاڑے کا شباب ڈھل چکتا ہے اور گلابی سردی ہوتی ہے۔

بسنت رت کیا جہان میں آئی پیامِ دورِ بہار آیا　　نظر ہے مستِ شراب جلوہ کہ روئے گل پر نکھار آیا
اچھوتی کلیوں کے بھی لبوں پر تبسم بیقرار آیا　　نئے شگوفے کھلائے گویا یہ موسمِ خوشگوار آیا

نصیب سبزہ کے جاگ اٹھے ہیں ستارہ ہے اوج پر چمن کا
جما ہے نقشہ روش روش پر شگفتہ پھولوں کی انجمن کا

سرسوں کے کھیت کی دلفریبی و دلکشی ملاحظہ ہو:۔

سماں یہ سرسوں کے کھیت کا ہے کہ زعفراں زار کھل رہا ہے
فضا میں کندن دمک رہا ہے سرور آنکھوں کو مل رہا ہے

یہی خیال دوسری نظم میں یوں ظاہر کیا ہے:-

سرسوں کے کھیت کیا ہیں کیسر کی کیاریاں ہیں
قدرت کی خاک پہ یہ زیبا نگاریاں ہیں

یا

پھولی ہوئی سرسوں ہے تابندہ شرارے ہیں — یا خاک کے دامن میں چھٹکے ہوئے تارے ہیں

دوسرا بند ہے:-

اماں ہے سردی کی سرد مہری شباب جاڑے کا ڈھل چکا ہے — ہوا ہے آغاز دورِ نو کا زمانہ کروٹ بدل چکا ہے
کھلی ہے خوابیدہ چشم نرگس روش پہ سبزہ سنبھل چکا ہے — قبائے غنچہ ہے چاک خوردہ کلی کا دامن نکل چکا ہے
خزاں الم سے جراغ پا ہے کہ آتش گل بھڑک رہی ہے
بہار کی جو ہے آمد آمد چمن کی قسمت چمک رہی ہے

ایک اور بند ملاحظہ ہو:-

کھلے ہیں ٹیسو کے پھول بن میں ضیا فگن ہے شفق رنگ — جڑے ہیں قدرت نے سبز شاخوں پہ شیشہ ہائے شراب احمر
جب ان پہ پڑتی ہیں ہلکی ہلکی شعاع سیمینِ ماہ انور — مرقع شانِ دلفریبی دکھاتا ہے جاں فزا منظر
لگائے صحرا کو لعل اُس نے جو وجہ زیبائشِ چمن ہے
نہالِ فطرت کے فیض سے ہر زمین گلزار ہر کہ بن ہے

اس قدر دلکش تشبیہیں ہیں کس قدر رنگین خیال ہے الفاظ کی شوکت سے تصویر جمالی میں ایک جلالی شان پیدا ہو گئی۔ دوسری نظم کی ایک بیت ہے ؎

گلہائے اشرفی کا سکّہ چلا چمن میں
شبنم نے ہر کلی کے موتی بھرے دہن میں

کیا خوب شعر ہے، کیسی بلند پایہ تشبیہ ہے "شبنم نے ہر کلی کے موتی بھرے دہن میں"

بہ حال بسنت رت میں ہر طرف قدرت کی شگوفہ کاری کا ظہور ہے ؎

شگوفہ کاریِ فطرت کا ہر طرف ہے ظہور — شگفتگی سے چمن زار دہر ہے معمور
وفورِ جلوۂ گل سے برس رہا ہے نور — نگاہیں کیف میں ڈوبی ہیں دل ہیں مست سرور

کلی کلی گرہ رنگ و بو ہے گلشن میں
بسنت رت میں یہ شانِ نمو ہے گلشن میں

"گنگاجی" کی دلکش لہریں ملاحظہ ہوں :۔

رنگت میں چاندنی سے اجلا بدن ملا ہے | آب رواں کا ہلکا سا پیرہن ملا ہے
ہر موج کا ہے دعویٰ مہتاب کی کرن ہوں | آئینۂ صفا ہوں سیماب پیرہن ہوں
ہر لہر کہہ رہی ہے اِک موجِ نور ہوں میں | ہے ہر حباب گویا جامِ بلور ہوں میں
پانی کے آئینہ میں تارے ہیں عکس افگن | یا جلوۂ چراغاں ہے تیرے زیرِ دامن

دریائے گنگا کا رتبہ ہر بحر سے بڑا ہے اسی کے فیض سے سمندر بھی فیضیاب ہوتا ہے یا یوں کہئے:۔

بھارت کی سرزمیں کے تجھ سے نصیب جاگے | پانی بھرے نہ پھر کیوں ہر بحر تیرے آگے

اس شعر میں معنی کا ایک خزانہ بھرا ہے محاورے کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ گنگاجی کی عظمت اتنی بلند ہے کہ اس کے آگے سمندر پانی بھرتا ہے۔ دوسرے معنی میں گنگاجی کا پانی سمندر اپنے میں لیتا ہے کیا خوب شعر ہے۔

بھارت کی سرزمیں کے تجھ سے نصیب جاگے
پانی بھرے نہ پھر کیوں ہر بحر تیرے آگے

چند شعر اور ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

اے منبعِ تقدس گہوارۂ تمدن | تجھ سے فیضیاب تجھ سے آوارۂ تمدن
مسکن ہے تو قدیمی اسلاف کا ہمارے | ڈالے رہے ہیں ڈیرے صدیوں ترے کنارے

✣ ✣ ✣

تھا شاندار کیسا دورِ کہن ہمارا | فردوس برزمیں تھا گویا وطن ہمارا
مہرِ عروج اپنا نصف النہار پہ تھا | وقفِ خزاں یہ گلشن اپنی بہار پہ تھا
ہے تجھ کو یاد ازبر وہ داستاں ساری | لہریں تری ورق ہیں تاریخ کے ہماری

✣ ✣ ✣

دامن میں تیرے پنہاں خاکسترِ سلف ہے | گنجِ گہر نہاں ہے جس میں تو وہ صدف ہے
تو عظمتِ گذشتہ کی آج تک امیں ہے | جاہ و جلال تیرے پہلو میں تہ نشیں ہے

✣ ✣ ✣

آبِ گہر خجل ہے تجھ میں ہے وہ صفائی قطروں میں بس رہی ہے تاثیر جاں فزائی
وحدانیت کا نغمہ موجوں کے ساز میں ہے اعجاز حق نمائی رنگِ مجاز میں ہے

نظم "تارے" میں فرماتے ہیں:-

کہکشاں ہے کہ جادۂ زریں یا فلک پر ہے جدولِ سیمیں
تابغِ افزا ہے جلوۂ رنگیں بہر گردوں ہے مایۂ تزئیں
دستِ فطرت کے نقش سارے ہیں
مہر و مہ کہکشاں کہ تارے ہیں

"تاروں بھری رات" کا کیسا اچھا سماں باندھا ہے:-

کیا گل ہیں کھلے دامنِ گلزار فلک پر صدقے ہیں زر و لعل و گہر جن کی چمک پر
لیلائے شب اوڑھے ہوئے تاروں کی ردا ہے کیا حسن ضیا پاش ہے دل جس پہ فدا ہے

⁂ ⁂ ⁂

قندیلیں سر شام سے روشن ہیں فلک پر کیا گنبدِ گردوں پہ چراغاں کا ہے منظر
دامانِ فلک میں گلِ خوش رنگ پڑے ہیں یا سقفِ زمرد میں دُر و لعل جڑے ہیں
تاریک کوئی، ماند کوئی، کوئی درخشاں ثابت کوئی سیارہ کوئی کوئی ہے رقصاں

⁂ ⁂ ⁂

ہمدم یہی غمدیدوں کے ہیں رنج و تعب میں دل ان سے بہل جاتا ہے تنہائی شب میں
گردوں پہ عجب محفلِ انجم کا ہے عالم آتا ہے نظر دور سے اک مجمع برہم

لیکن یہ سب دلکش مناظر رات بھر کے مہمان ہیں صبح ہوتے ہی یہ مجمع منتشر ہو جاتا ہے ان سب چراغوں کو جو چرخ پر روشن تھے بادِ سحری کا ایک جھونکا گل کر دیتا ہے:-

شب ڈھلتے ہی رنگِ رخِ انجم ہوا پھیکا گل کر گیا جھونکا انہیں بادِ سحری کا
آیا ہے دمِ صبح یہ فرق ان کی چمک میں
مرجھائے ہوئے پھول ہیں دامانِ فلک میں

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا سے ہمارے یہاں کی قومی یا مذہبی قصص و روایات کسی قسم کے تاریخی نظموں کی طرف بہت کم توجہ کی گئی جس کے باعث اُردو ادب اب تک اپنی ناداری کے لئے بدنام ہے۔ نیچرل شاعری کے آغاز کے ساتھ ساتھ شعرا کی توجہ اس طرف بھی

مبذول ہوئی۔ مسرت کا مقام ہے کہ اب عرب و فارس کے قصص کے ساتھ ساتھ ہند کی بھی عظیم الشان روایات وغیرہ نظم ہونے لگی ہیں۔ جناب برق نے اکثر منظومات ایسی لکھی ہیں جن کو یا کسی تاریخی واقعہ سے تعلق ہے یا کسی مذہبی روایت کے مطابق ہیں مثلاً "پدمنی کا جوہر" "پریم کا تحفہ" یا بھیلنی کے بیر" "راجکماری پنا" "شکنتی بان" "مہارانا پرتاپ کی تلوار" وغیرہم۔ یوں تو یہ سب ایک خاص رنگ رکھتی ہیں مگر ان میں سے بعض ایسی ہیں جن کے مطالعہ سے دل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً "میراں بائی" میں پریم اور بھگتی کا وہ دریا موجیں مار رہا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں بجلی کوند جاتی ہے۔ ایسی سلیس، پرجوش، دلکش اور موسیقی سے معمور نظمیں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

بھگوان کرشن کے مندر میں   ہے محو تمنا میراں بائی
اک بین ہے دست نازک میں   لب وقف نغمہ آرائی

٭ ٭ ٭

کیا راگ ہے کیا لے کاری ہے   اک وجد کا عالم طاری ہے
جو سر ہے پریم کٹاری ہے   جو زخم ہے زخم کاری ہے
ہے چرخ سے بارش نور قمر   ہے سطح زمیں اک تختۂ زر
دامان شب مہتاب ہے تر   نغموں کی تراوش سے یکسر
احساس خودی کافور ہوا   عرفاں سے دل معمور ہوا
یکرنگ پریمی پریتم ہیں   اب پردۂ حائل دور ہوا

٭ ٭ ٭

اے دیوی کرشن مراری کو   ہم بھینٹ چڑھانے آئے ہیں
تیرے روحانی نغموں سے   کھنچکر دیوانے آئے ہیں
لے یہ ہیروں کی مالا ہے   یہ ادنےٰ نذر ہماری ہے
کر ارپن اُس کی سیوا میں   تو جس کی پریم بھکاری ہے

زبان کی برجستگی و شستگی کے علاوہ بعض ہندی الفاظ اس طرح باموقع استعمال کئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے سونے کی انگوٹھی میں ہیرے جڑ دیئے ہیں۔ خط کشیدہ الفاظ غور طلب ہیں۔ مہارانا پرتاپ کی نظم بھی خوب ہے ؎

حیرت سے زمیں میں گڑ گئے پاؤں   سکتہ سا ہوا جکڑ گئے پاؤں
گم ہوش ہوئے یہ دم زدن میں   کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

پہرے پہ کھڑے تھے ہر طرف بھیل   شہ زور، سیاہ رو، گراں ڈیل
اک بھیل کو آنکھ سے بلایا   رازِ دلِ مضطرب سنایا

کتنا ہی کوئی جری نہ کیوں ہو   ہوتے نہیں وار ایک سے دو

"نالۂ بیوہ" اور "یتیموں کی فریاد" دو پُر درد نظمیں ہیں۔ خصوصاً "یتیموں کی فریاد" کے ایک ایک شعر سے مایوسی اور حسرت ٹپکتی ہے ؎

ہم سر سے پاؤں تک ہیں اک نقشِ نامرادی   تصویرِ بیکسی ہیں روحِ بیکساں ہیں

یتیموں کو "نقشِ نامرادی" کہنا جنابِ برق کی ہی فکرِ بلند کا معجزہ ہے سچ ہے حسرت اسی کا نام ہے ؎

سایہ سے ہم پدر کے محروم ہیں سراسر   جس گود میں پلے تھے اُسکے ہی نوحہ خواں ہیں
نظروں سے گر چکے ہیں مانندِ اشکِ حسرت   کون آنکھ اُٹھا کے دیکھے ہر سو رواں دواں ہیں
پُرسانِ حال کوئی اپنا نہیں جہاں میں   ہیں وقفِ کس مپرسی وہ جنسِ رائگاں ہیں
غربت نصیب ہیں ہم خود اپنے ہی وطن میں
جل جائیں شاخ پر جو وہ پھول ہیں چمن میں

کس قدر پُر درد اور دلگداز مصرعہ ہے "جل جائیں شاخ پر جو وہ پھول ہیں چمن میں"۔ دولتمندوں کی بے پروائیوں اور عشرت پسندیوں کو دیکھکر یتیم کہتے ہیں ؎

تن ڈھانکنے کو ہم کو کپڑا نہ ہو میسّر   پوشاک کے ہوں اُن کے فیشن نئے نرالے

ہندوستانیوں کی موجودہ حالت کا ایسا صحیح نقشہ ہے۔ سچ ہے کہ ہمارے لاکھوں بھائی ایسے ہیں جو بھوکوں مرتے ہیں اور جنھیں تن ڈھانکنے کو پھٹا کپڑا بھی مشکل سے نصیب ہوتا ہے اور ہم ہیں کہ کروڑوں روپیہ نئے نئے فیشنوں پر پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ واقعات کی بدیہی مثال ہے۔

تن ڈھانکنے کو ہم کو کپڑا نہ ہو میسّر
پوشاک کے ہوں اُن کے فیشن نئے نرالے

"فلسفۂ گیتا" اس نظم میں رموزِ گیتا کا انکشاف کیا ہے، گیتا کا اصول ہے کہ دنیا میں رہ کر

یاد الٰہی میں مصروف ہونا چاہیئے۔ دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں میں دھونی رمانا فضول ہے، کیونکہ ؎

جب تک ہے گر سانس عمل کی ہو ضرورت آزاد نہیں کرم سے مٹی کی یہ مورت

اس لئے انسان کو دنیا میں اس طرح رہنا چاہیئے ؎

بے لوث کنول بن کے تو رہ بحرِ جہاں میں
کثرت میں ہو وحدت کی تجلی دل و جاں میں

اگر انسان دنیا میں ہر نیک کام بے غرض کرے اُس کے ثمر سے بے پروار ہے، اگر اس کی حق شناس آنکھوں نے حق کو تلاش کر لیا ہو تو وہ آواگون سے چھوٹ جاتا ہے اور خالق و مخلوق میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا ؎

تنکام کا آدرش اگر پیش نظر ہو دامن ترا آلایشِ عصیاں سے نہ تر ہو
وا دیدۂ حق بین ہو حق کی خبر ہو بازیچۂ فانی میں دوبارہ نہ گزر ہو
پھر قطرۂ و دریا میں نہ پردہ رہے باقی
مٹ جائے دوئی ایک ہی جلوہ رہے باقی

افسوس ہم نے اس رفیع الشان آدرش کو طاقِ نسیاں پر رکھدیا۔ شاعر کس حسرت سے دعا کرتا ہے اور ہم بھی آمین کہتے ہیں:-

اے کاش ہو یہ فلسفہ آدرش ہمارا جنت سے بدل جائے جہنم کا نظارا
شمشیرِ حوادث سے نہ ہو قلب دو پارا پھر اوج پر اے برق ہو بھارت کا ستارا
ہنگامۂ ہستی میں ظفریاب رہیں ہم
روشن صفتِ مہرِ جہانتاب رہیں ہم

رُباعی

(از جناب فروغ علوی کاکوروی)

دُھن فکرِ معیشت کی لگی رہتی ہے ہر وقت کچھ ایسی ہی پڑی رہتی ہے
جو شخص ہے بس وہ اپنی ہی فکر میں ہے حالت دنیا کی کیا یہی رہتی ہے؟

ماتمِ برق

(از منشی جگدیش سہائے سکسینہ بی اے ایل ایل بی)

صد حیف آج بزم میں خالی ہے جائے برق
باغِ جہاں سے اب نہ اُٹھے گی صدائے برق

بزمِ ادب میں کیوں نہ شبِ غم کا جوش ہو
گُل ہو گیا چراغِ تجلی فزائے برق

اسرارِ حسن و عشق کا اب ترجماں ہے کون
خاموش ہے زبان ترنم سرائے برق

حیراں تھے سُن کے زمزمہ سنجانِ بوستاں
باغِ سخن میں نغمۂ عشرت فزائے برق

افسوس اب کہاں وہ بلاغت وہ اوجِ فکر
وہ گل فشانیٔ لبِ رنگیں نوائے برق

خجلت سے برق ابر کے دامن میں چھپ گئی
دیکھی جب اُس نے چرخِ سخن پر ضیائے برق

دلّی کو اُس کی ذاتِ گرامی پہ ناز تھا
لیلائے شاعری تھی جہاں میں فدائے برق

کیا کیا ملے ہیں خاک میں ارمان اے اجل
پہلو میں درد اُٹھ کے یہ کہتا ہے ہائے برق

اے آسماں وہ مخلصِ صادق کدھر گیا
تڑپا رہی ہے قلب کو یادِ وفائے برق

کل ماتمِ رواں تھا چمن زارِ ہند میں
روتے ہیں آج اہلِ گلستاں برائے برق

سب کو اجل کے دام میں آنا ہے ایک دن
مہماں سرائے دہر سے جانا ہے ایک دن

حکمِ خدا یہی ہو تو انسان کیا کرے
کیسے عروسِ دہر کسی سے وفا کرے

مرجھا کے رہ گئے گُلِ رعنائے بوستاں
شکوہ مگر نہ بلبلِ خونیں نوا کرے

غم آفریں ہے گرچہ فراقِ رواں و برق
اس دردِ لادوا کی کوئی کیا دوا کرے

آتی نہیں ہے قالبِ مردہ میں روح پھر
انساں ہزار نالہ و آہ و بُکا کرے

دنیائے بے ثبات میں مجبور ہے بشر
جو دل میں آئے خالقِ ارض و سما کرے

ہوتے نہیں ہیں چاک جگر کے رفو کبھی
ہر چند کوئی صبر کی تلقیں کیا کرے

غمہائے روزگار سے کس کو ملی اماں
کہدو اجل سے جامۂ ہستی قبا کرے

اعمال کھینچ لاتے ہیں دنیا میں ورنہ روح
زنہار رُخ نہ جانبِ دارِ فنا کرے

اے رہروانِ ملکِ عدم شادماں رہو
قربِ خدا نصیب ہو تم کو خدا کرے

آواگون کی قید سے حاصل نجات ہو
جنت میں بے نیازِ حیات و ممات ہو

سر رامچندر راؤ مرحوم

۶۸

افسوس کہ ۱۵ مئی ۱۹۳۶ء کو صوبہ مدراس کے مشہور و معروف لیڈر سر موچرلہ رامچندر راؤ کا اڑسٹھ سال کی عمر میں بنگلور میں انتقال ہوگیا۔ آپ کی صحت کچھ دنوں سے اچھی نہیں تھی۔ چنانچہ پارسال بھی خون کے دباؤ کی زیادتی سے آپکی حالت تشویش انگیز ہوگئی تھی، مگر اس وقت علاج معالجہ سے آرام ہوگیا تھا۔ امسال موت نے آپ کو ہم سے ہمیشہ کے لئے چھڑا لیا۔

سر رامچندر راؤ ضلع گوداوری کے متمول زمیندار اور کامیاب وکیل تھے۔ جب اضلاع کے جدید بندوبست کے سلسلہ میں ضلع گوداوری کے دو حصے کردیئے گئے تو آپ ایلور میں پریکٹس کرنے لگے، اور اپنی قانونی قابلیت کے باعث مقامی بار کے لیڈر بن گئے۔ آپ کی پبلک لائف کی ابتدا لوکل بورڈ سے ہوئی۔ آپ اپنی قابلیت اور ہردلعزیزی کی بدولت ایلور میونسپلٹی کے چیرمین ہوگئے، اور اس منصب پر سالہا سال تک قائم رہے۔ اس کے بعد آپ ایلور ڈسٹرکٹ بورڈ کے بھی چیرمین نامزد ہوگئے۔ چنانچہ اس ضلع کے سب سے پہلے غیر سرکاری نامزد شدہ چیرمین آپ ہی تھے۔ انگلستان میں لوکل سلف گورنمنٹ کے تجربات کو پارلیمنٹری زندگی کا پہلا زینہ خیال کیا جاتا ہے، یہی بات مرحوم کے متعلق بھی صحیح ثابت ہوئی کیونکہ آپ نے ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈوں میں کام کرکے بہت جلد لوکل سلف گورنمنٹ کا تجربہ حاصل کرلیا۔ اور اپنی خوش انتظامی کی بدولت بہت ہردلعزیز ہوگئے۔ یہ ہردلعزیزی آگے چلکر بہت کام آئی۔ اور آپ منٹو مارلے اسکیم کے ماتحت مدراس کونسل کے ممبر ہوگئے۔

سر رامچندر راؤ ذات کے برہمن تھے، اس زمانہ میں احاطہ مدراس میں غیر برہمن تحریک "جسٹس پارٹی" کا جس کے جنم داتا سر تھیاگرو چیٹی تھے، بڑا زور تھا۔ صوبہ بھر میں برہمنوں کے خلاف منافرانہ جذبات بھڑک رہے تھے۔ انھیں دنوں مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے ماتحت تمام برٹش صوبوں میں قانونی کونسلیں قائم ہوئی تھیں، آپ بھی ضلع کشتنا سے کونسل کے امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ اکثر جگہ غیر برہمن امیدواروں کو شاندار کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ آپ کا مقابلہ بھی ایک غیر برہمن امیدوار سے تھا۔ لیکن آپ کو اپنے حلقے کی کثرت رائے حاصل ہوئی۔ اسی واقعہ سے عوام میں آپ کی عزت و توقیر و ہردلعزیزی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ غرض آپ ۱۹۲۳ء تک مدراس کونسل کے ممبر رہے۔ اور اپنی قابلیت اور مستعدی کے

ذریعہ جلد ہی کونسل کے غیر سرکاری ممبروں میں ایک امتیازی پوزیشن حاصل کر لی۔ آپ کی تمام تقریریں ہمیشہ مدلل اور پراز معلومات ہوا کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے لوگ آپ کو "مدراس کا گوکھلے" کہنے لگے تھے۔ بات یہ ہے کہ آپ اپنی تقریروں میں اس قدر تفصیل اور اعداد و شمار سے کام لیتے تھے کہ زیر بحث مسئلہ بالکل آئینہ ہو جاتا تھا۔

۱۹۲۳ء کے بعد آپ لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ اور جن اوصاف و خوبیوں کی بدولت آپ کو مدراس کونسل میں امتیازی حیثیت حاصل ہوئی تھی انھیں کی وجہ سے آپ اسمبلی کے بھی ایک نہایت قابل و معزز ممبر شمار ہونے لگے۔

آپ لبرل خیالات کے مدبّر تھے۔ آپ کئی ضلعوں کی سیاسی کانفرنسوں اور ایک مرتبہ مدراس پراونشل کانفرنس کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے۔ ایک آئین پسند مدبر کی حیثیت سے آپ عدم تعاون سول نافرمانی اور ستیاگرہ کے سخت مخالف تھے، اور ہمیشہ تخریبی پالیسی کی مذمت کرتے رہے۔ اور انھیں خیالات پر آپ آخر دم تک قائم رہے۔ آپ نے ۱۹۲۱ء ہی میں پیشگوئی کر دی تھی کہ گورنمنٹ کے خلاف براہ راست کارروائی کارگر نہ ہوگی۔ آپ نے صاف صاف کہدیا تھا کہ یہ تمام کارروائیاں بالکل بے نتیجہ ثابت ہونگی اور متعدد ناکامیوں کے بعد لوگوں کو پھر آئینی جدوجہد کی طرف رجوع ہونا پڑیگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہو رہا ہے۔ خود مہاتما گاندھی کا خیال ہے کہ "اب پارلیمنٹری ذہنیت کو فروغ ہو رہا ہے اور یہی ذہنیت باقی رہیگی"۔ چنانچہ کانگریس کے ممبر آیندہ قانونی کونسلوں میں داخل ہو رہے ہیں اور کیا عجب ہے کہ سرکاری عہدے بھی قبول کرنے لگیں۔

بہرحال سر راگھویندر راؤ بڑے پکے لبرل تھے۔ چنانچہ تین سال ہوئے جب کلکتہ میں نیشنل لبرل فیڈریشن کا چودھواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو اس کی صدارت کے لئے آپ ہی منتخب کئے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں جدید انڈیا ایکٹ کے سلسلہ میں بھی آپ لبرل ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے انگلستان گئے تھے اور جائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت دی تھی۔ آپکی اعتدال پسندی، معقولیت اور تجربہ کاری کے بڑے بڑے لوگ معترف تھے۔ کیونکہ آپ کے سب کام ہمیشہ پُرخلوص اور ذاتی نفع و نقصان کے خیال سے بے لوث ہوا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے صلاح و مشورہ کی مسٹر مانٹیگو وزیر ہند اور لارڈ سنہا جیسے عظیم القدر لوگ بھی قدر فرمایا کرتے تھے۔

سر راگھویندر راؤ ملکی جدوجہد کے سلسلے میں کئی مرتبہ انگلستان تشریف لے گئے۔ ایک مرتبہ آپ ہندوستانی طلبا مقیم انگلستان کے متعلق تحقیقاتی کمیٹی کے ممبر بنکر گئے۔ دوسری مرتبہ آپ نے ریاستی

پر جا کانفرنس کے وفد کی رہنمائی کی۔ آپ اس کانفرنس کے پریسیڈنٹ بھی تھے۔ پہلی اور دوسری گول میز کانفرنس کی ممبری کے لئے بھی آپ کا انتخاب ہوا تھا۔ ہندوستان میں بھی آپ متعدد کمیٹیوں کے سرگرم ممبر تھے۔ غرض آپ ہمیشہ کچھ نہ کچھ مفید کام کرتے رہتے تھے۔

ملکی مسائل کے بعد سر راجیندر راؤ کو امداد باہمی کے کاموں سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ آپ کوآپریٹو تحریک کے عظیم الشان امکانات کے تہ دل سے قائل تھے، اور اس تحریک کی ترقی و نشو و نما میں اپنی انتہائی قابلیت صرف کرتے رہتے تھے۔ آپ نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بعض یوروپین ملکوں میں بھی جا کر کوآپریٹو کاموں کا بغور مطالعہ فرمایا تھا۔ کوآپریشن کے معاملہ پر آپ کو اس قدر زبردست عبور حاصل ہو گیا تھا کہ ملک کے ماہرین فن آپ کو اس بارہ میں مسلم الثبوت اور قابل استناد اُستاد تسلیم کرنے لگے تھے۔ پارسال آپ کو گورنمنٹ نے "سر" کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ عام خیال کے بموجب آپ کو یہ خطاب اسی تحریک کے متعلق کارگزاریوں کی بدولت ملا تھا۔

سر راجیندر راؤ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ مدراس میں "لینڈ مارگیج بنیک" (اراضیات رہن رکھنے والے بنک) کا قیام تھا۔ جس کے آپ عرصہ دراز تک آنریری پریسیڈنٹ رہے۔ اسی بنک کی دیکھا دیکھی ہندوستان کے دیگر حصوں میں بھی اب اس طرح کے بنک قائم ہو رہے ہیں۔ آپ ریزرو بنیک آف انڈیا کے بھی ڈائرکٹر تھے۔

آپ کی سیرت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آپ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ اہل ملک کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لیا جائے۔ اگرچہ اس طرف آپ کی صحت اچھی نہ تھی اور تھوڑی سی محنت سے تکان محسوس ہونے لگتا تھا، لیکن جب مدراس کونسل میں اس مطلب کا مسودۂ قانون پیش ہوا کہ صوبہ کے انعامداروں کا منصب بغیر کسی معاوضہ کے ضبط کر لیا جائے تو آپ بیقرار ہو گئے، اور آپ نے انعامداروں کی وکالت میں اپنی پوری قابلیت صرف کر دی اور ان کی طرف سے کئی یادداشتیں مرتب کر کے پیش کیں۔ آپ کی بیش بہا زندگی کے اس کارنامے سے بھی ہر طرف بیحد قدر ہوئی۔

ایک عرصہ سے آپ نے وکالت چھوڑ دی تھی، اور پیرانہ سالی کی وجہ سے دوسری مصروفیات سے بھی کنارہ کش ہو گئے تھے لیکن آپ کا دل و دماغ ہمیشہ وطن کی بہترین خدمت کے لئے وقف رہتا تھا۔ آپ بہت صاف باطن اور سچے محب وطن تھے۔ آپ کی سب سے بڑی آرزو بھی یہی تھی کہ وطن عزیز کی ہر ممکن خدمت انجام دیں۔ سیاسی حیثیت سے آپ کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ آپ بعض

خیال آرائیوں یا نظریہ بازیوں سے کام نہ لیتے تھے، بلکہ ہمیشہ دانشمندی کے ساتھ ہر معاملہ کے عملی پہلو پر غور کرتے تھے۔

آئینی اصلاحات کے سلسلہ میں آپ کو ہندوستانی ریاستوں کی رعایا کے حقوق سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اسی لئے آپ ریاستی پرجا کانفرنس کا وفد لیکر انگلستان تشریف لے گئے تھے لیکن جب آپ گول میز کانفرنس کے سلسلے سے انگلستان گئے، و، وہاں کے مدبروں کی باتیں سنیں تو آپ کو محسوس ہو گیا کہ دیسی ریاستوں کے موجودہ نظم ونسق کے ردوبدل میں سخت قانونی اور آئینی دقتیں لاحق ہونگی۔ اور ریاستوں کی رعایا کے سیاسی حقوق کے متعلق کوئی جدید قانون بنانا سخت دشوار ہوگا۔

بہر حال آپ نے اپنی تمام زندگی اہل وطن کی بے لوث اور پرخلوص خدمت کے لئے وقف کردی تھی۔ نجی حیثیت سے آپ ایک سچے دوست، مہماں نواز بزرگ، شگفتہ مزاج یار، اور مکمل جنٹلمین تھے اور صوبۂ اندصرا کے لیڈروں میں آپ کو بہت ممتاز درجہ حاصل تھا۔ افسوس آپ کے بعد آپ کی جگہ پر ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی!

غزل

(از جناب جیواد میرٹھی مرحوم)

ہزار پردوں میں جبتک رہیگا تو باقی
رہے گی تشنگی ذوق جستجو باقی

شرار خاک میں جب تک ہے آرزو باقی
رہے گی عالم امکاں کی ہاؤ ہو باقی

اگرچہ دل میں ہے ابتک وہ آرزو باقی
نہ جام و مے ہے نہ ساقی ہے نے سبو باقی

خودی نے چاک کئے کائنات کے پردے
نہ پیرہن رہا نے حاجت رفو باقی

خزاں کا خوف کسے ہے؟ ہمارے لمیں ابھی
وہی ہے جوش وہی لذت نمو باقی

صدائے غیر میں گم ہو چلا ہے دل تیرا
کہاں ہے رندوں میں اگلی سی ہاؤ ہو باقی

کسے دماغ کہ اب سیر گلستاں دیکھے
کسی کلی میں نہیں بانکپن کی بُو باقی

سیّد ماجد علی مرحوم

(از مسٹر طالب الٰہ آبادی)

خاں صاحب سید ماجد علی صاحب مرحوم ایڈوکیٹ و گورنمنٹ پلیڈر (الٰہ آباد) ۱۸۸۸ء کے آخری مہینوں میں پیدا ہوئے، غریب مگر شریف گھرانا تھا، والد سید صاحب علی صاحب حکیم بھی تھے اور عالم بھی۔ تھوڑی سی زمینداری تھی اور کچھ کھیتی باڑی بھی ہوتی تھی، حیثیت معمولی مگر آن بان بہت تھی، انکی طبابت، غریب نوازی، خودداری، کنبہ پروری اور خداترسی کے ڈنکے اٹھ گنوؤں اور مہائیں میں بجتے تھے، سپوت بیٹا ان تمام صفات میں اپنے باپ سے ملتا جلتا تھا ۱۸۹۵ء میں خاندانی رسم کے مطابق بسم اللہ ہوئی، کلام پاک اردو فارسی کی درسی کتابیں مولوی مراد علی صاحب منڈوری سے پڑھیں، ماں کا سایہ پانچ ہی سال کی عمر میں اٹھ چکا تھا، بھاوج اور بہن نے پانچ برس کی جان کو اپنی اولاد سمجھ کر پالا۔

۱۹۰۲ء میں الٰہ آباد میں انگریزی شروع کی، اسکول میں داخل ہوئے ۱۹۱۲ء میں بی۔ اے پاس کیا، ذہانت کا یہ حال تھا کہ کسی کتاب، لکچر، یا مضمون کو کبھی دہرانے کی ضرورت نہ ہوئی، حافظہ اتنا غیر معمولی تھا کہ صفحے کے صفحے اور لکچر کے لکچر ذہن میں حرف حرف محفوظ رہتے تھے، مشہور ہے کہ میور سنٹرل کالج میں فلسفے کے آتش بیان مقرر ریڈفورڈ (Radford) صاحب پورے گھنٹے بھر پچاس لفظ فی منٹ کی رفتار سے تقریر کرتے تھے اور ختم تقریر کے بعد ماجد صاحب لوگوں کو چھوٹے ہوئے جملے لکھا دیا کرتے تھے اور یہ تو کوئی بات ہی نہ تھی کہ مجلس عزا میں ڈیڑھ دو سو بندوں کا مرثیہ پڑھا گیا اور ماجد صاحب نے ختم مجلس کے بعد شائقین کو پورے بند اسی ترتیب سے لکھوا دئیے مرحوم اکثر امتحانات میں امتیازی شان سے کامیاب ہوئے، کہتے ہیں کہ ایک بار ڈن صاحب نے سات صفحات کے نوٹ لکھائے بیچ میں مرحوم کی پنسل ٹوٹ گئی بورڈنگ ہاؤس پہونچ کر یاد سے نوٹ مکمل کر لئے ایک حرف کا فرق نہ تھا، ۱۹۱۴ء میں وکالت پاس کی سال بھر تک بڑے بھائی سید عابد علی صاحب مرحوم (ایڈوکیٹ) کے ساتھ مل جل کر کام کرتے رہے اس کے بعد ۱۹۱۵ء سے ان کے سایۂ عاطفت میں علٰحدہ وکالت کرنے لگے، بھائی کی وکالت معراج پر تھی طوطی بولتا تھا، ضلع کے وکلا میں پہلا



سید ساجد علی مرحوم

نام تھا چنانچہ ان کو بھی ان کی ذات سے پوری پوری مدد ملی سال ہی دو سال میں یہ بھی چمک اُٹھے شہر کی تنگ گلیوں سے نکل کر ۱۹۲۶ء میں سول لائن میں بنگلہ لے لیا اور رہنے لگے جہاں سے یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو چک پر سید رضی الدین حسن صاحب وکیل کے مکان میں اُٹھ آئے۔ یہی زمانہ افاقہ مرض کا تھا۔ ۲۵ جنوری ۱۹۳۶ء کو تیسرا حملہ ہوا تو پھر سنبھل ہی نہ سکے ۱۹۲۹ء میں ضلع کے گورنمنٹ پلیڈر مقرر ہوئے اور مرتے دم تک سرکاری وکیل رہے۔ انہوں نے اپنی فرض شناسیوں کی ایسی اچھوتی مثال چھوڑی ہے کہ مدتوں تک پبلک اور حکام عزت و محبت سے یاد کریں گے۔ ادائے فرض کے پہلو بہ پہلو امجد صاحب نے سماجی تعلقات کا توازن بھی اس طرح قائم رکھا کہ فریقین ہمیشہ خوش رہے۔

مئی ۱۹۳۵ء میں مرحوم کو سرکار سے اعتراف خدمات کے صلہ میں "خان صاحب" کا خطاب ملا۔ آپ ولایت میں تھے۔ ۲۴ اپریل ۱۹۳۵ء کو رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو پی سی کے ساتھ یورپ کی سیر کو گئے ہوئے تھے۔ ۹ جولائی ۱۹۳۵ء کو موصوف ہی کے ساتھ ہندوستان واپس آئے ۱۱ اگست ۱۹۳۵ء تک کام کرتے رہے ۱۲ اگست کو صبح چھ بجے سے ایک بجے دن تک منھ سے خون آیا، سوا سیر سے کم نہ نکلا ہوگا، کھاٹ سے لگ گئے۔ آٹھ مہینے پڑے رہے، ایلوپیتھی طب اور یونانی کے بہترین اطبا اور ڈاکٹر معالج رہے مگر مرض بڑھتا ہی گیا، تین دفعہ فصد کھولی گئی ہر مرتبہ آدھ سیر تین پاؤ خون نکالا گیا، دو بار خود فطرت نے منھ سے خون نکالا مگر بلڈ پریشر میں کوئی مستقل کمی نہیں ہوئی، ڈاکٹر سید محمد مصطفےٰ صاحب آخر تک ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ دن میں کئی کئی بار معاینہ کرتے تھے۔ ہڈی چمڑا رہ گیا تھا مگر دل دھونکنی کی طرح چلتا رہتا تھا اور دماغ کی پوری قوتیں اپنا اپنا کام کئے جاتی تھیں۔ سر تیج بہادر سپرو، سر وزیر حسن، سر شاہ محمد سلیمان، اور ملا صاحب سے لیکر یکہ والے تک برابر خیریت پوچھنے اور دیکھنے آیا کرتے تھے، ہر مذہب ہر ملت اور ہر عمر کے لوگ دست بدعا تھے "مگر وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے"۔

ذرا سی تکلیف میں بھی وہ کھٹکا ہوتا تھا کہ قلب کی حرکت یکایک رُک جائیگی، چنانچہ ۱۵ مارچ ۱۹۳۶ء کی بھیانک رات کو کائنات حیات کا رہا سہا شیرازہ درہم برہم ہوگیا۔ رات کو پون بجے تک باتیں کرتے رہے۔ یکایک بارہ بجکر ۴ منٹ پر خاموش ہوگئے اور پھر نہ بولے۔ نہ ہاتھ پاؤں کھینچے نہ ہچکی آئی نہ سکرات کا عالم ہوا پھر بھی قیامت آگئی، بیوی رانڈ اور بچے یتیم ہوگئے۔ منجھلے بھائی جو دس برس مرحوم سے بڑے ہیں فطرتاً بذلہ سنج اور جوان طبیعت ہیں۔ آٹھ مہینے کی مسلسل بیماری میں سایہ کی طرح مرحوم کے ساتھ رہ کر انتھک تیمار داری کرتے رہے مگر اب وہ نیم مردہ سے ہوگئے

ہیں اور بوڑھے معلوم ہوتے ہیں۔

مرحوم نے دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی ہے۔ لڑکی ان کے چھوٹے بھتیجے سید غالب علی صاحب ایڈوکیٹ اور ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ الہ آباد کی بیوی ہے۔ بڑا لڑکا اٹھارہ بیس کا اور چھوٹا سات برس کا ہے۔

مرحوم ایک معمولاً صاف سادے اور ہندوستانی وضع کے کپڑے پہنتے تھے۔ ترکی ٹوپی خاکی سلک یا سیاہ الپکے کی شیروانی قمیص کرتے اور چوڑی دار پاجامہ کبھی کبھی کسی خاص موقع پر یا ٹینس کھیلنے کے وقت کوٹ پتلون اور انگریزی ٹوپی بھی پہن لیتے تھے مگر شاذونادر۔

مزاج میں تعصب نام کو بھی نہ تھا، خوشامد کی بو اور غرور کی چھاؤں بھی نہ تھی، بوڑھا ہو یا بچہ امیر ہو یا غریب عورت ہو یا مرد ہندو ہو یا مسلمان، اپنا ہو یا غیر، ہر شخص سے اس طرح ملتے کہ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہی سب سے زیادہ مرحوم کی نگاہ میں عزیز ہے۔

بوٹا سا قد، صاف رنگ، مسکراہٹ میں مقناطیسی اثر تھا جس سے لوگ بے اختیار کھنچتے تھے ہنستا ہوا مکھڑا، تبسم ریز آنکھیں۔ ہونٹوں کی گلابی پنکھڑیاں ہر وقت کھلی رہتی تھیں۔

کبھی اپنے قابو بھر کسی کو تکلیف نہیں دی۔ جلد بازی بہت تھی، آن تھی، شان تھی، غصہ بھی جلد آتا تھا کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی تیور پر بل آگیا، چہرے کا رنگ بدل گیا، مگر جتنا تیز غصہ آتا تھا اتنا ہی جلد اتر جاتا تھا ادھر غصہ اترا اور ادھر ماجد صاحب جس پر غصہ آیا تھا اُسے منانے لگے۔ میں نہیں جانتا کہ اڑتالیس برس کی زندگی میں کبھی کوئی شخص مستقل طور پر ان سے ناخوش رہا ہو۔ بات یہ ہے کہ وہ ہر چیز کی اصلی قیمت اور ہر شخص کی حقیقت کو پہچانتے تھے اور اپنے برتاؤ سے کبھی کسی کو شکایت کا کوئی موقعہ نہ دیتے تھے۔

مذہباً وہ شیعہ مسلمان تھے اور اپنی آزادروی، عیش طلبی اور رندانیت کے باوجود بھی حسینؓ شہید کے شیدائی تھے، کربلا معلیٰ ہو آئے تھے، مرثیہ کہا، سلام کہے، عشرہ بھر جو کی روٹیاں اور ساگ کھاتے تھے۔ کالا کرتہ پہنتے تھے۔ محرم میں گانوں کے تمام کاموں میں حصہ لیتے تھے اور پورے جوش کے ساتھ۔ خوش گلو تھے سوز پڑھتے تھے، نوحے پڑھتے تھے، آواز میں درد تھا، تحت خوانی کرتے تھے صاحب نظر تھے کبھی کبھی حدیث بھی پڑھتے تھے، جناب عباسؓ علمبردار کا بڑا علم اُٹھاتے تھے موسیقی سے ایک خاص ربط تھا، طبلہ بھی بجا لیا کرتے تھے۔ خوش اعتقادی سمجھئے یا حُسن اتفاق موت بھی ملی تو ایسے دنوں میں جو شیعوں کے نزدیک نہایت متبرک سمجھے جاتے ہیں یکم محرم کا دن گزر کر شب کو انتقال ہوا گویا اُن کی روح بھی حسینؓ غریب کی پیشوائی کو کربلائے معلیٰ ہو چکی،

ماجد صاحب کو ۲۹۔ ذی الحجہ سے بار بار چاند کی رٹ لگی ہوئی تھی معلوم ہوا کہ ہلال محرم دکھائی دیا تو بیمار عاشق نے کانپتے اور سوکھے ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹا اور خواہش کی کہ مجھے بھی چاند دکھا دو۔ یہ مسرور ہو کر کہا کہ اب محرم والوں میں میرا بھی شمار ہو جائے گا۔ جب میں چاند رات کے دن عشرہ کرنے کے لئے گھر سے کی طرف چلنے لگا تو مرحوم نے کہا جاؤ اور سب بچوں کو ساتھ لئے جاؤ میں بھی دو ایک دن میں آجاؤں گا دوسری تاریخ کو لاش آئی اور کربلا میں بھائی کے پاس دفن ہوئی۔

کیا دوانے نے موت پائی ہے ایسا موتے ہے زندہ جاوید

طالب

(۲)

مرحوم فطری شاعر تھے چنانچہ آپ نے اس لطیف اور وہبی ملکہ کو نہ تو کتابیں پڑھ کر حاصل کیا نہ کسی اُستاد کے در پر جبیں سائی کی۔ وزن کا احساس سات آٹھ سال کی عمر ہی سے تھا کہ ایک دفعہ الہ آباد سے گاؤں جاتے ہوئے ہنومان گنج میں ڈاک خانہ کا بورڈ دکھائی دیا تو فوراً زبان پر جاری ہو گیا۔ ”پوسٹ آفس ڈاکخانہ ڈاک گھر ÷ ڈاکخانہ پوسٹ آفس ڈاک گھر“

آپ نے سب سے پہلے ۱۹۱۴ء میں مسلم بورڈنگ ہاؤس الہ آباد میں اپنی غزل پڑھی اس زمانہ میں وہ اپنا کلام میر علی عباد صاحب مرحوم نیساں الہ آبادی کو دکھاتے تھے، نیساں صاحب کا سلسلہ منشی منیر کے ذریعہ ناسخ تک پہونچتا ہے چنانچہ ان کے یہاں منیر اور ناسخ اسکول کی اکثر خوبیاں موجود ہیں۔ ماجد صاحب کی غزل کا صرف ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ہے، غزل اُستاد کی دیکھی ہوئی تھی۔ کہیں ضائع ہو گئی۔

یہ کس نے چاندنی کی سیر میں رُخ سے نقاب اُلٹی چکوروں کی پھری جاتی ہیں نظریں ماہ کامل سے

یہ ابتدا تھی۔ انتہا یہ ہے۔ کہ ۱۹۳۵ء میں یورپ کے سفر میں جو غزلیں کہیں ان میں بستر بیماری پر ایک شعر کہا

یارب اتنے پوچھنے والے ہوں جس بیمار کے * اس کی بیماری پہ صحت کا یقیں کیونکر نہ ہو

آپ نے کل ۵۰ غزلیں کہی ہیں، کچھ قصیدے اور کچھ اعتقادی نظمیں اور سلام ہیں ایک مرثیہ ہے اور بعض خاص موقعوں کی نظمیں ہیں۔ ادبی کلام کا منتخب مجموعہ جس کا انتخاب میں نے مرحوم کی فرمایش سے کیا تھا کتابی شکل میں انڈین پریس میں زیر طبع ہے۔ اس کی ترتیب آپ خود اپنی علالت کے دوران میں پسند کر چکے ہیں۔ اعتقادی نظمیں ”سات نشتر“ کے نام سے سفر کربلا

کے بعد چودھری سید عترت حسین صاحب رئیس بطور نے شائع کی تھیں آپ نے کبھی نام نمود، اعلان افتخار، یا اظہار کمال کے لئے شعر نہیں کہے۔ حساس فطرت موسیقی سے گہرے ربط کے علاوہ مزاج میں شوخی اور طبیعت میں مسلسل رومان کا عنصر تھا۔ شعر کہنے کے لئے مجبور تھے جب جذبات کی فراوانی برداشت سے باہر ہوجاتی تھی تو شعر موزوں کرکے سکون قلب حاصل کرتے تھے، حسن وعشق کی گلیوں میں ہر وقت پھیرے ہوا کرتے تھے۔ وصل و ہجر کے مزے اٹھائے جاتے تھے پھر غزل نہ کہتے تو کیا کہتے۔

اُن کی غزلوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے صرف قافیہ پیمائی یا خامہ فرسائی نہیں کی جوبات کہی معنے اور اثر کے لحاظ سے نئی کہی ارکان میں وہ قدما کی پوری تقلید کرتے تھے۔ نہ انکی غزلوں میں درس عمل کی تلاش ہے نہ دور حال فلسفے کا پیام۔ روزمرہ کی باتیں ہیں فطری حادثات کی تصویریں ہیں البتہ حسن بیان شاعرانہ اور انداز تحریر میں تغزل کا رنگ ہے۔

زود گو ہونے کے باوجود پُرگو نہ تھے۔ کبھی مشاعرے میں بیٹھ کر غزل کی غزل کہہ لی کبھی گھر سے مشاعرے تک جاتے ہوئے شعر کہہ لئے۔ یا یوں بھی شعر کہنے بیٹھے تو گھنٹے آدھ گھنٹے میں جتنا کہنا تھا کہہ اٹھ گئے یہ نہیں کہ گھنٹوں بحر شعر میں غوطے لگا رہے ہیں۔ ۲۰ برس تک شعر وسخن سے ذوق رہا مگر کیٹس اور وحید کی طرح کل کائنات ڈیڑھ دو سو صفحات سے زیادہ نہیں ہے۔

غزل پڑھتے وقت انکو درد بھری آواز کا ترنم اور حسن ادا کا ایسا رنگ جمتا تھا کہ لوگ مسحور ہوجاتے تھے۔

نیساں صاحب سے تھوڑے ہی دنوں تلمذ رہا ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۶ء تک جو کچھ کہا جذبات سے مجبور ہوکر کہا۔

بس اک راز مستقل ہے جہاں میں جو کچھ ہے بس وہ دل ہے ۔۔۔ جو کچھ بھی ہے دل ہی آدمی کے وہ صرف دل کے گداز میں ہے

اثر کے سامنے لفظوں کی نشست، ترکیبوں کا انوکھا پن، اور فن کی نزاکتیں کسی چیز کی کوئی وقعت ان کی نگاہ میں نہ تھی۔

شعر کہنا ہے جو ماجد تو اثر کے کہو ۔۔۔ ورنہ کیا لطف فقط قافیہ پیمائی کا

وہ دور جدید کے ممتاز غزل گو تھے مگر نہ اقبال کا پیام عمل ان کے یہاں ہے نہ جوش کا طوفان بیان، نہ جگر کی والہانہ باتیں ہیں نہ اصغر کی اچھوتی ترکیبیں۔ انکی غزل گوئی میں صفی ثاقب جلیل اور اثر کا سا انداز ہے۔ ماجد صاحب کا معشوق گوشت اور پوست کا مادی معشوق ہے، وہ

انسان بھی ہے اور دل بھی رکھتا ہے۔ صرف شاعری کی تخلیق اور حسن بیان کا پتلا نہیں ہے۔ آپ بھی دیکھ لیجئے۔

دل دھڑکتا ہے الٰہی خیر دیوانے کی ہو
آج دو دن سے صدا موقوف ہے زنجیر کی

یا

نیچی نگاہیں کوئی بے اختیار اٹھاد ے
دلچسپ آج اے دل اتنی تو داستاں ہو

ماجد صاحب کے کلام میں اکثر کھلی اور رندی شوخیاں ملیں گی مگر ابتذال کی چھانوں بھی نظر نہ آئے گی مرحوم عرفان اور علم الٰہی کی کتنی منزلیں طے کر چکے تھے اس کا اندازہ صرف ایسے مرزا پرست شمار حین کر سکتے ہیں جو غالب کے ہر شعر میں تصوف کی ایک درسگاہ دیکھ لیتے ہیں۔ میں تو معمولی پوچھ کا آدمی ہوں، اتنا ہی جانتا ہوں کہ ماجد صاحب کا یہی عالم تھا جس میں ہم سب ہیں اور وہ ایسی ہی کیفیات کی تصویریں کھینچتے ہیں جیسی آئے دن ہم لوگوں پر گزرتی رہتی ہیں ہاں کبھی کبھی لہجہ میں شوخی اور بے تکلفی آجاتی ہے۔

وہ لڑکپن کا تھا حسن اور یہ جوانی کی بہار
تل یہی پہلے بھی تھا رخ پر مگر قاتل نہ تھا۔

مگر ماجد صاحب کی شاعری کے اصلی جوہر اس وقت کھلتے ہیں جب آپ ان کے وہ شیریں نغمے سنیں جو درد میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جنکی ہر لے کے ساتھ خون جگر کی چھینٹیں اڑتی ہیں۔

سانس بھی جیسے ہو تھمی تارے بھی جیسے ہوں رکے
آہ کچھ ایسی کیفیت ہوتی ہے انتظار میں

دہر کی آبادیاں آبادیاں ہیں نام کی
جن پہ تھے سو آبادیاں صدقے وہ ویرانے کہاں

اٹھ گیا آج زمانے سے مریض غم ہجر
سو گیا جاگنے والا شب تنہائی کا

ناریکی اس کے آگے کیوں کر نہ اک جہاں ہو
جس کا کہ شام ہوتے برباد آشیاں ہو

آپ نہ کبھی رعایت لفظی کے پیچھے پڑے نہ صنعتوں کے گورکھ دھندے میں گرفتار ہوئے۔ اسی لئے ان کے کلام میں آپ کو محنت، جستجو، تلاش یا آورد کی جھلک کہیں نہیں ملیگی۔ یہ ضرور تھا کہ نظم کرنے کے وقت لفظوں کا انتخاب ترنم کے اعتبار سے کرتے تھے اور اکثر گنگنا کر شعر کہتے تھے۔ جو ادا سب سے زیادہ پسند آئی وہ چھانٹ لی۔ فن موسیقی سے واقف ہی تھے۔ بڑے بڑے گانے والوں کو سن چکے تھے، کن رس تھے، انتخاب بحر و قوافی میں بھی نغموں سے مدد لیتے تھے، لفظوں کے نغمے اور مصرعہ کے سجاؤ میں بھی لے اور تال سے چولی دامن کا ساتھ رکھتے تھے۔ اور جگر صفی جوش اور اقبال کی طرح صرف اپنی آواز کے خداداد درد اور اثر سے کام لیتے تھے، پڑھنے میں اچھل کود تاؤ بھاؤ اور ایکٹنگ بھی نہ تھی نہ بلاوجہ ہر مصرعہ یا شعر کو دہراتے تھے۔

اکثر مشاعرے ماجد صاحب کے ہاتھ رہتے تھے مگر انھوں نے کبھی کسی شاعر سے مقابلہ کا خیال بھی نہ کیا۔ 'تو بڑا کہ میں' کا عام قضیہ انکے نزدیک آداب محفل کے خلاف تھا، کدورت یا کسی سے مَیل رکھنا انکی فطرت کیلئے اجنبی باتیں تھیں وہ ہر شخص سے محبت اور ہر فرد کی عزت کرتے تھے۔ نہ ان کے کلام میں آپ کو کبھی تعلّی طنز تعریض یا چشمک کے اشارے ملیں گے: نہ ان کی حیات کے کسی شعبے میں ان چیزوں کا پتہ چلیگا کیا مشاعرہ اور کیا غیر مشاعرہ کیا خلوت اور کیا جلوت ہر جگہ وہ ایک سے تھے۔ صاف پاک اور دلچسپ کوئی انکو بہت اچھا شاعر سمجھے یا نہ سمجھے مگر اچھا آدمی سمجھنے پر ہر ایک مجبور ہوجاتا تھا۔ یہاں پر انکی حیات کے بعض واقعات کا ذکر میں نے صرف اس لئے کردیا ہے کہ اشعار میں ذاتی عنصر کا ہر جگہ غلبہ ہے کلام کو ذرا سا کرید کردیکھئے تو ان کا خون شعر کی رگوں میں موجزن ملیگا یہ دوسری بات ہے کہ "بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر" سے۔ وہ بھی مجبور رہتے تھے۔ شراب اور اسکے اثرات و متعلقات کا ذکر بھی اُردو غزل گوئی کا زیور ہے مگر صرف آرائش کے لئے۔ اظہار مضمون کے واسطے۔ ماجد صاحب میکدۂ حُسن و عشق کے پہونچے ہوئے رند تھے مگر میرے علم میں اُنھوں نے شراب کبھی نہیں پی۔ انکے شعر ان کی حیات کا آئینہ ہیں جن کا ثبوت ان کے مجموعہ کلام کے ہر تیسرے شعر سے مل سکتا ہے ؎

موت سے ڈرنا بھی کوئی بات ہے   آخری ایک اور انگڑائی سہی

یہ انگڑائی ماجد صاحب مرحوم کو نصیب نہیں ہوئی کیونکہ وہ بولتے بولتے ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے۔ مگر ایام بیماری میں جب صرف ہڈیوں کی مالا رہ گئے تھے اس وقت بھی آن بان کا یہ عالم تھا کہ فصد کھلوائی، سوئی لگوائی اور زبان سے ہوش میں سی بھی نہیں کہا۔ علالت کے زمانہ میں بار ہا سکتے میں ہیں اور درد سے بیچین ہیں۔ دل دھڑ دھڑ کر رہا ہے کروٹ نہیں لے سکتے مگر سب کو تسکین دیے جاتے ہیں۔

زمین و آسمان میرا ہے یہ کون و مکان میرا   وہیں منزل بناؤں گا میں جی چاہے جہاں میرا

قصیدوں میں یا مرثیہ اہلسلام میں کوئی خاص بات نہیں، اعتقادی نظموں میں لطف و اثر ضرور ہے کیونکہ ماجد کے تمام جذبات گہرے لطیف اور اثر انگیز تھے۔ لوگوں کو ان کے اعتقادی کلام میں بہت کچھ سامان ضیافت ملے گا

کبھی کبھی فارسی میں بھی شعر کہتے تھے مگر بہت کم فارسی میں بھی جذبات اور اثر کا وہی عالم ہوتا تھا۔

از ہستی دو عالم چیزے نہ خبر دارم
قلب من و یاد تو چشم من و روئے تو

موت

(از جناب سید محمد جعفر قدسی جائسی)

اے اجل سر دفتر دارِ فنا ہے تیرا نام — تجھ سے آثارِ قیامت ہیں نمایاں صبح و شام
کچھ تجھے پروا نہیں برہم ہو دنیا کا نظام — کھینچ کر لاتی ہے مرغِ روح کو تو زیرِ دام
جاں بلب اشکوں سے ہو پابندِ غم یا آہ سے
کیا غرض تجھ کو کسی کے نالۂ جانکاہ سے

پیچ و تابِ نزع کی تو پھینکتی ہے جب کمند — پیکرِ ذی روح میں ہوتا ہے لرزاں بند بند
زندگی بھر تو رہا غافل دلِ غفلت پسند — چونکتا تھا خوابِ غفلت سے کہ دیکھی آنکھ بند
ڈوب کر قعرِ فنا میں کوئی گھبرایا تو کیا
سر سے پانی چڑھ گیا پھر ہوش میں آیا تو کیا

تیرا آنا باعثِ بربادیِ کاشانہ ہے — منزلِ آباد میں تجھ سے عیاں ویرانہ ہے
گو یہ دنیا رہگذر ہے اور مہماں خانہ ہے — اس پہ بھی ہر سو تری بیداد کا افسانہ ہے
رحم سے ناآشنا کچھ اس طرح دل ہے ترا
عاجزوں کا ذکر کیا سرکش بھی قائل ہے ترا

توڑ دے رگ رگ بدن کی تجھ میں وہ تاثیر ہے — جسمِ انسانی تجھی سے پیکرِ تصویر ہے
روح کھنچ آتی ہے اپنی قوتِ تسخیر ہے — تیرے آگے سرد ساری گرمیِ تدبیر ہے
گو بظاہر تو بےزائل کی بصارت آنکھ سے
اٹھ گئے غفلت کے پردے درحقیقت آنکھ سے

لوٹ لے جاتی ہے دم میں کاروانِ عیش کو — خون کے آنسو رلاتی ہے جہانِ عیش کو
خاک کرتی ہے بہارِ بوستانِ عیش کو — کلبۂ احزان بناتی ہے مکانِ عیش کو
تیرے دستِ ظلم سے نالاں ہیں سب شاہ و گدا

لہ یہ نظم سید ماجد علی صاحب گورنمنٹ پلیڈر الہ آباد کی وفات حسرت آیات کے سلسلے میں لکھی گئی تھی (۔ن)

تو نے کیسے کیسے گھر ویراں کئے وا حسرتا

قصرِ خاکی میں جو رکھا تو نے اے ظالم قدم — دل کے ذرّے ذرّے میں پیدا ہوئی تصویرِ غم
اشکِ حسرت کی تراوش نے کیا آنکھوں کو نم — ہچکیاں آنے لگیں کھنچنے لگا رگ رگ سے دم
غیر حالت ہو چلی ظاہر ہوئے آثارِ حشر
گرم آخر کو سرِ بالیں ہوا بازارِ حشر

مرنے والے کے الم میں کوئی مضطر سینہ چاک — سوزِ پنہاں کے اثر سے دل کسی کا جل کے خاک
غم سے کوئی سخت جاں کرتا ہے اپنے کو ہلاک — پیٹتا ہے سر کوئی حسرت زدہ اندوہ ناک
عرش کے پائے ہلا دیتا ہے کوئی آہ سے
دل تلاطم میں کسی کا نالۂ جانکاہ سے

سنگِ فرقت سے کسی کا شیشۂ دل چور ہے — دردِ حرماں سے کوئی فریاد پر مجبور ہے
کاوشِ غم سے کسی کے قلب میں ناسور ہے — کوئی طالب ہے ترا، تو اس سے لیکن دور ہے
رنج سے گر کسی کے لب پہ ہے مہرِ سکوت
کوئی پابندِ رضائے پاک حیّ لا یموت

جو گیا دنیا سے پھر اس کا پتہ مفقود ہے — سامنے سر منزلِ ملکِ عدم موجود ہے
غافلو آئینۂ عبرت یہ ہست و بود ہے — شورشِ نظارۂ رنگِ چمن بے سود ہے
"سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں"

چشمِ عبرت وا ہو اور آثارِ عبرت خیز دیکھ — واقعاتِ جانگداز آیاتِ حشر انگیز دیکھ
ہر رگِ جاں کے لئے اک نشترِ سر تیز دیکھ — پنجۂ مژگانِ اہلِ درد کو خوں ریز دیکھ
ذرہ ذرہ انقلابِ دہر کی تصویر ہے
صبح کچھ اور شام کچھ اندازِ چرخِ پیر ہے

ایک ہم ہیں اور ہزاروں حسرتیں جانکاہ ہیں — رو میں سیلابِ حوادث کی بہ شکلِ کاہ ہیں
مبتلائے رنج و پابندِ الم صد آہ ہیں — رہ نوردانِ سبیلِ عشق کے ہمراہ ہیں
کون غمخواری کرے دلِ خستگانِ ہجر کی
ہے دلوں میں نوک پیوستہ سنانِ ہجر کی

آزاد

(افسانہ)

(از جناب سید علی احمد ایم - اے)

شمس الحسن صاحب گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم تھے - ہر سال چھ مہینہ دلّی اور چھ مہینہ شملہ پر رہا کرتے - پہاڑ پر جانے کا بھتہ ملتا تھا، سرکاری کوارٹر کا کرایہ بہت کم تھا، اسلئے اوپر نیچے آنے جانے کی زحمت کے علاوہ کوئی اور تکلیف نہ تھی - پھر وہ افسران اور رؤسا کے ساتھ ہر سال پہاڑ پر جاتے تھے - گھر پر اور دوستوں وجاننے والوں میں انکی عزت زیادہ تھی - ہر شخص کا بل بوتا نہیں کہ ہمیشہ پہاڑ پر جایا کرے - پہاڑ کی اور نیچے کی زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے - شملہ پر لوگوں کے لئے تو سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مکانوں کے کرایہ حد سے زیادہ، دوسرے زندگی بڑی مہنگی - ہر شخص بار بار شملہ کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا - دوسرے مرادآباد سے شاید ہی کوئی ہر سال پہاڑ پر جایا کرتا ہو - سر محمد یعقوب البتہ ہر سال جایا کرتے تھے، ان کے بعد پھر مسٹر شمس الحسن - چنانچہ لوگوں کی نگاہوں میں مسٹر شمس الحسن، جواب اپنے آپ کو "ایس - حسن" لکھنے لگے تھے، سر یعقوب کے بعد دوسرا درجہ رکھتے تھے - شاید اگر اُن کے پہلے بھی سر' لگا ہوتا تو وہی بازی جیت جاتے -

بہرکیف، جو کچھ ہو - اب تو مسٹر ایس - حسن تھے اور شملہ دلّی کی رہائش - یار دوستوں میں، جو دفتر ہی کے لوگ تھے، مسٹر حسن کافی ہر دلعزیز تھے - لیکن بس ملاقات وہ رہی کی تھی - البتہ کبھی کبھی چاء وغیرہ کی دعوت کر دیا کرتے تھے - کیونکہ اسمیں کوئی زیادہ خرچ نہیں ہوتا تھا - بیوی سلیقہ والی میں، سب کچھ گھر ہی میں تیار ہوجاتا تھا - تاہم مسٹر حسن بازار سے بھی کچھ منگوالیا کرتے - اس لئے نہیں کہ وہ اچھا ہوتا تھا، بلکہ اس لئے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ صرف گھر کی بنی ہوئی چیزوں پر ٹالدیا ہے

نکی شادی ہوئے چھ برس ہو چکے تھے، اور اب ایک لڑکی اور ایک لڑکا موجود تھا - بچّے ہوتے تو اس سے بھی زیادہ، لیکن اتفاق سے شملہ کے بازار میں ایک کباڑی کی دوکان سے اُنہیں "میری سٹوپس" کی ایک آدھ کتابیں سستے داموں مل گئیں - ان کتابوں کا اُن پر بڑا اثر ہوا - اس کے علاوہ وہ برابر اس بات پر بھی غور کیا کرتے تھے کہ آخر انگریزوں کے اتنے کم بچے کیوں ہوتے ہیں - اسی وجہ سے اُنکی بیویاں تندرست وتوانا اور خوش وخرم رہتی ہیں - اُنکے جسم کیسے سبک اور سڈول ہوتے

یں - اس وجہ سے انھوں نے بھی طے کر لیا کہ "میری سٹوپس" کی تمام ہدایتوں پر پورے طور پر عمل
رکے اپنی بیوی کو بھی تندرست اور خوبصورت بنائے رکھیں گے۔ یہ بچے بھی بس غلطی سے ہوگئے
بہر حال اب ان بچوں کی وجہ سے مسٹر حسن کی فکروں میں تو اضافہ ہوگیا لیکن ان کی بیوی کی حیثیت بڑی حد
تک ان بچوں کی آیا کی ہوگئی۔ ہر وقت ان کی وجہ سے بیچاری کچھ نہ کچھ سنا کرتیں۔ مسٹر حسن کے سپرنٹنڈنٹ
نے اپنے بچوں کے لئے ایک گھوڑا رکھ چھوڑا تھا۔ وہ خود اتنا تو خرچ نہ کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے ایک
گدھا پال لیا جس پر ان کے بچے بھی ہوا خوری کو جاتے تھے۔

مسٹر حسن کو قدرت نے فطرتاً اتنول اور اطمینان دے رکھا تھا۔ ان کو اپنے سوائے کسی اور چیز
سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ گھر میں بچے بیمار پڑتے تو ان کو پرواہ نہ ہوتی۔ حالانکہ بڑا بچہ انکا بڑا لاڈلا تھا۔ بیوی
بیچاری بخار میں جلا کرتیں تب بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ البتہ انکی تکلیف اور بے چینی اور بڑھ جاتی۔
اسلئے جب سے شام کو گھر میں گھستے اور دوسرے دن جب تک دفتر نہ چلے جاتے ہر وقت چڑچڑاہی کرتے
" نہ کھانے کا ٹھیک ہے، نہ بیٹھنے کا۔ سارے گھر میں بچوں کے پوتڑے پڑے رہتے ہیں۔ یہاں
ایک نے پیشاب کر دیا، وہاں دوسرے نے گندہ کر دیا۔ ڈرائنگ روم میں منوں خاک جمع ہوگئی۔
کوئی آجائے تو کیا کہے گا۔"

غرض یہ خراب ہی، وہ خراب ہے۔ بہر حال انھیں اپنی تکلیفوں کا تو پورا احساس ہوتا تھا، لیکن
بیوی بیچاری کی مدد کرنی درکنار۔ الٹ کر پوچھتے بھی نہ تھے۔ وہ غریب بخار میں جلتی رہتیں لیکن یہ ل
کر کبھی پانی بھی نہ دیتے۔ ایسی حالت میں بھی بیچاری میاں کی ہر آسائش کا برابر خیال رکھتیں۔ اور صبح
سے شام تک بچوں، ناشتہ، کھانے وغیرہ میں لگی رہتیں۔ یوں بھی مشکل سے کوئی گھڑی فرصت کی ملتی
تھی جو اپنی پڑوسنوں سے جا کر ملتیں۔ اس پر بھی تکہ فضیحتی ہوتی رہتی۔ میاں کسی بات سے بھی خوش
نہ ہوتے تھے۔ انکو کام صرف اتنا تھا کہ صبح کو بڑے دن چڑھے اٹھتے، اور دیر تک آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر
اپنے دانتوں، آنکھوں، بال غرض ہر چیز کا بغور معائنہ کرتے۔ گھنٹہ بھر تو صرف کپڑے پہننے میں لگا دیتے۔
پھر چھڑی ہاتھ میں لیکر، مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے، سیٹی بجاتے، دفتر روانہ ہوجاتے۔

دفتر میں کسی کو "ہلو" کسی کو "گڈ مورننگ" کرتے ہوئے گھستے۔ پھر ذرا ٹائپ کرنیوالی لڑکیوں کی طرف
سے گذرتے۔ اگر کسی نے نظر اٹھا کے دیکھ لیا تو باچھیں کھل گئیں۔ دور ہی سے "ہلو۔ گڈ مورننگ، مس فلاں"
کرتے، اور خوش خوش اپنے میز پر بیٹھتے۔ اگر سویرا ہوا تو کسی اور کی میز پر بیٹھ جاتے اور پھر وہیں دفتر کی باتیں
چھڑ جاتیں، یعنی کام کے کثرت کی شکایت یا کسی کی برائی۔

"ذرا سنگھ کو دیکھو۔ کس قدر بنتا ہے۔ جس دن سے فرسٹ ڈیوژن ملا ہے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا۔ کام تو آتا نہیں، لیکن اپنے آپ کو فرعون بے سامان سمجھتا ہے۔ کل ہی میرے پاس فائل لے کے دوڑا ہوا آیا۔ مسٹر حسن ذرا یہ تو بتانا کہ کیا نوٹ لکھوں۔ اور اگر میرا کوئی کام ہو تو ٹکا سا جواب دیدیتا ہے۔ میاں قسمت کی کھاتا ہے۔ بس تو اُس جیسے دس کا کام ایکدن میں نکال کر پھینک دوں۔ مگر میاں خوشامد کیسے کرنی آتی ہے۔ اُسے دیکھو تو صبح سے شام تک ڈارون کے آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ اگر ڈارون (سپرنٹنڈنٹ) کو ڈالیاں نہ چڑھاتا تو مرکے بھی فرسٹ ڈیوژن نہ ملتا۔ مگر بھئی ہم سے تو اس طرح خوشامد ہو نہیں سکتی۔ اسکو دیکھو تو۔ دفتر کے بعد اُٹھ کے سمتھ صاحب کے پاس سلام کرنے کو پہونچ جاتا ہے۔ اور باز رہے سو دا سکٹ لا دینے میں عار نہیں۔ انھیں دھوتی بند وں نے تو ہم سب کا ستیا ناس مار رکھا ہے۔ یہ بے ایمان اینگلو انڈین تو یہی چاہتے ہیں کہ ہم اُن کے جوتے ہی صاف کیا کریں۔ اور سب اُنھیں خوشامد کی بدولت۔ اور اوپر سے بڑے پیٹریٹس بنتے ہیں۔ یہاں تو دن بھر جی حضور کرتے ہیں، باہر نکلتے ہی گالیاں سناتے ہیں، کہ لعنت ملک کی آزادی کے گیت گاتے ہیں جیسے گویا ملک کو آزاد ہی کر لیں گے لیکن انگریز بھی دبتے ہیں تو انھیں لوگوں سے۔ اور یہ تو دیکھو کہ ایک دوسرے کو کیسے گھسا لیتے ہیں۔ بس ایک کے پیر جمنے کی دیر ہے۔ پھر تو چاروں طرف ہندو ہی ہندو دکھائی دینے ہیں۔ رائے صاحب جمنا داس نے دیکھو سپرنٹنڈنٹ ہوتے ہی اپنی برانچ میں چھ ہندو بھر لئے۔ ہم لوگ تو تبّی کا گو ہیں، منصور صاحب ڈپٹی سکریٹری ہو گئے لیکن ایک آدھ مسلمان کو رکھوالینا کیا ہم لوگوں کی بھی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ کیسے عذر کر رہے تھے۔ لیکن جب کام پڑا تو کہنے لگے کہ سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ میں ہے ہی کیا؟ میں مجبور ہوں۔ میرا حق کاٹ کے سنگھ کو فرسٹ ڈیوژن تو دیدیا، لیکن اُس سے کام نہیں سنبھلتا!"

غرض اسی طرح کی باتوں میں وقت کٹتا۔ دوپہر کو ٹفن کے وقت جب چھٹی ہوتی تو ٹفن روم سے چاء توس، سینڈوچ وغیرہ منگا کر کھا لیتے۔ بیوی برابر کہتی تھیں کہ ناشتہ ساتھ لیجایا کیجئے۔ اور لوگ بھی تو لیجاتے ہیں۔ لیکن یہ تکلیف کون گوارا کرتا۔ شروع شروع میں ٹکیاں اور شامی کباب لے گئے۔ پھر کچھ روز تھرماس میں چائے، کچھ توس اور انڈا وغیرہ لیجانے لگے۔ لیکن یہ تجربہ بھی کچھ کامیاب نہیں ہوا۔ دفتر میں جتنے انگریز اور اینگلو انڈین تھے ان کے گھروں سے نوکر ٹفن لے آتے تھے۔ کچھ اینگلو انڈینوں کے نوکر اپنے ساتھ ان کے کتّے بھی لے آتے تھے۔ کچھ لوگوں نے دفتر ہی میں

انتظام کرلیا تھا۔ مسٹر حسن نے بھی دفتر ہی میں انتظام کرلیا۔ مگر پوری چیزیں لینے میں کافی خرچ بیٹھتا تھا، اس لئے چا، اور توس پر ہی اکتفا کی۔ کھا پی کر میز پر پاؤں رکھ کے کرسی میں بیٹھ جاتے، اور چھت کی طرف دھواں اُڑا اُڑا کے بڑی آسودگی سے سگرٹ پیتے، یا کچھ اور لوگوں سے وہی دفتر کی ہانکتے۔

شام کو مال روڈ کا چکر لگاکے، عورتوں کو گھورتے، اور ٹہلتے ٹہلاتے، اپنا بھاری جسم لئے ہانپتے ہوئے بہت دیر میں گھر آتے۔ پہاڑ پر چڑھائی اُتار کی ہمیشہ شکایت رہتی تھی۔ چا، پی، اور اگر جی چاہا تو کچھ دیر بیوی سے بات چیت کی یا بچوں سے کھیلے، نہیں تو ڈرائنگ روم میں، کوئی پرانا میگزین یا انگریزی کا کوئی معمولی ناول جو کسی کباڑی کے ہاں سے خرید لاتے تھے، لیکے بیٹھ جاتے۔ وہ بیوی سے اکثر کہا کرتے تھے کہ۔

"ڈرائنگ روم میں کیوں نہیں بیٹھتیں؟ انگریزوں کی عورتوں کو دیکھو کتنے آرام اور عیش سے رہتی ہیں۔ شام کو کھانے کے بعد ہمیشہ ڈرائنگ روم میں سب بیٹھتے ہیں۔ کیسا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تم تو سنتی ہی نہیں"۔

بیوی بیچاری ذرا پرانے خیال کی تھیں، ان سے کرسیوں پر چڑھ کے نہ بیٹھا جاتا تھا۔ ایک آدھ بار انہوں نے کوشش کی، لیکن اُن کی ٹانگیں ہمیشہ اُٹھکر کرسی پر آجاتیں اور وہ آلتی پالتی مار لیتیں۔ لیکن مسٹر حسن کو یہ برا معلوم ہوتا تھا۔

"کوئی دیکھے گا تو مذاق اُڑائے گا" انہیں کرسی پر بھی بیٹھنا نہیں آتا!"

بیوی بیچاری عادت سے مجبور تھیں۔ دوسرے جب کبھی وہ اس کمرے میں بیٹھتیں تو خواہ مخواہ مسٹر حسن کو اس بات کا خیال آتا اور وہ اپنے بیوی سے کہتے،۔

"دیکھو تو انگریزوں کی بیویاں کیسے اپنا سب کام خود کرتی ہیں۔ کپڑے دھونا، بازار سے سودا لانا۔ آخر تم بھی کیوں نہیں کرتیں۔ اس سے صرف کفایت ہی نہیں ہوتی بلکہ سامان بھی اچھا آجاتا ہے، اور صحت بھی اچھی بنی رہتی ہے۔ مسٹر نرائن کی میم کو دیکھو۔ آخر وہ بھی تو انگریز ہے، لیکن میاں کے لئے سگریٹ تک خود ہی بازار سے لاتی ہے"۔

آخر کو بیوی نے ڈرائنگ روم میں بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا تھا آئے دن ذرا ذرا سی بات پر میموں کے حوالے دئے جاتے اور نکتہ نصیحتی ہوتی۔ کبھی صفائی پر، کبھی بچوں پر کبھی بیوی کی "ہندوستانی" عادت پر۔

آخرکار بیچاری کو دق ہوگئی۔ کچھ روز تو وہ اپنے بخار کو چھپائے رہیں، جوشاندہ وغیرہ

پی لیتیں۔ لیکن مرض میں روز بروز زیادتی ہی ہوتی گئی۔ مسٹر حسن روز کہتے

"یہ کیا ڈھونگ بنا رکھا ہے، کام وام کچھ نہیں کرتیں۔ بچے الگ رُلتے پھرتے ہیں، نہ مجھے وقت پر ناشتہ ملے، نہ کھانا۔ مجھے کام کرنا ہوتا ہے۔ دن بھر دفتر کی بیٹھوں، اور گھر پر یہ اور مصیبت"!

جب تک بنا بیچاری کرتی گئیں۔ ہندوستانی بیوی کی بھی کیا زندگی ہے!۔ اپنے آپ کو میاں کا غلام سمجھتی ہے۔ مصیبتیں اُٹھائے، بُرا بھلا سنے، بچے جنے، انکو پالے، میاں کا کاج اور منھ سے اُف تک نہ نکالے۔

غرض بیگم حسن کا حال ابتر ہی ہوتا گیا۔ اب تو مسٹر حسن کو بھی خیال آیا، اور ایک روز ڈاکٹر کو بلا کر دکھا دیا۔ اور اپنے ذمہ داری سے سبکدوش ہوگئے، اور پھر ڈاکٹر سے حال کہنے کے لئے بھی کوئی نہ گیا۔ غرض دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اب اُنکا حال یہ ہوگیا کہ چارپائی پر پڑی رہتی تھیں آنکھوں میں حلقہ پڑ گئے اور رنگ سیاہ ہوگیا، بخار سے جسم تپتا رہتا اور کھانسی کے مارے بُرا حال ہوگیا۔ اکثر تو اُنہیں ایسی کھانسی اُٹھتی کہ معلوم ہوتا اب آنکھیں باہر ہی نکل پڑیں گی۔ لیکن مسٹر حسن دفتر سے آتے تو چڑچڑ ہی کرتے رہتے۔

"ایک تو ویسے ہی کونسا آرام ملتا تھا، اور اب یہ مصیبت آن پڑی ہے۔ کسی بات کا بھی ٹھیک نہیں"!

بیوی بیچاری تو مردہ ہو ہی رہی تھیں، یہ سنکر اور بھی سہم جاتیں۔ جو کچھ ہو سکتا پلنگ پر ہی پڑے پڑے کرتیں، میاں کے ناشتہ کے لئے ٹکیاں تلنا، انڈا پکانا یا حلوا بنانا۔ مگر اپنے لئے کچھ نہیں۔ بچے بیچارے دن بھر مارے مارے پھرتے۔ گھر میں ایک مرد اور ایک لڑکا نوکر تھا۔ جب بیوی کا یہ حال ہوا تو نوکروں نے بھی لاپروائی شروع کر دی۔ بچوں کو کپڑے بدلے ہوئے کئی دن گذر جاتے مگر نام نہ لیتے شام کو مسٹر حسن اس پر بھی کہتے۔

"بچوں کا تو ذرا حال دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے اُن کی ماں مرگئی اور وہ یتیم ہو گئے ہیں۔ کس قدر میلے کپڑے پہنے ہیں۔ نوکروں کے بچے بھی اتنے گندے نہ رہتے ہوں گے"!

بیوی کا یہ حال تھا کہ پانی پینے کے لئے اُٹھنے کی ہمت باقی نہ رہی تھی۔ میاں کو یہ توفیق کہاں کہ نام ہی کے لئے سہی گھر کے کام میں ذرا ہاتھ تو بٹائیں۔ اُن کو اپنے آپ سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔

آخر کار بیوی نے اپنی علالت کا حال اپنے گھر لکھدیا۔ اُن کی ماں تو بچپن ہی میں مرچکی تھیں۔ والد نے سُنا تو بہت پریشان ہوئے، اور خود آ گئے اُنکی خالہ بھی جنہوں نے اُن کو پالا تھا سنکر بولائی ہوئی آگئیں۔ دونوں والد اور خالہ، اُنکی حالت دیکھکر رونے پیٹنے لگے۔ لیکن مسٹر حسن بگڑ کر بولے۔

"آپ صاحب آپ لوگ ناحق اسقدر پریشان ہو رہے ہیں۔ گھبراہٹ کی کیا بات ہے۔ معمولی بخار ہے"

"ڈاکٹر کو دکھا ہی چکا ہوں۔ کچھ روز میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ نہ معلوم انہوں نے آپ کو لکھ ہی کیوں دیا۔"

اب چونکہ گھر میں اور آدمی آ گئے تھے مسٹر حسن اور بھی بے فکر ہو گئے۔ شام کو مال روڈ کے بجائے ایک چکر کے دو چکر لگاتے، رات گئے گھر آتے، اور بغیر بیوی کے کمرے میں جھانکے ہوئے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ اگر بہت ہوا تو اتوار کے دن جیسے مکان کی صفائی کیجاتی ہے، مسٹر حسن کوئی دس منٹ یا پندرہ منٹ کے لئے بیوی کے پاس جا بیٹھتے، لیکن تمام وقت اس طرح کا لیکچر دیتے کہ بیوی کے آنسو بہنے لگتے، چلنے پھرنے پر، بچوں کی دیکھ بھال پر۔ وہ کہتے "کام کاج میں دل لگاؤ۔ اُٹھ کے کیوں نہیں بیٹھ جاتیں۔ ذرا ٹہلو طبیعت ٹھیک کیسے ہو۔ پڑے پڑے کھانا بھی ہضم نہیں ہوسکتا"۔ اور بیوی کا یہ حال تھا کہ پلنگ پر بھی مشکل سے اُٹھ کر بیٹھ سکتی تھیں۔

جب کبھی سُسرے سے بات چیت ہوتی، کام کی شکایت کر دیتے۔

"آج اُن کا کیا حال رہا؟ مجھے تو آجکل کام کی وجہ سے سر اُٹھانیکی بھی مہلت نہیں ہوتی۔ اتنے کیسیز آ گئے ہیں، کہ ڈھیر اکٹھا ہو گیا ہے۔ اسقدر کام ہے کہ اب جا کر فرصت ملی ہے"۔

پھر کھانا کھاکے اگر بہت خیال آیا تو بیوی کے پاس ایک آدھ منٹ کو کھڑے کھڑے ہو آتے اور اس کے بعد بستر میں لیٹ جاتے، اور کتاب پڑھتے پڑھتے سو جاتے۔

ایک روز رات کو اُنہیں بیوی کی کچھ ایسی محبت آئی کہ تھوڑی دیر کے لئے اُن کی چارپائی کے پاس جاکے بیٹھ گئے۔ ان کے سُسر اُسی وقت کہیں چلے گئے تھے۔ بیوی کی خالہ دوسرے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ مسٹر حسن کی بیوی چارپائی سے لگی مردے کی طرح پڑی تھیں۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں چھت پر گڑی ہوئی تھیں۔ سانس کے چلنے کی آواز خرخر آ رہی تھی، جیسے پہاڑ کی چوٹی پر درختوں میں ہوا کا غناٹا۔ مسٹر حسن نے بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سامنے میز پر بوتلوں، ڈبوں، اور گدڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ مسٹر حسن کی نگاہ ان چیزوں پر پڑی اور ان کی تیوری پر بل آ گئے۔ وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ بیوی کے کمزور جسم کو جنبش ہوئی، اور مُڑ کر کانپتی ہوئی، نحیف آواز میں کہنے لگیں:۔

"میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ اور شادی کر لیجئے۔ میں بُرا نہیں مانوں گی نہیں۔

میری وجہ سے آپ تکلیف نہ اُٹھایئے۔"
ان کی آواز بھرا گئی، اور ایک گرم آنسو اُن کے گال پر بہتا ہوا تکیئے پر گرا۔ مسٹر حسن نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ سامنے اونچے پہاڑ کا سلسلہ رات کی تاریکی میں، سیاہ اور مدہم، آسمان تک چلا گیا تھا۔ پہاڑ کے دامن پر یکایک ایک الاؤ کی آگ بھڑکی، لیکن فوراً ہی دب گئی، اور اندھیرے کے علاوہ کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔

بیوی کے اِن مایوس کن الفاظ نے مسٹر حسن پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ اپنا غصّہ بھول گئے، اور بیوی کا ہاتھ آہستہ سے دبا کر بولے:-

"نہیں، اس طرح کی باتیں مت کرو۔ تم اچھی ہو جاؤ گی۔ اتنی ہراساں کیوں ہوتی ہو؟ کل میں ڈاکٹر مینکین کو بلا کر تمہیں دکھا دوں گا۔ بڑا ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ سب اُس کی تعریف کر رہے تھے..."

ان جملوں نے ان کی بیوی کے اندر غلامی کے اُس احساس کو اُبھار دیا جو صدیوں سے ہندوستان کی عورتوں میں موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اِن جملوں نے اُن کے اندر نئی جان ڈال دی۔ ان کے چہرہ پر اُس خوشی کے آثار نمایاں ہونے لگے جو ایک غلام کو اُس وقت محسوس ہوتی ہے جب اُس کا آقا اُس سے کبھی اچھی طرح بات کرے، یا کتے کی وہ وجدانہ کیفیت جو اپنے مالک کے پیار کرنے اور چمکارنے سے اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ اس وقت بیگم حسن کا جی ہی چاہتا تھا کہ پکڑ کر اپنے میاں کے قدم چوم لیں۔ وہ بستر ہی پر پڑے پڑے اپنے اچھے ہونے اور میاں کی خدمت کرنے کے خواب دیکھنے لگیں۔

صبح اُٹھ کر مسٹر حسن نے ڈاکٹر مینکین کو ٹیلیفون کیا۔ اُسے دس بجے سے پیشتر فرصت نہ تھی، اسلئے اُس نے دس اور گیارہ کے درمیان آنیکا وعدہ کیا۔ مسٹر حسن کو تو دفتر جانا تھا اسلئے اپنے خسر سے کہہ کر چلے گئے.... شام کو دفتر سے ذرا جلد واپس آئے، اور خلاف معمول اپنے بیوی کے کمرے میں چلے گئے، اور خسر سے پوچھا کہ ڈاکٹر کیا کہتا تھا۔ اُنہوں نے کہا:-

"وہ دیکھ گیا ہے۔ دوا بھی تجویز کر دی ہے۔ لیکن وہ کہتا تھا کہ میں انکے شوہر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس پر مسٹر حسن بولے:-

"کیوں؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ وہ کچھ انجکشن وغیرہ دینے کو کہتا تھا۔"

"تو مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتا ہے؟"

"میاں تم آخر کو شوہر ہو۔ اس خیال سے کہتا ہوگا کہ تم ذمّہ دار ہو"

"میں کیا کرونگا؟ دوا کے لئے کہتا ہوگا کہ بازار سے لا دو۔ اور کیا۔ لیکن مرض کیا بتاتا تھا؟"

"یہ تو مجھ سے کہا نہیں۔ غالباً۔ وہ کہتا تھا انشاءاللہ آرام ہو جائے گا"

"تو آخر مرض کیا تجویز کیا؟"

پہلے تو خسر خاموش رہے مگر کچھ دیر بعد بولے:۔

"شاید تم سے اُسی کے بارہ میں بات چیت کرےگا"

"تو صاحب میں کیا کروں گا۔ کیا آپ سے نہیں کہہ سکتا تھا؟"

"میاں تم آخر شوہر ہو"

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کرلونگا۔ آپ آخر چھپا کیوں رہے ہیں؟ کہہ کیوں نہیں دیتے کہ دق بتاتا تھا..."

خسر ویسے ہی متفکر اور پریشان تھے۔ یہ سنکر غصہ سے لال ہوگئے۔ مریض کے منہ پر اس صفائی سے کہدینا تم کو دق ہو گیا ہے! لیکن وہ بیچارے بھی کیا کہہ سکتے تھے۔ آخر کو بیٹی دے چکے تھے۔ اب تو صبر کے سوائے کچھ اور چارہ نہ تھا...

مرض جڑ پکڑ چکا تھا، اور ڈاکٹر مینیکن کے علاج سے بھی بیوی کو کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ چنانچہ اُنکی خالہ اور والد نے یہ صلاح کی کہ اُنکو دلّی لے جا کر حکیموں کو دکھائیں۔ پہلے تو مسٹر حسن نے کہا۔ "دق کے مریض کو گرمی میں لیجانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ دوسرے حکیموں کے علاج میں دھرا کیا ہے۔ صرف بھر بھر کے قدحے پلاتے ہیں۔ نہ مرض پہچانیں، نہ ٹھیک علاج کریں..." لیکن ان لوگوں کے اصرار سے راضی ہو گئے۔

اتوار کا دن ان لوگوں کے دلّی جانیکے لئے مقرر ہوا۔ ہفتہ کی رات کو چونکہ خسر اور خلیہ ساس اسباب وغیرہ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے، مسٹر حسن اپنی بیوی کے پاس جا بیٹھے۔ وہ چار پائی کے پاس خاموش بیٹھے تھے پچھلی آسائشوں کا خیال کر کے ایک حد تک مغموم تھے۔

آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی کڑک کی آواز ہوتی تھی۔ بادلوں میں تیزی سے بجلی چمکتی اور پھر پہلے کی نسبت زیادہ تاریک اور اندھیرا ہو جاتا۔ بجلی کی چمک میں بیوی کا زرد چہرہ سفید اور مرجھایا ہوا چمک اٹھتا، اور آنکھوں کے گڑھے اور چہرہ کی ہڈیاں اور نمایاں ہو جاتیں۔ باہر درختوں میں ہوا کا چلنا ایک کرۂ سرد کی طرح مایوس کن معلوم ہوتا تھا۔

مسٹر حسن کی بیوی نے اُنکی طرف کئی دفعہ غم اور یاس سے دیکھا، اور وہ بھی بیوی کو تسلی دینے لگے۔ لیکن بیوی نے میاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور منھ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ اُنکا ہاتھ بالکل سرد تھا۔ وہ ناامیدی سے لپٹی میاں کا ہاتھ بھینچے رہیں، جیسے اب اُنکو اپنے بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی اور دنیا میں سہارے کے لئے اُنکے پاس اپنے میاں کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ اس معصومانہ حرکت میں وہ درد اور گداز تھا، زندگی میں وہ مایوسانہ التجا جو انسان موت سے کرتا ہو، وہ حسرت بھری خواہش جو کوئی مرتے وقت اپنے محبوب سے کرتا ہو کہ مجھے اس آخری وقت میں نہ چھوڑنا۔ اسمیں موت کی ہولنا کی تھی، وہ ڈر جو موت کے سامنے انسان پر غالب آجاتا ہو وہ درد انگیز حسرت جو دنیا کی چیزیں چھوڑتے وقت، اپنے جیلوں سے جُدا ہوتے ہوئے انسان کو اس بات کا احساس دلا دیتی ہے کہ ہم رخصت ہو رہے ہیں اور اب پھر کبھی واپس نہ آئینگے۔ یہ زندہ رہنے، ہنسنے بولنے، محبت کرنے اور محبت کئے جانے کی موہوم خواہش تھی مگر اُسوقت وہ نا اُمید ہو چکی تھیں کہ اب انھیں موت سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

اس ذراسی درد بھری حرکت میں وہ دریائے محبت موجزن تھا جسنے مسٹر حسن کو بھی افسردہ کردیا۔ انکا ہاتھ کانپنے لگا، اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بوندیں ٹپک پڑیں۔۔ ایک بھٹکا ہوا جگنو کمرے میں آگیا، لیکن ایک لمحہ چمکنے کے بعد پھر تاریکی میں غائب ہوگیا۔ زور سے بجلی چمکی، اور پہاڑوں میں ہوا کا سناٹا بڑھ گیا۔۔

—:—

مسٹر حسن کالکا تک اپنی بیوی کو پہونچانے گئے۔ اور دلی کی گاڑی میں سوار کرانیکے بعد شملہ واپس آگئے۔ گھر انکو اکیلا اور سونا معلوم ہوا، لیکن ایک آدھ روز میں وہ اُس کے عادی ہوگئے۔

دلی سے روزانہ بیوی کی خیریت کے خط آتے رہے۔ لیکن حکیموں کے علاج سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مولویوں کو دکھایا گیا، جادو ٹوٹکے، گنڈے، تعویذ کئے گئے لیکن کسی چیز سے افاقہ نہ ہوا۔ روز بروز حالت خراب ہی ہوتی گئی۔ آخرکار ایک روز مسٹر حسن کے پاس تار آگیا کہ تمہاری بیوی اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئیں اور آپ آزاد ہیں"

کچھ روز تو مسٹر حسن افسوس میں رہے۔ گھر کی بربادی اور آرام کے ختم ہونے کا خیال دس پندرہ روز تک ان پر نمایاں اثر لئے رہا۔ اور بچوں کے خیال نے انکی پریشانی کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ لیکن چند ہی دنوں کے بعد ہی وہ نئی زندگی کے خواب دیکھنے لگے۔

اور اب وہ دوسری شادی کرنیکی فکر میں ہیں۔ کئی ایک پیغام آچکے ہیں۔ لیکن اُنھوں نے طے کرلیا ہے کہ لڑکی دیکھے اور اُس سے ملے ہوئے بغیر شادی نہ کریں گے۔۔۔'

———

تنقید کتب

کلیم عجم

جناب سیماب اکبرآبادی کی تازہ کتاب ہے۔ جو نثر اور نظم دونوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں مولانا سیماب کے چودہ خطبات ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف مشاعروں کیلئے لکھے گئے تھے۔ یہ خطبات تاریخی، جغرافیائی اور علمی معلومات سے معمور ہیں۔ اور انمیں جگہ جگہ دلچسپ نکات بیان کر کے اُردو کو نشو و نما و ترقی دینے کی ترکیبیں بتائی گئی ہیں مثلاً آپکی رائے میں۔

(۱) قومی انجمنوں کے دوش بدوش قومی مناظمے منعقد ہونا چاہیے جنمیں غزلوں کے کسی خاص موضوع پر نظمیں پڑھی جائیں۔

(۲) مبتدی شاعروں کو مشاعروں میں غزل پڑھنے سے بجائے بزرگان وطن اور مشاہیر شعرا کا کلام غور و فکر کے ساتھ سنکر انکی کہنہ مشقی تجربہ کاری سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

(۳) اہل قلم کو تقلید چھوڑ کر اجتہاد کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے، ایران میں زلفوں پر مقراض چل چکی، بند قبا ٹوٹ چکے، کجکلاہی کا دور ختم ہو چکا، مگر ہندوستانی شاعر پرانے ایران کی تقلید میں، ابتک خیالی زلفوں کی درازی سے طول شب ہجر کی پیمائش کر رہا ہے اور کہتا ہے

جب طولِ شامِ غم سے بڑھیں دل کی وحشتیں
سایہ سمجھ لیا تری زلفِ دراز کا

مولانا سیماب کا دل جذبات حُبِّ وطن اور اُردو علم ادب کی محبت سے تڑپ رہا ہے انکی خواہش ہے کہ اُردو شعرا غیر قوموں خصوصاً ایرانیوں کی کورانہ تقلید کو چھوڑ کر فطرت کی صحیح ترجمانی کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں مولانا سیماب لکھتے ہیں۔

(۱) خدا کے لیئے اپنی شاعری کو کارآمد بنائیے اور اس الزام کو شاعری سے دُور کر دیجئے کہ وہ مُلک کیلئے مفید نہیں ہے۔

(۲) شاعری ایک بہترین عطیہ فطرت ہے ایک لطیف ترین روحانی جذبہ ہے۔ جو خصائص السنۂ مغربیہ و مشرقیہ کی شاعری میں جدا جدا موجود ہیں وہ بیک وقت، قدرت نے اُردو شاعری کو ودیعت فرمائے ہیں۔ عرب اپنی رزمیہ شاعری کے لیے

مشہور ہے۔ مغرب اپنی فطرت نگاری پر نازاں ہے، ہندی شاعر جذبات کا خالق ہے۔ یونان فصاحت کا مبلغ ہے، جرمنی نفسیات کی تحلیل پر حاوی ہے، ایران وقومیات کی تبلیغ کا علم بردار ہے، مگر میں بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ اُردو شاعری میں رزم بھی ہے، بزم بھی، فطرت نگاری بھی ہے، رومان بھی، تحلیل نفسی بھی ہے اور جذبات کی ترجمانی بھی، قومی تبلیغ بھی ہے اور سیاسی تلقین بھی۔ یہ صرف ہماری سہل پسندیاں اور غفلت کاریاں ہیں کہ اُردو شاعری روبزوال نظر آرہی ہے۔ ہم قافیہ پیمائی، معاملہ بندی، ہوٹ، مبالغہ، تکلّف اور آورد کی دلدل میں اسطرح پھنس گئے ہیں کہ ہمیں نکلنے کے لیے راستہ نہیں ملتا۔ اگر ہم فکر و تامل سے کام لیں تو اسی خارزار قدامت و تقلید سے ایجاد و اختراع کے پُر بہار چمن پیدا ہو سکتے ہیں۔

۳۔ صاحبو! زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ اب فرضی عشق و محبت جتانے کا وقت باقی نہیں رہا۔ اب مجازی جذبات وصل و فراق کی نقالی کا موقع نہیں رہا۔ حقیقی موضوعات اسقدر کثیر موجود ہیں کہ ہمیں فرضیات اور ظنیات کی طرف متوجہ ہونے کی مُہلت بھی نہ ملنی چاہیے۔ ہم شاعر ہیں، ہمیں فطرت کے الہام کدے سے ایک فلک رس ذہن عطا ہوا ہے۔ ہمیں اپنے خیالات میں ترفع پیدا کرنا چاہیے، ہمیں کاغذ پر ذہن سے وہ چیز لانی چاہیے جو ہمارے بعد کاغذ سے ذہنوں میں منتقل ہو سکے اور جو ہمارے لیے، ہمارے ملک کے لیے، اور فرزندان وطن کے مستقبل کیلئے ایک ابدی پیام بن سکے۔ اگر ہم من حیث الشاعر دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں، اور اگر ہمیں اپنی شاعری کو ایک زندہ قوم کی شاعری بنانا منظور ہے تو ہمیں اپنی ذہنیت، موجودہ تخیل، اور موجودہ قول و ضوابط میں انقلاب پیدا کرنا ضروری ہے ورنہ موجودہ شاعری اپنے موضوعات، قواعد اور رسمی فوائد و عوائد کے ساتھ نہ صرف خود فنا ہو جائیگی بلکہ ایک دن اپنے ساتھ ہمیں بھی فنا کر دیگی

۴۔ آخر تقلید ہی ہمارا نصب العین کیوں ہو؟ ہم اپنے ذہنوں کو دوسروں کے دل و دماغ سے نکلی ہوئی پیداوار کی جگالی کے لیئے مجبور کیوں کیے ہوئے ہیں اور ہم بیگانوں کے نقش پر چلنے کو تدبیر منزل کیوں سمجھے ہوئے ہیں؟ کیا ہندوستان کا ماحول ہماری شاعرانہ تخیلی تشنگی کو نہیں بجھا سکتا؟ کیا ہندوستان کا سواد شعریت آفرین اور شعر نگار نہیں ہے۔ کیا گنگا جمنا کی موجوں میں ٹیمس، نیل اور نہر رکن آباد کا پُر کیف تموج نہیں پایا جاتا؟ کیا ہمارے ملک کے جنت فریب باغوں میں بلبل سے بہتر کوئی خوش الحان طائر موجود نہیں؟ کیا ہم کوئل اور پپیہے کو محض اس تعصب کی وجہ سے اپنی شاعری میں دعوت شرکت دینا نہیں چاہتے کہ ہندی یا بھاشا شاعری میں اُنکے نغمے گونج چکے ہیں؟ کیا جمالیاتی ذوق کی نشو و نما تکمیل اور مصرف صحیح کے لیئے معیار نظر پر صحیح اُترنے والا جمال، اس سرزمین حسن و محبت میں موجود نہیں؟ کیا ایران کے فرہاد و شیرین، نجد کے قیس و لیلیٰ، مصر کے یوسف و زلیخا، اور عراق کے وامق و عذرا سے بہتر رومان، کنک اور تارا، نل اور دمن، ہیر اور رانجھا کی وطنی

افسانوں میں نہیں ملتا؟ کیا مذاکر تجلّی کے لئے صرف موسیٰ بن عمران اور طور سینا مخصوص؟ اور بودھ، یا کرشن یا ایسے ہی دوسرے عرفان یافتہ انسانوں کا ذکر کرنا عیوب کلام کی کوئی شاخ ہے؟ اور کیا دار و رسن کی روایات زندہ کرنے کے لئے ہمیں منصور حلّاج کے علاوہ کوئی ملکی مثال کسی عہد میں نہیں ملتی؟

مولانا سیمآب کے خطبات اسی قسم کے جواہر پاروں سے بھرے ہوئے ہیں جنکا تعلق نکھنے سے ہے۔ البتہ مولانا کے بعض خیالات سے ہمیں اتفاق نہیں ہے، مثلاً آپ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"اگر آج ساری دنیا کا ایک لشکر عظیم تیار کیا جائے، تو شعرا بطور مقدمۃ الجیش اسکے آگے آگے ہوں گے۔ اور اس کی تحیابی و کامرانی، حرکت روانی، صرف شعرا کی اثر آفرینی اور گرم نوائی پر موقوف ہوگی۔"

آجکل کی لڑائیوں میں کڑکے یا رجز کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ اگر شعرا مقدمۃ الجیش بنکر آگے بڑھینگے تو مشین گنوں اور زہریلے گیس کے بموں سے قافیہ درکنار عرصۂ حیات تنگ ہی ہو جائیگا۔

خطبات کے آخر میں مولانا سیمآب نے اپنی مختصر سی خود نوشت سوانحعمری بھی لکھدی ہے۔ اور اُن الفاظ کی فہرست دیدی ہے جو آپ کے نزدیک متروک ہیں۔

کلیم عجم کا حصۂ نظم تین حصوں میں منقسم ہے۔ جن کے نام علیحدہ علیحدہ (۱) نشید نو (۲) بادۂ دیرشین۔ اور (۳) صہبائے کہن ہیں۔ پہلا نام یعنی "نشید نو" غرابت سے خالی نہیں اس حصہ کی تمام غزلیں تاریخ وار بقید مقام مشاعرہ درج ہیں جس سے آپ کے کلام کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

مقدمات کے سلسلے میں مولانا نے اُردو شاعروں سے دریافت کیا ہے کہ کیا ایران کے فرہاد و شیریں، نجد کے قیس و لیلےٰ، مصر کے یوسف و زلیخا، اور عراق کے وامق و عذرا سے بہتر رومان کنک اور تارا، نل و دمن اور ہیر رانجھا، وطنی انسانوں میں نہیں ملتا؟ کیا مذاکر تجلّی کے لئے صرف موسیٰ بن عمران اور طور سینا مخصوص ہیں؟ ان سوالات کے جواب میں خود مولانا سیمآب لکھتے ہیں:-

طور موسیٰ

مری رسائی سے دور ہے تو گر ابھی تجھکو یاد ہوگا　　کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں اُلٹ دیا تھا نقاب تیرا
طور موسیٰ، دلِ طائف، چمنستانِ خلیل　　یادگاریں ہیں تری جلوۂ جاناں کیا کیا
جب تجلّی ان کی برق آزار یوں پر آگئی　　آبلے سے دل کے پیدا طور سینا کر دیا

جا کر جو میں نے قُل اَرِنی طور پر کہا آواز آئی موسیٰ عمران نہیں ہیں آپ!

لیلیٰ مجنوں :-

نجد کے ہر تِون سے اعجازِ محبت پوچھیے پڑگئی جس پر نگاہِ قیس لیلےٰ ہوگیا
نہ اب رہگذارِ قیس رکھ اپنی نگاہوں کو جو لیلےٰ بن کے نکلیگا اِسی محمل سے نکلیگا
قیامت میں نہ ہو پردہ دری حُسن محبت کی سُنا ہے قیس اسے لیلیٰ ترے محمل سے نکلیگا
جب جلوہ کوئی نگاہ میں باطل نہیں رہا اب امتیازِ لیلیٰ و محمل نہیں رہا

قیس و فرہاد :-

وہ عبا قیس کی، فرہاد کا وہ جامہ تنگ وحشت و کہسار نے دیکھے ہیں گریباں جابجا

یوسف :-

نظروں میں میری یوسفِ ثانی تو آپ ہیں آنکھوں میں میری خواب پریشاں نہیں ہیں آپ

محمود و ایاز :-

پیکرِ غزنوی میں بھی عشق نے داد بندگی حُسن نے کیں کرامتیں بندگی ایاز میں
یہی راز تھا کہ حقیقتیں رہیں راز بزم مجاز میں وہی غزنوی کی نظر میں تھی جو گرہ تھی زلفِ ایاز میں

مولانا کی شاعری پر ہم اس سے قبل "کار امروز" کے سلسلے میں ریویو کر چکے ہیں۔ اب مزید قلم فرسائی کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے پختہ کار، کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہونے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت آپ کا کلام تعریف سے مستغنی ہے بہرنوع یہ کتاب اس قابل ہے کہ اردو ادب کے فدائی اسکا ضرور مطالعہ کریں۔

لے لکھائی چھپائی سب عمدہ، ضخامت چار سو صفحات۔ سائز بڑا۔ مجلّد، کتاب میں مولانا کی جوانی اور موجودہ عمر کی تصویریں بھی ہیں قیمت غالباً تین یا چار روپیہ ہونگے۔ ملنے کا پتہ:۔ دارالاشاعت قصر الادب آگرہ

حدیثِ حسن

یہ سید شمیم احمد صاحب فطرت واسطی کی پچاس نظموں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ فطرت صاحب اُردو کی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ انکی نظمیں زمانہ۔ اور اردو کے دیگر نامور رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں ابھی وہ ماشاء اللہ جواں سال ہیں۔ اسلیے انکے کلام میں حکمت کا فلسفہ یا تصوف و اخلاقیات کے خشک مضامین کے بجائے وہی جذبات زیادہ نظر آتے ہیں جن کا عہد شباب متقاضی ہے خیالات میں بلندی و الفاظ میں روانی و ترنم، بندشوں میں چستی بھی موجود ہے۔ غرضکہ کلام پڑھنے سے

طبیعت میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے، گو اسکا اثر زیادہ دیرپا نہیں ہوتا۔ مناظر فطرت سے متاثر ہوکر جب وہ الفاظ میں انکی تصویر کھینچتے ہیں تو دلچسپ اور موزون الفاظ میں کھینچتے ہیں۔ شروع میں مسٹر اقبال احمد سہیل نے ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے اور فطرت صاحب کے کلام کی تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ مقدمہ واقعی قابل قدر ہے۔

اس کتاب میں واسطی صاحب کا فوٹو بھی ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ، چھوٹی تقطیع کے ۱۱۲ صفحات، مجلد قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ:- شاہکار بکڈپو، گورکھپور

کلام ٹیگور

یہ ہندوستان کے شاعر اعظم ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کے ایک سو اکیس گیتون کا اردو نثر میں ترجمہ ہے، جو موصوف کی قائم کردہ آدرش یونیورسٹی شانتی نکیتن میں عموماً گائے جاتے ہیں۔ اس مختصر سے مجموعہ کو "مشتے نمونہ از خروارے" سمجھنا چاہیے کیونکہ ڈاکٹر صاحب ممدوح کے صرف گیتون کی تعداد تین ہزار کے قریب ہے اور کل منظوم کلام انکا اتنا ہے کہ پندرہ ضخیم جلدون میں سما سکتا ہے۔ حال میں ڈاکٹر ٹیگور کی پچھترویں سالگرہ منائی گئی تھی جسکی خوشی میں ہم نے گذشتہ نمبر میں یادگاری نظمیں شائع کی ہیں، غرض ابھی آپ کی تصانیف کا سلسلہ جاری ہے۔ اور خدا کرے عرصہ تک جاری رہے۔

ایک زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنے سے عموماً وہ خوبیاں اکثر زائل ہو جاتی ہیں جو اصلی کلام میں موجود ہوتی ہیں۔ تاہم محمد ضیاء الدین صاحب پروفیسر شانتی نکیتن مبارکباد دینے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے گیتون کا بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ گو اصلی گیتون کی تازگی، وہ برجستگی تخیل کی بلندی الفاظ کی موزونیت اور روانی اور مصرعون کا ترنم اور موسیقیت کا کسی نثر ترجمے میں قائم رہنا ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی مترجم صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے خیالات کو بہت پسندیدہ الفاظ اور پاکیزہ ترکیبون کا لباس پہنایا ہے۔

ٹیگور کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اسکی الہامی سادگی اور بےساختگی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر لکھتے وقت دماغ پر بالکل زور نہیں دیتے بلکہ جو کچھ دل پر وارد ہوتا ہے اسے برجستگی کے ساتھ موزون الفاظ میں بے تکلف بیان کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکا ہر شعر واردات قلب کی مسکراتی تصویر ہوتا ہے۔

اسکے ساتھ ہی کلام میں حریت و آزادی اور وطن پرستی کے جذبات بھی کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

ٹیگور فطرت کے دربار سے دنیا کے لئے ایک پیغام لائے ہیں اور وہ پیغام یہ ہے کہ "ہر قوم ذلت کو

ہر دوسری قوم و ملت سے بحیثیت انسان میل جول اور اتحاد کرنا چاہیئے۔"

آپ کا چہرہ پیغمبرانہ جلال اور آپکا کلام اعجاز عیسوی لیے ہوئے ہے ہمارے نزدیک ہر محب وطن اور جذبات عالیہ کے ہر شیدائی کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ اور اُن مبتدی شاعرون کیلئے تو اسکا پڑھنا قطعی ناگزیر ہے۔ جو ابھی معمولی حدود سے باہر نہیں نکلے ہیں اس کتاب کے شروع میں ڈاکٹر ٹیگور کا فوٹو اور اسکے بعد چودہ صفحات پر مترجم صاحب کی فاضلانہ تمہید ہے جسمین ڈاکٹر صاحب کے کلام کی خصوصیات پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔

لکھائی چھپائی ٹائپ، کاغذ عمدہ ارزتی، ضخامت ۲۲ × ۱۸ سائز کے ایکسو تیس صفحات، کتاب مجلد باتیبہ قیمت ڈھائی روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ وشوا بھارتی بک شاپ منا کارنوالس اسٹریٹ کلکتہ۔

ٹیگور اور اُن کی شاعری

اس چھوٹی سی کتاب میں مولانا مخدوم محی الدین صاحب بی۔ اے۔ نے ڈاکٹر ٹیگور کے سوانح حیات پر روشنی اور اُنکے کلام اور تصانیف پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ آجکل کی دنیا میں جبکہ ہر شخص عدیم الفرصت اور زندگی کی دوا دوش میں مبتلا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے مطالعہ سے بہت فائدہ ہوگا۔ کالج اور اسکول کی بڑی کلاسون کے طلبا کو یہ کتاب ضرور پڑھنا چاہیئے۔

لکھائی چھپائی کاغذ معمولی، ضخامت چھوٹے سائز کے آٹھ جزو۔ قیمت ایکروپیہ آٹھ آنہ۔ جو ہمارے نزدیک بہت زیادہ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد۔ دکن

ہمارے افسانے

ملک کے نوجوان ادیب سید وقار عظیم ایم۔ اے۔ کی یہ تازہ تصنیف فن افسانہ نویسی کی مختصر تاریخ ہے جسکے پہلے حصہ میں فن افسانہ نگاری کے مختلف پہلوؤن مثلاً ابتدا اور ارتقا، مقامی رنگ، اصلاحی مقصد، ترجمے، عورت کا تخیل، محبت اور نفسیات، نیز افسانہ نگاری کے مستقبل پر بحث کی گئی ہے۔ اور دوسرے حصہ میں ملک کے مشہور افسانہ نگارون مثلاً منشی پریم چند، سدرشن، نیاز فتحپوری، سید سجاد حیدر، مجنون گورکھپوری، علی عباس حسینی، ڈاکٹر اعظم کریوی وغیرہ وغیرہ ستائیس افسانہ نگارون پر تنقید کی گئی ہے۔ اور اُنکے طرز تحریر کے خصوصیات پر مختصر اً روشنی ڈالی گئی ہے۔ ملک کے مبتدی افسانہ نگار اس کتاب کے مطالعہ سے

بہت کچھ مستفید ہو سکتے ہیں۔

نوٹ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۶۸ صفحات، قیمت سوا روپیہ عہ

ملنے کا پتہ:۔ سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد

افسانہ نگاری

ہندوستان کا کوئی رسالہ یا اخبار اٹھا کر دیکھ لیجئے، اُسمیں آپ کو مختصر افسانے ضرور نظر آئینگے، گویا افسانہ نگاری آجکل کی ادبی دنیا کے فیشن میں داخل ہے۔ لیکن اُنکے لکھنے والوں میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں، جو یہ بھی نہیں جانتے کہ افسانہ کیا چیز ہوتی ہے، کیونکر لکھا جاتا ہے اور کس مقصد کے لیے لکھا جاتا ہے، نوجوان ادیب سید وقار عظیم ایم۔ اے۔ نے مندرجہ عنوان پر کتاب لکھکر ہندوستانی افسانہ نگارون کے لئے شاہراہ ہدایت قائم کردی ہے۔ یہ کتاب نو باب میں تقسیم ہے (۱) افسانہ کی حقیقت (۲) پلاٹ (۳) شرخی (۴) فنی ترتیب (۵) ابتدا و خاتمہ (۶) کردار نگاری (۷) افسانہ او حقیقت (۸) افسانہ اور محبت (۹) افسانہ اور اتحاد اثر۔ ان جملہ امور پر فاضل مصنف نے بہت خوش اسلوبی سے بحث کی ہے۔

نوٹ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، ضخامت دو سو صفحات قیمت سوا روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد

ساقی دہلی کا جاپان نمبر

یون تو ملک کے بہت سے رسالے سال میں کوئی خاص نمبر نکالنے کا شوق رکھتے ہیں لیکن معصر ساقی دہلی کے خاص نمبرون کی خصوصیت اکثر نمایان ہوتی ہے۔ چنانچہ اسکے جاپان نمبر میں تقریبًا تمام مضامین جاپان کے متعلق شایع کیے گئے ہین ان مین سے بعض مضامین جاپانیون کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں مضامین کی فراہمی میں پروفیسر نورالحسن برلاس استاد مدرسہ عربی ٹوکیو جاپان اور انکی محترمہ بیگم صاحبہ نے بہت زیادہ حصہ لیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر انکی امداد و اعانت شامل حال نہ ہوتی تو کار پرداز ان رسالہ ساقی کیلئے اسقدر عمدہ جاپان نمبر نکالنا مشکل ہوتا۔ اس نمبر کی دلاویز خصوصیت اسکی متعدد تصاویر ہیں جو عمومًا جیتے جاپانی زندگی کا مکمل مرقع پیش کرتی ہیں۔ مضامین میں فلسفہ، سیاست جاپان "توکیدا سا ہی" "شگوفوں کا پھول" "جاپانیون کا معیار زندگی" "جاپانی شادی" نہ صرف دلچسپ بلکہ پر از معلومات ہیں۔ ہم اس اعلی نمبر کی اشاعت پر اپنے محترم معصر کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

یہ نمبر ساقی کے ڈھائی سو صفحات پر چھپا ہے۔ قیمت صرف سوا روپیہ عہ شائقین منیجر صاحب ساقی کھاری باؤلی دہلی سے طلب فرمائین۔

ڈاکٹر ایس۔ کے۔ برمن لمیٹڈ

پچاس برس سے مشہور لاثانی دیسی پیٹنٹ دواؤن کا ہندوستانی وسیع کارخانہ

صیغہ نمبر ۱۱ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ

STAR TRADE S.K.B. MARK (REGD)

زیل ام (Regd)

(کٹے جلے چوٹ وغیرہ پر لگانے کا مشہور مرہم)

یہ صرف نباتات (جڑی بوٹیون) سے بنا ہے۔ اس مین چربی نہین ہے۔ آگ سے جلنے کا چھالا زہریلے کیڑے مکوڑون کے کاٹنے کے جلن۔ چاقو چھری وغیرہ سے کٹنے۔ گرنے پھسلنے وغیرہ اچانک حادثون سے فوری آرام پانیکے لیے ہر خاص عام کو اپنے پاس رکھنا چاہیئے۔

قیمت فی ڈبیہ ۹ر نو آنہ

محصولڈاک تین ڈبیون تک سات آنہ ۷ر

نمونہ کی ڈبی دو آنہ ۲ر جو صرف ایجنٹون سے ہی ملسکتی ہے

سرابنا (Regd)

(سردرد ریاحی درد کی ٹکلی)

روتے کو ہنساتی ہے

آدھے یا سارے سر مین کیسا ہی درد کیون نہ ہو اسکے کھاتے ہی جاتا رہے گا۔ خواہ کسی بھی عضو مین کیسا ہی ریاحی درد ہو اسے یہ فوراً دور کر دیتی ہے۔

قیمت فی شیشی آٹھ آنہ ۸ر

محصولڈاک آٹھ شیشیون تک سات آنہ ۷ر

نمونہ ڈیڑھ آنہ ۱۰ر

جو صرف ایجنٹون سے ہی ملسکتا ہے۔

نوٹ:- دوائین ہر جگہ ملتی ہین۔ خریدتے وقت اسٹار ٹریڈ مارک اور ڈاکٹر برمن کا نام ضرور دیکھ لیا کرین۔

(۱) کانپور (نیا گنج) کے ایجنٹ محمد حفیظ محمد نصیر (۲) کانپور (کلکٹر گنج) کے ایجنٹ چھوٹے لال اینڈ سنس (۳) کانپور (نیا گنج) کے ایجنٹ مسرز راما اینڈ کمپنی۔

میدانِ عمل

سعیٔ پیہم ہے نشانِ قیس و شانِ کوہکن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہسار

ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جو اُن کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ میدانِ عمل میں ملک کی موجودہ بیداری اور بے چینی روح کی ایک جھلک ہے۔ اس ناول کے افراد کوئی خیالی اشخاص نہیں معلوم ہوتے کہ جس سے اگر نیکی ہوتی ہے تو ایسی کہ اُسکی نظیر دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈھنے سے نہیں ملتی اور اگر گنہگار یا مجرم دکھایا جاتا ہے تو ایسا کہ شیطان بھی بازی ہار جائے۔ "میدانِ عمل" میں اس ورکے وہ زندہ انسان ہیں جن سے نیکی اور بدی، رہنمائی اور بے راہ روی دونوں ممکن ہیں۔ وہ محبت کرنے اور محبت کی آگ میں اپنا سب کچھ جلا کر خاکستر کر دینے کے اہل ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں ہندوستان کا مستقبل ہے۔ اور اُن کے کارناموں پر کروڑوں انسانوں کی فلاح اور جہالت کا بار۔

ایسے اشخاص کی زندگی کی داستان ہر محبِ وطن پڑھنا پسند کریگا خصوصاً اس حالت میں جبکہ منشی پریم چند کے سحر طراز قلم نے ان میں صفحۂ قرطاس پر جیتی جاگتی زندہ ہستیاں بنا دیا ہو۔

قیمت صرف ۲ ؎

ملنے کا پتہ:۔ **مکتبہ جامعہ، قرول باغ، نئی دہلی**